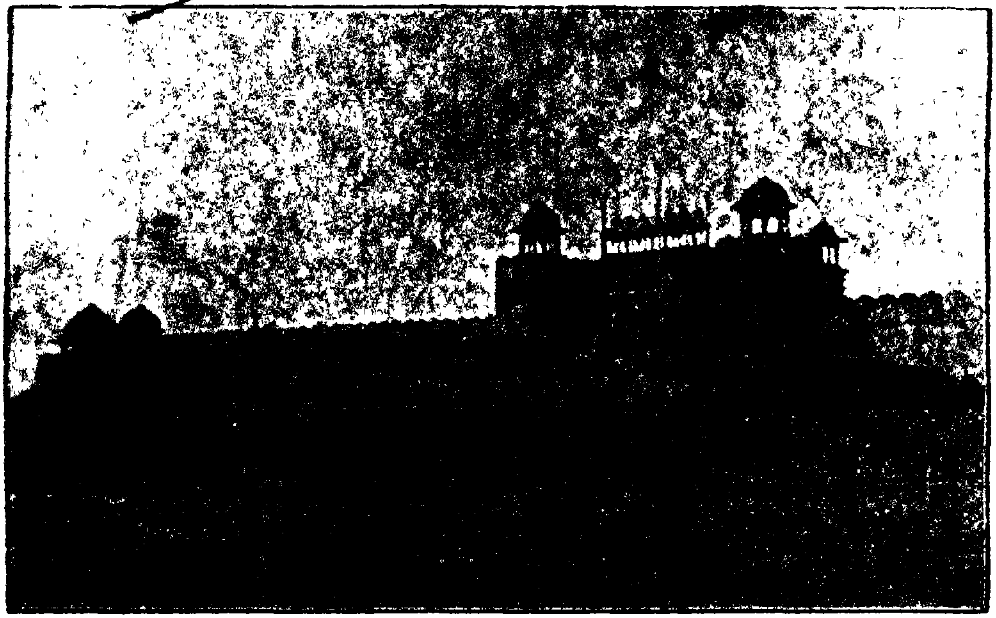
جلد پنجم　　　جنوری سنہ ۱۹۲۵ع　　　حصۂ ہفت دہم

اُردو



انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

فردوسی کا مذہب

(از جناب محمود خاں شیرانی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

جس طرح فردوسی کے حالات کے متعلق ہماری معلومات ناکافی اور غیر یقینی ہے۔فردوسی کے مذہب کے متعلق بھی ہمارا علم ناقابل اعتبار ہے۔ ہم نے یہ مان لیا ہے کہ وہ شیعہ تھا اور اسی پر مطمئن ہیں لیکن تحقیقات کی روشنی میں ہمارا یہ اعتقاد وہم و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا—

پرانی روایات اس کو شیعہ بیان کرتی ہیں۔شاہنامہ اس بارہ میں متضاد اور متناقض شہادت پیش کرتا ہے جس کی رو سے فردوسی شیعہ بھی مانا جا سکتا ہے اور سنی بھی اور یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص شیعہ اور سنی دونوں ہو نہیں سکتا۔البتہ ایک امر یقینی ہے کہ جہاں شاعر کو اس کے دشمنوں نے مجوسی۔فلسفی۔دہریہ۔ملحد۔کافر اور معتزلی کہا ہے وہاں اس کو رافضی بھی کہا ہے۔اب دشمنوں کے بیانات پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔۔اگر وہ ملحد اور مجوسی تھا تو شیعہ بھی تھا۔۔اگر یہ نہیں تھا تو وہ بھی نہیں تھا—

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا ان ایام میں مذہبی نوعیت کے افترا اور بہتان لگانے پر بہت آمادہ رہتی تھی۔حسنک میکال آخری وزیر سلطان محمود غزنوی پر بھی ملحد اور قرمطی ہونے کا الزام لگایا گیا تھا اور خلیفۂ بغداد نے سلطان محمود سے اس کا سر طلب کیا تھا۔اصلی واقعہ صرف اسی قدر تھا کہ جب حسنک حج بیت اللہ کے لئے گیا تھا فاطمیئین مصر نے اس کے اور سلطان کے لئے چند تحائف بھیجے تھے جن کو اس نے قبول کر لیا تھا۔سلطان محمود نے جو اپنے وزیر کے مذہب سے خلیفہ کی بہ نسبت زیادہ صحیح واقفیت

رکھتا تھا جواب میں کہلا بھیجا کہ حسنک میرے سامنے کا بچہ ہے میں نے اس کو تربیت کیا ہے اگر وہ تمہارے نزدیک قرمطی ہے تو سمجھہ لو کہ میں پہلے قرمطی ہوں۔ لیکن محمود کی آنکھہ بند ہوتے ہی سلطان مسعود کے دور میں حسنک میکال کو اسی جرم میں سولی دی جاتی ہے —

قدیم روایات جن کے متعلق ایما ہو چکا ہے حقیقت میں فردوسی کو شیعہ مانتی ہیں۔ ان میں سب سے پرانی دیباچۂ قدیم کی روایت ہے۔ جس کی رو سے سلطان محمود کے دربار میں فردوسی کی محرومی کا اولین محرک اس کا مذہب تھا لیکن صاحب دیباچہ یہ ذکر نہیں کرتا کہ وہ مذہب کیا تھا۔ اس کے الفاظ ہیں۔ —

"اما بر سر شاهنامه شرط ادب نگاه نداشته بود و سخن در مذهب خود گفته —

گرت زین بد آید گناه منست　　چنین است این رسم و راه منست

سلطان را ناخوش آمد و سیاست فرمود۔ پس عنصری و جماعت شاعران زمین بوس کردند و اورا از سیاست خلاص دادند"۔ نظامی عروضی کی شہادت کی رو سے فردوسی صریحاً شیعی اور معتزلی ہے اس کا بیان ہے کہ خواجہ کے دشمنوں نے سلطان کو فردوسی کے انعام کے لئے مشورہ دیتے وقت کہا کہ صرف پچاس ہزار (درم) کافی ہوں گے اس لئے کہ وہ رافضی اور معتزلی ہے۔ دوسرے موقعہ پر نظامی فردوسی کی شیعیت کا اس وقت ذکر کرتا ہے جب فردوسی سلطان محمود کی ہجو لکھہ کر اور فرار ہو کر طبرستان میں اسپہبد شہریار کے پاس جو آل باوند کا ایک رکن تھا پناہ گزین ہوتا ہے۔ جب شاعر شہریار کے نام پر شاہنامہ منسوب کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسپہبد شہریار جواب میں اس وقت کہتا ہے کہ اسے استاد محمود کو دشمنوں نے بہکا دیا ہے اور تیری کتاب کا ذکر مناسب موقعہ پر نہیں کیا بلکہ تیری بد گوئی کی گئی۔ دوسرے تو شیعہ طبقہ سے تعلق

رکھتا ہے اور جس کو خاندان پیمبر سے محبت ہوتی ہے۔دنیاوی معاملات میں سرسبز نہیں ہوتا اس لئے کہ اہل بیت کو خود کامیابی نہیں ہوئی۔نظامی کی اصل عبارت ذیل میں نقل کی جاتی ہے—

(۱) اما خواجۂ بزرگ (احمد بن حسن میمندی) منازعاں داشت کہ پیوستہ خاک تخلیط در قدح جاہ او همی انداختند۔محمود با آں جماعت تدبیر کرد کہ فردوسی را چہ دهم۔گفتند پنجاہ هزار درم و این خود بسیار باشد کہ او مردے رافضی است و معتزلی مذهب و این بیت بر اعتزال او دلیل کند کہ او گفت—

بہ بینندگاں آفرینندہ را	نہ بینی مرنجاں دو بینندہ را

و بر رفض او این بیتها دلیل است کہ او گفت—

خردمند گیتی چو دریا نهاد	بر انگیختہ موج ازو تند باد
میانہ یکے خوب کشتی عروس	بر آراستہ همچو چشم خروس
اگر خلد خواهی بدیگر سراے	بنزد نبی و وصی گیر جاے
چو هفتاد کشتی درو ساختہ	همہ بادبانها بر افراختہ
پیمبر بدو اندروں با علی	همہ اهل بیت نبی و وصی
گرت زیں بد آید گناہ منست	چنیں داں و ایں راہ راہ منست
بریں زادم و هم بریں بگذرم	یقیں داں کہ خاک پئے حیدرم

(چهار مقالہ طبع یورپ صفحہ ۴۹)

(۲) و شاهنامہ بر گرفت و بطبرستان شد بنزدیک اسپهبد شهریار کہ از آل باوند در طبرستان بادشاہ او بود و آں خاندانے است بزرگ نسبت ایشان بیزدگرد شهریار پیوندد و پس محمود را هجا کرد در دیباچہ بیتے صد و بر شهریار خواند و گفت من ایں کتاب را از نام محمود با نام تو خواهم کردن۔ کہ ایں کتاب همہ اخبار و آثار جدان تست۔شهریار او را بنواخت و نیکوئیها فرمود و گفت یا استاد محمود را برآں داشتند و کتاب را بشرطے عرضہ نکردند

و ترا تخلیط کردند و دیگر تو مرد شیعیئی و هر که تولی بخاندان پیغمبر کند او را دنیاوی هیچ کارے نرود که ایشانرا خود نرفته است۔محمود خداوندگار منست تو شاهنامه بنام او رها کن و هجو او بمن ده تا بشویم و ترا اندک چیزے بدهم (چهار مقاله صفحه ۳۹ و ۴۰)-لیکن نظامی کے بیانات پر زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ خواجہ احمد بن حسن میمندی کی سرپرستی کی روایت کی جس کا نظامی مدعی ہے شاهنامہ تائید نہیں کرتا۔البتہ سلطان کے وزیر اول ابوالعباس خواجہ فضل بن احمد کا ذکر دو مقام پر شاهنامہ میں ملتا ہے اور فردوسی اس کا شکر گذار بھی معلوم ہوتا ہے —

ز دستور فرزانۂ دادگر　　پراگندہ رنج من آمد بسر

(شاهنامه صفحه ۲۴۴ طبع بمبئی سنه ۱۲۷۵ هجری)

نیز فردوسی کے شیعہ تذکرہ نگار خواجہ احمد بن حسن میمندی کو جسے غلطی سے وہ عام طور پر حسن میمندی لکھنے کے عادی ہیں۔بالعموم فردوسی کا دشمن بیان کرتے ہیں۔فردوسی کے ان دوستوں میں خواجہ کی نسبت اظہار دشمنی میں اس قدر مبالغہ کیا گیا ہے کہ غریب خواجہ کو خارجی مشہور کر دیا گیا ہے چنانچہ عبارت ذیل ملاحظ ہو —

" و چنین گویند ارکان دولت سلطان از شهر و نواحی با فردوسی انواع خلق و محبت و کرم همی نمودند و فروسی در مدح ایشان سخن گفتے ر حسن میمندی از ین جهت با فردوسی مظنه داشتے و غبارے درمیان ایشاں شده بردے و هیچ نوع چنانچه فرموده سلطان بود با او بجا نیاوردے تا بعدیکه فردوسی گفت که حضرت حق عزشانه در ازل چناں تقدیر فرموده بود که این کتاب بر زبان من تمام شود و مرا در مال سلطان طمعے نیست و بجاه و تقرب حسن میمندی احتیاجے ندارم میگفت مثنوی (کذا)

من پیش کز مبادے فطرت نبوده ام　　مائل بمال هرگز و طامع بجاه نیز

سوئے در وزیر چرا ملتفت شوم — چوں فارغم ز بارگہ بادشاہ نیز

و گویند حسن میمندی در طبع خوارج بود و فردوسی کہ تشیع بطبیعت داشت اورا عدم الوجود میدانست و ہر چند احمد و اولاد فردوسی را بر موافقت و ترک مخالفت وزیر تحریص میکردند اجتناب و اعتراض زیادہ نمودہ میگفت —

بدل ہر کہ بغض علی کرد جائے — ز مادر بود عیب آں تیرہ رائے

کہ ناپاک زادہ بود خصم شاہ — اگر چند باشد بایوان و گاہ

ز میمندی آئین مردی مجوئے — ز نام و نشانش مکن جستجوئے

قلم بر بسر او بزن ہمچو من — کہ گم باد نامش بہر انجمن

(دیباچۂ بایسنغر خانی)

یہ بیانات اگرچہ تاریخی لحاظ سے بے سر و پا ہیں نہ فردوسی ایسا خود پسند اور مغرور تھا نہ خواجہ احمد بن حسن میمندی خارجی اور نہ یہ اشعار فردوسی کے۔ لیکن میں نے اس غرض سے یہاں ان کو نقل کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ شیعہ حلقوں میں خواجہ کس نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔۔

فردوسی کی انتہائے پیری اور جسمانی کمزوریوں کا خیال کرتے ہوئے اسی سال کی عمر میں طبرستان جیسے دور دراز ملک کا سفر اختیار کرنا اور جاتے ہی شہریار کے ہاں رسائی پیدا کرلینا غیر اغلب معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح کہ خود شہریار کی شخصیت غیر یقینی ہے —

اسپہبد شہریار

تاریخ میں اس کی شخصیت نہایت عجیب ہے۔ نہ صرف اس کے نام بلکہ اس کی ہستی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا جانا چاہئے اس کی زندگی کے کارناموں سے ہمیں اسی قدر علم ہے کہ —

شہریار شروین بن رستم بن سرخاب بن قارن بن شہریار کا فرزند ھے جو ماکان بن کاکی کا معاصر تھا اور شہریار خود رکن‌الدولہ بویہ اور وشمگیر بن زیار کا ھمعصر تھا-اس کا فرزند جو دادا کے نام پر شروین کے نام سے موسوم تھا اس کی حین حیات میں وفات پا جاتا ھے اور شہر یار-قابوس بن وشمگیر اور سلطان محمود کے زمانہ تک زندہ رھتا ھے اور فردوسی اسی کے دربار میں شاھنامہ لے کر جاتا ھے--

یہ بیان میں نے ابن اسفند یار کی تاریخ طبرستان کے انگریزی ترجمہ سے لیا ھے جس کو پروفیسر براؤن نے شایع کیا ھے- مرزا محمد قزوینی شہر یار کے زمانہ کے متعلق صاحب مرزبان نامہ کے ذکر میں کہتے ھیں--

"پدر مرزبان اسپہبد رستم بن شہریار بن شروین معاصر شمس‌المعالی قابوس بن وشمگیر ۳۶۶ ھجری بود در فریم (پریم) وشہر یار کوہ قائم مقام پدرشد وپدرش شہریار بن شروین معاصر سلطان محمود غزنوی بود و در ۳۳۷ ھجری (بقول شیفر-معلوم نیست از روے چہ ما خذے) بتخت نشست و مدتے دراز بماند وزمان سلطان محمود را درک نمود واوست کہ فردوسی بعد از قرار ازدربار سلطان محمود نبزد وے رفت و خواست شاھنامہ بنام او کند و آنحکایت معروفست"— مرزبان نامہ مقدمۂ مصحح صفحہ واو)

اس کی تاریخ وفات کے لئے مرزا مرصوف لکھتے ھین--

"تاریخ وفات این شہریار معلوم نیست ھمیں قدرابن اسفند یار گوید "شہریار مدتے دراز بماند-تادر عہدشمس‌المعالی قابوس بن وشمگیر وھم در عہد سلطان یمین‌الدولہ محمود بماند" وچوں تاریخ اتمام شاھنامہ در ۴۰۰ ھجری است در ھر حال وفات شہریار بعد ازاں واقع شدہ است" (چہار مقالہ صفحہ ۱۹۰)-گویا ۳۳۷ ھجری میں شہریار تخت نشین ھوکر ۴۰۰ ھجری کے بعد تک زندہ رھا-یہ طویل مدت سلطنت بجاے خود ایک حیرت خیز امر ھے

اور تریسٹھ سال سلطنت کرنے کے باوجود اس دراز مدت میں وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کا تاریخیں ذکر کرتیں۔اس کے معاصر وشمگیر اور رکن الدولہ جبکہ ۳۵۷ هجری اور ۳۶۶ هجری میں وفات پاتے هیں شهریار فردوسی کے انتظار میں پانچویں صدی کے آغاز تک مرنے کا نام نہیں لیتا۔مرزا محمد کا بیان اور بھی عجیب هے۔وہ کہتے هیں کہ رستم شہریار کا فرزند شمس المعالی قابوس کا همعصر هے اور خود شہریار سلطان محمود ۳۸۸ هجری و ۴۲۱ هجری کا هم عہد هے۔اس طرح بیٹا باپ سے پہلے تخت نشین هوجاتا هے اس سے عجیب وہ بیان هے جو ابن اسفندیار دے رہا هے۔وہ کہتا هے —

"شہریار کا جانشین اسپہبد دارا هوا جس نے صرف تھوڑی مدت حکومت کی۔دارا کے بعد اس کا فرزند اسپہبد شہریار* برسر تخت آیا جو قابوس بن وشمگیر کے ساتھ اس کی اٹھارہ سالہ مہاجرت میں شریک رہا۔جرجان میں قابوس کے ساتھ واپس آیا اور یہاں آکر اس نے کارهائے نمایاں کئے۔شہریار کوہ فتح کیا اور باقی بن سعید کی اعانت سے ۳۸۷ هجری میں اس نے فیروزان بن حسن کو شکست دی اور قابوس کے لئے ملک کو پاک وصاف کرکے جب خود طاقتور هوگیا تو قابوس سے بغاوت کی اور رستم بن مرزبان کے هاتھ پر گرفتار هوکر باقی عمر قید میں گذاری" —

اب ایک نئی دشواری پیش آتی هے۔یعنے ایک شہریار کے بجائے ایک هی وقت میں دو شہریار ماننا پڑتے هیں۔یعنے شہریار ثانی اور شہریار ثالث (آل باوند میں تین شہریار گذرے هیں) شہریار ثالث اگرچه دارا کا فرزند اور جانشین هے اور شہریار ثانی اگرچه دارا کا مورث هے دونوں همعصر بن جاتے هیں کیونکه بقول ابن اسفندیار دونوں قابوس اور سلطان محمود کے معاصر

* یه یاد رهے که اسی شہریار کو تاریخ یمینی میں "اسپهبد شہریار بن شروین" کہا گیا هے۔دیکھو صفحه ۱۷۳ تاریخ یمینی۔مطبع محمدی۔لاهور —

ھیں۔ شہریار ثالث قابوس کے لئے اس کا آبائی ملک فتح کرتا ھے لیکن شہریار ثانی کسی اور ضرورت سے نہیں صرف فردوسی کی خاطر سنہ ۴۰۰ ھجری کے بعد تک زندہ مانا جاتا ھے —

ان مشکلات کو مدنظر رکھکر میں یہی مناسب سمجھتا ھوں کہ شہریار ثانی کی وفات کو قابوس کی جلا وطنی کے زمانہ سے قبل جو سنہ ۳۷۰ ھجری سے شروع ھو کر سنہ ۳۸۸ ھجری پر ختم ھوتا ھے مان لیا جائے اور اس کے دربار میں فردوسی کے جانے کے قصہ کو بے بنیاد تصور کیا جائے —

ایک فرانسیسی کتاب میں (مملوکۂ پروفیسر محمد شفیع ایم۔اے وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاھور) جس کا نام اس وقت میری یاد سے اتر گیا ھے۔ شہریار ثانی۔ دارا اور شہریار ثالث کے سنین سلطنت حسب ذیل ملتے ھیں —

شہریار ثانی جلوس سنہ ۳۱۷ ھجری م سنہ ۹۲۹ عیسوی — وفات سنہ ۳۵۵ ھجری م سنہ ۹۶۹ عیسوی — دارا جلوس سنہ ۳۵۵ ھجری م سنہ ۹۶۹ عیسوی — وفات سنہ ۳۶۲ ھجری م سنہ ۹۷۲ عیسوی — شہریار ثالث جلوس سنہ ۳۶۲ ھجری م سنہ ۹۷۲ عیسوی — وفات سنہ ۳۹۷ ھجری م سنہ ۱۰۰۶ عیسوی —

ان سنین پر بظاھر کوئی اعتراض وارد نہیں ھوتا۔ اب ظاھر ھے کہ شہریار ثانی کے پاس فردوسی کا سنہ ۴۰۰ ھجری میں جانا ناممکن ھے۔ رھا شہریار ثالث۔ اول تو اس کے دربار میں فردوسی کا جانا تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اگر مان لیا جائے کیونکہ تاریخ عتبی میں اسی شہریار کو اسپہبد شہریار بن شروین کے نام سے یاد کیا گیا ھے۔ اس لئے احتمال ھو سکتا ھے کہ فردوسی اس کے پاس گیا ھو۔ لیکن فردوسی کو اس کے پاس جانے کے لئے کوئی وقت نہیں ملتا۔ شہریار ثالث سنہ ۳۹۷ ھجری میں وفات پاتا ھے لیکن وفات سے قبل ایک عرصہ قید میں گذارتا ھے اس لئے سنہ ۴۰۰ ھجری میں فردوسی اس کے ھاں بھی نہیں جا سکتا —

ایک اور امر قابل توجہ ھے۔ مرزا محمد حاشیۂ چہار مقالہ صفحہ ۱۹ میں

لکھتے ھیں کہ چھار مقالہ کے تمام نسخوں میں شہریار کے بجائے شہرزاد اور طہران کے مطبوعہ چھارمقالہ میں شبرزاد اور ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان کے نسخوں میں شہریار تھا چونکہ تاریخ میں کسی شہرزاد یا شیرزاد کا سراغ نہیں چلا اس لئے انھوں نے ابن اسفندیار کی سند پر شہریار اختیار کر لیا۔بہرحال یہ شہریار یا شیرزاد خواہ ھم اس کو کسی نام سے پکاریں ایک ایسی عجیب ھستی ھے جس کے نام اور شخصیت پر پردہ پڑا ھوا ھے اور کوئی تعجب نہیں اگر نظامی عروضی نے اپنے قصہ کو نمکین بنانے کے لئے تراش لیا ھو۔۔

بقول نظامی شہریار محمود کو اپنا آقا تسلیم کرتا ھے اور کہتا ھے "محمود خداوندگار منست" لیکن ھمیں معلوم ھے کہ ان ایام میں سلطان محمود کا طبرستان سے کوئی تعلق نہیں تھا ان ممالک کا بادشاہ قابوس بن وشمگیر تھا اور شہریار اس کا محکوم تھا۔ان حدود میں محمود کے سیاسی اثرات قابوس کی وفات کے ایک عرصہ بعد پھیلتے ھیں—

حق یہ ھے کہ فردوسی نہ طبرستان گیا نہ اور کہیں بلکہ جب سلطان محمود سے مایوس ھوا امیر ابوالمظفر نصر بن ناصرالدین برادر سلطان محمود کے پاس خراسان یا سجستان چلا گیا۔میرا یہ عقیدہ خود شاھنامہ کے بیانات پر مبنی ھے نصر ان ایام میں یا امیرالجیوش خراسان تھا یا والی سجستان۔اس کا ایک درھم ضرب سجستان سنہ ۴۰۱ ھجری راقم کے پاس موجود ھے—

داستان شیریں خسرو کی تمہید میں فردوسی شاھنامہ کے ذکر کے بعد سلطان سے اپنے تعلقات کی برھمی کا تذکرہ یوں بیان کرتا ھے—

بود بیت شش بار بیور هزار　　سخنهاے شایستۂ غمگسار
نه بیند کسے نامۂ پارسی　　نوشته بابیات صد بار سی
اگر باز جویند ازو بیت بد　　همانا نباشد کم از پنج صد

چنیں شہریارے و بخشندۂ بگیتی ز شاہاں درخشندۂ
نکرد اندریں داستانہا نگاہ ز بدگوے و بخت بد آمد گناہ
حسد برد بدگوئی در کار من تبہ شد بر شاہ بازار من

اور سالار شاہ یعنے امیر نصر کی خدمت میں شاہنامہ پیش کر کے صلہ کا امیدوار ہوتا ہے ساتھہ ہی امیر نصر سے استدعا کرتا ہے کہ امیر سلطان سے اس کی سفارش کر دے - چنانچہ شاہنامہ —

چو سالار شہ ایں سخنہاے نغز بخواند ببیند بپاکیزہ مغز
ز گنجش من ایدر بوم شادماں کزو دور باد ابد بدگماں
وزاں پس کند یاد بر شہریار مگر تخم رنج من آید بہار
کہ جاوید باد افسر و تخت او ز خورشید تابندہ تر بخت او

اشعار بالا میں فردوسی سلطان کی نا قدردانی کا شاکی ہے جو دشمن کی سعایت اور بدگوئی کا نتیجہ ہے اس بدگوئی کی تشریح اور تاویل تذکرہ نگاروں نے فردوسی کے اعتزال اور شیعیت سے کی ہے لیکن ان اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاویل بالکل غیر موزوں ہے اور میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ اس بدگوئی کا فردوسی کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا - عام اس سے کہ وہ شیعہ ہو یا معتزلی یا سنی مختصر یہ کہ مذہب سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے --

حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ قدما بھی فردوسی کے مذہب سے اسی قدر تاریکی میں ہیں جس قدر کہ ہم اور ہمارے اہل عصر - ذیل میں شاہنامہ سے وہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو ہمارے شاعر کی شیعیت کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں - دیباچۂ شاہنامہ میں خلفاے راشدین کا نام بنام ذکر کے بعد جیسا کہ اہل تسنن کا دستور ہے یہ اشعار آتے ہیں —

حکیم ایں جہانرا چو دریا نہاد بر انگیختہ موج ازو تند باد
چو ہفتاد کشتی برو ساختہ ہماں بادبانہا بر افراختہ

یکے پھن کشتی بساں عروس | بیا راستہ همچو چشم خروس
محمد بدو اندروں با علی | همان اهل بیت نبی و وصی
خردمند کز دور دریا بدید | کرانه نه پیدا نه بن ناپدید
بدانست کو موج خواهد زدن | کس از غرق بیروں نخواهد شدن
بدل گفت اگر با نبی و وصی | شوم غرقه دارم دو یار وفی
همانا که باشد مرا دستگیر | خداوند تاج و لوا و سریر
خداوند جوے و می و انگبیں | همان چشمهٔ شیر و ماء معیں
اگر چشم داری بدیگر سرا ے | بنزد نبی و علی گیر جا ے
گرت زیں بد آید گناہ منست | چنیں است ایں رسم و راه منت
دلت گر براه خطا مایل است | ترا دشمن اندر جهاں خود دلست
نباشد جزاز بے پدر دشمنش | که یزداں بآتش بسوزد تنش

خلفاے راشدین کی منقبت کے بعد هی دیباچہ میں ان اشعار کا ایراد ان کی حثیت کو مشتبہ کر رها هے۔ پچھلے تین اشعار جن میں غیر ضروری جوش دکھایا گیا هے رها سها پرده فاش کر دیتے هیں۔فردوسی سے سخت اشتعال کے موقعوں پر بھی ایسی سخت زبان کی مشکل سے امید کی جاتی هے۔وه جس طرح نرم گفتاری اور شیریں زبانی کی تلقین کرتا هے اُسی طرح اس پر عمل بھی کرتا هے۔اس بارہ میں اس کا مقوله هے ۔

درشتی زکس نشنود نرم گوئے | سخن تاتوانی بآزرم گوئے

اور جو لوگ شاهنامه کے ذریعه فردوسی کے اخلاق خصائل اور سیرت سے واقف هیں هرگز یقین نهیں کرسکتے که فردوسی ان اشعار کا مصنف هے۔نیز شاهنامه کا دیباچه تنگ چشمانه مذهبی جوش دکھلانے کے لئے قطعی غیر موزوں مقام هے۔اظهار عقیدت کی غرض سے میں مانتا هوں که فردوسی شیعه هونے کی بنا پر محبت و تفضیل حضرت علی کرم الله وجهه کے لئے جو چاهتا لکھتا لیکن نه

ایسی زباں میں جس سے دوسرے فریق کی دل آزاری کا احتمال ہو۔سلطان محمود ایک سنی بادشاہ تھا اور شیعہ حلقوں میں کٹا سنی مانا جاتا ہے۔بلکہ نظامی عروضی کہتا ہے "سلطان محمود مردے متعصب بود" (چہار مقالہ صفحہ ۴۹) ایسے بادشاہ کے دربار میں اول تو سلاطین بویہ و دیالمہ کو چھوڑ کر فردوسی کا جانا کیا ضرور تھا اور اگر گیا تھا تو اپنے مذہب کا آشکارا کرنا کیا فرض تھا اور اگر کیا تھا تو صورت حالات میں سب سے معقول اور سنجیدہ طریقہ یہی تھا کہ اپنے مذہب کا ایسے الفاظ میں ذکر کرتا جس سے کم سے کم درباری مذہب کو یا وہ مذہب جس کا سلطان پیرو تھا صدمہ نہ پہونچتا کیونکہ سلطان کے ہاں فردوسی (اور اس امر پر تمام اسناد متفق ہیں) انعام اور صلہ کی امید میں گیا تھا نہ اس کے مذہب پر سب وشتم کرنے اور اپنے مذہب کی تلقین کرنے۔میرا مقصد اسی قدر ہے کہ فردوسی کو معقول پسند انسان ہونے کے لحاظ سے سلطان کے مذہبی جذبات کو کسی طرح برافروختہ کرنا نہیں چاہئے تھا۔اس قدر جاننے کے بعد جب ہم شاہنامہ میں ایسے اشعار دیکھتے ہیں — دلت گر براہ خطا مائلست۔۔۔ترا دشمن اندر جہاں خود دلست — نباشد جزاز بے پدر دشمنش۔۔۔کہ یزداں باتش بسوزد تنش — تو ہمارا استعجاب اس کے انتہائی درجہ تک پہونچ جاتا ہے۔اگر فردوسی ان اشعار کا مالک ہے تو ہم کو ماننا ہوگا کہ یا تو اس کو سلطان سے صلہ کی کوئی توقع تھی ہی نہیں یا یہ کہ مذہبی جنوں اس پر غالب تھا جن کے اثرات میں اس نے محمود جیسے جابر بادشاہ کے تعصبات مذہبی کی پروا نہ کرکے اس کے جلال اور دبدبہ اور کرو فرو مطلق العنانی کو یک قلم فراموش کرکے صاف صاف اس کو خارجی بنا دیا اور اس کے منہ پر کہہ بھی دیا۔تم اگر راہ خطا پر چلتے ہو تو تم خود اپنے دشمن ہو۔حضرت علی کا دشمن ایک بے پدر ہی ہو سکتا ہے جس کو خدا آتش جہنم میں جھونکے۔اب یہ راہ خطا کیا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دشمن کون ہے! خارجی فرقہ! فردوسی صلہ کی

امید میں دربار سلطانی میں جاتا ہے نہ اس کو خارجی المذہب بیان کرے اور بلا وجہ اشتعال دینے۔ اگر اس کو جنون نہ کہا جائے تو کیا سمجھا جائے --

ہماری خوش عقیدگی کو اس کے انتہائی مدارج تک پہونچا دیتا ہے اگر ہم سے اس اعتقاد کی امید کی جائے کہ یہ اشعار فردوسی نے واقعتاً سلطان کو خطاب کرکے پڑھے تھے۔ اس سے میں یہ مان لینا ہزار درجہ بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ الحاقی ہیں اور فردوسی نے ہرگز نہیں لکھے —

دیباچہ کے علاوہ شاہنامہ میں دو تین مقام اور ایسے ہیں جہاں شعبد رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً خاتمہ داستان سیاوش کے یہ ابیات

بدان گیتیم نیز خواہش گراست — کہ با ذوالفقار است و با منبر است

منم بندۂ اہل بیت نبی — ستایندۂ خاک پائے وصی

اور داستان نوشزاد کے خاتمہ کے یہ ابیات —

اگر در دلت ہیچ مہر علی است — ترا جز شبیر دخواہش گریست

بمیندو بدو رستہ کردیم و بس — در رستگاری جز او نیست کس

اگر در دلت زو بود ہیچ ریغ — بدان کو بہست از تو دارد دریغ

دل شہریار جہاں شاد باد — ہمیں گفتۂ من ورا یاد باد

جہاندار محمود جویاے حمد — کرو در ہمہ دل بود جاے حمد

سر تاج او شد ستون سپہر — ہمیشہ ز فرش فروزندہ مہر

داستان نوشزاد فردوسی کے غزنوی کلام سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ سلطان کے مدحیہ ابیات سے صاف ظاہر ہے۔ یہاں پھر فردوسی سلطان کو اپنے مذہب کی تلقین کر رہا ہے اور بد قسمتی سے ایسی طرز میں جو ایک معمولی مستمع کو بھی ناگوار گذرے چہ جائیکہ ایک سلطان جابر و قاہر کو جو محمود کے پایہ کا ہو اور خود اپنے مذہب میں سخت ہو۔ حضرت علی سے کینہ رکھنے والا خوارج کے سو اور کوئی نہیں —

ان اشعار کو بھی پہلے اشعار کی طرح میں الحاقی مانتا ہوں۔ مذکورہ بالا وہ تمام عنصر ہے جس پر شاہنامہ میں فردوسی کی شیعیت کی شہادت ختم ہو جاتی ہے —

ہجو میں اس کی شیعیت کے اثبات کا مواد شاہنامہ سے بھی زیادہ ملتا ہے یہاں میں وہ اشعار بھی حوالۂ قلم کرتا ہوں —

۱ — مرا غمزہ کردند کاں بد سخن | بمہر نبی و علی شد کہن
۲ — ہر آنکس کہ دردلش کین علیست | ازو خوار تر در جہاں گو کہ کیست
۳ — منم بندۂ ہردو تا رستخیز | اگر شہ کند پیکرم ریز ریز
۴ — من از مہر این ہردو شہ نگذرم | اگر تیغ شہ بگذرد بر سرم
۵ — نباشد جز از بے پدر دشمنش | کہ یزداں بآتش بسوزد تنش
۶ — منم بندۂ اہل بیت نبی | ستایندۂ خاکپائے وصی
۷ — نترسم کہ دارم ز روشندلی | بدل مہرجان نبی و علی
۸ — چہ گفت آں خداوند تنزیل و وحی | خداوند امر و خداوند نہی
۹ — کہ من شہر علمم علیم دراست | درست این سخن قول پیغمبر است
۱۰ — گواہی دہم کین سخن راز اوست | تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
۱۱ — چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے | بنزد نبی و وصی گیر جائے
۱۲ — گرت زین بد آید گناہ منست | چنین است و این رسم و راہ منست
۱۳ — باین زادہ ام ہم برین بگذرم | چناں داں کہ خاک پئے حیدرم
۱۴ — ابا دیگراں مر مرا کار نیست | بدین در مرا جائے گفتار نیست
۱۵ — چو بر تخت شاہی نشاند خدائے | نبی و علی را بدیگر سرائے
۱۶ — گر از مہر شاں من حکایت کنم | چو محمود را صد حمایت کنم
۱۷ — جہاں تا بود شہریاراں بود | پیامم بر تاجداراں بود
۱۸ — کہ فردوسی طوسی پاک جفت | نہ این نامہ بر نام محمود گفت

۱۹- بنام نبی و علی گفته ام   گهر هائے معنی بسے سفته ام

سلطان محمود کی هجو بقول نظامی برباد کردی گئی تھی۔موجودہ هجو ایک مجموں* دستاویز هے اور فردوسی سے کوئی علاقه نهیں رکھتی اور نه فردوسی کے عهد تک اس کی سراغرسی هو سکتی۔اشعار نمبر ۵-۸-۹--۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-شاهنامه کے دیباچه سے منقول هیں۔بیت نمبر (۹) داستان سیاوش کے خاتمه پر ملتا هے۔نمبر (۱۵) شاهنامه کے قلمی نسخوں میں مل جاتا هے اور یوسف زلیخا سے فردوسی کے دیباچه میں بھی منقول هے۔ابیات نمبر (۱) و (۸) نظامی کے چهار مقاله میں ملتے هیں۔

کیا یه امر قابل حیرت نهیں که فردوسی شاهنامه میں امیر نصر کے سامنے جیسا که اوپر دیکھا جاچکا هے صرف دشمن کی بدگوئی کے بیان پر قناعت کرتا هے اور کوئی تشریح نهیں کرتا که وہ بدگوئی کس نوعیت کی تھی۔دیباچۂ قدیم صرف اس بیان پر قناعت کرتا هے "که سخن در مذهب خود گفته" لیکن یه بیان نهیں کرتا که رہ مذهب کیا تھا۔فردوسی سے ایک اور نصف صدی بعد نظامی دعوے سے کهتا هے که وہ بدگوئی فردوسی کا اعتزال اور شیعیت تھی جو هجو کے اشعار میں محبت نبی و علی کے نام سے یاد کی گئی هے۔حقیقت میں اگر فردوسی کو اس بدگوئی کی اصلی نوعیت سے اطلاع هوتی تو وہ امیر نصر کو ضرور اس سے واقف کرتا اگر کوئی جھوٹی تهمت تھی تو اس کی تردید کرتا۔اگر راست تھی تو عذر اور معافی کا خواستگار هوتا۔اس قدر ضرور هے که وہ بدگوئی خواہ کسی قسم کی کیوں نه هو فردوسی اس اتهام سے اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا تھا۔سلطان کی ناقدردانی کے باوجود وہ سلطان کی توجه اپنے معاملات میں مبذول کرنے کا ساعی تھا کیونکه امیر نصر سے وہ ملتمس هے که آپ بھی میری اس محنت

---

* اس مضمون پر اکتوبر سنه ۱۹۲۱ء کے رسالهٔ اردو میں مفصل بحث کی جا چکی هے۔

کی داد دیں اور سلطان سے سفارش کر کے میرے نہال امید کو بارور کریں اگر یہ ناقدری فردوسی کے مذہب کی بنا پر تھی تو فردوسی امیر نصر کے ہاں ہرگز نہ جاتا کیونکہ خود امیر نصر اسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا جو فردوسی کے نزدیک مذہب خوارج تھا—

اعتزال اور شیعیت کی تہمت اگر واقعی فردوسی ایسا تھا تو کوئی ایسا گہرا راز نہیں تھا جو امیر نصر سے چھپایا جاتا کیونکہ نصر سے فردوسی کے تعلقات خوشگوار تھے۔شاہنامہ میں کئی موقعوں پر فردوسی اس کی مدح سرائی کر رہا ہے اور اسی وجہ سے اس موقعہ پر وہ اس کے پاس جاتا ہے۔شیعہ یا معتزلی ہونا ان ایام میں کوئی جرم نہیں تھا پھر کیا وجہ ہے کہ فردوسی نصر سے چھپاتا اور ہجو میں اس کو بیان کرتا ہے۔میری دلیل یہی ہے کہ فردوسی اپنے بدگو اور اس کی بدگوئی کی نوعیت سے ناواقف محض تھا اس لئے وہ نہ جان سکا۔لیکن فردوسی کے بعد میں آنے والی نسلوں نے ان اشعار کی تاویل کی غرض سے جو امیر نصر کے ذکر میں اس سے قبل مذکور ہوچکے ہیں اس کو مذہبی رنگ دیدیا کیونکہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ محض ان اشعار کی تشریح میں تذکرہ نگاروں اور فردوسی پرستوں نے یہ تمام طوفان بے تمیزی اٹھایا ہے ورنہ ہمعصر تاریخیں فردوسی اور مذہبی بنا پر سلطان کی اس کے ساتھ بدسلوکی کا ایک حرف بھی نہیں کہتیں—

یہ بھی یاد رہے کہ فردوسی نے ہجو کے ایک سو اشعار میں اونیس بیس ابیات اپنی شیعیت کے اظہار میں صرف کئے ہیں۔اگر مختلف ہجوؤں سے یہی اشعار فراہم کئے جائیں تو ان کی تعداد ساٹھ تک پہونچے گی۔لیکن شاہنامہ کے ساٹھ ہزار ابیات میں اسی رنگ کے اشعار کلہم اٹھارہ اونیس ملتے ہیں۔ ہجو کے میدان میں فردوسی کا یکایک اس قدر جوشیلا شیعی ہوجانا نہایت غیر معمولی معلوم ہوتا ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ شاہنامہ کے دوران میں وہ اپنے

اصلی جذبات کا اظہار سلطان محمود کے تعصب کی بنا پر نہیں کرسکتا تھا تو یہ کوئی سنجیدہ عذر معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ شاہنامہ کے ضمن میں بعض موقعوں پر نہ صرف اپنے مذہبی جذبات کا ذکر کرتا ہے بلکہ ساتھہ ہی سلطان کو اس طرح سے خطاب کرتا ہے کہ گویا وہ خارجی تھا۔

شاہنامہ کا اکثر حصہ طوس میں لکھا گیا ہے جہاں کوئی چیز فردوسی کو اپنے مذہبی جذبات کے اظہار سے مانع نہیں تھی لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ اس حصۂ شاہنامہ میں (جو موجودہ شاہنامہ کی ڈھائی جلدوں سے زیادہ ہے) صرف ایک موقعہ پر اس نے دو بیت منقبت میں لکھے ہیں۔ جو داستان سیاوش کے خاتمہ میں ملتے ہیں اور جن کو میں اوپر نقل کر آیا ہوں۔ شاہنامہ کا باقی حصہ (قریباً ڈیڑھ جلد) غزنی میں لکھا گیا ہے چنانچہ دیباچہ اور داستان نوشزاد اس نے غزنیں ہی میں لکھی ہیں۔ انہی دو مقام پر منقبت کے سلسلہ میں اس نے ایسے شعر بھی لکھے ہیں جن پر ہر سنی اعتراض کر سکتا ہے تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ فردوسی کو غزنیں پہنچ کر جو اہل تسنن کے زیر اثر تھا یہ بات یاد آئی کہ مذہباً میں شیعہ ہوں اور مجھہ کو اپنے مذہب کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے اور وہ بھی اس طریقہ پر کہ جس سے دوسرے فرقہ کی دل آزاری ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ایسی تنگ خیالی فردوسی کے مذاق اور اخلاق سے بعید بلکہ ابعد ہے —

ذیل میں اس قصیدہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو مجالس المومنین میں قاضی نوراللہ شوستری نے فردوسی کی طرف منسوب کیا ہے۔ مجالس المومنین میں شیعہ شعرا کی فہرست میں فردوسی کو سب سے اول جگہ دی گئی ہے۔ قاضی صاحب کا عقیدہ ہے کہ شاہنامہ فردوسی نے طوس میں بنام نبی و علی لکھا تھا اور سلطان محمود کی خاطر اصحاب ثلثہ کا ذکر تقیہ کر کے کر دیا ہے۔ نبی و وصی کے نام پر شاہنامہ لکھے جانے کا ثبوت قاضی صاحب ہجو کے ان اشعار سے دیتے ہیں —

که فردوسی طوسی پاک جفت ... نه این نامه بر نام محمود گفت
بنام نبی و علی گفته ام ... گہر ھاے معنی بسے سفته ام

اب موقعه آگیا هے که میں اس قصیدہ کو هدیۂ ناظرین کروں:—

اگر بری بخم زلف تابدار انگشت
ز زلف خویش برآری بزینهار انگشت
مگر شمارۂ زلف تو میکند شانه
که کردہ در خم زلف تو بیشمار انگشت
گرہ کشود ز رگهاے جان خسته دلاں
چو کردہ زلف سیاہ تو تا تار انگشت
بحرت قتل من انگشت کش نهادی دوش
سرم فداے تو زین حرت بر مدار انگشت
سزاے شهد شهادت شهید عشق بود
جو یار تیغ بر آرد دلا برار انگشت
پے نظارۂ مشکیں هلال تو هر ماہ
کشدمه نو ازیں نیلگوں حصار انگشت
بمستی آرزوئے پایبوس او کردم
نهاد بر لب چوں نوش خود نگار انگشت
دلا چو پیر شدی بگذر از هوا و هوس
ز بهر آرزوے نفس خود برار انگشت
بگو که بود که شد فتحیاب خیبر ازو
که کرد بر در آں قلعه استوار انگشت
که پارہ کرد کمند نفاق و رشتۂ کفر
بگاهوارہ که زد دردهان مار انگشت

علی عالی اعلی که دست همت او
هزار پے زدہ در چشم ذوالفقار انگشت
شہے کہ تا بدو انگشت در ز خیبر کند
برآمد از پئے اسلام صد هزار انگشت
شہے کہ زو بدو انگشت مرہ را بدو نیم
برائے قتل عدو سخت ذوالفقار انگشت
شہے کہ دلدل او را نہ خرامیدن
بغارہ در شدیش دست و پا چہار انگشت
ز تیغ دست تو جان بردوز جہان ایمان
هر آنکه کرد بدین تو استوار انگشت
ز دست تیغ تو جان بروے از برآوردے
پئے شہادت دین تو ذوالفقار انگشت
کسے که حب تواش نیست تا بروز شمار
بهرزہ گوی به تسبیح بیشمار انگشت
کسیکه دست بدامان حیدر و آلش
نزد بسا که بدندان کند فگار انگشت
شہا تراست مسلم کرم که گاہ رکوع
کند برائے تو انگشتری نثار انگشت
کمینه چاکر و مداح تست فردوسی
همیشه با قلمش گشته دستیار انگشت
قبول کردہ غلامی قنبر تو بجان
نهادہ از مژہ بر چشم اشکبار انگشت
بزرگوار خدا یا بحق حیدر و آل
در آن نفس که رود خلق را ز کار انگشت

موالیان علی را ز روے لطف و کرم
ز هول روز جزا بر قراردار انگشت
شہا غلام غلام تو ام مرا مگزار
برائے فاقہ برآرم بزینہار انگشت *

قاضی صاحب نے فردوسی کی شیعیت کا اس قصیدہ سے ثبوت دیا ہے جس میں لطف یہ ہے کہ فردوسی کا تخلص تک موجود ہے - معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاهنامہ کی رو سے فردوسی کی شیعیت کی شہادت قاضی صاحب کی نگاہ میں ناکافی تھی اس لئے یہ قصیدہ چونکہ میں واقف ہوں قاضی صاحب نے اکثر سنی مشاہیر کو اپنی جماعت میں شامل کر لیا ہے اس لئے مجھکو شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں فردوسی کے ساتھہ بھی وهی سلوک مرعی نہ کیا گیا ہو لیکن میں اس قصیدہ کے متعلق چند نکات پیش کرتا ہوں —

(۱) تمام دنیا تلاش میں ہے کہ فردوسی کا کلام بہ صورت قطعہ و قصیدہ و غزل دستیاب ہو لیکن نو صدیاں گزرنے کے باوجود چند قطعات کے سوا جو اکثر قدیم و جدید تذکروں میں ملتے ہیں ایک شعر بھی نہیں ملتا - قاضی صاحب نہایت خوش قسمت ہیں کہ ان کو پورا قصیدہ مل گیا - لیکن بدقسمتی سے انہوں نے اس کا کوئی ماخذ نہیں دیا - اس لئے یہ شبہہ کرنے کے لئے کافی گنجائش ہے کہ کہیں وہ مجعول نہ ہو —

(۲) کلام پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ قصیدۂ بالا کی زبان فردوسی کے عہد اور کلام سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی - زبان کی یہ روانی - بندشوں کی چستی - ترکیبوں کی لمبی نشست - کنایات و محاورات و اضافات زیادہ تر قاضی صاحب کے عہد میں پائے جاتے ہیں —

---

* از مجالس المومنین —

(۳) ردیف جو فارسی شاعری کا اسلوب خصوصی ہے انگشت نمائی در رہی ہے کہ فردوسی کے عہد میں عام طور پر اس کا رواج نہیں تھا اور نہ ایسی سنگلاخ زمینوں میں جس میں یہ قصیدہ لکھا گیا ہے ان ایام میں قصیدے لکھے جانے کا دستور تھا۔دواوین عنصری۔فرخی اور منوچہری کے تتبع سے یہ نکتہ آسانی کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہونچ سکتا ہے۔

(۴) تخلص کی موجودگی اس کی حالت کو اور بھی مشتبہ کئے دیتی ہے کیونکہ شعرا ان ایام میں اپنے تخلص کے استعمال کے پابندی کے ساتھ عادی نہ تھے۔بالخصوص فردوسی اس بارہ میں نہایت بے پروا ہے۔شاہنامہ میں دقیقی کے اشعار کے آغاز واختتام پر دو جگہ اس کا تخلص ملتا ہے۔لیکن قدیم نسخوں میں انہی اشعار میں "گوینده" تھا جس کی بجاے متاخرین نے فردوسی بنا دیا ہے۔

ایک اور مضمون قصیدہ جو فردوسی کی طرف منسوب ہے ذیل میں حوالۂ قلم کیا جاتا ہے۔

اے دل ار داری ہواے جنت الماوی بیا
در حریم کبریا بے کینہ و کبر و ریا
گر بقائے جاوداں خواہی رہ عقبی گزیں
ور سرائے خلد خواہی بگذر از دار الفنا
نعمت اسلام عامست و نہ خاص از بہر عام
خوان دیں گسترده و دردادہ مردم را صلہ
جہد کن تا ناسزا ہرگز نہ گوئی با کسے
ور بگوئی نا سزا یابی جزا روز جزا
عاقل دنیا و دینی آنکہ از علم و عمل
سنت احمد بجاآری و فرض کبریا

سنت احمد بود از حب اولاد رسول
زانکه فرض کبریا باشد ز حب مرتضیٰ
بگذرانی پایۂ قدر خود از ایوان عرش
گر بجا آری زایماں شرح شرع مصطفا
کے رسی هرگز بسر حکمت عهدالست
تانخوانی معنے ایات قرآں هل اتیٰ
معنے قراں کلام الله اگر دانی بحق
از پئے فصل ولی الله بر خوان انما
گر هنر از تیغ میجوئی مجو جز ذوالفقار
ور حدیث از جود میگوئی مگو جز لافتیٰ
لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار
مادر شبیر و شبر فاطمه خیرالنسا
پس بریں معنی نظیرش در جهاں هرگز نبود
گر تو گوئی بود در گیتی کدا میں کے کجا
رو بتوریت کلیم و بشنوازیچوں که چوں
خواند احمد میت میت و مرتضیٰ را عیلیا
دیدۂ تحقیق بکشا و به بیں عین‌الیقیں
در ولایاتش نشان معجزات انبیاء
گر خلیل‌الله نبود معجز اندر منجلیق
کاں زماں آمد درون نار نمرود از هوا
گر شد اندر نار ابراهیم هم خوش درگذشت
از سه فرسنگ آتش مدین علی مرتضی
هم شنودی کزپے فتح سلاسل بوالحسن
رفت اندر منجلیق و شد دراں حصن از قضا

گر کلیم حق بمعجز از سر چاه شعیب
بر گرفت و باز پشت افگند سنگ آسیا
لام و جیم الف من از حصن حیدر در بکند
مرتضی در باز پشت افگند چل گام از قضا
گر بموسی داد بعد از مدتی دختر شعیب
در زمان دختر بحیدر داد شاه انبیا
داد گرگی پاسخ یعقوب چون پرسید ازو
بهر فرزند عزیز آن یوسف زیبا لقا
نیز با شیر خدا هم گرگ آمد در سخن
از برای گوسفند آن زن پیر دغا
صالح پیغمبر از معجز اگر پیش گروه
یک شتر آورد بیرون از صیل گاه دعا
حیدر از تل حصا آورد بیرون اشتران
یک قطار او داد در قرض نبی فخر رجا
پس بسان موسی و هارون بقرب و منزلت
ابن عم خواند او بمعنی اوز خود داماد را
ذوالفقار از بهر دفع کفر حیدر را بداد
همچنان از بهر دفع سحر موسی را عصا
گر شد اندر دست داؤد نبی آهن چو موم
از برای درع و دفع تیر در روز وغا
پیل آهن نیز حیدر ساخت در حال آوژه
خورد شد هم سنگ خارا در کفش چون توتیا
راستی را گر بملک اندر سلیمان نبی
مور را دانست دفعاً زد مرغانرا ندا

بوالحسن مفتی مور و مار و ماهی بود و درغ
قاضی باز و کبوتر میر نهل و اژدها
گر ز روے معجز مطلق بهر حدے مگر
از دم عیسی مریم مردہ یا بیدے بقا
جمجمه اندر زمیں با آب و ابقا کبر کرد
زندہ شد از نطق حیدر بعد چندیں سالها
اندریں گردون گرداں قرص ماہ نور بخش
شد دو نیم از معجزات مصطفاے مجتبا
از براے طاعت عصرش علی را باز گشت
خسرو سیارگاں خورشید در اوج سما
چشم بر کندہ بریدہ دست قصاب از دمش
شد درست و بهتر از اول بفرمان خدا
اینهمه برهاں و صد چندیں ز روے راستی
گر براے دیگراں داری بیاور انها
کهربا گر زانک با قیمت بود اماں ولے
نزد عاقل قیمت گوهر ندارد کهربا
گر بدانی نور حیدر همچو نور مصطفی
از خداوند جهاں آید بجانت مرحبا
چوں کنم شرحش چگویم چوں همی نالم ز درد
هر زماں از درد جانسوز شهید کربلا
بر نگردم از رہ حب علی و آل او
از رہ حیدر بگردیدن خطا باشد خطا
هر که بر گشت از رہ حب علی و آل او
رفت و ماند او جاوداں در محنت و رنج و عنا

دولت جاوید فردوسی طوسی را بہ بیں
گفت مدح خاندان از همت آں عبا

میں اس قصیدہ کے متعلق کوئی رائے دینا نہیں چاہتا یہ بالکل روشن ہے کہ اس قصیدہ کو فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا۔قصہ مختصر یہ وہ تمام شہادت ہے جس کی رو سے فردوسی کی شیعیت کا ادعا کیا جاتا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ شہادت زیادہ تر ناقص اور غیر معتبر ہے۔

فردوسی کا اعتزال

شاہنامہ کے دیباچہ میں حمد باری میں ایک شعر وارد ہوتا ہے—

بہ بنیندہ گاں آفرینندہ را   نہ بینی مرنجاں دو بینندہ را

اور شعر کی معنی یہ ہیں کہ خدا کی ذات پاک کا مشاہدہ باصرہ کے ذریعہ سے ممکن نہیں اس لئے اپنی آنکھوں کو اس کے دیدار کی جستجو میں زحمت نہ دے اور شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ذات باری کا اور ایک حواس کی معرفت نہیں ہوسکتا—

علاوہ اور تفریقی مسائل کے جو اشاعرہ اور معتزلہ میں بحث و جدال کے مورث ہوئے ہیں ایک مسئلہ رویت باری ہے اشاعرہ کا اعتقاد ہے کہ قیامت کے روز خدا کا دیدار بلا کیف ہوگا وہ اپنے مذہب کی تائید میں یہ آئیۃ کریمہ پیش کرتے ہیں وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرہ معتزلہ جن کا اعتقاد اس کے بالکل برعکس ہے اس آیۃ شریفہ سے متمسک ہوتے ہیں لاتدرکہ الابصار وهو یدرک الابصار و هواللطیف الخبیر۔اس آیت کی دلیل پر یہ معتزلی عقیدہ کو دنیا و عقبیٰ میں خدا کا دیدار نا ممکن ہے

شعر بالا کے استدلال پر نظامی عروضی فردوسی کو اہل اعتزال سے مانتا ہے۔میرے خیال میں کسی مسلسل نظم سے منفردہ شعر لے کر خاص معنی پہنا

دینا اور پھر شاعر پر اعتراض کرنا صریح بے انصافی ہے بھلا اس شعر سے کون خیال کرسکتا ہے کہ فردوسی رویت کا منکر ہے۔ شاعر کا صحیح مفہوم دریافت کرنے کی نیت سے ہم کو شعر مذکور اس کے اور اشعار کے ساتھ ملاکر پڑھنا چاہئیے تاکہ تسلسل قائم رہے یعنی اس طرح —

خرد گر سخن بر گزیند همی   همانرا گزیند که بیند همی
به بینندگاں آفرینندہ را   نہ بینی مرنجاں دو بینندہ را
نیاید بدو نیز اندیشہ راہ   کہ او برتر از نام واز جایگاہ

اور شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم ذات باری کے ادراک سے قاصر ہیں اس لئے کہ ہمارا تعقل انہی اشیا کے وجود کا قائل ہو سکتا ہے جو حواس کی معرفت اس تک پہونچے لیکن ذات باری کا مشاہدہ آنکھوں سے نہیں ہو سکتا۔ حواس ایک طرف خدا کی ذات تو دائرہ تخیل کے تفرقات سے بھی بالا ہے —

نظامی گنجوی جو اہل تسنن سے ہیں فردوسی کی تقلید میں قریب قریب یہی خیال ادا کر رہے ہیں چنانچہ —

بآں چیزہا با بد اندیشہ راہ   کہ باشد بد و دیدہ را دستگاہ
خدا را نشاید باندیشہ جست   کہ در تست ہرچہ آں زاندیشہ رست

(سکندر نامہ بحری)

اب فردوسی ایک شعر کی بنا پر جس کا تسلسل توڑ دیا گیا ہے کیونکر معتزلی مانا جاسکتا ہے اس قسم کے استدلال کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ میں نماز اس لئے نہیں پڑھتا کہ قرآن مجید میں لا تقربوا الصلوٰۃ آیا ہے اور وانتم سکارا ے کو بالکل چھوڑ جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے ہاں یہ ایک مقبولہ خیال رہا ہے۔ شاہنامہ میں کسی موقعہ پر فلاسفہ کی تردید اور بطلان میں کوشش کرتا ہوا فردوسی قریب قریب یہی مطلب یوں ادا کرتا ہے —

ایا فلسفه دان بسیار گوئے	نپویم براہے که کوئی بپوے
ترا هرچه بر چشم بر بگذرد	بگنجد همی در دلت باخرد
چنا نداں که یزدان نیکی دهش	جز آنست وزیں بر مگر داں منش
سخن هیچ بهتر ز توحید نیست	نبا گفتن و گفتن ایزد یکے است

فلاسفه کے نزدیک وهی باتیں قابل قبول هیں جو حواس کی معرفت ادراک میں آسکیں اور جس کو عقل باور کر لے - فردوسی کا یه مقصد هے که ذات باری کے ادراک کے لئے یه طریقه غلط هے وه سرحد ادراک اور اندیشه سے بری هے --

فردوسی کا تسنن

فردوسی کے تسنن کے متعلق اگرچه کسی تاریخ میں کوئی شہادت نہیں اور نه سفینوں میں کوئی ایسی روایت هے - شاهنامه میں کچھ ایسا ذخیرہ ملتا هے جس کی بنا پر کہا جا سکتا هے که وہ سنت جماعت تھا - سب سے پیشتر دیباچه کے یه اشعار ملاحظه هوں --

اگر دل نخواهی که باشد نژند	نخواهی که دایم بوی مستمند
چو خواهی که یابی ز هر بد رها	سر اندر نیاری بدام بلا
بوی در د و گیتی ز بد رستگار	نکو نام باشی بر کردگار
بگفتار پیغمبرت راه جوے	دل از تیرگیها بدیں آب شوے
ترا دین و دانش رها ند درست	رہ رستگاری بیا یدت جست
چه گفت آں خداوند تنزیل و وحی	خداوند امر و خداوند نهی
که خورشید* بعد از رسولان مه	نتابید برکس چو بوبکر به

* تلمیح هے اس حدیث کی طرف " ماطلعت الشمس ولاغربت علی احد بعد النبیین افضل من ابی بکر "

عمر کرد اسلام را آشکار — بیا راست گیتی چو باد بہار
پس از هر دو آں بود عثماں گزیں — خداوند شرم و خداوند دیں
چہارم علی بود جفت بتول — کہ او را بخوبی ستاید رسول
کہ من شہر علمم علیم در است — درست این سخن قول پیغمبر است
گواہی دہم کیں سخن راز اوست — تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
بداں باش کو گفت و زیں بر مگرد — چو گفتار و رایت نیاید بدرد
علی را چنیں گفت و دیگر ہمیں — کزایشاں قوی شد بہر گونہ دیں
نبی آفتاب و صحاباں چو ماہ — بہم نسبتے یکدگر راست راہ

ان کے علاوہ یہ اشعار شاہنامہ میں اور ملتے ہیں —

(۱) بدو آفریں کو جہاں آفرید — ابا آشکارا نہاں آفرید
خداوند دارندۂ ہست و نیست — ہمہ چیز جفتست و ایزد یکیست
بپیغمبرش بر کنم آفریں — بیارانش بر ہر یکے ہمچنیں
(ساختن سیاوش کنگ وژ صفحہ ۱۲۰ جلد اول شاہنامہ)

(۲) وزو بر روان محمد درود — بیارانش بر ہر یکے بر فزود
ہمہ پاک بودند پرہیزگار — سخنہاے شاں برگزشت از شمار
(خاتمہ داستان اردشیر بابکاں-نیایش آفرینندۂ بے نیاز و مدح و ثنائے سلطان محمود صفحہ ۹۳ جلد سوم)

(۳) وزو بر روان محمد درود — بیارانش بر ہر یکے بر فزود
(خاتمہ داستان سکندر گلۂ فردوسی از آسماں و نیایش خداے را صفحہ ۷۸ جلد سوم)

(۴) سپاس خداوند دانا کنم — زبان و خرد را توانا کنم
توانا خداوند بر ہرچہ ہست — خداوند بالا و داراے پست
فرستم درود فرستادہ اش — گزین گزینان آزادہ اش

محمد که بر بود نیها سر اوست　　خداوند را از همه اوے دوست
که ایزد ز یارانش خوشنود باد　　روان بد اندیش پر دود باد

(خاتمہ شاهنامہ قلمی) یہ اشعار ایسے نسخوں میں ملتے هیں جن میں اختتام شاهنامہ کی تاریخ سنہ ۴۰۰ هجری کے بجاے سنہ ۳۸۹ هجری دی گئی هے چنانچہ -

اگر سال نیز آرزدت آمدست　　نهم سال هشتاد با سبصد است
مہ بهمن و آسمان روز بود　　دہ کلکم بدیں نامہ پیروز بود

(۵) حضرت عمر خلیفۂ ثانی کے حق میں داستان یزد جرد کے آغاز میں یہ اشعار آتے هیں —

چناں بد کجا سرفراز عرب　　کہ از تیغ او روز گشتے چو شب
عمر آنکہ بد مومناں را امیر　　ستودہ* و را خالق بے نظیر

یہ تمام وہ مواد هے جس کی رو سے فردوسی کو سنی کہا جا سکتا هے۔ لیکن شاهنامہ میں ان متضاد عناصر کی حاضری کیا استعجاب کا پہلو لئے هوئے نہیں هے۔ اس عقدہ کا حل یوں هی ممکن هے کہ یا تو فردوسی کو اهل تسنن و تشیع نے اپنے اپنے مذهب کا رکن بنانے کی کوشش کی هے اور نتیجہ یہ هوا هے کہ دونوں مذهبیت کے اشعار شاهنامہ میں ملنے لگے هیں لیکن سنیوں کی فارسی ادبیات سے عام بے اعتنائی خصوصاً اپنے هم مذهبوں کے خلاف ان کا تعصب ادنی ادنی اختلات پر الحاد اور کفر و زندقہ کا الزام اور تہمت تراشنے کا ان کا عام انداز بھلا ان کو کب اجازت دیتا کہ مطعون فردوسی کی تصنیف میں وہ اپنے رنگ کے اشعار اضافہ کرنے کی زحمت گوارا کرتے۔ نظامی عروضی نے جب کہ اس کو شیعہ اور معتزلی بنانے پر قناعت کی تھی آشوب تورانی نے تو کوئی دقیقہ اٹھا

* اس آیت کی طرف اشارہ هے - یا ایها النبی حسبک الله و من اتبعک من المومنین - من اتبعک سے مراد فاروق اعظم هیں —

نه رتها *۔ہر قسم کی سب و شتم فردوسی کے حق میں استعمال کرتا ہے —
میں چند اشعار پر قناعت کرتا ہوں شاعر فردوسی کو خطاب کر رہا ہے۔

نه سنی نه شیعی نه مغ نے جهود — نه ترسا ندانم ترا دیں چه بود
ز هر مذهبیے فارغ از ملحدے — ز دیرے بروں خارج از مسجدے
بهر مذهب و پیشه جنگ و جدل — ز بعثت فگندن بهر دیں خلل
بهر علت از مرتدی و بدی — نجس بودی اکنوں نجس تر شدی
ازیں پیشتر سعدے بے بدل — بحق تو گویا سرود ایں مثل
که گر چاه نصرانیاں نیست پاک — بشوئی اگر مرده گبرے چه باک+

ازیں پیش شاید سخن گوے طوس — بدو غ سخن آبش از جوے طوس
مغ مغ نسب گبر آتش پرست — به بیعت بهر موے بد داده دست
کهیں موے بد وجه نان مجوس — بهر و خمه مرثیه خوان مجوس
دلش گبرو جاں گبرو گبری زباں — ز گبراں بگبری زباں قصه خواں
دل و دیں بفرمان کسری کیش — ز اسلام بیگانه با کفر خویش
با نگارش از کعبه گم کرده راه — ترا شیده آتش کده قبله گاه
ز زردشت احکام دینش ستد — پرستندهٔ هیر چوں هیر بد
ز پاژند و ژندش بدل وعظ و پند — مفسر بتفسیر استاد و ژند
بوخشوری مژدک و زردهشت — دروں دامن اعتقادش بهشت
مرادش ز زردشت پیر مغاں — براهیم پیغمبر اندر جهاں

* لیکن با خبر سنیوں میں وہ ہمیشہ مقبول رہا ہے چنانچہ امام احمد الغزالی ـ نظامی گنجوی ـ صاحب راحت الصدور ـ صاحب مرزبان نامہ صاحب جہاں گشا ـ شیخ سعدی اور مولانا جامی اس کے مداح ہیں —

+ سعدی :— اگرچه چاه نصرانی نه پاک است
جهود مرده می شویم چه باک است

شب و روز تا زندہ بر تخت و عاج　　بزرینه کفش و بزرینه تاج
نویسندۂ داستان مغاں　　بزرگی دہ خاندان مغاں *

شاهنامه کے متعلق بھی آشوب کی راے قابل ملاحظہ ہے کہ ہے —

ندانم جہاں را چه ونگی گرفت　　که مالک سخن مست تنگی گرفت
زفہم سخن دور بر رفتگاں　　بتقلید هم سر بسر رفتگاں
نه پیے بردہ بر قبح گفتار تو　　نه بے لطفی و لطف اشعار تو
ز ترکیب یک چند لفظ دری　　ترا موجدے دیدہ در شاعری
بنظمت نخوانده حروف زیاد　　ز شہنامه ات قصها کردہ یاد
همه غافل از جا و بیجاے حرف　　لقب دادہ ات اوستاد شگرف
مگر شعر فہما همه مردہ اند　　ویا رفت فہم بیاں بردہ اند
کز ایراں و توراں و هندوستاں　　یکے بر نیامد ز دانشوراں
که بر سقم گفتار تو راہ یاب　　کند آگہت از خطا و صواب
بالفاظ سست و ز معنت و کرحت　　چه لازم شدت نظم شہنامه گفت
ابا و ابر رستها بیژنا　　حکیم این الفهاے زائد چرا
ضیافتگر نکته سنجان دهر　　نه فرمردہ تمئیز یا زهر و ز هر
چنیں بد خورش خوانے آراستی　　چنیں بزم بیلطف پیراستی
بطعن دقیقی ز گفتار تو　　پسندم شد این بیت ز اشعار تو
"دهاں گر بماند ز خوردن تهی　　ازاں به که ناساز خوانے نهی"

(صولت فاروقی)

---

* صولت فاروقی

+ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ہموطنوں میں بوجہ تصنیف شاهنامه جسکو ادب و شعر کی خدمت کے بجاے صریحاً مجوسیوں کی خدمت کے ساتھ تعبیر کیا گیا تھا - بدنام تھا اور اسی بنا پر شیخ ابوالقاسم طوسی نے (جلکو متاخرین نے

باقی صفحه آئندہ —

یا بقول قاضی نوراللہ شوستری فردوسی نے تقیہ کرکے سنی رنگ کے
اشعار بخوف سلطان محمود داخل کر دیے ہیں۔ لیکن اگر واقعہ ایسا ہوتا تو

ابوالقاسم خرقانی لکھا ہے ۔ اسکے جنازہ کی نماز پڑھنے سے انکار کردیا تھا وغیرہ۔ یہ قصہ
اگرچہ دیباچۂ بایسنغر خانی کیوجہ سے ہمارے ہاں عام طورپر مشہور ہے لیکن
اسکا کوئی قدیمی ماخذ معلوم نہ تھا۔ شیخ عطار کا اسرارنامہ ہماری موجودہ
معلومات کی روشنی میں اس روایت کا سب سے قدیم ماخذ ماناجاسکتا ہے جس میں
یہ تمام قصہ درج ہے۔ میں یہاں بعینہ اسکو حوالۂ قلم کرتا ہوں

شنودم من کہ فردوسی طوسی   کہ کرد او در حکایت بی فسوسی
بہ بست و پنج سال از نوک خامہ   بسر می برد بہر شاہنامہ
بآخر چوں رسیدش دم بآخر   ابوالقاسم کہ بد شیخ الاکابر
اگرچہ بود پیر پر نیاز او   نکرد از راہ دین بروے نماز او
چنین گفت او کہ فردوسی بسے گفت   ہمہ درحق گبرے ناکسے گفت
بمدح گبرگاں عمرے بسر برد   چو وقت مردن آمد بے خبر مرد
مرا درکار او برگ ریا نیست   نمازم برچنین شاعر روا نیست
چوفردوسی مسکین را ببردند   بزیر خاک تاریکش سپردند
درآنشب شیخ اورا دید در خواب   کہ پیش شیخ آمد دیدہ پر آب
زمرد رنگ تاجے سبز برسر   لباسے سبزتر از سبزہ در بر
بہ پیش شیخ بنشست و چنین گفت   کہ اے جان تو با نور یقین جفت
نکردی آں نماز از بے نیازی   کہ بے ننگ آمدت زین بے نمازی
خدائے ما جہانے پر فرشتہ   ہمہ از فیض روحانی سرشتہ
فرستادا نیست لطف کارسازی   کہ تا کردند برجانم نمازی
خطم دادند بر فردوس اعلیٰ   کہ فردوسی بفردوس است اولیٰ
خطاب آمد کہ اے فردوسی پیر   اگر راندت زپیش آنطوسی پیر
پذیرفتم ملت ناخوش بخفتی   بداں یک بیت توحیدم کہ گفتی
مشو نومید از فضل الٰہی   مدہ بر فضل ما بخلے گواہی
یقین میداں چو ہستی مرد اسرار   کہ عاصی اندک است و مرد بسیار
گر آمرزد بیکرہ خلق را پاک   نیامرزیدہ باشد جز کف خاک
خداوندا تو میدانی کہ عطار   ہمہ توحید میگوید در اشعار
ز نور تو مساعی می نماید   چوفردوسی فقاعی می کشاید

باقی صفحہ آئندہ۔

شاهنامہ میں صرف سنی رنگ کے اشعار پائے جاتے نہ شیعہ رنگ کے تو ایسی صورت میں فردوسی اپنے مذہب کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور رہتا۔پھر جب کہ ایک طرف فردوسی سلطان کے تعصب کے خوف سے اپنے آپ کو سنی لباس میں ظاہر کر رہا ہے دوسری طرف شیعہ رنگ میں ایسے اشعار لکھ رہا ہے جس سے سلطان کو خارجی بنایا جا رہا ہے تو اس متضاد عنصر کی موجودگی میں تقیہ کا نظریہ ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔یا وہ سلطان سے خائف تھا یا نہیں تھا اگر خائف تھا تو وہ سلطان کو خارجی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور اگر خائف نہیں تھا تو اس کو اپنے مذہب کے چھپانے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور نہ سنی عقیدہ کے اشعار کہنے کی حاجت —

غزنین میں فردوسی کے تعلقات سلطان کے ساتھ جب تک کہ دشمن کی بدگوئی کا واقعہ پیش نہ آیا نہایت خوشگوار تھے۔شاہنامہ کی بعض داستانوں سے ثابت ہے کہ وہ سلطان کے سامنے سنائی گئی تھیں۔داستان ہفتخوان اسفندیار سلطان کے سامنے پڑھی گئی ہے اس داستان کے خاتمہ پر فردوسی کہتا ہے —

اگر شاہ پیروز بپسندد ایں نہادیم بر چرخ گردندہ زیں

داستان اردشیر کی تمہید میں ایک شعر یوں آتا ہے۔

ز ساسان و بابک چہ داری خبر بخوان ہیں بشہ بر ھمہ سر بسر[1]

اور سلطان سے فردوسی کی اس قدر بے تکلفی ہو گئی تھی کہ اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے بعض اوقات سلطان کو وعظ و نصیحت بھی کی ہے چنانچہ داستان اردشیر میں شاعر اور اردشیر کے انتظامات ریاست و قواعد ملکی بیان کر کے سلطان کو الفاظ ذیل میں خطاب کرتا ہے —

چو فردوسی بہ بخشش رائگاں تو بنقل خرد بفردوسش رساں تو
بفردوسی کہ علیلوش خوانند مقام صدق و نور و نہش خوانند

لطف اسوقت تھا جب یہ بیان آشوب کی نگاہ سے گذرتا —

[1] از شاہنامۂ قلمی سنہ ۷۵۲ ہجری۔

زدانای سخن بشنو اے شہریار　　جہانرا بدیں گونہ آباد دار
چو خواہی کہ آزاد باشی ز رنج　　بے آزار و آگندہ بیرنج گنج
بے آزاری زیر دستان گزیں　　کہ یابی ز ہر کس بداد آفریں

داستان مہبود وزیر نوشیرواں کے اختتام پر شاعر ایک مرتبہ اور سلطان کو نصیحت کرنے میں مصروف ہے - کہتا ہے -

اگر دادگر باشی اے شہریار　　نمانی و نامت بود یادگار
تن خویش را شاہ بیدادگر　　جز از گور نفریں نیارد بسر
اگر پیشہ دارد دلت راستی　　چنانداں کہ گیتی تو اراستی
چو خواہی ستایش پس مرگ تو　　خرد بایدا اے نامور برگ تو
چناں کز پس شاہ نوشیرواں　　بگفتار من داد او شد جواں

نوشیرواں جب اپنے ملک کو چار حصوں میں منقسم کر کے رعایا و مزارعین کی بہبود کے لئے فرامین جاری کرتا ہے اس ذکر میں بوڑھا شاعر ایک مرتبہ اور سلطان کو خطاب کر کے کہتا ہے —

اگر دادگر گیتی اے شہریار　　بگیتی بمانی یکے یادگار
کہ جاوید ہرکس کند آفریں　　بر آں شاہ کا باد دارد زمیں

فردوسی اس پایہ کا شخص ہے کہ اپنے مذہب کو چھپانا یا تقیہ کرنا اس کے لئے ایک ہتک کہا جا سکتا ہے دوسرے سلطان محمود کے دربار میں ہر ملت و مذہب کے شخص کا گذر تھا - جو پادشاہ ہندوؤں کو اپنے لشکر میں اعلیٰ عہدے دے سکتا تھا کیا وہ ایک شیعہ شاعر کی موجودگی کا اپنے دربار میں رواداں نہوتا - بالخصوص جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسی سلطان نے ایک اور شیعہ شاعر یعنی غضائری رازی کو پیلبار انعام بخشی کی ہے - غضائری کہتا ہے —

امیدوارم کیں بار صد ہزار تمام　　بمن بیارد بر پاے فیل بر فیاں*

* مسعود سعد سلمان کہتا ہے - مصرع "چوں لطف شاہ ماضی بر شاعر غضاری"

ابو ریحان البیرونی ایک اور شیعہ فاضل کو خود محمود نے خواهش کر کے اپنے دربار میں بلایا ہے۔محمود کی دو لڑکیاں شیعہ شہزادوں منوچہر بن قابوس اور عنصر المعالی کیکاؤس کو بیاهی گئی هیں۔اس لئے فردوسی کے متعلق تقیہ کا خیال میرے نزدیک بالکل غیر موزوں ہے۔شاهنامہ میں ایسے اشعار کی موجودگی جو سلطان محمود پر خارجی ہونے کی تعریف کرتے هیں صاف ظاهر کر رهی ہے کہ فردوسی ان اشعار کا قائل نہیں ہو سکتا کیونکہ فردوسی حقیقت میں اگر ایسا دیوانہ ہوتا تو محمود کے دربار سے اپنی جان سلامت نہیں لے جا سکتا تھا اس لئے میں اس عقیدہ پر آیا ہوں کہ شاهنامہ میں شیعہ عقیدت کے اشعار کا ادخال کسی غیر فردوسی کا کام ہے اور خود فردوسی سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔جن حضرات نے فردوسی کے نام پر قصائد شائع کئے هیں کیا چند اور اشعار نہیں لکھہ سکتے تھے۔۔

لیکن فردوسی کے مذهب کا مسئلہ طے کرنے کے لئے هم کو کسی اور جدید شہادت کی ضرورت ہے جو بالکل غیر مشتبہ اور معتبر ہو۔یہ شہادت بھی شاهنامہ میں موجود ہے اور میں اس کا ذیل میں ذکر کرتا ہوں۔۔

(۱) اشاعرہ و معتزلہ میں مسئلۂ جبر و قدر سنگ تفرقہ انداز رها ہے۔ متکلمین کے نزدیک جبر ضد عدل ہے۔اس سے ان کی مراد بندوں کی مقهوریت اور مغلوبیت ہے جس کے اثر میں ان کے تمام افعال مهد سے لے کر لحد تک گویا اقوال و افعال خدا هیں جو ان کے هاتھہ اور زبان سے ان کے اختیار اور ارادہ کے بغیر جاری کرتا ہے یعنے اعمال خیر و شر میں جو کچھہ اس زندگی میں هم سے سرزد ہونے والا ہے خدا نے اپنے علم ازلی کے مطابق هماری تقدیر میں لکھہ دیا ہے اور اس سے سر مو تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔۔۔

سعدی:- به بدبختی و نیکبختی قلم
بگردید و ما همچنیں در شکم

نظامی:- اگر نیکم و گر بدم در سرشت
قضائے تو ایں نقش بر من نوشت

اورخواجہحافظ- گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ منست

دیگر در کوئے نیک نامی ما را گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

یہ اشاعرہ کا مسئلۂ جبر ہے۔صاحب گلشن راز کہتے ہیں—

ہر آنکس را کہ مذہب غیر جبر است
نبی فرمود کو مانند گبر است

یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ۔"القدریۃ مجوس ھذہ الا"—

لیکن معتزلہ کا مختار یہ ہے کہ عباد اپنے اقوال و افعال میں فاعل و موجد ہیں۔ جبر یہ کہتے ہیں کہ عباد فاعل بالایجاب ہیں نہ فاعل بالارادہ و اختیار—خلاصہ یہ کہ معتزلہ انسانوں کو اپنے افعال کا مختار مانتے ہیں اور یہی ان کا مسئلۂ قدر ہے اور اسی بنا پر ان کو قدریہ کہا جاتا ہے۔اب شیعوں اور معتزلیوں کا چولی دامن کا ساتھہ ہے اکثر مسائل ان میں عام ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں دونوں فرقے متفق ہیں—

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں:—

"و بندگان در فعل خود مختار اند و خود فاعل فعل خود اند خواہ اطاعت باشد خواہ معصیت و اکثر امامیہ و معتزلہ بایں قول قائل اند اشاعرہ کہ اکثر اہل سنت اند میگویند فاعل ہمہ افعال بندۂ خداست و بندگان مطلق در آنہا اختیار ندارند بلکہ خدا بر دست ایشان افعال را جاری میکند و در آنفعل مجبور اند اما بعضے ازیشاں میگویند کہ ارادہ از بندہ مقارن فعل می باشد اما آں ارادہ مطلقاً دخلے در وجود آں فعل ندارد وایں مذہب

باطل است ''—(از حق الیقین)—

یہ شیعہ نقطۂ نظر ہے۔ان مسائل پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی معتزلہ کے بر خلاف اشاعرہ کا ہم زبان ہے تقدیر کے بارے میں فردوسی کا اعتقاد ہے کہ مشیت الہی نے جو کچھہ ازل کے دن ہمارے مقدرات میں لکھہ دیا ہے انہی احکام کے مطابق ہم چلتے ہیں وہ احکام ایسے طاقت ور اور زبردست ہیں کہ نہ ہم ان پر چوں و چرا کر سکتے ہیں اور نہ ان سے احتراز کر سکتے ہیں ان میں رد و بدل۔تغیر و تبدل کے لئے گنجایش نہیں۔اس کے حکم کے بغیر سانس تک نہیں لیا جا سکتا اور نہ پاے مور حرکت کر سکتا۔تقدیر الہی کے آگے تدبیر انسانی کوئی چیز نہیں۔نوشتۂ تقدیر امٹ اور اٹل ہے حیلہ اور پرہیز سے کوئی تبدیلی اس میں پیدا نہیں کی جا سکتی گویا انسان تقدیر خداوندی کے ہاتھہ میں ایک کٹھہ پتلی ہے وہ جس طرف اور جس طرح چاہتی ہے اس کو توڑتی اور موڑتی ہے۔

امثال از شاہنامہ

(۱) بدانگہ کہ لوح آفرید و قلم　　بزد بر ہمہ بود نیہا رقم

(صفحہ ۳۴ جلد اول)

(۲) کہ ہر چیز کو آفرید از بوش　　بدانسو کشد بندگاں را روش

(صفحہ ۲۳ جلد چہارم۔فرستادن خاقان دختر خود را بانامہ و خواستہ ہمراہ مہران نزد نوشیرواں)

یعنے جیسا ازل میں تقدیر کر دیا گیا ہے۔اسی کے مطابق ہم چلتے ہیں۔

(۳) اگر زو مرا رنج خواہد فزود　　قلم رفت و ایں بودنی کار بود

یعنے جس بات پر قلم جاری ہو گیا ہے وہ ہو کر رہے گی۔

(صفحہ ۱۳۰ جلد اول بخواب دیدن پیراں سیاؤش را و پیدا شدن خسرو)

(۴) ہمہ بندگانیم و او پادشاست　　خرد بر توانائی او گواست

نفس جز بفرمان او نگذرد پئے مور بے او زمیں نسپرد

(صفحہ ۲۱ جلد چہارم پاسخ نامہ خاقان از انوشیروان)

اس کی قدرت ایسی زبردست ہے کہ اس کی مشیت کے بغیر سانس تک نہیں لیا جاسکتا اور رینگنے والی چیونٹی کا پانو تک نہیں هل سکتا—

(۵) از و گر نوشتہ بمن بر بدی است نگردد بپرهیز کاں ایزدی است

(جلد اول صفحہ ۱۳۰)

اگر ہماری تقدیر میں کوئی برائی لکھی ہے تو ہمارے پرہیز سے وہ بدی ٹل نہیں سکتی —

(۶) کہ کار خدائی نہ کاریست خورد قضائے نبشتہ نشاید سترد

نوشتۂ تقدیر مٹایا نہیں جاسکتا-

(۷) نبشتہ بسر بردگر گونہ بود ز فرماں نکاهد نخواهد فزود

قضا چوں ز گردوں فرو هشت پر همه زیرکاں کور گردند و کر

مولانا روم اس شعر کو یا اس کے عربی ماخذ کو مد نظر رکھکر کہتے ہیں—

چوں قضا بیروں کند از چرخ سر عاقلاں گردند جملہ کور و کر

(صفحہ ۲۴ جلد اول- پرسیدن سہراب نام و نشاں سرداران ایران از هجیر)

یعنے خدا کے حکم میں کوئی کمی و بیشی واقع نہیں ہو سکتی جب قضائے الہی آتی ہے تو دانشمند اندھے اور بہرے ہوجاتے ہیں—

(۸) نوشتہ چنیں بود ماں در بوش برسم بوش اندر آید روش

(صفحہ ۲۱ جلد اول)

(۹) چو یرداں چنیں راند اندر بوش بر ینگونہ پیش آوریدم روش

(صفحہ ۲۵ جلد اول)

(۱۰) چنیں گفت دستاں کہ دانا یکیست بتقدیر او راہ تدبیر نیست

(صفحہ ۹۴ جلد اول)

یعنی تقدیر کے آگے ہماری تدبیر بیکار ہے—

(۱۱) بکوشیم و از کوشش ما چه سود کز آغاز بود آنچه مابست بود

(صفحہ ۱۵۲ جلد اول)

ہماری کوشش بیکار ہے جو ہونا ہے ازل سے دن مقرر ہو چکا ہے—

(۱۲) نوشته چنیں بود و بود آنچه بود ز فرماں نکاهد نخواهد فزود

(صفحہ ۹۲ جلد چہارم۔ کشته شدن بہرام چوبین بدست قلوں)

(۱۳) ز بخش جہاں آفریں بیش و کم نگردد بخوره پیمائے دم

خدا نے جو ہمارا نصیبہ مقرر کر دیا ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی اس پر گفتگو کرنا فضول ہے گویا ان معاملات میں فردوسی بحث کرنا بھی پسند نہیں کرتا چنانچہ ایک اور مقام پر کہتا ہے۔

نوشته چنیں بود و بود آنچه بود سخن بر سخن چند خواهی فزود

(صفحہ ۹۷ جلد چہارم رسیدن خسرو و بہرام چوبین بہمدیگر و گفتگو با یک دگر کردن)

میں بخوف طوالت صرف انہی چند امثال پر قناعت کرتا ہوں ورنہ شاهنامہ میں یہ جذبات و خیالات قدم قدم پر ملتے ہیں—

(۲) معتزلہ جو اپنے آپ کو عدلی کہتے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم سے خیر و صلاح کے سوا اور کچھ صادر نہیں ہوسکتا اور بحکم عقل رعایت مصالح عباد اس پر واجب ہے پس خدا کی نسبت یہ اعتقاد کرنا کہ وہ اپنے بندوں کو اعمال خیر و شر پر اول تو مجبور کرے اور بعد میں ان کی پاداش میں سزا دے قبیح معلوم ہوتا ہے۔۔

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں۔

" حق تعالیٰ حکیم است و کار هاے او منوط بحکمت و مصلحت است و فعل عبث و بیفائدہ ازو صادر نمی شود او رادر افعال اغراض صحیح

و حکمت ہا ے عظیمہ ملحوظ می باشد ولیکن غرض در افعال الہی عاید بہ بندگاں میگردد غرض او تحصیل نفع از برائے خود نیست و بریں قول اتفاق کردہ اند امامیہ و معتزلہ و حکماء اشاعرہ گفتہ اند کہ افعال خدا معلل با غراض نیست و آیات و احادیث بسیار بر بطلان ایں قول دلالت میکند۔

و اکثر امامیہ را اعتقاد آنست کہ آنچہ اصلح باشد از برائے خلق و نظام عالم فعلش بر حق تعالیٰ واجب است''

(از حق الیقین)

بر خلاف اس کے اشاعرہ کا عقیدہ ہے کہ بروے عقل خدا پر کچھہ واجب نہیں وہ قادر مطلق اور فعال مایشاء ہے وہ جو چاہے اور جب چاہے کرے کسی کو اس پر قدرت نہیں وہ چاہے تو چھوٹی چیز کو وسیع کر دے اور وسیع کو سمیٹ دے جس کو چاہے بلند کرے اور جس کو چاہے پست کرے۔ ذلیل کو عزت دے اور عزت والے کو ذلیل کر دے جس کو چاہے راہ راست پر لائے اور جس کو چاہے سیدھی راہ سے الگ کر دے جسے جو چاہے دے اور جو چاہے چھین لے۔ وہ جو کچھہ کرتا ہے یا کرے گا وہی عدل اور انصاف ہے۔ نفع و ضرر اس کے ہاتھہ میں ہے اس کی مشیت اور ارادہ کے بغیر کچھہ ہو نہیں سکتا اللہ عزو جل پر ثواب یا عذاب یا بندے کے ساتھہ لطف یا اس کے ساتھہ وہ کرنا جو اس کے حق میں بہتر ہو کچھہ واجب نہیں۔ مالک علی الاطلاق ہے جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے اس پر کوئی جور و حیف لازم نہیں آتا۔

اس روشنی میں دیکھتے ہوے فردوسی اشاعرہ کا ہم زبان ہے اس کے نزدیک ذات باری قادر علی الاطلاق ہے نہ شیعہ اصحاب کی طرح اس کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ عزو جل پر اصلح واجب ہے اور نہ وہ یہ مانتا کہ نیکیوں کا خالق اللہ ہے اور برائیوں کا خالق انسان ہے ان میں سے ہر مسئلہ میں وہ فرقۂ سنت و الجماعت کا پیرو ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

(۱) یکے را بر آری بچرخ بلند | یکے را کنی خوار و زار و نژند
یکے راز ماہ اندر آری بماہ | یکے راز چاہ اندر آری بماہ
یکے را بر آری و شاهی دهی | یکے را بدریا بماهی دهی
نه با آنت مهر و نه با اینت کیں | که بہ دانی توئی ایجهاں آفریں
جهاں را بلند و پستی توئی | ندانم چهٔ هرچه هستی توئی

(صفحه ۱۹۳ جلد دوم - گرفتار شدن خاقان و شکست خوردن تورانیاں)

(۲) غم و اندوه و رنج و تیمار و درد | ز نیک و ز بد هر چه آمد بمرد
کمی و فزونی و نیک اختری | بلندی و پستی و کند آوری
ز داد تو بینم همی هرچه هست | دگر کس ندارد دریں کار دست

یعنے غم و رنج - درد و تکلیف - نیکی بدی - کمی بیشی - نیک بختی اور بد بختی - بلندی اور پستی جو انسان پر عارض ہوتی ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں اور انصاف ہیں —

(صفحه ۷۰ جلد اول کشتن رستم ارژنگ دیو را)

(۳) توانائی او راست ما بنده ایم | هم از راستیهاش گوینده ایم
یکے را دهد تاج و تخت بلند | یکے را کند خوار و زار و نژند
نه با آنش مهر و نه با اینش کیں | نمیداند ایں جز جهاں آفریں

(صفحه ۹۳ جلد چهارم)

(۴) وزو یست پیروزی و هم شکست | به نیک و به بد زاں بود کام دست
زماں و مکاں و جهاں آفرید | پے مور و کوه گراں آفرید
خرد داد و جاں و تن زورمند | بزرگی و دیهیم و تخت بلند
رهائی نیابد سر از بند او | یکے را بود فرو اورند او
یکے را دگر شور بختی بود | نیاز و غم و درد و سختی بود
ز رخشنده خورشید تا تیره خاک | همه داد بینم زیزداں پاک

(صفحه ۱۶۲ جلد اول)

(۵) بدو نیک زاں داں کش انباز نیست بکاریش فرجام و آغاز نیست

(صفحہ ۴۰ جلد چہارم) دیگر

ازویست نیک و بد و هست و نیست همه بندگانیم ایزد یکیست

(صفحہ ۳۹ جلد اول) دیگر

تو مگزار هرگز رہ ایزدی که نیکی ازویست و هم زو بدی دیگر
بزرگی ز خوردی به پیمان اوست همه بودنی زیر فرمان اوست دیگر
جز او را مخواں کردگار بلند کزو شادمانی وزو مستمند دیگر
بد و نیک بیند ز یزدان پاک وزو دارد اندر جہاں ترس و باک

(صفحہ ۱۰۳ جلد چہارم)

(۳) فرقۂ اهل تسنن و تشیع میں هاروت و ماروت کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ان فرشتوں کی بابتہ وہ قصہ جس سے ان کا بشری حیثیت اختیار کر کے دنیا میں آنا۔لوگوں کو جادو کی تعلیم دینا۔زہرہ پر عاشق هونا اور اس کو اسم اعظم سکھانا مفہوم هوتا ہے اور جو اهل سنت و جماعت میں مقبول ہے اهل تشیع نہیں مانتے۔فردوسی کے هاں شاهنامہ میں ایک سے زیادہ موقعوں پر هاروت کا ذکر آتا ہے اور اس طریقہ سے آتا ہے جس سے ظاهر هوتا ہے کہ اس قصہ پر اس کا اعتقاد تھا۔کیونکہ ان کی جادوگری کا وہ ذکر کرتا ہے۔چنانچہ

گہے میگساریدو گہ چنگ ساخت تو گفتی که هاروت نیرنگ ساخت

(تمہید داستان بیژن)

شیعہ هونے کی حیثیت سے فردوسی اس تلمیح کا استعمال نہیں کرسکتا تھا۔

(۴) سکندر کے حالات جو فردوسی نے شاهنامہ میں دئے هیں ایسا معلوم هوتا ہے کہ زیادہ ترسنی مآخذ سے لئے گئے هیں کیونکہ اهم واقعات میں اسکے بیانات ثعلبی اور نظامی کے بیانات سے مطابق هیں جبکہ تاریخ طبری اور روضۃالصفا سے موافق نہیں۔

(۵) اسیطرح صوفیوں کے متعلق اسکی راے اهل سنت والجماعت کے مطابق هے-وہ انکا ذکر موقر الفاظ میں کرتا هے-سکندر کی داستان میں کہتا هے

فریباں کہ برشہر ما بگذرند چہا نندہ پاے ولباں تا چرند
دل از عیب صافی و صوفی بنام بدرویشی اندر شدہ شاد کام
زخواهندگان نام شاں بر کنید شمار اندر آغاز دفتر کنید

(صفحہ ۱۰ جلد سوم)

واضح رهے کہ شیعہ جماعت میں ابتداهی سے اهل تصوف کی نسبت معاندانہ راے قائم کر لی گئی تهی حتی کہ انکو مجوس اور نصاری کے ساتھ تشبیہ دیجاتی تهی-جناب امام علی نقی کا قول هے—

"الصوفیہ کلهم مخالفونا و طریقهم مغایرۃ لطریقنا و ان هم الا نصاری اومجوس هذہ الامہ" فرقۂ صوفی یہ سب همارے مخالف هیں انکا طریقہ همارے طریقہ سے جدا هے اور وہ اس امت کے نصاری اور مجوس هیں—

امام جعفر صادق کی راے بهی ملاحظہ هو:—

"قال رجل الصادق ع خرج فی هذا الزمان قوم یقال لهم الصوفیہ فما تقول فیهم فقال ع انهم اعداء نا فمن مال الیهم فهو منهم و یحشر معهم و سیکون اقوام یدعون حبنا و یمیلون الیهم و یتشبهون بهم و یلقبون انفسهم بلقبهم ویاولون اقوالهم الا فمن مال الیهم فلیس منا وانا منہ براء و من انکرهم و ردعلیهم کان کمن جاهد الکفار مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ"

(ترجمہ) امام صادق سے ایک شخص نے پوچها کہ اس زمانہ میں ایک فرقہ مبعوث هوا هے جسکو صوفی کہا جاتا هے آپکی ان کے بابتہ کیا راے هے آپنے جواب دیا کہ وہ همارے دشمن هیں جو ان کی طرف مائل هوا وہ انهی میں سے هے اور انهی کے ساتھ محشور هوگا اور عنقریب ایسے لوگ بهی هوں گے جو هماری محبت کا دعوی کریں گے اور ان کی طرف میل کریں گے ان کے ساتھ مشابہت

کریں گے ان کے القابات سے اپنے آپ کو ملقب کریں گے اور ان کے اقوال کی تاویلیں کریں گے - لیکن جو شخص ان کا مائل ہوا وہ ہماری جماعت سے تعلق نہیں رکھتا اور ہم اس سے بری ہیں اور جس نے ان کا انکار کیا اور ان کی تردید کی اس کا رتبہ ایسا ہے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے ساتھ شریک ہو کر کفار کے ساتھ جہاد کیا —

ابو ہاشم کوفی صوفی کے متعلق جو بقول جامی سب سے پیشتر صوفی کے لفظ کو رواج دیتے ہیں بروایت امام حسن عسکری امام جعفر الصادق کی رائے حسب ذیل ہے —

"قال سئل الصادق ؑ عن حال ابوالہاشم الکوفی الصوفی قال ؑ انہ فاسد العقیدۃ جداً"

امام جعفر الصادق سے ابوالہاشم الکوفی صوفی کے متعلق استفسار کیا گیا آپ نے فرمایا کہ وہ بد عقیدہ ہے —

ان محترم ہستیوں کے اس قسم کے صریح اعلانات کے بر خلاف شیعہ حلقوں میں تصوف کے لئے کسی سرسبزی کی امید رکھنا نا ممکن تھا ایک مدت دراز تک یہی حالت قائم رہی لیکن پچھلے چند قرون میں سیاسی اسباب کے زیر اثر متصوفین کے لئے احترام کے آثار صفویہ کے زمانے سے شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ اس خاندان کے اجداد شیخ صدرالدین موسیٰ اور شیخ صفی الدین اسحق بن جبرئیل خود صوفی تھے —

(۲) یہاں ایک اور غیر متعلقہ امر کے متعلق چند الفاظ کہنا مناسب ہوں گے - کتاب یوسف و زلیخا بقول جمہور فردوسی کی تصنیف ہے اگرچہ اس اعتقاد میں میں شریک نہیں ہوں تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ فردوسی کی تصنیف ہے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے ذرائع وہی روایات ہیں جو اصحاب سنت و جماعت کے ہاں شائع ہیں - جس کا یہ مطلب ہے کہ اس کا مصنف سنی ہے

نہ سمجھے میں ان متعدد دلائل سے جو مصنف کتاب کے سنی ہونے کے نظریہ کے حق میں پیش کی جاسکتی ہیں بخوف طوالت صرف ایک روایت پر اکتفا کرتا ہوں۔

مثلاً وہ موقع جہاں زلیخا عشرت خانہ طیار کروا کر حضرت یوسف کو بلواتی ہے اور طالب وصال ہوتی ہے۔اس موقعہ پر حضرت یوسف بے مائل ہونے اور ازار بند کی ساتوں گرہیں کھولنے وغیرہ کے جو تفصیلی حالات اس تصنیف میں ملتے ہیں ان کا ناقل کوئی شیعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تمام روایت اہل تشیع کے ہاں مردود ہے۔جہاں شیعہ اصحاب نے سنیوں کے خلاف اور اعتراض کئے ہیں وہاں یہ اعتراض بھی کیا ہے۔میں ان کی تصنیف "تبصرۃ العوام" سے ذیل کی عبارت نقل کرتا ہوں جہاں مولف نے سنیوں کے بیانات دے کر ان پر جرح کی ہے:۔

"روایت کنند کہ چوں زلیخا قصد یوسف کرد ودرخانہ بہ بست۔یوسف نیز قصد فجور کرد۔ناگاہ یعقوب را دید انگشت بدنداں گرفتہ وگفت یا یوسف ترا از انبیا می شمارند وتو قصد فجور میکنی و از سفیان بن عتبہ روایت کنند کہ گفت یوسف قصد فجور کرد بازلیخا و در موضعے نشست کہ مرداں بازناں بقصد مجامعت نشینند و بروایت دیگر چناں درقدمہائے زن نشست کہ مرد در حال مجامعت با حلال خود نشیند۔این حکایت جہلہ (سنیاں) در تفاسیر خود یادکردہ اند و ایں فواحش از تاویلات آیات قرآن استنباط کنند و بر انبیا ورسل بندند وگویند مذہب اہل سنت وجماعت است و ہرکہ خلاف ایں گوید اورا رافضی و متبدع گویند"

میں یہاں مثنوی یوسف و زلیخا کے وہ اشعار بھی درج کرتا ہوں۔

چناں آتشے بردلش برفروخت	کہ مرشرم اورا سرا سر بسوخت
چودل بر ہوا جستنش میل کرد	سہ بند از گرہ زود بکشاد مرد
پس از کنج خانہ یکے دست دید	کشیدہ بکردار سیم سپید

همی برکف او نوشته عیان — که بیند همی کردگار جهان
فروخواند یوسف ولیکن هواش — نکرد از گره برکشادن جداش
دو بند دگر بر کشاد از میان — بفرمان اهریمن تیره جان
زکنجی دگر باز دستی بدید — هنرمند یوسف درو بنگرید
بدان بد نوشته که این کار زشت — امیدت ببرد ز حور بهشت
فروخواند یوسف ولیکن نداشت — بدان کزهوا کام بیرون گذاشت
دل از کام جستن همی بر نتافت — سوی بند دیگر کشادن شتافت
ببخشود بروی جهان آفرین — فرستاد دروقت روح الامین
بصورت چو یعقوب پرهیزگار — هم از کنج خانه شدش آشکار
بیوسف چنین گفت کای کنج هوش — ز دو زخ تن خویشتن دار گوش
زیقوب آزرده بشنو سخن — بدینسان گنه زرد رویم مکن
بدین گر شود چهره زردم زتو — بیزدان که بیزار گردم زتو
چو یوسف رخ و چشم یعقوب دید — بدانسان سخن گفتن ازوی شنید
چنان لرزش افتاد در دست و پائی — که در تن نماندش دل رهنمائی*

(صفحه ۱۲۷ دارالطباعۀ خاصۀ مدرسۀ مبارکه دارالفنون طهران)

---

* اسکے علاوہ جب ہم امام احمد غزالی طوسی (برادر امام غزالی) شیخ عطار اور نظامی گنجوی کے بیانات پر غور کرتے ہیں تو قرائن سے فردوسی کا اہل تسنن سے تعلق رکھنے کا استدلال صاف مترشح ہے - یہ تینوں بزرگ اہل سنت و الجماعت کے ہاں اپنے اپنے مرکز میں بلحاظ شہرت و تقدس نہایت بلند پایہ رکھتے ہیں - انمیں سے ہر ایک کا مذہب کے ساتھہ بہت قریبی تعلق رہا ہے - فردوسی کا ذکر یہ بزرگوار عزت کے ساتھہ کرتے ہیں جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ فردوسی انکے نزدیک اہل تسنن سے تھا - امام احمد غزالی کا بیان مرزبان نامہ - باب سوم -- داستان سہ رہزن انباز - صفحہ ۷۷ و صفحہ ۷۸ طبع یورپ میں ملتا ہے عطار کا حوالہ اسی مضمون نے ایک حاشیہ میں گزرچکا ہے - نظامی کے بیانات اقبال نامہ - شرف نامہ - اور بہرام نامہ میں ملتے ہیں - راحة الصدور - جہانکشای جوینی اور مرزبان نامہ وغیرہ میں شاہنامہ کے اشعار کا کثرت کے ساتھہ نقل کیا جانا اسی عقیدہ کی تحت کا ایک اور قرینہ ہے —

ان بعض مسائل میں جو اتفاقیہ شاهنامہ میں آگئے هیں دیکھا جاتا هے کہ فردوسی بالکل اهل تسنن کے همراہ ہے اسلئے انکے اثرات سے میں اسکو سنی عقیدہ کا مانتا هوں—

فردوسی کے اور عقائد کے متعلق جو شہادت شاهنامہ سے مل سکتی هے ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی هے—اگرچہ شاهنامہ باعتبار مضمون ایسی کتاب نہیں جس میں مصنف کو اپنے عقائد کے اظہار کا زیادہ موقعہ ملتا تاهم اسقدر یقینی هے کہ اسکے معتقدات وهی تھے جو عام مسلمانوں کے هوتے هیں۔ وہ دین اسلام کو سب سے بہتر مذهب مانتا هے اور نور ایمان سے اپنے دل کو روشن کرنا چاهتا هے—

بگیتی درآں کوش چوں بگذری — سرانجام اسلام با خود بری
دل از نور ایماں گر آگندۂ — ترا خامشی بہ کہ گویندۂ

خدائے پاک کی ستائش اور اسکی توحید کی اشاعت فردوسی کا پہلا اور آخری سبق هے جسکی تکرار سے وہ کبھی تھکتا نظر نہیں آتا—توحیدی مضامین کی کثرت سے اگر کسی نے شاهنامہ کو قرآن العجم کہا هے تو غیر موزوں نہیں کہا هے فارسی میں مشکل سے کوئی ایسی کتاب هوگی جس میں توحیدی مضامین اس کثرت سے پائے جائیں

جبکہ فلاسفہ کی زبان میں فردوسی خداکو روح اور عقل کا خالق مانتا هے جسلیے مکان اور زمان خلق کئے جو خورشید۔ قمر۔ زحل اور زهرہ کا مالک هے۔ آسمانوں اور جہانوں کا خدا هے۔ خاک۔ آب۔ آتش اور هوا جس کی هستی پر شہادت دیتے هیں۔ فقہا کے همزبان بن کر گویا هے کہ اس نے ایک کن سے دونوں جہانوں کی تخلیق کی اور لوح و قلم پیدا کئے۔ وہ بے نیاز۔ دانا اور توانا بے سہیم و شریک اور بے مانند هے اس کے احکام میں چوں و چرا نہیں کی جاسکتی۔ هم اس کے مجبور بندے هیں—همارا فرض اس کی عبادت اور اس کے احکام کی

تعمیل ہے خدا کی جناب میں اظہار عجز و نیاز کی تاکید وہ بار بار کرتا ہے۔
فردوسی کہتا ہے —

وہ قادر مطلق ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس کے یار ہے۔ نہ جفت ہے۔ وہ کبھی بہار پیدا کرتا ہے اور کبھی خزاں۔ درخت انگور کو وہی میوہ دیتا ہے کبھی اس کو بہاریں کرتا ہے اور کبھی زرد رو۔ تمام عناصر اس کی ہستی کی گواہی دیتے ہیں۔ دستور۔ گنجور۔ تاج و تخت۔ کمی بیشی۔ خوش اقبالی اور بد اقبالی سے وہ بے نیاز ہے۔ خشکی میں پیل اور آب میں نہنگ اس کے فرمان سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ بدی اور نیکی سب اس کے طرف سے ہے شمس و قمر اور زحل کا مصور۔ تخت و تاج کو رونق بخشنے والا۔ خاشاک سے شیر و پیل تک اور پائے مور کی گرد سے رود نیل تک اگر زمین سے آسمان تک پہونچ جائیں سب اسی کے حکم میں ہیں نہ اس کے حکم کی انتہا ہے اور نہ اس کی پادشاہی کو زوال ہے۔ دنیا کی چھوٹی بڑی چیز کا صانع۔ خاشاک سے عرش تک ہر ایک چیز اس کی ہستی کی شہادت دیتی ہے۔ چیونٹی سے شیر کو سزا دلواتا ہے۔ پیل زبردست پر پشہ کو غالب کرتا ہے۔ وہ کیوان و بہرام و خورشید کا خداوند جس سے ہم کو امید و بیم ہے اگرچہ میں اپنی جان تفکر میں گھلا دوں تب بھی میں اس کی حمد سرائی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جیسا اس کا حق ستایش ہے ویسے کوئی اس کی ثنا نہیں کر سکتا اس لئے ہم کو اس کی بندگی کے لئے کمر بستہ رہنا چاہئے اس کی ہستی کا معترف ہو کر اس کی عبادت میں مصروف ہونا اس کے فرمانوں کی تعمیل کرنا اور اس کی بخشش کی امید رکھکر گناہ سے خائف رہنا چاہئے اور اس کے پیغمبر پر درود بھیجنا چاہئے

یہاں شاہنامہ سے بعض امثال پر قناعت کی جاتی ہے —

(۱) بنام خداوند خورشید و ماہ — کہ دل را نہاش خرد داد راہ
خداوند ہستی و ہمراستی — نخواہد ز تو کژی و کاستی

خداوند کیوان و بهرام و شید   کزو یست امید و بیم و نوید
ستودن من او را ندانم همی   از اندیشه جان بر فشانم همی
ازو یست پیدا زمان و مکان   پئے مور بر هستی او نشان
ز گردندہ خورشید تا تیرہ خاک   همں باد و آب آتش تابناک
بهستی یزداں گواهی دهند   رواں ترا آشنائی دهند
سوے آفرینندۂ بے نیاز   ببابد که باشی همی در گداز
ز دستور و گنجور و زتاج و تخت   ز کمی و بیشی و ناکام و بخت
هم او بینیاز است ما بندہ ایم   بفرمان و رایش سر افکندہ ایم
چو جان و خرد بیگماں کردہ است   سپهر و ستارہ بر آوردہ است
جز او را مداں کردگار بلند   کزو شادمانی و زو مستمند
شب و روز و گرداں سپهر آفرید   خور و خواب و تندی و مهر آفرید
(۲) نگارندۂ هور و کیوان و ماہ   فرو زندۂ فر و دیهیم و گاہ
ز خاشاک ناچیز تا شیر و پیل   ز گرد پئے پیل تا رود نیل
گر از خاک بر چرخ گرداں روند   همه زیر فرمان یزداں روند
نه فرمان او را کرانه پدید   نه زو پادشاهی بخواهد برید
(۳) خداوند کیوان و خورشید و ماہ   کزو پست و پیروزے و دستگاہ
خداوند هستی و همراستی   از و یست بیشی و هم کاستی
خداوند بخشنده و کارساز   خداوند روزی دہ بے نیاز
خداوند گیتی خداوند مهر   خداوند ناهید و گرداں سپهر
جز از راے و فرمان او راہ نیست   خور و ماہ ازیں دانش آگاہ نیست

(صفحه ۱۳۸ جلد اول)

(۴) ستودن نداند کس او را چو هست   میاں بندگی را ببایدت بست
بدیں آلت و راے و جان و رواں   ستود آفرینندہ را کے تواں

بهسنیش باید که خستو شوی ز گفتار بیکار یکسو شوی
پرستنده باشی و جوینده راه بفرمانها ژرف کردن نگاه

فردوسی سرائے جاودانی کا معتقد ھے اور کئی موقعوں پر اس کی نسبت تلمیح کرتا ھے—

چنیں گفت مارا سخن رھنمائے جزایفست جاوید مارا سرائے — دیگر
همیں بگذرد بر تو ایام تو سرائے جزایں باشد آرام تو — دیگر
ز رفتن مگر بهتر آیدت جائے چو آرام گیری بدیگر سرائے

سرائے جاودانی اس سرائے سے بہتر ھے—

رها کن ز چنگ ایں سپنجی سرائے که پر مایه تر زیں ترا هست جائے

اور اس دنیا میں همارے نیک اعمال کا ثمرہ اس دنیا میں ملے گا—

تو تا زندۂ سوے نیکی گرائے مگر کامیابی بدیگر سرائے

(صفحه ۳۸ جلد سوم)

جب هم اس دنیا سے رحلت کریں گے خدا سے همارا سروکار هوگا همارے اعمال خواہ اچھے هوں یا برے—

چو رفتی سروکار با ایزدست اگر نیک باشدت کار ار بد است — دیگر
گه رفتن آمد بدیگر سرائے مگر نزد یزداں به آیدت جائے

وہ بہشت اور دوزخ کا معتقد ھے—

اگر ماند ایدر ز تو نام زشت بیابی عفاالله خرم بہشت
نه چوں من شده خوار و بر گشته بخت — دیگر
بدوزخ فرستاده نا کام رخت

رضواں مالک بہشت کا نام ان ابیات میں آتا ھے—

بتان بهشتند گوئی درست بگلنار شاں روے رضواں بشست

(صفحه ۶۵)

توبہ پر بھی اعتقاد کامل رکھتا ھے—

توا ے پیر فرتوت بے توبہ مرد　　　در توبہ بگزیں و راہ خرد

ابلیس کا ذکر بھی کرتا ھے—

خیال بد کہ ابلیس روزے پگاہ　　　بکے انجمن کرد پنہاں زشاہ

خانۂ کعبہ کا ذکر نہایت احترام کے ساتھہ کرتا ھے۔ وہ کہتا ھے کہ خانِ حرم وھی ھے جس کو خدا بیت الحرام کہتا ھے۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام اس کے بانی ھیں خدا نے اس کو بیت اللہ کہا ھے یہ اس مقام پاک کی حرمت کی بنا پر ھے ورنہ خدا کو کھانے پینے یا آرام کرنے کے لئے کسی گھر کی ضرورت نہیں ھے۔ جب سے یہ پرستشگاہ تعمیر ہوئی ھے اس میں ھمیشہ خدا کی عبادت ہوتی آئی ھے—

خداوند خواندیش بیت الحرام　　　بدو شد ترا راہ یزداں تمام

ز پاکی ورا خانۂ خویش خواند　　　نیایش کنا نرا بداں پیش خواند

خدا ے جہاں را نیاید نیاز　　　بجائے خورو کام و آرام و ناز

پرستشگہے بود تا بود جائے　　　بد و اندروں یاد کرد خدائے

شاھنامہ میں بیت المقدس کا بھی ذکر آتا ھے—

بحشکی رسید ند سر جنگجوئے　　　بہ بیت المقدس نہادند روے

(صفحہ ۲۲ جلد اول سنہ ۱۲۹۲ ھجری)

ظلمات میں سکندر کے جانے کے وقت وہ مسلمانی تکبیر اللہ اکبر کا بھی ذکر کرتا ھے—

چو لشکر سوے آبحیواں گذشت　　　خروش آمد اللہ اکبر ز دشت

خضر علیہ السلام کو سکندر کا رھبر مانتا ھے—

و را اندریں خضر بد رایزن　　　سر نامداران آں انجمن

سکندر بیامد بفرمان اوے　　　دل و جاں سپردہ بہ پیمان اوے

ظلمات سے واپسی کے وقت حضرت اسرافیل سے سکندر کی ملاقات کا

ذکر بھی کرتا ھے—

سرا فیل را دید صورے بدست | بر افروختہ سرز جاے نشست
پر از باد لب دید گاں پرز نم | کہ فرساں کے آید زیزداں کہ دم
چو بر کوہ روے سکندر بدید | چو رعد خروشاں فغاں بر کشید
کہ اے بندۂ آز چندیں مکوش | کہ روزے بگوش آیدت یک خروش
توچندیں مرنج از پے تاج وتخت | بر فتن بیارا و بر بند رخت

کید ھندی کے خواب میں وہ دین اسلام کی ترویج کی پیشین گوئی بیان کرتا ھے—

چھارم ز تازی یکے دین پاک | سر ھوشمنداں بر آرد بخاک

اور اسی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و صلم کی نسبت بھی بشارت دیتا ھے—

ازیں پس بیاید یکے نامدار | ز دشت سواران نیزہ گزار
یکے مرد پاکیزۂ نیک خوئے | بدو دین یزداں شود چار سوے

وہ عبرانی تاریخ کو ایرانی تاریخ کے ساتھ جیسا کہ بعض خوش عقیدہ مورخین کا دستور ھے تطبیق دینے کی کوشش بھی کرتا ھے اس عقیدہ کا کہ حضرت ابراھیم اور زردشت ایک ھی شخص ھیں وہ بھی معتقد ھے—

تهم دین زردشت پیشیں بدوے | براھیم پیغمبر راست گوے

لیکن حضرت ابراھیم کے تقدم کا حضرت موسی پر لحاظ نہ رکھکر منو چھر کی زبان سے حضرت موسی کی آمد کی بشارت نوذر کو ان ابیات میں دیتا ھے—

نگر تا نتابی ز دین خداے | کہ دین خدا آورد پاک راے
کنوں نو شود در جھاں داوری | کہ موسی بیاید بہ پیغمبری
پدید آید آنکس زخاور زمیں | نگرتا نباشی ابا او بکیں
بدو بگرو آں دین یزداں بود | نگہ کن ز سر تاچہ پیماں بود

تاریخ طبری میں منوچہر کو حضرت موسیٰ کا ہمعصر مانا گیا ہے —
حضرت اسمٰعیل کا ذکر بھی ادب کے ساتھ کیا ہے —

نبیرہ سماعیل پیغمبر است که پور براهیم نیک اختر است

فردوسی کا بھی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ پیغمبر تھے چنانچہ ان کی نسبت کہتا ہے —

پدر دبیر او بود و مادر کنشت نگهبان و جوینده خوب و زشت
چو روشن‌روان گشت و دانش پذیر سخنگوئے و داننده یاد گیر
به پیغمبری نیز هنگام یافت به برنائی از زیرکی کام یافت
تو گوئی که فرزند یزدان بد او بدان دار بر گشته خندان بد او
بخندد برین بر خردمند مرد تو گر باهشی گرد یزدان بگرد
که هست او بفرزند و زن بے نیاز بنزدیک او آشکار است راز

نوشیرواں اپنی وفات کے قریب ایک خواب دیکھتا ہے جس کی تعبیر رسول مقبول کی ولادت اور ترویج دین اسلام ہے یہ بھی فردوسی کے مسلمہ معتقدات کی دلیل ہے — نوشیرواں کے خواب کی روایت اکثر تاریخوں میں ملتی ہے مگر فردوسی نے کسی قدر ضمنی اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے — تاریخ طبری میں عبدالمسیح آکر سطیح سے اس خواب کی تعبیر دریافت کرتا ہے شاہنامہ میں گزارندۂ خواب حکیم بوزرجمہر ہے * —

جنگ میں دشمنوں کے خلاف مارے جانے کے موقعوں پر متوفی کے لئے فردوسی کا بھی اعتقاد ہے کہ شہید ہوتا ہے —

کسے که بود کشته زین رزمگاه بهشتی شود گشته پاک از گناه

(صفحہ ۲۳ جلد اول)

---

* نوشیرواں کے خواب کی روایت تمام بایسنغری نسخوں میں ملتی ہے لیکن اس عہد سے قبل کے بعض شاہناموں میں جو میری نظر سے گذرے ہیں یہ بیان مذکور نہیں ہے —

پردہ کا بھی شاھنامہ میں مذکور آتا ھے—

پس پردۂ او یکے دختراست — کہ روشن ز خورشید روشن تراست — دیگر

کرا درپس پردہ دختر بود — اگر تاجدارد بد اختر بود

فردوسی مانتا ھے کہ ایک امر کن سے خدا نے دونوں جہان کو پیدا کیا—

دو گیتی پدید آرد از کاف ونوں — چرا نہ بفرمان او در فنوں

اس کے ھاں لوح و قلم کا بھی ذکر موجود ھے—

بد آنگہ کہ لوح آفرید و قلم — بزد بر ھمہ بود نیہا رقم

خواب کے وجود میں عام مسلمانوں کی طرح اس کا بھی اعتقاد ھے وہ اس کو دانش پیغمبری کہتا ھے —

نگر خواب را بیہدہ نشمری — یکے بہرہ دانش ز پیغمبری

روانہاے بیدار بیند بخواب — ھمہ بود پنہا چو آتش بر آب

عربوں سے با وصف محبت ایران اس کو کوئی قومی عناد نہیں ھے اگرچہ استیلائے عرب پر عجم کے بیان میں بد قسمتی سے اس نے ایسی روایات سے کام لیا ھے جن میں عربوں کے ساتھہ بے انصافی کی گئی ھے • ان کے جس قدر کارنامے ھیں ان کو یا تو بیان نہیں کیا ھے یا نہایت خفیف کر کے دکھایا ھے بعض ارکان اسلام کا اگر بے ادبی سے نہیں تو ادب کے ساتھہ بھی ذکر نہیں کیا ھے اور غالباً یہی اصلی وجہ فردوسی کی بدنامی کی معلوم ھوتی ھے—تاھم جہاں عربوں

• بایسنغری اڈیشن سے قبل کے بعض شاھناموں میں داستان یزد جرد سے ایسے ابیات جو صریحاً عربوں کے خلاف معاندانہ جوش کا اظہار کرتے ھیں خصوصیت کے ساتھہ غیرحاضر ھیں جس سے شک گذرتا ھے کہ شاید اس قسم کے اشعار بعد میں اضافہ کردیے گئے ھیں — ایک نسخہ نوشتۂ سنہ ۷۵۲ ھجری میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ اور رستم سپہ سالار یزد جرد کے درمیان جنگ کے واقعات کی تفصیل بایسنغری نسخوں اور مطبوعہ شاھناموں سے کئی امور میں مختلف ھے — خود اس داستان کی موجودہ ابتر حالت شاھد ھے کہ اس میں ضرور تصرفات کئے گئے ھیں—

کی تعریف کی ھے وھاں فردوسی نے اس قوم کے مخصوص خط و حال ان کی حریت پرستی - رجز خوانی-فوری اشتعال-نیزہ بازی اور شمشیر زنی کے اوصاف کو فراموش نہیں کیا ھے چنانچہ—

اگر شد فریدوں چنیں شہریار ۔۔۔ نہ ما بندگانیم با گوشوار

سخن گفتن و رنجش آئین ماست ۔۔۔ عنان و سنان باختن دین ماست

بخنجر زمیں را میستاں کنیم ۔۔۔ بہ نیزہ ھوا را نیستاں کنیم

عربی ضرب الامثال-محاورات اور مقولوں کو جو اس کے عہد تک عام مسلمانوں گفتگو میں رائج ھوچکے ھوں گے فردوسی اپنی زبان میں کامیابی کے ساتھہ تبدیل کردیتا ھے اور اس ترجمہ میں ضرور کچھہ نہ کچھہ جدت بھی اضافہ کرتا دیکھا جاتا ھے

عربی امثال	فردوسی کا ترجمہ
اذا جاء القضا عمی البصر	قضا چوں ز گردوں فرو هشت پر همه زیر کاں کور گردند و کر
خیر الامور اوسطها	بکار زمانه میانه گزیں چو خواهی که یابی همی آفریں
طلب البیعر قرنین فضع الاذنین	که خرشد که خواهد ز گاواں سرو بیکبار گم کرد گوش از دو سو
الدنیا مزرعة الاخرة	یکے مزرع آنجهانست ایں نظر بکشاے و حقیقت به بیں
من حضر بیراً لاخیه فقد وقع فیه	کسی قدر تبدیلی کے ساتھہ کہا ھے کسے کو برہ بر کند ژرف چاہ سزد گر کند خویشتن را نگاہ
سید القوم خادمهم	چگفت آں سخن گوے با ترس و هوش چو خسرو شوی بندگی را بکوش

فردوسی کا ترجمه	عربی امثال
نگر تا چه گوید سخنگوے بلخ که باشد سخن گفتن راست تلخ که گفتار تلخست با راستی به بند و به تلخی در کاستی	الحق مر
	من عاش بعد عدوه یوماً فلقد بلغ المنا
دم آبخوردن پس بد سگال به از عمر هفتاد و هشتاد سال	و ان حیوة المرء بعد عدوه و ان کان یوماً واحد لکثیر
شتاب و بدی کار اهریمن است پشیمانی و رنج جان و تن است	العجلت من الشیطان

(صفحه ۱۲۷ جلد اول)

سگ آں به که خواهندهٔ ناں بود چو سیرش کنی دشمن جاں بود	جوع کلبک یتبعک ثمن کلبک یاکلک

(صفحه ۱۱۳ جلد چهارم)

داستان آذر نوش میں ایک حدیث نبوی جس کے اصل الفاظ مجھکو مل نه سکے فردوسی یوں بیان کرتا ھے

چه خوش گفت دیں آور تازیاں — که خشم پدر جانت آرد زیاں

کسی اور عرب سردار کا قول فردوسی یوں نقل کرتا ھے —

سپهدار تازی سر راستاں — بریں بر بگوید یکے داستاں
که تا زنده ام چرمه جفت منست — خم چرخ گردوں نهفت منست
عروسم نباید که رعنا شوم — بنزد خردمند رسوا شوم

(صفحه ۳۱ جلد اول)

اس قدر مطالعہ کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاھنامہ میں اسلامی مذھبیت کا عنصر کم پایا جاتا ہے اگرچہ ظاھر ہے کہ فردوسی کا مضمون ایک عجمی تاریخ تھی جس میں ان جذبات کے اظہار کا بہت کم موقع مل سکتا ہے۔ساتھ ھی میں یہ بھی اضافہ کرنا چاھتا ھوں کہ فردوسی کی حیثیت زیادہ تر ایک دنیادار مسلمان سے ملتی جلتی ہے جس کو مذھب کا شغف نہو۔وہ کوئی متقی اور دیندار مسلمان نہیں تھا اور نہ فقیہ اور عالم۔مذھبی رنگ اس پر کبھی نہیں کھلا اور نہ اس میں انہماک رھا -

وہ اپنے ملک کے رواج کے مطابق جیسا کہ ھم اس عہد میں عام طور پر دیکھتے ھیں شراب خواری کا عادی تھا۔ناصر خسرو نے جبکہ چالیسویں سال اور امیر کیکاؤس نے اپنی عمر کے پچاسویں سال سے نوشی سے توبہ کرلی تھی۔ فردوسی نہ اس عہد میں اور نہ اس عمر میں جیسا کہ شاھنامہ سے معلوم ھوتا ہے توبہ کرتا دیکھا جاتا ہے بلکہ پیری اس نشاط سے لطف اٹھانے کے لئے اور بہانہ ھو گئی تھی—

چو پیری درآید ز ناگہ بمرد جوانش کند بادۂ سالخورد

کرا کوز شد پشت و بالاش پست بکیواں برد سر چو شد نیم مست

اسنے اپنی عمر کے تریسٹھویں سال تک شراب سے توبہ نہیں کی تھی چنانچہ—

مئے لعل پیش آورای روزبہ چو شد سال گویندہ بر شصت و سہ

اکثر داستانوں کے اختتام یا آغاز میں فردوسی کو شراب کی ضرورت محسوس ھوتی ہے۔شاید نظامی نے دانائے طوس کی تقلید میں سکندرنامہ میں یہی شیوہ اختیار کیا ہے اگرچہ تحقیق معلوم ہے کہ نظامی دختر رز کے گرفتاروں میں نہ تھے—

مگر فردوسی کی شراب نوشی حافظ اور خیام کی طرح رندانہ اور مستانہ نہیں ہے بلکہ وہ اس سے حظ حاصل کر کے نیم مستی پر ھی قناعت کرتا ہے—

گرت ھست جامے مئے زرد خواہ بدل خرمی را مدار از گناہ

نشاط و طرب جوے و مستی مکن گزافه مپندار مغز سخن دیگر
زمے نیز تو شادمانی گزین که مست از کسے نشنود آفرین
(صفحه ۱۶ جلد چهارم)

فردوسی موت کے ذکر کے ساتھ شراب بھی یاد رکھتا ہے -

اگر مرگ دارد چنیں طبع گرگ برازے یکے جام خواهم بزرگ

اپنے کسی ہاشمی دوست سے جو غالباً حسین متیب ہے ایک موقعہ پر شراب طلب کر رہا ہے —

مئے لعل پیش آور اے ہاشمی زخمے که بیشی ندارد کمی

بہار کی آمد اور اس کے دل میں شراب کا ولولہ پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ داستان رستم و اسفندیار کی تمہید میں دیکھا جاتا ہے —

کنوں خورد باید مئے خوشگوار که مے بوے مشک آید از کوهسار
هوا پر خروش و زمیں پر ز جوش خنک آنکه دل شاد دارد بنوش
درم دارد و نقل و نان و نبید سرے گو سفندے تواند برید

عمر کے اکسٹھویں سال (۹) شراب سے تائب ہونے کا عزم مصمم کر رہا ہے —

چو سالت شد اے پیر بر شصت و یک مئے و جام و آرام شد بے نمک
بگاه پسیچیدن مرگ مے چو پیراهن شعر باشد بدے
فسر ده تن اندر میاں گناه رواں سوے فردوس گم کرده راه
زیاراں بسے ماند و بس در گذشت تو با جام همواره بوده بدست
بآغاز اگر کار خود ننگری بفرجام ناچار کیفر بری

اس شصت و یک کا نسخه هفتاد و یک ہے جو میرے خیال میں یہاں زیادہ مناسب ہے —

اسی زمانہ کے قریب ایک اور مقام پر توبہ کے لئے تصمیم عزم کرتا پایا جاتا ہے جہاں کہتا ہے —

تو اے پیر فرتوت بے توبہ مرد　　خرد گیر و ز بزم شادی بگرد
جہاں تازہ شد چوں قدح یافتی　　رواں از در توبہ بر تافتی
اگر بخردی سوے توبہ گرائے　　ہمیشہ بود پاکدیں پاک رائے
پس از پیریت روزگاراں نماند　　تموز و خریف و بہاراں نماند

اور یقین کیا جاتا ہے کہ اس موقعہ پر شاعر نے توبۂ نصوح کرلی ہے -

فردوسی کی طبیعت کا رنگ دیکھتے ہوے کہا جاتا ہے کہ مذہب کے سوا جس چیز نے اس کے قلب پر اپنا سکہ جمایا تھا وہ حکمت اور فلسفہ ہے اس طرح اگر اس کا شمار حکماے اسلام میں کیا جاے تو غیر موزوں نہیں ہوگا- بعض مصنفین نے اس کو حکیم لکھا ہے ان کا ایسا لکھنا صحیح معلوم ہوتا ہے—

فقیہانۂ طریق سخن میں خدا ارحم الرحمین اور قہار و جبار ہے-لیکن فلسفی طبع فردوسی شاھنامہ کے پہلے صفحہ کیا بلکہ پہلے شعر میں خدا کو خداے جان و خرد کہتا ہے جو نام و مقام سے بر تر ہے اور جس تک پیک تخیل کو رسائی نہیں-حمد کے بعد دیباچہ کا دوسرا زینہ ستایش خرد ہے "اول ماخلق اللہ العقل" اگرچہ حدیث نبوی بتائی گئی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ فلاسفہ کا ایک مسئلہ ہے-فردوسی کے نزدیک عقل آفرینش کا پہلا گوہر ہے -

ع- نخست آفرینش خرد را شناس

اس خیال میں مولانا نظامی گنجوی بھی فردوسی کے ہم زبان ہیں- چنانچہ سکندر نامۂ بحری میں کہتے ہیں—

نخستیں خرد را پدیدار کرد　　ز نور خودش دیدہ بیدار کرد

خرد فردوسی کا قول ہے ایک بہترین خلعت ہے جو خدا نے انسان کو عطا کیا ہے- اس سے کونین میں انسان کی آبرو ہے-خرد کے بعد فردوسی روح کے ذکر میں مشغول ہے اور یہ ظاہر ہے کہ عقل کلی اور نفس کلی فلاسفہ میں بحث و جدال کے وقیع مضمون رہے ہیں-بواطنہ کے ہاں بھی یہ مسائل ان کےفلسفہ کے

اصل الاصول هیں —

آفرینش کا بیان جو فردوسی دیتا ہے وہ حکماے یونان کے خیالات سے ملتا جلتا ہے۔ ابتدا میں کچھ نہیں تھا۔ نیستی سے خدا نے ہستی کی تخلیق کی۔ آغاز میں ایک جنبش ہوئی جس سے آتش پیدا ہوئی حرارت سے خشکی ظاہر ہوئی۔ سکون سے سردی نے ظہور پایا اور سردی سے تری کی تولید ہوئی ان سے عناصر کی ولادت ہوئی۔ ایک آتش بلند ہوئی جس نے آسمانوں کو تو بر تو اور متحرک قائم کیا۔ دوازدہ بروج اور سبعہ سیاروں کو افلاک پر جگہ ملی۔ آگ بلند ہوئی باد و آب نے درمیان میں اور خاک نے سب سے نشیب میں مقام پایا۔ زمین ایک تاریک اور سیاہ مرکز تھا۔ آفتاب اس کے گرد گھومنے لگا۔ پہاڑ نمودار ہوئے۔ پانی کے چشمے ابلے۔ دریا و کوہ و دشت و راغ سے زمین روشن چراغ کی طرح معلوم ہونے لگی جمادات کے بعد نباتات نے بروز کیا۔ گیاہ اور مختلف نوع کے درختوں نے بالیدگی شروع کی۔ ان کا سر نشیب میں ہے اور متحرک نہیں ہیں اور نہ بالیدگی کے سوائے کوئی اور وصف ان میں موجود ہے۔ اب جنبش کرنے والا یعنی حیوان سطح پر نمودار ہوا جو عالم نباتات پر متصرف ہوا۔ اس کا خاصہ یہ ہے کہ درخت کی طرح اس کا سر زمین میں نہیں ہے۔ اس کو کھانے۔ سونے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے اور یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے اور نہ خدا اس سے عبادت چاہتا۔ لیکن آفرینش کا سب سے قیمتی اور آخری رکن انسان ہے اس کا قد راست ہے۔ نطق اور عقل دونوں اس کو عطا ہوتے ہیں دد و دام اس کے مطیع ہیں۔ تخلیق انسان کے غایت کے سوال کو فردوسی خود چھیڑتا ہے اور کہتا ہے —

مگر مردمی خیرہ دانی ہمی — جز ایں را نشانے ندانی ہمی

ترا از دوگیتی برآوردہ اند — بچندیں میانجی بپروردہ اند

نخستیں فطرت پسیں شمار — توئی خویشتن را بہازی مدار

کیا بشریت ایک بیکار شے ہے اور بس! نہیں اے انسان دونوں جہان میں تجھ کو شرف دیا گیا ہے اور متعدد وسائل سے تیری پرورش کی گئی ہے۔ آفرینش کی سب سے اول مگر شمار میں سب سے آخری مخلوق اے انسان تو ہے! تو اپنے آپ کو مہملات میں ضائع مت کر۔۔

چونکہ بعض فلسفیانہ معتقدات کی رو سے انسانی مقدرات کی عنان مدبران فلکی کے سپرد کی گئی ہے اس لئے تخلیق انسان کے بعد فردوسی کو ہم افلاک کے ذکر میں مشغول دیکھتے ہیں۔ حکیم طوس ان معتقدات کو دھراتے ہوے گویا ہے "اس تیز گھومنے والے گنبد کو دیکھو جس سے سب کو درد و درمان تکلیف اور آسایش ملتی ہے۔ کسی وقت گردش سے اسے قرار نہیں ہے اور نہ ہماری طرح تباہی پذیر ہے۔ ہمارے مقدرات کے خیر و شر سے وہ باخبر ہے" —

نگہ کن بریں گنبد تیز گرد   کہ درمان ازویست وزویست درد
نہ ازگردش آرام گیرد ھمی   نہ چون ما تباھی پذیرد ھمی
ازو داں فزونی ازوداں شمار   بد و نیک نزدیک او آشکار

ان معتقدات کی معلوم ایسا ہوتا ہے کسی معترض نے تردید کی ہے۔ اعتراض غالباً نظم میں اور حاشیہ پر ہوگا۔ اس میں سے صرف ایک شعر جو غلطی سے متن میں داخل کرایا گیا ہے ابتک موجود ہے۔ جو یہ ہے —

زیاقوت سرخ است چرخ کبود   نہ از آتش و آب، نزباد و دود

یاد رہے یہ شعر اسلامی نقطۂ نگاہ سے ہے لیکن معلوم رہے کہ فردوسی کے لئے کسی ایسے اعتراض کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ خود ان عقائد کی شاھنامہ کے دوران میں ایک سے زیادہ موقعہ پر تردید و تکذیب کرتا دیکھا جاتا ہے

آسمان کی دورنگی۔ دنیا کی بیمہری اور زمانہ کی بیوفائی جسطرح اور شعرا میں ہے فردوسی کے ہاں بھی ایک مقبول موضوع رہا ہے جسکو وہ اپنی تصنیف کے دوران میں کہیں فراموش نہیں کرتا۔ ہم اپنی بداعمالیوں کا الزام

شیطان کی سر تھوپتے ھیں۔اسی طرح وہ ناگوار واقعات جو ھماری دسترس سے باھر ھیں اور ھمپر گذرنے ھیں تقدیر کے حوالہ کئے جاتے ھیں۔فردوسی جس لئے ھماری طرح شخصی سلطنتوں کی آب وھوا اور استبداد کے سایہ میں پرورش پائی تھی سلطنت کی تعدی۔اکابر کے مظالم اور اس قسم کے دیگر واقعات کو آسمانی تعدی سے تعبیر کرتا ھے-مزید براں اجرام فلک کی عالم سفلی پرتاثیرات کا عام عقیدہ اور تنجیم کی مشرقی ممالک میں عالمگیر مقبولیت اور ایسے اسباب ھوگئے تھے جنھوں نے اس فلسفہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں آسمان مختار کل اور فاعل مطلق تسلیم کرلیا گیا ھے۔واقعات خیر و شر-کمال و نقصان۔ عسرت وآرام-درد و درمان سب افلاک کے علم اور انکے قبضۂ قدرت میں مان لئے گئے تھے

یہ عقیدہ اصل میں ایرانی ھے-فارسی نظم میں اس کے جراثیم کی سراغ رسی رودکی کے عہد تک کیجا سکتی ھے۔اس عقیدہ کی رو سے آسمان نہ تباھی پذیر ھے اور نہ توالی حرکت سے خستگی محسوس کرتا ھے اور نہ مرور ایام سے فرسودہ ھوتا ھے-معلوم ایسا ھوتا ھے کہ بعد میں اسی قسم کے اور اعتقادات اس میں منضم ھوگئے ھیں جن میں دنیا یا زمانہ فاعل کل اور مختار مطلق مانے گئے تھے-فردوسی کے ھاں یہ سب اعتقاد مخلوط شکل میں ملتے ھیں-ان تمام کی علیحدہ علیحدہ مثالیں دینا مضمون کو طوالت دینا ھے-میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ھوں--

اگر با تو گردوں نشیند براز — نیابی ھم‌از گردش او جواز
ھم او تاج و تخت بلندی دھد — ھم او تیرگی و نژندی دھد
بدشمن ھمی ماندوھم بدوست — گھے مغز یابی ازو گاہ پوست
سرت گربساید بابر سیاہ — سرانجام خاکست ازو جایگاہ

(صفحہ ۵۲)

دیگر جهانوا زکردار بدشرم نیست کسے را بنزدیکش آزرم نیست

همیشه بهر نیک وبد دسترس ولیکن نجوید خود آرام کس

یہ عقائد شاهنامه میں بالعموم هر مقام پرپائے جاتے هیں اور اس کے اتباع میں تمام ایرانی شعرا میں یه بدعت مقبول هوگئی هے۔ لیکن تعجب سے دیکھا جاتا هے کہ متعدد مقامات پر فردوسی ان اعتقادات کے بطلان و تکذیب میں سر گرم هے۔ اس کے اسلامی معتقدات هی غالب هے اس امر کے معرک هوے هوں گے چنانچه کیکاؤس کے ذکر میں کہتا هے -

گمانش چنان بد که گردان سپهر بکینی مر او را نمود است چهر

ندانست کیں چرخ را پایه نیست ستاره فراوان و ایزد یکیست

همه زیر فرمانش بیچاره اند چه با سعد و نحس اند و سیاره اند

اسی قسم کا بطلان ایک اور موقع پر مشاهده میں آتا هے جهاں شاعر کہتا هے -

یکے دائره آمده چنبری فراواں در آں دائره داوری

اگر چرخ را هست ازیں آگهی همانا که گشتست مغزش تهی

چناںداں کزیں دانش آگاه نیست بچون و چرا سوے او راه نیست

یزد جرد خاتم تاجداران عجم کے قتل کے وقت فردوسی گویا هے —

ز خاک آمد و خاک شد یزد جرد چه گوئی تو زیں بر شده هفت گرد

چو از گردش او نیابی رها پرستیدن او نیارد بها

بیزداں گراے و بد و کن پناه خداوند گردون و خورشید و ماه

کسی اور مقام پر شاعر آسمان کو خطاب کر کے شکایت میں گرم سخن هے —

الا اے برآورده چرخ بلند چه داری به پیری مرا مستمند

چو بودم جواں بر ترم داشتی به پیری مرا خوار بگزاشتی

بکردار مادر بدی تا کنوں همی ریخت باید برنج تو خوں

وفا و خرد نیست نزدیک تو پر از رنجم از راے تاریک تو

مرا کاش هرگز نه پروردهٔ چو پرورده بودی نیازردهٔ

بدانگه کزین تیرگی بگذرم	بگویم جفاے تو یاد آورم
بنالم ز تو پیش یزدان پاک	خروشان بسر بر پراگنده خاک
چنین داد پاسخ سپهر بلند	که اے مرد گوینده بیگزند
چرا بینی از من همی نیک و بد	چنین ناله از دانشی کے سزد
تو از من بهر بارهٔ بهتری	روانرا بدانش همی پروری
خور وخواب وراے نشستن تراست	به نیک و به بد راه جستن تراست
برین هرچه گفتی مرا راه نیست	خورو ماه زین دانش آگاه نیست
من از آفرینش یکے بنده ام	پرستندهٔ آفریننده ام
نگردم همی جز بفرمان اوے	نتابم همی سر ز پیمان اوے
ازان خواه راحت که اين آفرید	شب و روز و آئین و دین آفرید
چگوید بباش آنچه خواهد بد است	کسے کو جزین داند او بیهوده است
یکے آنکه هستیش را راز نیست	بکاریش فرجام و آغاز نیست
جز او را مخوان کردگار سپهر	فروزندهٔ ماه و ناهید و مهر
بیزدان گراے و بیزدان پناه	بر اندازه رو هرچه خواهی بخواه
وزو بر روان محمد درود	بیارانش بر هر یکے بر فزود

یه اشعار فردوسی کے فلسفه اور اس کے مذهب کے لب لباب هیں- فلسفه سے ذوق فردوسی کو اگرچه بے حد هے لیکن ایسا معلوم هوتا هے که فلسفه کسی وقت بھی اس کو پوری تسلی اور اطمینان نهیں دے سکا —

جب هم شاهنامه کھولتے هیں اور تمهید میں ایسے بیانات مثلاً ستایش خرد ـ ستایش روح - بیان آفرینش - جمادات - نباتات - حیوانات - انسان - افلاک ـ آفتاب و ماهتاب پڑھتے هیں تو ایسا معلوم هوتا هے که افلاطون اور ارسطو کا شاگرد جو یونان کے دبستان کی تمام روایات سے بخوبی ماهر هے حکمت و فلسفه کی نکات کی فارسی زبان میں ترجمانی کر رها هے لیکن جوں جوں شاهنامه کی

منازل قطع ہو کر عروج ہوتی ہیں۔ یونانی فلسفی برف کے تودے کی طرح تابش آفتاب سے گھل کر غائب ہو جاتا ہے اور اس کے بجائے حقیقی فردوسی نمودار ہوتا ہے جو یاس و قنوط اور الم پرستی کے اثرات میں بالآخر حکمت سے احتراز کر کے مذہب کی آغوش میں اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے —

حکمت سے فردوسی کی رو گردانی کے دو بڑے وجوہ معلوم ہوتے ہیں پہلا ہستی واجب الوجود جس میں اکثر فلاسفہ کو کلام رہا ہے۔ شاعر کسی فلسفی کو خطاب کر کے کہتا ہے —

کہ تم جو ہر شے پر عقل کی عینک چڑھا کر نظر ڈالتے ہو یہ سلوک واجب الوجود کے ساتھ مناسب نہیں۔ گفتگو اور بحث تو کبھی ختم نہیں ہو سکتی لیکن اگر تم معقول پسند ہو تو راہ راست پر چلو اور مانو کہ ہماری دانش بیچارگی ہے اور خدا کی ذات ہماری سرحد ادراک کے ماوراء ہے۔ بس اسی قدر جاننا کافی ہے کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ تم اپنی ذات کو بہت دور کھینچتے ہو لیکن یاد رہے کہ طرفۃ العین میں روح اور جسم میں مفارقت ہو جاتی ہے۔ زمانہ فلکی ہے اور تمہارا اصلی ٹھکانہ کوئی اور مقام ہے۔ سب سے مقدم تم خدا کی یاد کرو اور اس کی پرستش کرتے رہو جس سے افلاک قائم ہیں اور جو نیکی کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے —

ایا فلسفہ دان بسیار گوے	نپویم براہے کی گوئی بپوے
ترا ہرچہ بر چشم بر بگذرد	بگنجد ہمی در دلت با خرد
چنا نداں کہ یزداں نیکی دھش	جز آنست وزیں بر مگر داں منش
تو گرسفتۂ راہ سنجیدہ پوے	نیاید بہ بن ہرگز ایں گفتگوے
ہمہ دانش ما بہ بیچارگی است	بہ بیچارگاں بر بباید گریست
ہمیداں تو لو واکہ ہست و یکے است	ووانو خرد را جزیں راہ نیست
بیکدم زدن رستی از جان و تن	ہمی بس بزرگ آیدت خویشتن

همی بگذرد بر تو ایام تو — سرای جز این باشد آرام تو
نخست از جهاں آفریں یاد کن — پرستش برین یاد بنیاد کن
کزو یست گردوں گرداں بپاے — هم او یست بر نیکوئی رهنماے

کسی اور موقع پر فردوسی پھر یہی گفتگو دوهرا رها هے اور کہتا هے که واجب الوجود کی هستی میں نزاع کرنا اگر سوچو گے تو بے کار هے۔ پروردگار تمهارا خدا هے اور تم اس کے بندے هو نه وہ کهاتا هے نه وہ سوتا هے۔ کور دل اور بے خرد هی اس کی هستی کے معترف نه هوں تو نه هوں مگر دانا ان کو انسان نہیں مانیں گے۔ تم اپنی دانش کے اعتماد پر اپنے آپ کو ضلالت کے گڑھے میں نه ڈالو کیونکه اس کی هستی کی علامات اور آیات آب و خاک اور هر شے سے هویدا هیں۔ وہ دانا توانا اور دارندہ هے عقل اور نفس کا نقش بند وهی هے۔ جهان۔ مکان و زماں اس کی مخلوق هیں۔ وهی پیل و پشه کا خالق اور خورشید و ماہ کا خداوند هے جو ظفر اور قدرت عطا کرنے والا هے۔ راستی اور هستی کا مالک۔ کمی اور افزونی کا ظهور پیرا۔ کامیاب بنانے والا۔ مهربان جو هم کو رزق دیتا هے در آنحالیکه هم سے بے نیاز هے۔ عالم اور آفتاب۔ زهرہ اور آسمانوں کا خداوند جس کی راے اور حکم کے سوا همارے لئے کوئی اور راسته نہیں هے —

کنوں اے خردمند بیدار دل — مشو در گماں پاے در کش ز گل
چو گردن باندیشه زیر آوری — ز هستی مکن پرسش و داوری
ترا کردگاریست پروردگار — توئی بندۂ کردۂ کردگار
نشاید خور و خواب با او نشست — که خستو نباشد بیزداں که هست
دلش کور باشد زباں بیخرد — خرد مندش از مردماں نشمرد
ز هستی نشانست بر آب و خاک — ز دانش مکن خویشتن در مغاک
توانا و دانا و دارندہ اوست — خرد را و جانرا نگارندہ اوست
جهاں آفرید و مکان و زماں — پے پشۂ خورد و پیل ژیاں

خداوند کیوان و خورشید و ماہ　　کزو یست پیروزی و دستگاہ
خداوند هستی و همراستی　　ازو یست بیشی و همکاستی
خداوند بخشندۂ کارساز　　خداوند روزی دہ بے نیاز
خداوند گیتی خداوند مہر　　خداوند ناهید و گردان سپہر

جز از رائے و فرمان او راہ نیست
خور و ماہ ازیں دانش آگاہ نیست

کشیدگی کا دوسرا باعث یہ ہے کہ فردوسی زندگی کے روز مرہ کے واقعات نیکی۔بدی۔راحت و آرام۔بد بختی و نیک بختی۔داد و بیداد الغرض ہر سوال کا جواب فلسفہ سے مانگتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ فلسفہ ہر شے اور ہر واقعہ کا علت و معلول بتا وے۔مثلاً فردوسی یزد گرد آخری تاجدار ایران کے قتل کے خونیں واقعات لکھ کر ایک گہری فکر میں مستغرق دیکھا جاتا ہے۔وہ یہ سوچ رہا ہے کہ یزد جرد کے مارے جانے کو داد کہا جائے یا ستم۔حق کہا جائے یا نا حق۔اب فلسفہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔اگر دیتا ہے تو ایسا جس سے اطمینان نہیں ہوتا اور مشکل حل نہیں ہوتی۔وہ کہتا ہے -

چنیں داد خوانیم بر یزد جرد　　وگر کینہ خوانیم زیں هفت گرد
وگر خود ندانند همی کیں و داد　　مرا فیلسوف ایچ پاسخ نداد
وگر گفت مارا سخن بستہ گفت　　بماند همی پاسخ اندر نہفت

ایسے موقعوں پر دانائے طوس مذہب کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔مثلاً داستان سہراب کی تمہید میں حسب معمول ہمارا شاعر فلسفیانہ خیالات میں مستغرق نظر آتا ہے۔اس گہری فکر کے بانی سہراب کا قتل اور اس کی بے وقت موت کے واقعات ہیں۔انپر وہ اس پیرایہ میں استدلال کر رہا ہے کہ اگر باد صرصر ترنج خام کسی درخت سے گرادے تو باد کے اس فعل کو داد کہاجاے یابیداد۔ اچھا کہا جائے یابرا۔حکمت کے اس مقولہ کو کہ اگر موت نہیں ہوتی اور سلسلۂ

توالد وتناسل یوں ہی جاری رہتا تو زمین پر بیٹھنے کیلئے کوتوکیا انسان کو کھڑے رہنے کو بھی جگہ میسر نہ آتی - فردوسی ابتدائے مراحل ہی میں تسلیم کر لیتا ہے —

اگر مرگ کس را نیوبار دے — زپیر وجواں خاک بسپار دے

اچھا اس سے یہ تو مان لیا گیا کہ موت کا وجود ضروری اور برحق ہے —

دریں جائے رفتن نہ جائے درنگ

بر اسپ قضا گر کشد مرگ تنگ

چناں داں کہ داد است و بیداد نیست

چو داد آیدش بانگ و فریاد چیست

لیکن جب موت آتی ہے تو اس آندھی کی طرح جو کچے پکے میوے کی پروا نہیں کرتی اور سب کو گراتی آتی ہے - جوان بوڑھے چھوٹے اور بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتی - مرگ اگرچہ انصاف ہے لیکن جوانمرگی بظاہر داد نہیں معلوم ہوتی - فلسفہ اس کی عقدہ کشائی سے عاجز ہے - فردوسی مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے اور مذہب اس کے کان میں کہتا ہے کہ یہ خدائی راز ہیں اور فہم انسانی سے باہر - اگر ایمان کی سلامتی چاہتے ہو تو ان وساوس کو دل میں جگہ نہ دو اور خاموش ہو رہو - اپنے دین میں خلل ڈالنا اگر منظور نہیں تو جوان اور بوڑھے کی موت میں کوئی امتیاز نہ کرو - خدا کی پرستش کرتے رہو اور اس کی جناب میں عجز و نیاز سے پیش آؤ - اپنے آخری وقت کے لئے مستعد رہو اور کوشش کرو کہ خدا تمہارا خاتمہ اسلام پر کر دے —

بریں کار یزداں ترا راہ نیست	اگر دیو با جانت انباز نیست
جوانی و پیری بنزد اجل	یکے داں چو در دیں نخواہی خلل
دل از نور ایماں گر آگندۂ	ترا خامشی بہ کہ گو یندۂ
پرستش ہماں پیشہ کن با نیاز	ہمہ کار روز پسیں را بساز

۱۹

بکیهتی در آن کوش چون بگزری
سر انجام اسلام با خود بری

شاعری اور پریاں

از

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر

ہر ملک اور ہر زبان کی شاعری کا ایک بڑا عنصر پریاں ہیں۔ سنسکرت شاعری اپسراؤں کے تذکروں سے بھری ہوئی ہے۔ جو ہندو دیو مالا کی پریاں ہیں۔ کالی داس نے سکنتلا کی ماں ایک آسمانی پری کو بتایا اور اس کا دوسرا ڈراما "وکرم اروسی" اسی خوبصورت و دلربا مخلوق کا دلکش افسانہ ہے۔ ہومر نے اپنی مثنویوں میں پریوں کے واقعات تاریخ کے عنوان سے بتائے ہیں۔ شیکسپیر نے اپنے مشہور ڈراما "مڈسمر نائٹس ڈریم" میں پریوں کے حلقہ باندھ کے ناچنے کا سماں دیکھا ہے۔

عربوں کی جاہلیت کی شاعری اگرچہ قومی مفاخر، فیاضی و شجاعت کی تعریف۔ امرا کی مدح سرائی۔ اظہار عشق اور عزیزوں و دوستوں کی لاشوں پر مرثیہ خوانی تک محدود تھی مگر اس پر بھی وہ جنوں اور پریوں کے تذکرے سے خالی نہیں ہے۔ عربوں کو بنی اسرائیل کی کتابوں اور اپنی قدیم روایتوں سے حضرت سلیمان کا جنوں اور شیطانوں۔ عفریتوں اور پریوں پر حکومت کرنا معلوم ہوا تھا اور یقین رکھتے تھے کہ ملکہ بلقیس جو حضرت سلیمان سے ملنے کو گئی ایک پری کی بیٹی تھی۔ اسلام نے اس خیال کی ایک حد تک تائید کی۔ چنانچہ ان کی "الف لیلہ" پریزادوں اور جنوں کے واقعات سے

بھری پڑی ہے-رہی فارسی شاعری وہ تو گویا پریوں ہی کا حسن و جمال ظاہر کرنے کے لئے بنی تھی—

قدیم الایام میں ایسی مافوق الفطرت مخلوق کا یقین اس قدر غالب تھا کہ مذاہب میں سے شاید کوئی نہ ہوگا جس نے ایسی ہستیوں کے وجود کو تسلیم نہ کرلیا ہو چنانچہ ہندؤں کی اپسرائیں فارسیوں کی پریاں اور عربوں کے جن و عفریت سب نے مذہب کے آغوش میں نشو و نما پایا ہے-حضرت مسیح جنوں کو اتارا کرتے-اور عربوں کا عقیدہ تھا کہ اکثر بیماریاں جنوں کے چھو جانے یا سایے سے ہوتی ہیں—

جن ہوں یا دیو و پری ان کی نسبت عام یقین ہے کہ مادی انسان اور روح خالص کے درمیان ایک مخلوق ہیں-مادی جسم رکھنے کے ساتھ قادر ہیں کہ اپنے آپ کو غیر مرئی بنادیں یعنی نظروں سے غائب ہو جائیں-حیوۃ الحیوان میں ان کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ "ہوائی جسم ہیں جو مختلف صورتوں میں نمودار ہونے پر قادر ہیں-ذی عقل و صاحب فہم ہیں اور ایسے دشوار کام کرسکتے ہیں جو اوروں سے نہیں ہو سکتے-" اس کے علاوہ ان کے یہ خصوصیات بھی مانے جاتے ہیں کہ وہ ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں اور کوئی مقام کیساہی مخفی و محفوظ اور مقفل و مسدود ہو اس میں پہونچتے یا نفوذ کرجاتے ہیں-کبھی آسمان کے قریب ہوتے اور کبھی تحت الثریٰ کی سیر کرتے ہیں-خلاصہ یہ کہ انسانی خیال کے پروں سے اڑتے ہیں اور جہاں تک ہمارا خیال جاتا ہے وہاں تک ان کی بھی رسائی ہو جاتی ہے-یورپ میں یہ خیال بھی تھا کہ وہ سبز پوش رہتے ہیں ان کے رہنے کے مقامات وہ ہیں جہاں انسان نہیں رہتا یا نہیں پہونچ سکتا-خاموش صحرا-اجاڑ کھنڈر-گھنے جنگل-سنسان مرغزار-پہاڑوں کی خاموش گھاٹیاں سب ان کے مسکن ہیں—

ہندؤں کی اپسراؤں کا نشیمن پہلے آسمان کا کوئی حصہ ہے-ایرانیوں کے

پریزاد پہاڑوں خاصتاً کوہ قاف کی وادیوں میں رہتے ہیں۔غالباً انہیں سے یہ خیال عربوں میں پہونچا اور ان کے پریزاد کوہ قاف سے آکر بحر قلزم اور خاموش دشت ہائے عرب کی سیر کرنے لگے—

مجوس میں یزدان پاک نہاد کے مقابل اہرمن ناپاک سرشت اور اس کی فوج کے لوگ تھے۔جو اگرچہ بد صورت تھے مگر ان کی شان یہی تھی کہ جب چاہتے نظر کے سامنے آتے اور جب چاہتے غائب ہو جاتے۔مگر مذاہب اہل کتاب میں وہی اہرمن اور اس کی فوج والے جن و شیاطین کے لقب سے یاد کیے گئے اور ان کی نسبت یہ عقیدہ قائم ہوا کہ خدا کے رقیب اور اس کی برابری کا دعویٰ کرنے والے نہیں اسی کے مخلوق ہیں لیکن برگشتہ ہو کر اس کی خوشنودی کے خلاف کام کرنے لگے اور اس سے لڑنے کو تیار ہو گئے۔جس لڑائی اور سرداران و عساکر شیاطین کا نہایت ہی دلچسپ تماشہ ملٹن نے اپنی "پیراڈائز لاسٹ" میں دکھایا ہے—

اسی شان کے مخلوق قرآن میں جن بتائے گئے اور ان کی سرشت آتشی بیان کی گئی جس سے ابتدائے تخلیق عالم ارضی کی یہ تاریخ مدون ہوئی کہ دنیا میں انسان سے پہلے جن رہتے تھے۔آدمی تو خاک سے پیدا ہوا ہے مگر وہ آگ سے پیدا کیے گئے تھے۔انسان دنیا میں آیا تو زمین کے آباد اور اچھے حصوں پر قابض ہوگیا اور جنوں کو پہاڑوں اور دور و دراز صحراؤں میں اسی طرح بھگا دیا جیسے آریہ لوگوں نے ہندوستان میں آکے پرانے مجہول النسب رہنے والوں کو مار کے بھگا دیا تھا اور جیسے آریہ لوگوں نے مغلوب مفتوحوں کو راکشس اور شودر کے لقب دیے تھے ویسے ہی مسلمانوں نے ان جنوں کو شیطان قرار دیا۔مگر ان کے عقائد کی رو سے وہی جن شیطان تھے جو برے اور کافر ہوں۔مسلمان جن جن ہی کہلاتے رہے—

اجنہ کے آتشیں نژاد ہونے کی بنا پر لوگ اپنے پرانے عقیدے اور قیاس سے

کام لے کر اس تحقیق کو پہونچے کہ آگ میں دو چیزیں ہیں ایک شعلہ اور دوسرے دھواں لہذا شعلے سے جو پیدا ہوئے وہ پریزاد اور جن ہیں اور دھویں سے جو پیدا ہوئے وہ دیو و عفریت ہیں۔دیو کا لفظ ہندؤں میں عنصر الہی کا ایک مظہر مانا جاتا تھا۔فارسیوں نے اس کو شیطان کے مرادف تصور کیا یا بنا دیا اور بعد والوں کو ان کے حلیے سے ایک دودی مخلوق بتانے کا موقع مل گیا—

بعد ازاں فارسیوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جنوں اور دیووں دونوں میں نر و مادہ ہوتے ہیں۔جنوں کے نر پریزاد اور ان کی مادائیں پریاں ہیں اور دیووں کے نر دیو اور مادائیں دیونیاں ہیں پھر مذھب کی مساعدت سے یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ پریزاد اور جن عموماً نیک ہوتے ہیں۔ان میں سے اکثر بڑے دیندار ہیں اور انسانوں کو بہت کم ستاتے ہیں اور دیو عموماً برے ہوا کرتے ہیں جو آدمیوں کو ستاتے مارتے اور ھڑپ کرجاتے ہیں۔اسی مناسبت سے انسانی خیال کے مہیب تر خط و خال اور پہاڑوں کے ایسے قد و قامت ان کی طرف منسوب کئے گئے۔پھر ھندوستان میں یہ خیال قائم ہوا کہ جن و پری حاکم ہیں اور دیو ان کے غلام جو اکثر کہاروں کا کام دیتے ہیں۔یعنے پریوں کے تختوں کو کندھے پر رکھہ کے اڑتے پھرتے ہیں اور جہاں وہ حکم دیں لے جاتے ہیں—

عرب میں یہ عام خیال تھا کہ جنوں میں بغیر پروں کے اڑنے کی طاقت ہے۔وہاں وہ صرف روحانی قوت یا آتشی فطرت بلند پروازی سے بغیر پروں کے اڑتے تھے۔مگر ایران کے دیوو پری پردار تھے اور پروں کی مدد سے اڑتے تھے ھندوستان کی اپسراؤں کی شان سب سے جدا ہے۔ان کے لباس میں اڑنے کی قابلیت ہوتی ہے۔چنانچہ وہ اپنی ساریوں کی مدد سے اڑا کرتی ہیں۔اگر کوئی ان کی وہ ساری چین لے تو پھر ان میں اڑنے کی مطلق طاقت نہیں رہتی—

ایران میں جس طرح دیووں کی نسبت انتہا سے زیادہ بد صورتی مانی جاتی اور اُن کے ڈراونے شکل و شمائل تصور کئے گئے ہیں ویسے ہی پریوں کی نسبت خیال ہے کہ وہ انسانی خوبصورتی کا مکمل ترین نمونہ- بنی آدم کی عورتوں سے مافوق الفطرت حسن رکھنے والی اور جنت کی حوروں کے مثل نہیں تو ان سے ماتی جلتی ہیں--اس کے ساتھہ ہی یہ بھی مانا جاتا ہے کہ پریاں کبھی انسانوں پر عاشق ہو جاتی ہیں اور جن و پریزاد کبھی آدمیوں کی عورتوں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں -

تاریخ کے ابتدائی واقعات ایسے حوادث سے بھرے پڑے ہیں کہ انسان شہزادوں اور شہزادیوں کے ساتھہ پریوں اور جنوں کے نکاح ہوئے- ان سے اولادیں پیدا ہوئیں--اسی خیال پر بہت سے نثر قصوں اور مثنویوں کی عمارت قایم کی گئی اور پھر اسی کی بدولت حسن وعشق کی دنیا اور ہماری شاعری میں جان پڑی اور غیر معمولی جوش و ولولہ پیدا ہو گیا --

یہ عقیدہ اگرچہ آب وہم وخیال ہوتا جاتا ہے مگر عوام الناس کی بہت بڑی تعداد آج تک اس کو ایک دینی اعتقاد کی شان سے مان رہی ہے- جس نے عاملوں اور ملا سیانوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا ہے جو اپنے عملوں- تعویذوں اور فلیتوں (معاف فرمائیے اگرچہ صحیح فتیلہ ہے مگر میں اس موقع پر فلیتہ ہی کو صحیح سمجھتا ہوں) سے جنوں کو جلاتے- پریوں کو شیشہ میں اُتارتے اور دیووں کو باندھ کے مارتے ہیں- چنانچہ یہ فن ایک اچھا ذریعۂ معیشت بن گیا ہے —

مگر مجھے ان عاملوں سے تعلق نہیں- میں تو فقط یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس مافوق العادت مخلوق نے ہماری شاعری پر کیسا اور کتنا اثر ڈالا —

ہمارے یہاں عربی الفاظ کی طرح عرب کے اجنہ و شیاطین اور عفریت بھی ایران ہوتے اور فارسی شاعری کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے آئے- پھر هندوستان میں پہونچ کر انہوں نے سنسکرت اور هندی مذاق کا لباس پہنا —

عرب کی شاعری میں بجز جابجا اس مضارق کا نام آجانے اور اُن کے برے یا بھلے کرشموں کی طرف اشارہ ہونے کے کوئی منظوم قصہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ کتاب "حیوۃ الحیوان" میں دمیری نے جنوں کا حال بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔آیات قرآنی اور احادیث اور رطب ویابس روایتوں سے ان کے ہونے کا ثبوت دے کر مختلف واقعات بیان کئے ہیں۔اِس کے بعد فارسی میں اِن دیکھتے دیکھتے غائب ہو جانے والوں کے واقعات پر خوب خوب دادِ سخن دی گئی ہے۔اور یہ ہونا بھی چاہئے تھا اس لئے کہ پریوں کا خاص وطن کوہ قاف تھا جو ہمیشہ ایرانیوں کے زیرِ اثر رہا اور ایرانیوں کے دماغوں پر یہ مہیب وعالی شان سلسلۂ کوہ مدت ہائے دراز سے اثر ڈالتا رہا تھا۔کوہ البرز کی چوٹی ان کے حوصلوں کی منتہی رہی۔ان کا سیمرغ اسی پہاڑ میں رہتا تھا۔ ان کی پریاں قاف کی انہیں وادیوں اور بلندیوں سے اڑ اڑ کے آیا کرتی تھیں جہاں سمجھا جاتا تھا کہ ایک نہایت ہی دلکش ونزہت بخش جنت پہاڑوں کے آغوش میں دور تک پھیلتی چلی گئی ہے۔اور اسی حسن خیز سرزمین نے شاید انہیں عالم آشوب حسن بھی عطا کردیا ہے —

عربوں کے جنوں اور عفریتوں کے جسموں میں زندگی بخش سواد عجم میں پہونچتے ہی پر نکل آئے۔اِس لئے کہ پروں کو وہ وہاں سے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے اور غالباً ان کی مادائیں بھی اتنا حسن وجمال لے کے نہیں آئی تھیں۔ گرجستان اور خلخ کے حسن نے جو ایرانیوں کی جان تھا پریوں کو اپنے حسن کا لباس پنہایا تو عفریت ہائے عرب کے جسم کوہ البرز کے دامن میں نشوونما پا کے ان پہاڑوں ہی کے ایسے قدوقامت نکال لائے اور اُن کی بدصورتی انتہائی کمال کو پہونچ گئی —

فردوسی نے دیووں کے خصوصیات اور حلیے رنگوں کے لحاظ سے قایم کئے۔ سفید دیو رستم سے اُس کی ہفتخواں میں لڑا۔ کالے دیو ایرانیوں میں علی العموم

ہوتے تھے۔چنانچہ دیووں سے بد صورتی وہیبت ناکی کی اور پریوں سے حسن وجمال کی تشبیہہ میں کام لیا جانے لگا۔میرا خیال ہے کہ پریوں میں رنگوں کے لحاظ سے امتیاز ہونا بھی ایرانیوں ہی کی جدت طرازی ہے۔ہمارے یہاں کی لال۔سبز۔زرد۔نیلم پریاں ان رنگوں کی آب وتاب دکھاتی ہوئی ایران سے آئی ہیں۔ہندو دیومالا اور شاعری میں پریوں کی اس بوقلمونی کا کہیں پتہ نہیں مگر باوجود اس کے فارسی کی قدیم مثنویوں میں سے بہت کم صرف پریوں کے حالات اور ان کے حسن و عشق کے افسانے ہیں۔ضمناً اُن کا تذکرہ بے شک آگیا ہے۔ ایرانی جاہل مردوں اور عام عورتوں میں آج تک رنگین پریوں کا خیال کثرت سے پھیلا ہوا ہے اور ایک دینی عقیدے کی شان رکھتا ہے۔۔

محمود غزنوی کے جھنڈے کے ساتھ یہ جن و دیو و پری ہندوستان میں آکر یہاں کی اپسراؤں۔دیوتاؤں اور راکشسوں سے ملے۔فارسی مثنویوں۔عام نظموں اور نثر قصوں کی پریاں ہر طرف پھیل گئیں اور اردو زبان کی ابتدائی پرورش کہنا چاہئیے کہ خاص پریوں کے گود میں اور دیوؤں کے کھلانے بہلانے سے ہوئی۔۔

شاعری خیال آفرینی کا نام ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ خیال آفرینی کو جتنا انس خیالی اور خیال کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے ہوتا ہے واقعی اور محسوسی چیزوں سے نہیں ہوتا۔فلسفۂ تحقیق سے اس کو وحشت ہوتی ہے اور اس کے تمام قویٰ کمزور پڑ جاتے ہیں۔جس طرح مچھلی پانی سے نکل کے زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح شاعر کی زندگی بھی اسی وہمی و خیالی عالم تک ہے جس میں پریاں اڑتی پھرتی ہیں۔دیو آآ کے مقابلہ کرتے اور لڑتے ہیں۔

چنانچہ کسی زبان کی شاعری نہیں جس میں اس قسم کے خیالی مخلوقات سے جان نہ پڑی ہو۔اردو عہد جدید میں پیدا ہوئی اور اس کا نشو و نما ایسے زمانے میں ہوا جب کہ یہ خیالی کھلونے دنیا کے ہاتھ سے چھینے جاتے ہیں۔تحقیق

و واقعیت کا دور ختم ہو گیا اور ہر بات کی دلیل پوچھی جاتی اور ہر واقعہ کا ثبوت طلب کیا جاتا ہے۔ایسے زمانے میں دیو و پری کا وجود اگر غلط نہ بھی ہوا تو ان میں وہ اگلی قوت و توانائی نہیں باقی رہی اور جس حد تک ان خیالی ہستیوں کا زور ٹوٹتا گیا اسی قدر شاعری کا مزہ بھی پھیکا پڑتا گیا اور پڑتا جاتا ہے —

مگر باوجود زمانے کی نا مساعدتی کے اردو شاعری نے اپنے ابتدائی عہد کے ذوق و شوق میں اِن آتشی مخلوقوں سے کم فائدہ نہیں اُٹھایا۔ولی سے میر صاحب کے عہد تک بعینہ فارسی کی پریوں اور ایران کے دیوں سے تشبیہہ و استعارے کا کام لیا جاتا رہا اور عشق کی شمع ہمیشہ اِن آتشیں پیرھنوں کے شعلۂ رخسار سے روشن کی گئی —

بعد ازاں مثنویوں کی تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا تو خیال آرائی نے دیو و پری سے بہت زیادہ کام لیا۔سب سے پہلے مثنوی سحرالبیان لکھی گئی تو اُس میں شاھزادی بدر منیر کی رقیب ایک پری دکھائی گئی۔اِس کے چند روز بعد لذت عشق نام ایک مثنوی شایع ہوئی تو اُس میں بھی ایک پری ھی کے ذکر سے گرمی عشق پیدا کی گئی۔پھر مثنوی گلزار نسیم شایع ہوئی تو اُس میں اصلی معشوقہ پری ھی تھی۔اگرچہ یہ قصہ نثر اردو میں پہلے سے موجود تھا۔ اِس کے بعد مثنوی طلسم الفت شایقین سخن کے ھاتھوں میں آئی تو اُس میں بھی حسن و عشق کے چراغ میں شعلہ پری کی آتشیں جبیں سے روشنی پیدا کی گئی تھی۔چند روز میں اِن مثنویوں اور اِن کے ساتھ بیسیوں نثر کے قصوں اور داستاں گویوں نے سنت شعرا قرار دے دی کہ کوئی مثنوی لکھی جائے تو جب تک اُس میں پریوں اور دیویوں کا تذکرہ نہ ہو پڑھنے والوں کو مزہ نہ آتا۔

یہ سب پریاں وھی ایرانی پریاں تھیں یعنی پروں سے اُڑتی تھیں ہندو دیوتاؤں سے اُن کو کوئی تعلق نہ تھا۔اُن کے سروں پر ایرانی تاج ہوتے اور

ایرانی لباس یا هندوستان کے مسلمانوں کا لباس ہوتا۔کوہ قاف سے اُن کو خصوصیت ہوتی—

یہی پریاں کتابوں کے ورقوں اور سخن سنجوں کے دماغوں میں پھر رہی تھیں کہ واجد علی شاہ کا دور آیا اور اُردو شاعری اپنے پرانے حدود پر بہت کچھ ترقی کر آئی۔واجد علی شاہ کو بعض انگریز مصاحبوں کے خیال دلانے سے ڈراما کا شوق ہوا۔سری کرشن جی کی عاشقانہ زندگی کے پرانے ہندی ناٹک یعنی رہس نے ڈراما کا ایک خاکہ ان کی نظر میں پیش کر دیا اور خود جان عالم پیا کے نام سے کنھیا بن گئے۔اب وہ قیصر باغ اور اُس کے آس پاس کے باغوں اور کلچوں میں عاشق مزاج معشوق بنتے۔گوپیاں اور پریاں ان کے شوق میں ماری ماری پھرتیں۔کبھی وہ دھونی رما کے جوگی بنتے اور کبھی پریاں ان کے فراق میں زلفیں کھول کے اور سر پر اندوا رکھ کے جنگلوں کی خاک چھانتیں—

لیکن اسی زمانے میں ایک نامور شاعر امانت نے اردو کا پہلا ڈراما یعنی اپنی اندر سبھا تصنیف کی اور تصنیف کے ساتھ ہی وہ عام طور پر کھیلا جانے لگا۔امانت اگرچہ رعایت لفظی کے بادشاہ ہیں اور اِسی رعایت کے شوق میں بعض وقت اپنے اشعار کو غارت کر دیتے ہیں مگر اندر سبھا میں اُن کو سادی زبان اور سادہ رنگ شاعری اختیار کرنا پڑا۔مگر اُن کا سب سے بڑا کمال اِس اردو ڈراما میں یہ تھا کہ فارسی پریوں اور دیووں کو ہندو دیومالا کے مذاق کے سانچے میں ڈھال دیا۔اس مذاق کی اصلی ایجاد کا سہرا تو خود واجد علی شاہ کے سر ہے جنھوں نے بادشاہ سے کنھیا جی بن کر گویا ہندو مسلمانوں کو ہم آغوش کر دیا۔مگر امانت نے اندر سبھا میں اس امر کو نمایاں کرکے دکھا دیا کہ اب ہندوستان کے دیو پری کس شان کے ہیں —

اندر سبھا کو غور سے پڑھئیے تو نظر آئے گا کہ راجہ اندر ہندؤں کا ایک بڑا دیوتا ہے جو مسلمان بادشاہوں کے وضع و لباس میں ایرانی تاج پہنے

مغلیه دربار کے تخت پر بیٹھا ھے اور ھندو دیو مالا کے مذاق کے مطابق پریوں کا ناچ دیکھه رہا ھے-ایران کے دیووں نے ھندو راکشسوں کا حلیه اختیار کر لیا ھے جو راون کی فوج و سپاھی بنے ھوے ھیں-ایران کی پکھراج-لال-نیلم اور سبز پریاں پر لگائے اور مسلمان امیر زادیوں کا لباس پہنے اُڑنے والے تختوں یعنی ھندی اُڑن کھٹولوں پر بیٹھه کے آتی-ھندی دھنوں میں گاتی اور ھندی گتوں پر ناچتی ھیں- رھتی قاف میں ھیں اور بولتی اردو زبان ھیں-ھندستان کی مسلمان سوسائٹی کی معشوقائیں ھیں اور اردو غزلوں کے ساتھه ھندی گیت ان کے گلوں سے سنے جاتے ھیں-شاھزادۂ گلفام اپنے نام سے ایرانی-اپنی وضع سے اودھ کے خاندان شاھی اور لکھنؤ کی شیعه سوسائٹی کا شاھزادہ ھے- اس کا لال محل لکھنو کی سرخ عمارت جس میں پہلے شاھان اودھ کا تخت ھوتا اور اب عجائب خانه ھے اور اس کا شہر اخترنگر لکھنؤ ھے جس کو واجد علی شاہ کی شاعرانه خیال آفرینی نے اس نام سے موسوم کر دیا تھا—

بڑے لطف کی بات یه ھے که سبز پری رھتی کوہ قاف میں ھے اور گلفام کو اخترنگر لکھنؤ سے بلواتی ھے اور بلواتے وقت کالے دیو سے کہتی ھے که " جا تو سنگل دیپ سے اخترنگر میں ھاں "-یعنی جزیرۂ سراندیپ ھوتا ھوا جو ھندو دیو مالا کی رو سے راون کا مرکز حکومت اور ھندی مذاق کے دیووں کا نشیمن تھا—

پھر راجه اندر برھم ھوکے گلفام شاھزادے کو قید کرتا ھے تو کنوئیں میں جو چیز اگلے زمانے میں ھندوؤں کا نہیں بلکه کیانیوں اور زابلستانیوں کا قید خانه تھا-بعد ازاں سبز پری اس کے فراق میں بیتاب ھوتی ھے تو ھندوستان کی جوگن بنتی ھے جس کے چہرے اور پنڈے میں ھندوستان کی بھبوت ملی ھے-سر پر ھندوستانی الندوا ھے-زلفیں ھندوستانی جوگنوں کی جٹائیں ھیں اور کندھے پر ھندوستان کا پرانا باجا " بین " ھے اس کے نغمے میں

فارسی شاعری-ہندوستان کی موسیقی-لکھنؤ کی ٹھمریاں-ہندوؤں کی ہولیاں اور اردو اور بھاشا زبانیں ہیں اور یہ سب متباٸن الاصل چیزیں مل کے ایسی پر لطف ہوگئی ہیں کہ اس سے زیادہ بہتر مجموعہ مختلف مذاقوں کے یکجا ہو جانے کا بمشکل نظر آسکے گا—

موجودہ سرشتۂ تعلیم نئے کیمیاوی عملوں سے ان اجزا کو جدا کر کے الگ اور بے جوڑ کرنا چاہتا ہے-کمال بد مذاقی سے کوشش کی جاتی ہے کہ یہ ترکیب مٹا دی جائے اور مختلف چیزوں کے نہایت مناسبت سے گھل مل جانے نے جو خوش آہنگی اور لطیف و دلچسپ نیرنگی پیدا کردی تھی اس کو بے مزہ کردیا جاے-لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جو خوبی اس اتصال باہمی نے پیدا کی تھی وہ افتراق میں کبھی نہ نصیب ہوگی-کیونکہ ہندوستان کا موجودہ مذاق نہ اکیلا سنسکرت کا ہے نہ عربی کا-نہ فارسی ہے نہ ہندی-بلکہ ان مختلف زبانوں کی شاعری اور ان کے مذہبوں کا مجموعہ ہے—

وزن رباعی پر ایک نوٹ

از

(جناب محمد عظمت اللہ خان صاحب بی-اے)

سوال یہ ہے کہ رباعی کے لئے خاص وزن کیون معین کیا گیا اور کیا ضرور ہے که رباعی لکھی جائے تو اُس وزن کی چوبیس قسمون میں سے ھی کسی ایک یا ایک سے زیادہ بحرون (قسمون) میں لکھی جائے ؟ جستجو کے بعد بھی اِس بات کا پتہ نہیں چلا کہ کیوں ایسا کیا گیا ؟

میرا خیال یہ ہے کہ ایسا کرنے کی وجہ یہ ہوی کہ جب رباعی وجود میں آئی تو شعرا نے محسوس کیا کہ اِس صنف میں چونکہ دو بیتیں ہیں ایک ھی مضمون اِس میں زیادہ عمدگی اور وضاحت سے بندہ سکتا ہے۔لیکن بعد کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ قافیہ کی پابندی کے ساتھہ اگر رباعی کے چارون مصرعون میں ایک ھی وزن کی ایک ھی قسم یعنی ایک ھی بحر کی ھی پابندی کی جائے جیسی کہ غزل میں کی جاتی ہے اور وزن کی یکسانی کے ساتھہ اُسی وزن کی مختلف بحرون کو ایک ھی رباعی میں جایز نہ رکھا جائے تو یہ لطیف اور کار آمد صنف سخن "رباعی" ٹیڑھی کھیر ہو جائے گی۔مثلاً ایک غزل کے لئے مفاعیلن چاربار والی بحر کو ایک شاعر نے انتخاب کیا ہے تو اب شاعر مجبور ہے کہ اِس غزل کے ہر مصرع کی تقطیع مفاعیلن چاربار کے مطابق ہو۔اِسی طرح اگر رباعی صرف اس ایک ذیل کی بحر میں لکھی جائے—

مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

اور ہر مصرع کی تقطیع اسی طرح ہو تو ظاہر ہے کہ رباعی کا لکھنا بہت دشوار ہو جاتا-لہذا فطرتاً شعرا کو اِس امر پر غور کرنا پڑا کہ رباعی کے وزن میں سہولت اور وسعت پیدا کی جائے-غور و فکر کے بعد اِس حقیقت کا کھلنا دشوار نہ تھا کہ

مفعول و مفاعیل و مفاعیل و فعل

اور مفعول و مفاعیلن مفاعیلن فع کا وزن ایک ہی ہے-ہمارے عروضیوں نے پہلے تو یہ فرض کیا کہ یہ بحریں 'ہزج' کی زحافی بحریں ہیں اور زحافات کے عجیب وغریب خیالی ہتھکنڈوں سے اِس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مذکورۂ بالا دونوں بحریں دراصل ہزج کی زحافی نیرنگیاں-کتربیونت اور کاٹ چھانٹ کا کرشمہ ہے—

عروضیوں نے اِس رخ پر جب اور زور لگایا تو یہ اصول قرار دیا کہ رباعی کی بحروں کے ایک چکر کا تو مفعول اور دوسرے کا مفعولن مرکز ہے-یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے عروضیوں کو دایرے کیوں اسقدر پسند تھے بہرحال رباعی کے ہر مرکز کے گرد بارہ بارہ بحریں ترتیب دیکر دو شجرے غیر محبق اور محبق قرار دئیے-اس طرح رباعی کی چوبیس بحریں نکالیں اور اُن سب کو بلحاظ وزن یکساں مان لیا گیا-چنانچہ ایک ہی رباعی میں ان چوبیس بحروں میں سے چار مختلف بحروں میں چار مصرعے لکھے جائیں تو وزن نہیں بدلتا-مثلاً ایک رباعی کے چار مصرعے ذیل کی بحروں میں ہیں:—

(۱) مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

(۲) مفعول مفاعیلن مفعولن فع

(۳) مفعولن فاعلن مفاعیل فعل

(۴) مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

یہ رباعی بلحاظ وزن صحیح سمجھی جائیگی حالانکہ اس کے ہر مصرع میں لگھ اور گرو کی ترتیب بالکل جداگانہ ہے-اس کے لگھ اور گرو کا تجزیہ

یہ ہے:—

(۱) — — v | v — — v | v — — v | v —

(۲) — — v | v — — — | — — — | —

(۳) — — — | — v — | v — — v | v —

(۴) — — — | — v — | v — — — | —

اب اگر رباعی کے وزن اور اس کی چوبیس بحروں پر ہندی عروض کے ماترک طریقے کے لحاظ سے نظر ڈالی جائے تو رباعی کی اِن چوبیس بحروں کا ہم وزن ہونا فطرتاً ثابت ہوجاتا ہے اور زحافات کی کاٹ چھانٹ اور کتربیونت کی بے اصول قینچی کی ضرورت نہیں پڑتی اور پھر لطف یہ ہے کہ بجائے چوبیس بحروں کے رباعی کی بحروں کی تعداد دس ہزار نو سو چھیالیس تک پہونچ جاتی ہے۔ اِس تعداد سے شعرا کو گھبرانا نہیں چاہئے اِس لئے کہ وزن رباعی کی اِن بحروں کی فہرست تیار کرنی ضروری نہیں۔ ماترک اصول سے صرف شاعر کو یہ دیکھنا ہوگا کہ ہر مصرع میں بیس ماترائیں ہیں یا نہیں۔ اگر بیس ماترائیں ہوں تو پھر شاعر کو اِس کے جھمیلے میں پڑنے کی حاجت نہیں کہ لگھو اور گرو کی ترتیب کیا ہے۔ اوپر مثالاً چار مختلف بحریں دی گئی ہیں اور اِن کا لگھو اور گرو میں تجزیہ بھی کردیا گیا ہے۔ ان مصرعوں کی ماترک قیمت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ ہر لگھو ایک ماترا اور ہر گرو دو ماترا کے مساوی لیا جاتا ہے:—

(۱)
— — v | v — — v | v — — v | v —
۲ ۲ ۱ | ۱ ۲ ۲ ۱ | ۱ ۲ ۲ ۱ | ۱ ۲ = ۲۰

(۲)
— — v | v — — — | — — — | —
۲ ۲ ۱ | ۱ ۲ ۲ ۲ | ۲ ۲ ۲ | ۲ = ۲۰

(۳) — — — | — v — | v — — v | v —
۲ ۲ ۲ | ۲ ۱ ۲ | ۱ ۲ ۲ ۱ | ۱ ۲ = ۲۰

(۴) — — — | — v — | v — — — | —
۲ ۲ ۲ | ۲ ۱ ۲ | ۱ ۲ ۲ ۲ | ۲ = ۲۰

اس طرح رباعی کا وزن بیس ماترا کا ھے۔ البتہ اتنا یاد رھے کہ رباعی کی بعض بحروں کے آخر میں ایک ماترا زیادہ بھی آسکتی ھے جس کو ساقط سمجھا جائے گا۔مثلاً—

مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

کے بجائے مفعول مفاعل مفاعل فعول بھی آسکتا ھے فعول میں فعل سے ایک ماترا زیادہ ھے اس کو نظر انداز کردیا جاتا ھے—

ھمارے عروضیوں اور شعرا کا منشا یہی تھا کہ رباعی—جس کو ابتداء ترانہ کہتے تھے—کے وزن میں سہولت اور وسعت پیدا کی جائے۔صحیح اصول تو اُن کے ھاتھ نہ لگا لیکن اتنا فائدہ ضرور ھوا کہ اس وزن کی چوبیس بحریں قرار پاگئیں اور صنف رباعی ایران اور ھندستان میں مقبول عام رھی—

اول تو اِس کی کوئی معقول وجہ ھی نہیں ھے کہ رباعی کے لئے کوئی خاص وزن لازمی گردانا جائے دوسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک شاعر کی رباعیاں بلحاظ معنے ایک دوسرے سے کوئی لگاؤ اور تسلسل نہ رکھیں۔میرے خیال میں شاعر آزاد ھے کہ جون سی بحر میں چاھے رباعی لکھے اور یہ کہ رباعی کو ایک قسم کا بند تصور کرے اوراس قسم کے رباعی نما بندوں میں ایک نظم کی نظم لکھے۔ھماری عروض کی تنگ چشمی اور بےاصول قیدوں نے ھماری شاعری کو ایک غیر فطری سانچے میں ڈھال سا دیا ھے اور عروضی اصولوں کی فطرتی مطابقت اور لچک اردو شاعری میں نئی زمین اور نیا آسمان

پیدا کر دیکی —

رباعی کی موجودہ مسلمہ چوبیس بحروں میں سے بعض تو دلکش ہیں لیکن بعض نہایت بھونڈی ہیں اور عموماً اچھے رباعی گو ان بھونڈی کرخت بحروں سے پرہیز کرتے ہیں- ماترک طریقہ سے رباعی کے بیس ماترا والے چھند (وزن) کے کثیرالتعداد بھیدوں پر نظر ڈالی جائے تو ان میں سیکڑوں سریلی قسمیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ مثلاً کے طور پر ایک بنگالی "لی رک" کا مصرع ہے: —

پھول پھٹارے پھول پھٹارے دریا

اس مصرع میں بیس ماترائیں ہیں اور دراصل اس میں اور رباعی کے وزن میں کوئی فرق نہیں ہے- لیکن ہماری عروض میں چونکہ یہ بات پہلے طے پاگئی ہے کہ رباعی کے وزن کی چوبیس قسمیں مفعول یا مفعولن سے ہی شروع ہونی چاہئیں اس لئے یہ بنگالی گیت کا مصرع ہمارے عروضیوں کے نزدیک رباعی کے وزن میں نہ ہوگا —

اس نوٹ کا منشا صرف یہی ہے کہ اس بات پر زور دیا جائے کہ یا تو رباعی کے لئے سرے سے کوئی خاص وزن مخصوص ہی نہ کیا جائے یا ماترک اُصول کے لحاظ سے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ بیس ماترا والے وزن کی جتنی قسمیں (بھید) ہیں اُن سبھوں میں رباعی لکھی جاسکتی ہے-اِس سے ایک طرف تو یہ فایدہ ہوگا کہ رباعی کے وزن کی مختلف بحروں کا اُصلی فطری اُصول واضح ہوجائے گا اور دوسری طرف بجائے چوبیس بحروں کے دس ہزار سے اوپر بحریں ہاتھ آجائیں گی- جن سے صنف رباعی کا سریلا پن اور وسعت بہت زیادہ ہو جائے گی —

یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ شاعر کو بیس ماترا والے وزن (چھند) کی دس ہزار نو سو چھیالیس قسموں کی فہرست تیار کرنا لازمی نہیں ہے- شاعر کو صرف یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ رباعی کا ہر مصرع بیس ماترا کا ہے

یا نہیں۔اب رہا یہ سوال کہ شاعر نے اپنی رباعی کے مصرعوں میں لگھہ اور گرو کی ترتیب یعنی دوسرے الفاظ میں اِس وزن (چھند) کی جو جو قسمیں (بحریں) اختیار کی ہیں وہ سریلی ہیں یا نہیں۔اِس کا تصفیہ شاعر کا کان ہی کرسکتا ہے۔ اگر اُس کی پسند کی ہوئی بحریں بلحاظ ترنم دلکش نہ ہونگی تو اُس کی رباعی مقبول نہ ہوگی اور اِس ڈر کے مارے ہر شاعر اِس بات کی کوشش کریگا کہ جہانتک ممکن ہو بیس ماترا والے وزن کی سریلی قسمیں اختیار کرے—

خاتمہ پر بعض جویا طبایع کے لئے یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کسی چھند (وزن) کی قسموں (بھیدوں) کو کس طرح دریافت کیا جاتا ہے۔ ذیل میں ایک جدول دی گئی ہے۔اِس کو مطالعہ کرنے سے یہ طریقہ فوراً سمجھہ میں آجائے گا—

ماترا کی تعداد	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
بھیدوں کی تعداد	۱	۲	۳	۵	۸	۱۳	۲۱	۳۴	۵۵	۸۹

اوپر کے خانوں میں جو عدد ہیں اُن سے یہ مقصد ہے کہ چھند کی ماتراوں کی تعداد اِتنی ہے۔نیچے کے خانوں میں جو ہندسے ہیں اُن میں سے اوپر کے خانے والے چھند کے بھید (قسمیں) معلوم ہوتی ہیں مثلاً اوپر کے خانے میں چار کا ہندسہ ہے اِس کے یہ معنے ہوئے کہ چار ماترا والا چھند ہے تو اُس کے نیچے کے خانے میں پانچ عدد اِس چار ماترا والے چھند کی قسمیں بتاتا ہے۔اچھا اب پانچ ماترا والے چھند کی ہمیں قسمیں معلوم کرنی ہیں۔تو چار ماترا والے چھند کے نیچے جو پانچ کا عدد ہے اُس کو تین ماترا والے چھند کے نیچے والے تین کے عدد کو جوڑ لیں گے تو (۵ + ۳ = ۸) قسمیں پانچ ماترا والے چھند کی ہونگی۔اِس طرح آپ بیس ماترا والے چھند تک اگر سوچی یعنی ایسی جدول بنالیں جو اوپر دی گئی ہے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بیس ماترک چھند کی دس ہزار نوسو چھیالیس

قسمیں ہوتی ہیں-یہاں محض سہولت کی غرض سے صرف دس ماترا والے چھند تک ہی سوچی نمونتاً دیدی گئی ہے—

ایک دفعہ میں اس بات کو پھر ذہن نشین کرا دینا چاہتا ہوں کہ شاعر کے لئے صرف یہ دیکھہ لینا کافی ہے کہ اُس کا مصرع بیس ماترا یا جتنی ماترا کے چھند میں وہ شعر کہنا چاہتا ہے اتنی ماترا کا ہے یا نہیں-اِن حسابی جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں-سریلے پن کے متعلق خود شاعر کے کان سے بہتر ترازو ہو ہی نہیں سکتی-

عروض جدید

از

(جناب عبدالرحمن خاں صاحب اسسٹنٹ امپیریل اکانومک بوٹنسٹ - پوسا)

دنیاکی قوموں کو میدان ترقی میں دوڑتے ہوئے دیکھ کر ہمارے افسردہ و پژمردہ دلوں میں بھی قدم اُٹھانے کی اُمنگ پیدا ہوگئی ہے۔ پس و پیش واطراف و جوانب سے بڑھو بڑھو اور دوڑو دوڑو کی صدائیں آرہی ہیں۔قوت رفتار جس قدر بھی باقی رہ گئی ہے دستگیری کے لئے آمادہ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ "کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست" - جتنے منہ اُتنی ہی باتیں ہیں۔کوئی مشرق کی طرف راستہ بتاتا ہے کوئی مغرب کی طرف۔ایک جنوب کی سمت گھسیٹتا ہے تو دوسرا شمال کی جانب۔حیران ہیں کہ کس طرف جائیں۔کس طرف نہ جائیں۔تنزل کا یہ عالم ہے کہ ہماری ہستی ہی مجسم پستی بن گئی ہے۔ اور اِس کا احساس اِسقدر غالب ہے کہ اَپنی خوبیاں تک عیوب نظر آتی ہیں۔یورپی ترقی کی برق مثال شعاعوں نے آنکھوں میں کچھ ایسی چکا چوند پیدا کردی ہے کہ اب وہ بصارت کی شرمندۂ احسان نہیں رہیں۔ایسی نازک حالت میں ہمارا فرض ہے کہ قدم بڑھانے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کرلیں کہ کعبۂ ترقی کے لئے جو راستہ ہم تجویز کرتے ہیں وہ ترکستان تنزل کی راہ تو نہیں ہے—

دنیاوی چیزوں میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو بالکل بے عیب ہو یا اُس میں ترقی کی مطلق گنجائش نہ ہو۔اُردو عام عروض اِس کلیہ سے کس طرح

مستثنیٰ ہوسکتا تھا۔خوشی کی بات یہ ہے کہ بہی خواہان اُردو کا رجحان اِس کی اصلاح کی طرف بھی مائل ہوا ہے۔اس وقت جناب حکیم سید الطاف حسین صاحب کاظم کا رسالۂ گلزار عروض اور جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی۔اے کے دو مضمون جو رسالہ اُردو سنہ ۱۹۲۴ ع کے جنوری اور اپریل نمبروں میں چھپے ہیں ہمارے پیش نظر ہیں۔ہم نے بھی ایک رسالہ عروض جدید کے نام سے لکھا ہے جو عرصہ سے چھپنے کے لئے تیار ہے۔اس مضمون کا منشاء یہ ہے کہ اصلاح کے مختلف مجوزہ طریقوں کا مقابلہ کیا جائے تاکہ نکتہ رسان علم عروض و کارپردازان قسمت اُردو کو ان کے حسن و قبح پر غور و خوض کرنے کا موقع ملے- نیز ہم اپنے رسالہ کے شایع ہونے سے پہلے ماہران فن کے مفید مشوروں سے بہرہ اندوز ہو سکیں- علم عروض کے مختلف شعبہ ہیں جن میں سے تجزیہ۔تقطیع انفکاک بحور۔تقسیم بحور و تسمیہ بحور زیادہ اہم ہیں اور موجودہ مضمون میں انہی سے بحث کی جائے گی۔دکھانا یہ ہے کہ اِن مختلف شعبوں کے متعلق ہمارے ہاں کیا موجود ہے۔اِس میں کیا نقص ہیں اُن کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے اور ہندی اور انگریزی زبانیں جن سے ہم بہ آسانی مدد لے سکتے ہیں کہاں تک ہماری دستگیری اور رہبری کرتی ہیں—

تجزیہ بحور

بحر آواز کی ایک مسلسل زنجیر ہے جو چھوٹی چھوٹی کڑیوں سے مل کر بنی ہے۔ہر کڑی کا نام حرف ہے لیکن کہیں تو یہ کڑیاں ایک دوسرے سے ایسی پیوستہ ہیں کہ ان کا جدا کرنا مشکل ہے اور کہیں ان کا جوڑ ایسا ڈھیلا ہے کہ اُنہیں بآسانی علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔اِن آسانی سے علیحدہ ہو جانے والے ٹکڑوں کو اجزائے اولیہ یا سلیبل (Syllable) کہتے ہیں۔زبان اُردو پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں تین قسم کے اجزائے اولیہ ہو سکتے ہیں—

(۱) یک حرفی-جس میں ایک حرف متحرک ہو جیسے قلم میں ق-ہندی میں اسے لکھہ کرتے ہیں-اُردو عروض میں اِس کے لئے کوئی نام نہیں-عروض جدید میں اِس کا نام صغریٰ ہے—

(ب) دو حرفی-جس میں پہلا حرف متحرک ہو جیسے حق-اِس لفظ میں دونوں حرفوں کی آواز ایسی ملی ہوئی ہے کہ حائے مفتوح کی آواز نکالے بغیر قاف ساکن کی آواز کا نکالنا مشکل ہے-ہندی میں اسے گُر اور اُردو میں سبب خفیف کہتے ہیں—

(ج) سہ حرفی-جس میں پہلا حرف متحرک-دوسرا ساکن اور تیسرا موقوف ہو-جیسے یار-اس جگہ تینوں حرفوں کی آوازیں ایسی پیوستہ ہیں کہ انہیں جدا جدا ظاہر نہیں کیا جا سکتا-ہندی میں اِس کے لئے کوئی نام نہیں-اُردو میں اِسے سبب متوسط کہتے ہیں-مذکورۂ بالا اجزائے اولیہ کی ترکیب سے مرکب اجزا بنتے ہیں-اُردو زبان کے بعض اہل عروض نے اجزا کی تعداد نو تک بڑھا دی ہے لیکن اِن میں سے مفصلۂ ذیل چار ایسے ہیں جو تجزیہ کے لئے ضروری ہیں—

(۱) سبب خفیف (فع)
(۲) سبب متوسط (فاع)
یہ دونوں اجزائے اولیہ ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے

(۳) سبب ثقیل (فَعِ) ایسا دو حرفی جز جس میں دونوں حرف متحرک ہوں-یہ دو صغریٰ یا دو لکھہ کا مرکب ہے-ہندی میں اسے سپری کہتے ہیں—

(۴) وتد مجموع (فعل) ایسا سہ حرفی جز جس میں پہلے دو حرف متحرک اور آخری ساکن ہو-یہ ایک صغریٰ اور ایک سبب خفیف کا مرکب ہے اسے ہندی میں تومر کہتے ہیں-جو ایک لکھہ اور ایک گرو سے مل کر بنا ہے—

اُردو عروضیوں نے ان چاروں جزوں کا شمار اجزائے اولیہ میں کیا ہے-کیونکہ انہوں نے صغریٰ یا لکھہ کو علیحدہ جز نہیں سمجھا-یہ ایک غلطی یا بھول تھی تاہم مذکورۂ بالا چاروں جزوں سے تجزیہ کا مقصد بخوبی پورا ہو جاتا ہے۔

تجزیہ میں نہ تو زحافات کا جھگڑا ہے نہ کسی اور قسم کی دقت۔ ہر بحر کا تجزیہ نہایت آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ تقطیع تجزیہ سے بہتر تھی اس لئے اہل عروض نے تجزیہ کو صرف ارکان تقطیع کے جوڑ بند سمجھانے تک محدود رکھا —

ہندی میں اگرچہ اجزا کی تعداد تیرہ ہے لیکن اجزائے اولیہ صرف دو ہی ہیں جنھیں لکھ اور گُر کہتے ہیں۔ اِن کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔ سہ حرفی جز رکھنے کی اہل ہند کو ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ برج بھاشا میں لفظ کا آخری حرف موقوف ہونے کی بجائے متحرک ہوتا ہے پس ہندی اجزائے اولیہ سے اُردو زبان کے موقوف الآخر الفاظ کا تجزیہ صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر موقوف حرف کو متحرک مان لیں یا حذف کر دیں تو تقطیع ہو سکتی ہے —

مثلاً ع — " تم آل نبی اولاد علی سلطان الہند غریب نواز " کا تجزیہ دونوں زبانوں میں اِس طرح ہوگا —

	تم	آ	ل ن	بی	او	لا	د ع	لی
اُردو	خفیف سبب	خفیف سبب	ثقیل سبب	خفیف سبب	خفیف سبب	خفیف سبب	ثقیل سبب	خفیف سبب
ہندی	گُر	گُر	لکھ لکھ	گُر	گُر	گُر	لکھ لکھ	گُر

	سل	طا	نل	ہن	د غ	ر ی	ب ن	واز
اُردو	خفیف سبب	خفیف سبب	خفیف سبب	خفیف سبب	ثقیل سبب	خفیف سبب	ثقیل سبب	متوسط سبب
ہندی	گُر	گُر	گُر	گُر	لکھ لکھ	گُر	لکھ لکھ	گر لکھ

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں تجزیہ کا اصول ایک ہی ہے یعنی ہر ملفوظ حرف شمار ہوتا ہے۔ صرف اصطلاحی فرق ہے۔ علاوہ ازیں اُردو میں یہ نقص ہے کہ اِس میں تجزیہ کے لئے اجزائے اولیہ استعمال نہیں کئے گئے۔ کیونکہ اِس میں لگھ کا قائم مقام کوئی جز نہ تھا۔ ہندی میں یہ کمی ہے کہ اِس میں سبب متوسط کے مقابل کوئی سلیبل نہیں۔ ہم نے اپنی کتاب عروض جدید میں اِس کی اصلاح اس طرح کی ہے کہ مرکب اجزا سبب ثقیل و وتد مجموع کو چھوڑ کر ایک جز لگھ کا قائم مقام زیادہ کر دیا ہے۔ اِس طرح صرف تین اجزائے اولیہ سے تمام بحور کا تجزیہ ہو جاتا ہے۔ ہندی میں گُر اور لگھ کے واسطے علامات بھی مقرر ہیں۔ لیکن اُردو زبان میں صرف نام استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہم نے ارکان تقطیع کی طرح اجزائے اولیہ کے لئے بھی الفاظ مقرر کر دئے ہیں جس سے تجزیہ کے ڈانڈے تقطیع سے جا ملے ہیں۔ وہ الفاظ یہ ہیں —

(۱) لگھ یا صغریٰ۔ اس کے واسطے لفظ "نہ" استعمال کیا جاتا ہے جو حرف "ن" کا قائم مقام ہے اور ہائے مختفی ذریعہ اظہار حرکت ہے۔ تاہم مبتدیوں کی آسانی کے لئے تجزیہ کرتے وقت صرف "ن" لکھا جا سکتا ہے —

(۲) گُر یا سبب خفیف یا کُبریٰ۔ اس کے لئے لفظ "مل" استعمال کیا جاتا ہے جس میں میم مکسور اور لام ساکن ہے —

(۳) سبب متوسط یا جز اکبر۔ اس کے لئے لفظ "یار" استعمال کیا جاتا ہے جس میں پہلا حرف متحرک دوسرا ساکن اور تیسرا موقوف ہے —

مذکورۂ بالا تین لفظوں (نہ۔ مل۔ یار) سے دنیا بھر کے الفاظ و بحور کا تجزیہ یا تقطیع ہو سکتی ہے۔ ہم نے اِن کے بجائے ت۔ فع اور فاع اس لئے نہیں رکھے کہ مبتدی عین کا تلفظ صحیح طور سے ادا نہ کر سکیں گے تو صحیح تجزیہ سمجھنے میں اکثر دھوکا ہوا کرے گا —

۴ جناب عظمت صاحب نے اگرچہ تجزیہ کا بیان علیحدہ نہیں کیا لیکن اُن کے ہاں ایک جزی ارکان سے جو تقطیع کی جاتی ہے وہ تجزیہ کا قائم مقام سمجھی جاسکتی ہے۔اِس تقطیع میں اُنہوں نے بہ تقلید ہندی صرف دو جزوں ہی پر اکتفا کی ہے۔اپنے مضمون میں اُنہوں نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ " جز کے وہی معنی ہوں گے جو انگریزی میں سلیبل کے ہیں " لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اُنہوں نے کس قاعدے سے سبب متوسط (یار) میں دو سلیبل سمجھ لئے۔ شاید اِس خیال سے ایسا کیا ہو کہ جب درمیان مصرع حرف موقوف کو متحرک مان لیا جاتا ہے تو آخر مصرع بھی موقوف مان سکتے ہیں۔لیکن یہ اِستدلال صحیح نہیں۔کیونکہ مصرع کے بیچ میں موقوف حرف کے مقابل متحرک حرف کا لانا جائز ہے اِس لئے تقطیع میں مشابہت قائم رکھنے کے لئے موقوف کو متحرک ماننے میں کوئی ہرج نہ تھا۔

جیسے " شراب ناب کجا ومن خراب کجا۔ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا " ۔کے پہلے مصرع میں ناب اور خراب کے آخری حروف موقوف ہیں لیکن دوسرے مصرع میں اِن کے مقابل تفاوت کا واو اور بہ کی ب متحرک حروف آئے ہیں۔اِس لئے تقطیع میں یہ حروف بھی متحرک مان لئے گئے۔لیکن اُردو فارسی میں مصرع کے آخر حرف متحرک کبھی نہیں آتا۔پس خلاف واقعہ بات کو تسلیم کرنا درست نہیں۔علاوہ ازیں تجزیہ نظم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ہر لفظ کا خواہ وہ نثر کا جز ہو یا نظم کا جدا جدا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔بلکہ بعض اوقات نثر میں بھی تجزیہ کرنا پڑتا ہے جہاں موقوف کو متحرک ماننا بالاتفاق غلط ہے۔ پس ایسی حالت میں سبب متوسط کو جو اُردو عروض میں بجا اور درست طور پر موجود تھا چھوڑ دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

جناب کاظم صاحب نے گلزار عروض میں اپنی تقطیع کے لئے پانچ لفظ گل۔ صبا۔چمن۔فصل۔بہار۔مقرر کئے ہیں اور اُنہیں کلام کے اجزائے اولہ سے تعبیر کیا

ہے۔اس لئے اُن کی تقطیع کا ذکر بھی اِسی جگہ آنا چاہئے۔اُن کی کتاب کی خوبی کا دارو مدار دو دعووں پر ہے۔ایک تو یہ کہ اُنہوں نے تقطیع کرنے میں اجزائے اولیہ اور چھوٹے سے چھوٹے الفاظ استعمال کئے ہیں۔دوسرے یہ کہ تمام بحور کی تقطیع خواہ اب موجود ہوں یا آیندہ کسی زمانہ میں پیدا ہوں اُن کے مقرر کئے ہوئے ارکان سے ہوسکتی ہے۔لیکن افسوس ہے کہ یہ دونوں دعوے غلط ہیں۔پہلے دعوے میں تو اُنہوں نے وہی غلطی کھائی جو اُردو کے عام عروضیوں نے کھائی تھی۔چنانچہ گلزار عروض کے صفحہ ۴ پر وہ تحریر فرماتے ہیں "اُردو میں چھوٹے سے چھوٹا لفظ دو حرف کا ہی ہوسکتا ہے اور اُس کا پہلا حرف ہمیشہ متحرک اور دوسرا ساکن ہوتا ہے" اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کوئی لفظ ایسا نہ سوچ سکے جو لکھہ کا قائم مقام ہوتا۔حالانکہ عربی۔فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں واو عطف ایک ایسا لفظ ہے جو ایک حرف سے بنا ہے اور نہ۔کہ۔چہ وغیرہ بہت سے ایسے الفاظ اُردو فارسی میں موجود ہیں جن میں ہائے مختفی محض اظہار حرکت سے لئے آتی ہے اور وہ بخوبی لکھہ کا قائم مقام ہوسکتے ہیں۔دوسرا دعویٰ اِس لئے غلط ہے کہ گل اور صبا کے مسبغ الفاظ فصل و بہار تو اُن کے ہاں موجود ہیں۔لیکن چمنی کا مسبغ کوئی نہیں۔اِس لئے جہاں کہیں بھی مصرع کے آخر فعلات کا وزن آئے گا اُن کے الفاظ تقطیع کے لئے کافی نہ ہونگے۔جیسا کہ مثال ذیل سے ظاہر ہے۔ع تم آل نبی اولاد علی سلطان الہند غریب نواز —

تجزیہ	تم	آ	ل	ن	بی	او	لا	د	ع	لی
عروض جدید	مل	مل	نہ	نہ	مل	مل	مل	نہ	نہ	مل
جناب کاظم صاحب	گل	گل	چمنی			گل	گل	چمنی		
جناب عظمت صاحب	فع	فع	ت	ت	فع	فع	فع	ت	ت	فع

تجزیہ	سل	طا	نل	ھن	د	غ	ری	ب	ن	واز
عروض جدید	سل	مل	مل	مل	نہ	نہ	مل	نہ	نہ	یار
جناب کاظم صاحب	گل	گل	گل	گل		چھلی				
جناب عظمت صاحب	فع	فع	فع	فع	ت	ت	فع	ت	ت	فع تن

مذکورۂ بالا مثال سے ظاھر ھے کہ جناب کاظم صاحب کے مجوزہ پانچ لفظ بھی تمام بحور کی تقطیع یا تجزیہ کے لئے کافی نہیں ھیں حالانکہ عروض جدید کے مطابق صرف تین لفظوں (نہ مل یار) سے یہ مقصد بوجہ اتم پورا ھوجاتا ھے —

تقطیع بحور

تقطیع سے الفاظ کا ایسا مجموعہ مراد ھے جو حروف گوناگوں کی بھول بھلیاں اور ناقص رسم خط کی فریب دھی سے آزاد ھوکر خود بحر کو ایسی سادہ صورت میں پیش کرے جو اشعار کے جانچنے کے لئے کسوٹی کا کام دے سکے۔ تجزیہ بحر کے اجزا کا خیال ضرور پیدا کرتا ھے لیکن جس طرح چاول۔گوشت۔گھی۔نمک وغیرہ کہہ دینے سے کام و زبان پلاؤ کے ذائقہ سے متلذذ نہیں ھوسکتے اس طرح الکھ لکھ گر گر جپنے یا سبب خفیف و سبب ثقیل کے رٹنے سے وہ ترنم پیدا نہیں ھوسکتا جو بحر کا جز لاینفک ھے —

تقطیع اجزائے بحر کا خیال پیدا کرنے کے علاوہ بحر کا ترنم بھی اُسی طرح پیدا کردیتی ھے جس طرح گویے سا۔رے۔گا۔ما۔پا وغیرہ مقررہ الفاظ سے راگنی پیدا کرلیتے ھیں۔ارکان تقطیع کے قائم مقام ھندی اور انگریزی میں بھی ھیں لیکن چونکہ وہ علامات یا ناموں سے ظاھر کئے جاتے ھیں اِس لئے ترنم سے بے بہرہ ھیں۔وہ بحر کی تقطیع نہیں کرتے بلکہ ایک طرح کا تجزیۂ مرکب کرتے ھیں۔ ارکان اردو حروف علامات نہیں ھیں بلکہ یہ وہ در شہوار ھیں جو مجسم بحر ھیں اور جن سے ھندی اور انگریزی دونوں زبانوں کے دامن خالی ھیں۔ھمارا طریق

تجزیہ اور جناب عظمت صاحب کی یک جزئی تقطیع دراصل تجزیہ اور تقطیع دونوں کہلائے جانے کے مستحق ہیں لیکن وزن کرنے کے لئے اُن کے باٹ اِس قدر چھوٹے ہیں کہ مبتدی کے ہاتھ سے رشتۂ ترنم کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ گراں وزن چیزوں کے تولنے کے لئے باٹ بڑے ہونگے توآسانی ہوگی۔نصف من کو تولوں اور ماشوں میں بھی تول سکتے ہیں لیکن سیروں سے تولنے میں زیادہ آسانی ہے۔ اِسی خیال سے اور چند اور وجوہات سے جن کا بیان اِس جگہ غیر ضروری ہے اہل عروض نے ارکان اصلی حتی المقدور بڑے مقرر کئے تھے۔لیکن چونکہ وہ ہرقسم کی بحروں کی تقطیع کے لئے کافی نہ تھے اِس لئے مزید ارکان زحافات کے ذریعہ بنائے گئے۔ زحافات کا طریقہ خود بھی بہت پیچیدہ تھا۔تقسیم و جماعت بندی کا مشکل مسئلہ بھی اِسی کے ساتھ وابستہ کردیا گیا جس سے ارکان کی تعداد بڑھتے بڑھتے اکتالیس تک پہنچ گئی۔اور تقطیع حقیقی و غیر حقیقی کا جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ اُردو عروض پر جوکچھ اعتراض ہیں وہ زیادہ تر اِسی حصہ کی وجہ سے ہیں باقی سب اُس کی فروعات ہیں۔ہندی عروض میں اگرچہ زحافات کا جھگڑا نہیں ہے۔تاہم ارکان کی تعداد ۳۹ تک پہنچتی ہے۔جنمیں سے اکثر غیر ضروری ہیں۔علاوہ ازیں بعض ارکان کو دو مختلف طریقوں سے پیدا کیا مثلاً مفعولن۔ماترک طریقہ سے جس میں تعداد حروف کا خیال رکھا جاتا ہے چھہ ماترا کے پرستار سے پیدا ہوتا ہے اور ورنک طریقہ سے جس میں تعداد اجزا مدنظر ہوتی ہے تین ورن کے پرستار سے بنتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہررکن دونوں طریقوں سے حاصل ہوسکتا ہے۔اور بحیثیت رکن ماترک اور ورنک تفریق بالکل فضول ہے۔اہل ہند نے ماترک طریقہ سے جو ۳۱ رکن بنائے تھے وہی ماترک اور ورنک دونوں قسم کے اشعار کے لئے کافی سے بھی زیادہ تھے۔مگر اُنہوں نے آٹھ ارکان ورنک طریقہ سے بھی نکالے اور محض اوہام پرستی کی بناپر اُن کے ساتھ سعد و نحس کی چند فرضی خصوصیات مان کر ورنک شاعری کے ساتھ

مخصوص کردیا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہندی ارکان پیچیدگی اور تعداد کے لحاظ سے اُردو ارکان کی نسبت کسی طرح بہتر نہیں۔ ہندی کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ انگریزی سے ہم کہاں تک فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ہندی اور اُردو میں وزن کرنے کا طریقہ اُصولاً ایک ہے۔ دونو زبانوں میں وزن کی اِکائی حرف ہے اور ہر ملفوظ حرف تقطیع یا تجزیہ میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن انگریزی زبان میں حروف کی بجائے اجزائے اولیہ یعنی سلیبل کو اِکائی سمجھا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ سلیبل میں خواہ ایک حرف ہو یا زیادہ سب کا وزن یکساں سمجھاجاتا ہے۔ علاوہ ازیں اہل انگریزی حرکات مرکبہ سے ہمزہ کو جدا نہ کرسکے اِس لئے بسا اوقات جس لفظ کو ہم دو جزوں سے بنا ہوا خیال کرتے ہیں انگریزی زبان والے اُس میں صرف ایک ہی سلیبل مانتے ہیں مثلاً لائک (Like) میں ہمارے ہاں لازمی طور پر دو سلیبل مانے جائیں گے مگر انگریزی داں اِس میں ایک ہی سلیبل بتائیں گے۔ پھر بعض ساکن حروف انگریزی الفاظ کے شروع میں ایسے واقع ہوتے ہیں جس کے مقابل اُردو میں ہمیشہ متحرک حرف ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے حساب سے مختلف اجزا میں حروف کی تعداد ایک سے چھہ تک ہوجاتی ہے اور غضب یہ ہے کہ یہ سب ہموزن سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً—

ل — لا — لاز — کلاس — فلائی — فلائٹس — سب میں ایک ایک سلیبل ہے اور اِن سب کا وزن یکساں ہے۔ البتہ اِن میں سے جس پر زور دے دیا جائے وہ گران وزن سمجھا جائے گا۔ جناب عظمت صاحب نے اپنے مضمون میں اِن سب کو ایک ایک لکھہ کا قائم مقام مانا ہے اور انگریزی سے نا واقف اصحاب کو سمجھانے کے لئے شاید اِس سے بہتر طریقہ بھی نہ تھا۔ لیکن کوئی اُردو یا ہندی شاعر جسے موزونیت سے ذرہ بھر بھی لگاؤ ہے کبھی اِس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ پانچ پانچ اور چھہ چھہ حروف بھی ایک حرف متحرک کے ہم وزن ہو سکتے ہیں۔

اسی لئے وہ انگریزی شعر کو بلا خوف تردید نا موزوں کہہ دیتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک ہم انگریزی لے میں نہ پڑھیں اور ایکسنٹ کے جھٹکوں اور زیر و بم کی کشا کش سے قوت احساس حروف کو معطل نہ کر دیں انگریزی شعر کسی طرح موزوں نہیں پڑھا جا سکتا۔ اُردو تقطیع کو شعر کی جانچ کے لئے بلدیے کی ترازو سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس زمانہ میں ترازو ایجاد نہ ہوئی تھی وزن کا اندازہ مجوزہ پیمانوں سے کیا جاتا تھا۔ اب بھی کہیں کہیں یہ پیمانے مستعمل ہیں چنانچہ پنجاب کے بعض مقامات میں ایک پیمانہ رائج ہے جسے ٹوپا کہتے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ ایک ٹوپا گیہوں ایک ٹوپا جو سے وزن میں زیادہ ہوں گے اور ایک ٹوپا پارہ تو بہت ہی زیادہ وزنی ہو گا۔ اگر اسی ٹوپے سے گیہوں کا آٹا ناپیں تو ظاہر ہے کہ دبا دبا کر بھرنے سے اس میں زیادہ آٹا آئے گا اور معمولی طور پر بھر دیں گے تو کم سمائے گا۔ بالکل یہی حال انگریزی عروض کا ہے۔ اس کے ٹوپے میں گیہوں ہوں یا جو۔ پارہ ہو یا آٹا۔ سب کا وزن ایک سمجھا جاتا ہے البتہ اگر ٹوپے کو ذرا دبا کر بھر دیا جائے (یعنی سلیبل پر ایکسنٹ دے دیا جائے) تو وزن میں گرانی محسوس کی جاتی ہے۔ اُردو زبان میں ایکسنٹ کا وجود ہی نہیں۔ ایسی حالت میں ناظرین اندازہ فرما سکتے ہیں کہ انگریزی سے کہاں تک مدد مل سکتی ہے —

بوریا باف گرچہ بافندہ است　　نہ برندش بہ کارگاہ حریر

دراصل اُردو عروض کی اِصلاح کے لئے نئے ارکان کے پیدا کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ اُن کے کم کرنے کی ضرورت ہے۔ ارکان اجزا کی ترکیب سے بنتے ہیں ہندی میں صرف دو جز ہیں۔ اُردو میں تین۔ انگریزی میں دو یعنی (۱) زوردار اور (۲) بے زور۔ اگر زوردار کو گرو اور بے زور کو لگھو کا قائم مقام سمجھہ لیا جائے تو تینوں زبانوں سے جو رکن چاہیں پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن موقوف الاخر ارکان صرف اُردو ہی میں پیدا ہو سکیں گے۔ کیونکہ ہندی میں حرف موقوف

ہوتا ہی نہیں۔انگریزی میں اگرچہ حرف موقوف ہوتا ہے لیکن اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔کیونکہ وہ وزن پر کچھ اثر نہیں ڈالتا —

تقطیع کے بارے میں جناب عظمت صاحب نے جو تجاویز اصلاح پیش کی ہیں اُن کی تفصیل اُن کے مضمون میں مل سکتی ہے۔اِس جگہ صرف اِس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ اُنہوں نے چودہ ارکان رکھے ہیں جن میں سے آٹھ وہی ہیں جنہیں اہل ہند کی اوہام پرستی نے ورنک شاعری کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ یہ ارکان اجزا کی تعداد کے لحاظ سے بنائے گئے ہیں یک جزی۔دو جزی اور سہ جزی جن کی تفصیل یہ ہے:—

(۱) ت (۲) فع (۳) ت ع (۴) فاع (۵) ت عل (۶) فع لن (۷) مفعولن (۸) فعولن (۹) فاعلن (۱۰) ت ع لن (۱۱) مفعول (۱۲) مفاع (۱۳) فا ع ل (۱۴) ت ع ل —

مذکورۂ بالا ارکان کچھ ہندی اور کچھ انگریزی کی تقلید میں اختیار کئے گئے ہیں لیکن اُردو کے وزن کو اجزا کی تعداد سے کچھ سروکار نہیں۔اِس میں تعداد حروف کا خیال رکھنا مقدم ہے اِس لئے یہ ارکان یا یوں کہو کہ اُن کا ایک خاص طریقہ پر استعمال کرنا اُردو کے مناسب حال نہیں۔کیونکہ اِس طریقہ میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ایک مصرع کی تقطیع کو دوسرے مصرع کی تقطیع سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔جس سے شعر کی صحت و درستی کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔یا یوں کہو کہ تقطیع کا مطلب اصلی ہی فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے اِس طریقہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جو عروض جدید میں اِختیار کیا گیا ہے۔تا کہ مقابلہ کرنے میں آسانی ہو۔عروض جدید میں صرف چھ آصلی ارکان رکھے گئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے: —

نوٹ:۔
اِس مضمون میں فعلن متحرک العین اور فعلن ساکن العین میں فرق قائم رکھنے کے لئے اِنہیں ہمیشہ فعِلن اور فعلن لکھا گیا ہے ۔

چہار حرفی
(۱) فعلن (مل مل)
(۲) فعِلن (ن ن مل)
(۳) فاعل (مل ن ن)
(۴) فعول (ن مل ن)

پنج حرفی
(۵) فعولن (ن مل مل)
(۶) فاعلن (مل ن مل)

مذکورۂ بالا چھہ رکنوں میں پانچ عروض مروجہ میں پہلے ہی مستعمل ہیں۔ صرف ایک رکن فاعل نیا ہے۔یہ ارکان حروف کی تعداد کے لحاظ سے منتخب کئے گئے ہیں اِس لئے اُنہیں ماترک گُن کہا جا سکتا ہے۔گو یہ ماترا گُنوں اور ورن گُنوں دونوں پر حاوی ہیں۔اِن ارکان سے ہر بحر کی تقطیع نہایت آسانی سے ہو جاتی ہے۔جس بحر کی تقطیع کرنی ہو اُس کے اِبتدائی ملفوظ حروف پر غور کرو۔ اگر پہلے چار حروف پر جز ختم ہو جائے تو چہار حرفی رکن بنا لو ورنہ پنج حرفی۔یہی عمل آخر تک کرتے چلے جاؤ سالم رکن نکلتے چلے آئیں گے اور بحر کی تقطیع ہو جائے گی لیکن بعض صورتوں میں آخر میں ایک یا دو یا تین حروف بچ جائیں گے۔اُن کو تقطیع میں لانے کے لئے ہم نے تین زحاف رکھے ہیں۔ اگر تقطیع کرتے وقت مصرع کے آخر ایک حرف بچے تو وہ ضرور موقوف ہو گا۔ مثلاً حالی —

کام کا شاید زمانہ ہو چکا
فاعلن فعلن فعولن فاعلن
دل میں اب اُٹھتی نہیں کوئی اُمنگ
فاعلن فعلن فعولن فاعلات

مذکورۂ بالا شعر کے پہلے مصرع کی تقطیع چار سالم ارکان سے ہو گی دوسرے مصرع میں اگر آخری رکن فاعلن رکھیں تو ایک حرف موقوف

بچ رهتا هے اِس لئے رکن کو فاعلات بنانا پڑے گا۔هم چاهیں تو اِسے علیحدہ رکن تسلیم کرسکتے هیں ایسی حالت میں یہ کہنا پڑے گا کہ فاعلات ایک سالم رکن هے جو صرت مصرع کے آخر میں آتا هے اور فاعلن کے مقابل اس کا لانا جائز هے—

لیکن اِسے فاعلن کی مزاحف (مسبغ) صورت ماننے میں زیادہ آسانی هے۔کیونکہ موقوت حرت هر رکن کے آخر آتا هے اور ایک هی زحات (تسبیغ) سے چهہ رکن پیدا هوجاتے هیں علاوہ ازیں استخراج۔جماعت بندی اور تسمیه میں بڑی مدد ملتی هے—

اگر تقطیع کرتے وقت مصرع کے آخر دو حرت بچیں تو اُن کی صورت همیشه فع کی هوگی چونکه همارے چهہ رکنوں میں سے فاعل ایسا لفظ هے جس کے دونوں آخری حرت متحرک هیں وہ مصرع کے آخر اُسی وقت آسکتا هے جب که دونوں متحرک حروت حذت کردئے جائیں ایسی حالت میں اُس کی صورت فع کی هوجائے گی۔اِسی لئے هم نے فع کو فاعل کی محذوت صورت مانا هے۔یہ بهی ممکن تها که هم فع کو علیحدہ رکن مان لیتے۔لیکن محذوت ماننے میں تقسیم و تسمیه وغیرہ میں بہت مدد ملتی هے جیسا که آیندہ ظاهر هوگا—

اگر تقطیع کرتے وقت آخر مصرع تین حروت بچ جائیں اور آخری حرت موقوت نه هو تو اُن کی صورت همیشه فعل کی هوگی۔اسے هم نے فعول کی مقصور صورت مانا هے۔کیونکه فعول کبهی مصرع کے آخر نہیں آسکتا—

غرض مذکورۂ بالا تین زحات سے آتهہ رکن اور پیدا هوتے هیں جو همیشه مصرع کے آخر هی میں آتے هیں باقی ساری تقطیع گذشته چهہ سالم ارکان سے هوجاتی هے۔تمام ارکان کی تفصیل یہ هے—

ارکان سالم	ارکان مزاحف		
	محذوف	مقطوع	مسبغ
فعلن	.	...	مفعول
فعلن	...	..	فعلات
فعول	...	فعل	فعول
فاعل	فع	.	فاع
فعولن	...	..	مفاعیل
فاعلن	...	..	فاعلات

- مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ تقطیع جدید میں صرف چھ ارکان سالم
ر تین زحافات سے کام پڑتا ہے اور سالم اور مزاحف ارکان کی مجموعی تعداد
دہ ہے۔جناب عظمت صاحب نے بھی ارکان کی تعداد چودہ ہی رکھی ہے لیکن
ائج میں زمین و آسمان کا فرق ہے —

(۱) وہ تقطیع چار طرح پر تجویز کرتے ہیں یک جزی۔دو جزی۔سہ جزی
ر مرکب اُن کے نزدیک مختلف بحور کے لئے مختلف قسم کی تقطیع موزوں
گی۔لیکن اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ کونسی تقطیع زیادہ موزوں ہے
لہٰذا چاروں طرح تقطیع کرنا پڑے گی لیکن ہمارے طریقہ سے صرف ایک ہی
طیع ہوسکتی ہے اور وہ ہر حالت میں موزوں و مناسب ہوگی —

(۲) اُن کی تقطیع موجودہ عروض سے کم مشابہت رکھتی ہے کیونکہ
ں میں کم سے کم چار رکن ایسے ہیں جو موجودہ عروض میں نہیں (ف ـ ف ع ـ
ع ل ـ فا ع ل) ہمارے ہاں صرف ایک رکن " فاعل " زیادہ ہے ورنہ سب
ی ہیں جو مروجہ تقطیع میں عام طور پر مستعمل ہیں —

(۳) اِن کے ہاں آخری موقوف حرف متحرک مانا جاتا ہے جو نہ صرف اہل عروض کی مسلمہ روش کے خلاف ہے بلکہ اصول بھی ہے۔موقوف کو موقوف مان کر تقطیع کی جائے تو ان کے ارکان تقطیع کے لئے کافی نہیں—

(۴) اِن کے ارکان ورنک طریق پر بنائے گئے ہیں یعنی اِن میں صرف اجزا کی تعداد کا خیال رکھا جاتا ہے۔انگریزی زبان میں سب اجزا ایک حیثیت رکھتے ہیں اِس لئے اِس زبان میں یہ طریقہ سائنٹیفک ہو تو ہو لیکن اُردو میں تقطیع کو اجزا کی تعداد سے کوئی تعلق نہیں۔اِس میں حروف کی تعداد کا خیال مقدم ہے اسی لئے ہم نے ماترک طریق پر ارکان مرتب کئے ہیں جو ہندی اُردو۔فارسی یا عربی کی ہر بحر کی تقطیع کے لئے موزوں اور مناسب ہیں۔

(۵) اِن کی تقطیع سے تقطیع کا اصلی منشا پورا نہیں ہوتا۔یہ بات ایک مثال سے بخوبی سمجھ میں آجائے گی مثلاً حالی—

جب تک شہر آباد رہے گا   نام تمہارا یاد رہے گا

اِس کی تقطیع ہمارے طریقہ سے

فعلن	فعلن	فاعل	فعلن
فاعل	فعلن	فاعل	فعلن

ہوتی ہے اِس تقطیع پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر مصرع میں چار رکن ہیں اور ہر رکن چہار حرفی ہے۔اِس لئے ہر مصرعہ میں سولہ حروف ہیں۔دونوں مصرعوں میں صرف یہ فرق ہے کہ دوسرے مصرع میں فعلن کی جگہ فاعل آیا ہے۔یعنی ایک گُر کے مقابلہ میں دو لگھ آئے ہیں۔چونکہ اِس قسم کا اِختلاف اُردو میں جائز ہے اِس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شعر صحیح ہے۔جناب عظمت صاحب کے طریقہ سے دو جزی تقطیع یہ ہے۔

فعلن	فعلن	فا ع	فعل		فع
فا ع	فعل	فعلن	ت ع	فعلن	

قارئین کرام ذرا غور فرمائیں کہ اِن دونوں مصرعوں کی تقطیع میں کیا

مناسبت ہے۔ ہمارے خیال ناقص میں جب تک اِس تقطیع کو توڑ پھوڑ کر از سرِنو نہ کیا جائے مبتدی تو درکنار منتہی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اِن دونوں مصرعوں کا ایک ہی شعر میں جمع کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اب سہ جزی تقطیع بھی ملاحظہ ہو وہ یہ ہے۔

مفعولن	مفعول	فعولن	
فاعل	مفعولن	ت ع لن	فع

اِس میں پہلا مصرع تین رکن کا ہے اور دوسرے مصرع میں چار رکن ہیں۔ کوئی رکن کسی رکن سے مناسبت نہیں رکھتا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اِس قسم کی تقطیع آسانی پیدا کرے گی یا اُلجھن۔ ایسی تقطیع سے تو یہی بہتر ہے کہ تجزیہ ہی کو تقطیع سمجھ کر قصہ کوتاہ کر دیا جاوے۔ تقطیع کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ الفاظ کا ایسا مجموعہ پیش کر دیا جاوے جو حروف و حرکات میں مصرعہ سے مطابقت رکھتا ہو بلکہ الفاظ بھی ایسے ہونے ضروری ہیں جن کا بہ سہولت مقابلہ ہو سکے۔ تاکہ شعر کی درستی و نا درستی کا اندازہ کیا جا سکے—

جناب کاظم صاحب کی تقطیع میں بھی کم و بیش یہی نقص موجود ہیں کیونکہ اِن کے ارکان بھی چھوٹے بڑے ہیں مثلاً—

	تقطیع جدید			تقطیع کاظمی							
اندھیاری میں گھرائی ہے	فعلن	فعلن	فعلن	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل
جھڑی لگی ہے ہلکی ہلکی	فعول	فعلن	فعلن	صبا	صبا	گُل	گُل	گُل	گُل	گُل	

رمز شناسان عروض و موزونیت خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ کونسا طریقہ مقاصد تقطیع کو کمالیت کے ساتھ پورا کرتا ہے —

انفکاک بحور

اُردو میں بحور کا انفکاک دوائر کے ذریعہ کیا گیا ہے جو نہایت محدود اور پیچیدہ ہے اِس کے نقائص ماہرین فن سے پوشیدہ نہیں۔جناب کاظم و جناب عظمت صاحبان کے مجوزہ ارکان اِس قابل ہی نہ تھے کہ اُن سے اِستخراج بہ سہولت ممکن ہوتا اِس لئے اُنہوں نے اِس طرف توجہ ہی نہیں کی۔لیکن ہمارے ارکان ایسے مکمل ہیں کہ اُن کے ترکیب دینے سے تمام ممکن بحور پیدا ہو جاتی ہیں چنانچہ عروض جدید میں صرف چھ ارکان سے آٹھ رکن تک کی چالیس لاکھ اکیس ہزار چھتر مختلف بحریں نکالی گئی ہیں—

تقسیم و تسمیہ بحور

بحور کی جماعت بندی اور تسمیہ درحقیقت ایک مشکل کام ہے۔ کسی مشکل کام سے پنڈ چھڑانے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ سرے سے اِس فعل ہی کو بے سود سمجھ لیا جائے لیکن کوئی علم ایسا نہیں جس میں ترتیب و تقسیم سے چشم پوشی کی گئی ہو۔انگریزی شاعر بھی جو اپنے شعر کو موزونیت کے اعلیٰ معیار تک نہ پہنچا سکے جماعت بندی و تسمیہ کی ضرورت کے قائل ہیں۔عروض مروجہ میں زحافات کا گورکھدھندا محض جماعت بندی کی خاطر ہی تیار کیا گیا تھا۔عروضیان قدیم نے جب آٹھ رکن مقرر کرکے اُن سے اُنیس سالم بحریں پیدا کرلیں تو باقی تمام بحور کو انہی کی اقسام داخل کرنے کی کوشش کی۔ ارکان ہشت گانہ کی ساخت ایسی بے ڈھنگی تھی کہ اُن کے ذریعہ تمام بحور کی تقطیع ہونی ممکن نہ تھی۔اِس لئے مجبوراً دوسرے لفظ استعمال کرنے پڑے۔ممکن تھا کہ اِن نئے الفاظ کو بھی سالم رکن مان لیا جاتا۔لیکن جماعت بندی کا خیال مانع ہوا۔مجبوراً اُنہوں نے نہایت کاوش و جانکاہی سے اِن نئے الفاظ کا رشتہ ارکان ہشت گانہ ہی سے جاملایا اور تمام بحور کو جن میں باہمی مناسبت یا

مشابہت قائم کو نہ تھی مصنوعی اور بناوٹی تعلقات کی بنا پر ایسی مفروضہ انیس بحروں کی ذریات میں داخل کر لیا۔مثلاً اُن کے ہاں ۲۸ حروف کی ایک بحر " مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن " موجود تھی جسے وہ ہزج کہتے تھے۔ اب اِنہیں ایک اور بحر ملی جس کی تقطیع اُنہوں نے " مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن " کی۔اِس بحر میں چوبیس حروف ہیں اور اول الذکر بحر سے کوئی تعلق نہیں۔تاہم چونکہ اِس میں دوبار مفاعیلن موجود ہے اُنہوں نے چاہا کہ کسی نہ کسی طرح اِس بحر کو ہزج کی ذریات میں داخل کرنا چاہئیے۔مفعول کا تعلق مفاعیلن سے پیدا کرنا آسان بات نہ تھی۔مگر تصور کا میدان بہت وسیع ہے اُنہوں نے مفاعیلن کو اُونٹ کا سر خیال کیا اور اول و آخر حروف کو دونوں کان سمجھ کر کاٹ ڈالا۔میم و نون کے اُڑنے سے فاعیل رہ گیا یہ کن کٹا مفاعیلن مفعول کا ہموزن ہے اِس لئے اُنہوں نے مفعول کا نام اخرب (کن پھٹا) رکھا اور اس نئی بحر کو ہزج اخرب کہنے لگے۔ اہل عروض نے اپنی قوت متخیلہ کے بل پر جماعت بندی اور تسمیہ کے مرحلہ کو طے تو کر لیا لیکن اِس سے بے انتہا مشکلیں پیدا ہونے کے علاوہ تقسیم کی اصلی غرض ہی مفقود ہو گئی۔ عروض مروجہ کا یہی حصہ سب سے زیادہ محتاج اصلاح ہے۔جناب عظمت صاحب نے تو جماعت بندی و تسمیہ کو فعل لاحاصل خیال فرما کر اِس طرح توجہ ہی نہیں فرمائی۔لیکن جناب کاظم صاحب نے اپنے رسالہ میں تین طرح پر تقسیم کی ہے پہلی تقسیم میں تو سترہ بحروں کے وہی نام رکھے ہیں جو عروض مروجہ میں ہیں۔لیکن ہر بحر کے نام کے ساتھ چند مزاحف بحور کو بھی داخل کر لیا ہے۔مثلاً ہزج سالم کے ساتھ سات مزاحف بحریں اور بھی لکھی ہیں جن کو ہزج کا نام دیا گیا ہے۔چند بحور کو کسی ایک نام سے موسوم کرنے کے لئے کچھ مشابہت بھی ہونی چاہئیے۔عروض مروجہ میں گو اصلی مشابہت سے کام نہیں لیا گیا تاہم خیالی مشابہت زحافات کے ذریعہ سے پیدا کر لی گئی۔جس حالت میں

جناب کاظم صاحب زحافات کے جھگڑے کو اُٹھانا چاھتے ھیں تو وہ جہاں مشابہت بھی غائب ھوجاتی ھے اور اُن آٹھوں مختلف بحروں کو ایک ھی نام سے موسوم کرنے کے لئے کوئی دلیل باقی نہیں رھتی مثلاً " مفاعیلن مفاعیلن مفاعلن مفاعیلن "کو اگر جناب کاظم صاحب نے بحر ھزج کہا تو کچھ ھرج نہیں۔ لیکن مزاحف بحر " مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن " کو اھل عروض اِس لئے ھزج میں داخل کرتے ھیں کہ مفعول اُن کے تصور میں کن پھٹا مفاعیل ھے -اگر اِس تصور ھی کو نہ مانا جائے تو اس بحر کو ھزج سے کوئی تعلق نہیں رھتا-پس زحافات سے اِنکار کرنا اور دونوں بحروں کو ھزج کہنا گُڑ کھانے اور گُلگُلوں سے پرھیز کرنے کا مرادف ھے-مولانا کی دوسری تقسیم بھی اِسی قسم کی ھے-ھر بحر کی پہلی قسم رعنائی-دوسری سوسنی-تیسری سنبلی وغیرہ کہلاتی ھے-مگر جو ترتیب اُنہوں نے رکھی ھے نہ تو اِسی میں کوئی اُصول مدنظر رکھا گیا ھے نہ اِن ناموں میں ھی کوئی وجہ مشارکت معلوم ھوتی ھے مثلاً سوسنی نام کی تمام بحروں کو جمع کیا جاوے تو اُن میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں ملے گی جس کی وجہ سے وہ ایک ھی نام سے پکارے جانے کی مستحق ھوں-پس اس تقسیم کا لازمی نتیجہ یہ ھوگا کہ ھر بحر کے ساتھہ کم سے کم دو بے تعلق لفظ یا نام بھی رٹنے پڑا ں گے—

حکیم صاحب کی تیسری تقسیم بظاھر معقول نظر آتی ھے کیوں کہ اس میں اخلاط جداگانہ کی رعایت نظر آتی ھے-جن بحروں میں صرف گُل آتا ھے وہ زھری کہلاتی ھیں جن میں گُل اور صبا آتا ھے اُنھیں ازھری نام دیا گیا ھے - جن میں گُل اور چمنی موجود ھو وہ عبھری کے نام سے موسوم ھیں وغیر وغیرہ- جماعت بندی کا اصلی منشا یہ ھے کہ کم سے کم متشابہ بحور جو ایک ھی نظم میں جمع کی جاسکتی ھیں وہ ایک ھی گروہ کے ماتحت اِکھٹی ھو جائیں دیکھنا یہ ھے کہ اِس تقسیم سے یہ بات حاصل ھوتی ھے یا نہیں-اِس مطلب کے لئے ایک

ہی نظم کے دو مصرعوں کی تقطیع درج ذیل ہے —

مصرع	تقطیع کاظمی	نام کاظمی	تقطیع جدید	جدید نام
پرکھارت کی آمتا چھائی ہے	گُل گُل گُل جھمنی گُل گُل گُل	عبہری	فعلن فاعل فعلن فعلن	مربع رباعی سالم
بالوں کو کھولے رات آئی ہے	گُل جھمنی گُل گُل گُل گُل	عبہری	فاعل فعلن فعلن فعلن	ایضاً
اندھیاری میں گہرائی ہے	گُل گُل گُل گُل گُل گُل گُل	زہری	فعلن فعلن فعلن فعلن	ایضاً
جھڑی لگی ہے هلکی هلکی	صباصباگُل گُل گُل گُل	ازہری	فعول فعلن فعلن فعلن	ایضاً

مذکورہ بالا مثال میں چار متشابہ بحرین جمع ہوگئی ہیں۔ چاہئیے تو یہ تھا کہ اُن کے لئے کوئی ایسا عام نام ہوتا جس کے ماتحت وہ سب جمع ہوجاتیں لیکن جناب کاظم صاحب کی تیسری تقسیم اُلٹا ان کو متفرق کردیتی ہے۔ دو بحریں تو عبہری ہیں۔ ایک زہری ہے اور ایک ازہری۔ ان کی پہلی دو تقسیموں کے مطابق تیسرا مصرع متدارک ضمیرانی ہے باقی تین مصرعے کسی بحر میں بھی نہیں۔ جس سے اس تقسیم کی جامعیت کا اندازہ ہوسکتا ہے—

عروض جدید میں جو تقسیم ہم نے اختیار کی ہے وہ ان تمام نقائص سے پاک ہے۔ پہلی تقسیم ارکان کی تعداد کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ چونکہ اردو بحروں میں ارکان کی تعداد آٹھ تک ہوتی ہے اِس لئے بحروں کی آٹھ بڑی بڑی جماعتیں ہوجاتی ہیں۔ موحد (یک رکنی)۔ مثنی۔ مثلث۔ مربع۔ مخمس۔ مسدس۔ مسبع۔ مثمن (هشت رکنی) یہ تقسیم اِسی طرح کی ہے جیسے انگریزی میں Monometer و Dimeter وغیرہ ہے۔ مذکورہ بالا آٹھ جماعتوں کی تقسیم ارکان حروف کے لحاظ سے فریقوں میں کی گئی ہے۔ چونکہ ارکان دو قسم کے ہیں چہار حرفی

و پنج حرفی۔ پس جن بحروں کے تمام ارکان چہار حرفی ہیں وہ رباعی اور جن کے تمام ارکان پنج حرفی ہوں وہ خماسی اور جن میں دونوں قسم کے ارکان موجود ہوں وہ مرکب کہلاتی ہیں۔

فریقوں کو زحافات کے لحاظ سے چار جنسوں۔ سالم۔ محذوف۔ مقطوع اور مسبغ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اِس مختصر اور سادہ تقسیم سے چالیس لاکھ سے زیادہ بحور بہت تھوڑی جماعتوں کے ماتحت جمع ہو جاتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی اِس تقسیم میں یہ ہے کہ اِس میں متشابہ بحور کے لئے ایک ہی عام نام مل جاتا ہے۔ مثلاً مثال مذکورۂ بالا کی چاروں بحروں کا نام عروض جدید کی رو سے مربع رباعی سالم ہوتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر بحر میں چار چار رکن ہیں ہر رکن چار حرفی اور سالم ہے یعنی ہر بحر میں سولہ حروف ہیں۔ پس یہ نام مقصد تقسیم کو بوجہ احسن پورا کرتا ہے۔

عروض جدید میں عام نام کے علاوہ ہر بحر کا ایک خاص نام بھی تجویز کیا گیا ہے جسے نوعی نام کہتے ہیں۔ نوعی نام بنانے کا طریقہ نہایت آسان ہے۔ صرف چھ حروف کا مفہوم یاد رکھ لینے سے ہر شاعر دنیا بھر کی بحروں کا نام خود ہی بنا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر رکن کے لئے ایک ایک حرف مقرر کر لیا جاوے۔ چونکہ تمام بحور صرف چھ رکنوں سے بنتی ہیں اِس لئے صرف چھ حروف کافی ہوں گے۔ ہم نے عروض جدید میں جہاں اُردو اور فارسی کی تمام مروجہ بحریں مثال اور تقطیع کے ساتھ لکھی ہیں وہیں ہر بحر کا نوعی نام بھی درج کر دیا ہے۔ اُن ناموں کے بنانے میں مفصلہ ذیل حروف اِستعمال کئے گئے ہیں جو ارکان کے ہم وزن اسمائے الٰہی سے لئے گئے ہیں—

ب = فعلن = باری

ح = فاعل = حامد

ص = فعلن = صمد

ع = فعول = علی

ک = فعولن = کریم

م = فاعل = ماجد

مذکورہ بالا حروف کی مدد سے ہر بحر کا خاص یا نوعی نام بنایا جا سکتا ہے مثلاً "فعلن فاعل فعلن فعلن" کا نام "بعبب" اور "فاعل فعلن فعلن فعلن" کا نام "ععبب" ہوگا یہ نام ابتدا میں ضرور اجنبی معلوم ہوں گے مگر جس حالت میں "صلعم" سے ہم فوراً صلی اللہ علیہ و سلم سمجھ جاتے ہیں تو ذرا سی مشق کے بعد اِن ناموں سے بھی بحر کا وزن فوراً سمجھ میں آجائے گا اور یہی نام رکھنے کا مقصد بھی ہے۔ان ناموں میں بہت سی خوبیاں ہیں جن کا مفصل بیان ہم نے عروض جدید میں کیا ہے۔اِس جگہ صرف اِسی قدر لکھ دینا کافی ہے کہ بیس لاکھ پندرہ ہزار پانچ سو اڑتیس مختلف بحروں کے لئے علیحدہ علیحدہ نام نکل آتے ہیں جن کے مفہوم کا سمجھنا صرف چھ حرفوں کا مفہوم یاد کر لینے پر موقوف ہے۔اِس سے زیادہ آسانی اور کیا ہو سکتی ہے—

آخر میں ہم رباعی کی بارہ غیر مسبغ بحروں کی مروجہ و جدید تقطیع درج کرتے ہیں۔اگر ناظرین با تمکین جناب عظمت و کاظم صاحبان کے انداز پر تقطیع فرما کر اِس کا تقطیع جدید سے مقابلہ فرمائیں گے تو ہر طرز کا حسن و قبح خود ہی کھل جائے گا—

نمبر	تقطیع مروجہ	تقطیع جدید
۱	مفعولن مفعولن مفعولن فع	فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن
۲	مفعولن مفعولن مفعول فعل	فعلن فعلن فعلن فعلن فعہلن
۳	مفعولن مفعول مفاعیلن فع	فعلن فعلن فاعل فعلن فعلن
۴	مفعولن مفعول مفاعیل فعل	فعلن فعلن فاعل فعلن فعہلن

تقطیع جدید	تقطیع مروجه	نمبر
فعلن فعلن فعول فعلن فعلن	مفعولن فاعلن مفاعیلن فع	۵
فعلن فعلن فعول فعلن فعملن	مفعولن فاعلن مفاعیل فعل	۶
فعلن فعملن فعلن فعلن فعلن*	مفعول مفاعیلن مفعولن فع	۷
فعلن فعملن فعلن فعلن*فعملن	مفعول مفاعیلن مفعول فعل	۸
فعلن فعملن فاعل فعلن فعلن	مفعول مفاعیل مفاعیلن فع	۹
فعلن فعملن فاعل فعلن فعملن	مفعول مفاعیل مفاعیل فعل	۱۰
فعلن فعملن فعول فعلن فعلن	مفعول مفاعلن مفاعیلن فع	۱۱
فعلن فعملن فعول فعلن فعملن	مفعول مفاعلن مفاعیل فعل	۱۲

مذکورۂ بالا بارہ بحور کا عام نام "مخمس رباعی سالم" ہے اگر اِن میں سے ہر ایک کے بعد ایک ایک حرف موقوف اور زیادہ کر دیا جائے تو رباعی کی باقی ماندہ بارہ بحور بھی پیدا ہو جائیں گی اور اُن کا عام نام "مخمس رباعی مسبغ" ہوگا۔ تقطیع جدید نہ صرف اکثر بحور کو سالم بنا دیتی ہے بلکہ اس میں متشابہ بحور کا مقابلہ بھی نہایت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے گا تو یہ خوبی کسی اور طریق میں نہیں ملے گی —

ایک خلش سی ایک چبھن سی جس میں مزہ بھی آتا ھے

از

جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب

جان کی تہ میں کوئی بیٹھا ھے
ایک بے چینی کھٹکا ھے
چٹکیاں بیٹھا کوئی لیتا ھے
ایک کھٹکتا کانٹا ھے
ایک خلش سی ایک چبھن سی جس میں مزہ بھی آتا ھے

اس بے چینی سے سرگرداں
انساں سدا رہتا ھے
اس انجان کھٹک سے حیراں
سکھ ڈھونڈتا دکھ سہتا ھے
زیست کے طوفان جسم کی کشتی میں بے قابو بہتا ھے

تنک اسے ھی بھوک کا جانا
پیٹ کا دھندا پھیلا یا

جینا ٹھیرا کھانا کھانا
پیٹ سے بڑھکر جب پایا
مال بنایا عیش منایا دنیا سے چین سنایا

———:O:———

تیر اِسے ھی عشق کا جانا
دل چوٹی میں اٹکایا
حسن کا بنکر اک دیوانا
عشق کا افسانہ بنایا
ھجر کی راتیں وصل کی گھڑیاں چین کسیطرح نہ پایا

———O———

حق کی طلب بھی اسکو ھی مانا
مذھبؔ کا رنگ جمایا
صومعہ۔مندر۔مسجد۔گرجا
میں اپنے سر کو جھکایا
دل کو ٹٹولا روح کو چھانا چین نہ پانا تھا نہ پایا

———:O:———

علم کی چیٹک اسکو سمجھا
عقل کا ایک جال بچھایا
قدرت کے بھیدونکو پھانسا
جگ کی ھر چیز پہ چھایا
برق کو باندھا پون کو جیتا چین مگر ھاتھ نہ آیا

———:O:———

سانس کے جھونکوں سے یہ شکوہ

جان کا جب تک کھلتا ہے

سکھ دکھ کا ہے گورکھ دھندا

دل کا لنگر ہلتا ہے

ایک کھٹک ہے ایک چبھک ہے جس میں مزہ بھی ملتا ہے

تبصرے

ادب

ناٹک ساگر

(یعنی دنیاے ڈراما کی تاریخ)

میاں نور الہی اور صاحبزادہ محمد عمر صاحبان سے اُردو کے ناظرین بخوبی واقف ہیں۔ڈراما پر اُن کے بعض مضامین اِس رسالے میں شایع ہو چکے ہیں جو اِسی کتاب کے اجزا تھے۔نیز اِن کے بعض ڈراموں پر (جن میں سے اکثر ترجمے تھے) تبصرے بھی لکھے جا چکے ہیں۔اِن دونوں صاحبوں نے اِس بات کا بیڑا اُٹھایا ہے کہ دنیا کے بہترین ڈراموں کا ترجمہ اُردو زبان میں کریں گے۔ ڈرامے ہی تالیف کریں گے۔مضامین بھی ڈرامے ہی پر لکھیں گے اور غالباً باتیں بھی ڈرامے ہی کی کرتے ہوں گے۔غرض اِن کا اوڑھنا بچھونا ڈراما ہے۔بعض لوگوں کے خاص خاص لفظ تکیۂ کلام ہوتے ہیں گویا وہ ٹھیکے ہیں۔جن کی مدد بغیر وہ کوئی جملہ نہیں بول سکتے۔اسی طرح ڈراما اِن دونوں صاحبوں کا "تکیۂ خیال" ہے۔کوئی مضمون ہو کوئی خیال ہو وہ یا تو ڈرامے کے متعلق ہوگا یا اُس سے ٹکرا کر نکلے گا۔یہ اسی انہماک کا نتیجہ ہے کہ اُنہوں نے دنیا بھر کے ڈراموں کی تاریخ لکھ ڈالی ہے جس میں ہر ملک کے مشہور ڈراما نگاروں اور ایکٹروں کے خاص خاص کارنامے۔ممالک عالم کے اِسٹیج کے عروج و زوال کے اسباب اور فنِ ڈراما کی ارتقائی کیفیت بیان کی ہے۔اُردو زبان میں یہ پہلی

کتاب ہے جو اِس فن پر ایسی جامع حیثیت سے لکھی گئی ہے۔کتاب کیا ہے درحقیقت ایک ساگر ہے جو دلچسپ اور مفید معلومات سے بھر پور ہے—

ہندوستان کا باب ایک سو بارہ صفحہ پر ہے جس میں اِس ملک کے قدیم اور جدید ڈرامے پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔جس میں اُردو ڈرامے کے حصے میں تقریباً اڑتیس صفحے آئے ہیں بہت ہی پر لطف مضمون ہے اِس میں اُردو تھیٹروں اور ناٹکوں کی پوری تاریخ اور اُن کی تنقید۔ڈراموں کے مصنفوں کا ذکر۔اُن کی خصوصیات۔مشہور اور ہردلعزیز ایکٹروں کے حالات۔اُن کا اثر۔لوگوں کا شوق۔فن اور متعلقات فن کے متعلق تنقیدی اور ادبی نکات۔یہ سب باتیں ایسی خوبی سے لکھی ہیں کہ لایق مصنفین کی تحقیق اور کاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔اِس سے پہلے کبھی اِس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ کسی نے اِس مضمون پر بحث نہیں کی تھی۔لیکن اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اب تک اُردو زبان میں کوئی اعلیٰ درجے کا ڈراما نہیں لکھا گیا۔البتہ بنگالی زبان کو یہ عزت حاصل ہے۔وہاں ہماری طرح اِس فن کو معیوب خیال نہیں کیا جاتا۔ابھی ہمیں کچھ دنوں انتظار کرنا پڑے گا کہ اُردو میں ایسا ڈراما لکھا جائے کہ ہر لحاظ سے اعلیٰ پایہ کا ہو اور اُس کا ترجمہ غیر زبانوں میں کیا جائے۔اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں اِس فن کو حقیر سمجھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اِس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔اس کی حالت بعینہٖ وہی ہے جو اِس زمانے میں موسیقی کی ہو گئی ہے۔حالانکہ یہ وہ چیز ہے کہ اگر اس سے سلیقہ سے کام لیا جائے تو بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں اور اصلاح حالت اور اصلاح ذوق میں بہت بڑی مدد دے سکتا ہے۔اِس کی بڑی ذمہ داری ہمارے ادیبوں اور صاحب ذوق حضرات پر ہے۔کئی سال کا ذکر ہے کہ حیدرآباد میں ایک تھیٹر آیا ہوا تھا۔ہمارے ایک دوست نے اُسی زمانے میں ایک ڈراما لکھا تھا وہ اُنھوں نے تھیٹر کے مالک کو سنایا بعض مقامات سن کر اُسے بہت رقت ہوئی۔

سیریلس کے بعد اُس نے ڈرامے کی بہت تعریف کی اور مصنف کی خوب داد دی مگر ڈرامے کے لیلے سے معذوری ظاہر کی۔میں نے سبب پوچھا تو کہا کہ ہم اسٹیج کے لئے ایسے ڈرامے لیتے ہیں جنہیں سن کر چوتھے درجے کے بیٹھنے والے تحسین و آفرین کے نعروں سے داد دیں—

جب ڈرامے کا معیار یہ ٹھیرا تو ظاہر ہے کہ اس کی حالت کیا ہوگی۔اِس کتاب کے شروع میں حضرت کیفی (جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب دہلوی) نے ایک عالمانہ اور محققانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے جس میں اُنہوں نے بڑی سچی بات لکھی ہے "یہاں میں ایک سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔تھیٹر میں ایک کھیل ہو رہا ہے اور اسٹیج پر ایسی تقریر کرائی جاتی ہے یا ایک ایسا سین دکھایا جاتا ہے جسے مذاق سلیم گوارا نہیں کر سکتا۔اِس پر اگر دس بیس بھلے آدمی حاضرین میں سے اظہار ناپسندیدگی کریں یا تماشے سے اُٹھ جائیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ تماشا کرنے والی کمپنی پر اس کا کچھ اثر نہوگا۔ہوگا اور ضرور ہوگا۔اِس کی نظیریں موجود ہیں"۔ہماری اخلاقی بزدلی نے ایک ڈرامے ہی کو کیا ہمارے بہت سے معاملات کو خراب کر رکھا ہے۔اصلاح و ترقی کے لئے اخلاقی جرأت سب سے زیادہ ضروری چیز ہے—

ہمیں یقین ہے کہ اِس کتاب کی اشاعت ڈرامے کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو رفع کرے گی۔بہت سے ایسے نکتے معلوم ہوں گے جن سے ہم بے خبر تھے اور ملک کے انشا پردازوں کے لئے ہدایت کا کام دے گی۔جو صاحب ڈرامے سے شوق رکھتے ہیں یا جن کا رجحان اِس طرف ہے اُن کے لئے یہ کتاب ایک نعمت ہے نور صمر صاحبان قابل مبارک باد ہیں کہ اُنہوں نے اُردو ادب میں بہت اچھا اضافہ کیا ہے اور ایک ایسے مضمون پر کتاب لکھی ہے جس سے ہماری زبان خالی تھی—

ناظرین کو حیرت ہوگی کہ یہ پونے پانسو صفحہ کی کتاب ایک ہفتے

میں چھپ کر تیار ہوئی ہے یہ لاہور کے مطابع کا کمال ہے۔یہ تو خیر چھپائی کا کام ہے ہم نے سنا ہے کہ وہاں کے بعض اہل قلم ہفتہ بھر میں ایسی ضخیم کتاب تصنیف کر ڈالتے ہیں۔عجلت کے آثار اس کتاب میں بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں مگر وہ مصنفین کی محنت۔وسعت نظر اور مضمون کی اہمیت کے مقابلے میں اس قدر خفیف ہیں کہ قابل ذکر نہیں —

(کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔کاغذ بھی بہت اچھا لگایا ہے۔قیمت فی جلد دو روپئے آٹھ آنے اور مجلد کے تین روپیہ ہے۔شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتی ہے) —

کلام شاد حصۂ اول

مولوی سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی۔ہندوستان کے شعراء قدیم کی زندہ یادگار اور مشاہیر روزگار میں سے ہیں۔کلام شاد مدت مدید سے اُردو کے نامور علمی و ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے اور اہل ذوق ہمیشہ مزہ لیتے رہے ہیں۔شکر ہے کہ انجمن ترقی اُردو پٹنہ کی مساعی جمیلہ سے اُس کا پہلا حصہ چھپ کر شائع ہوگیا ہے۔یہ ایک سو ساٹھ صفحات پر صرف غزلوں کا مجموعہ ہے۔آغاز میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عظیم آباد کو اُردو سے کیا نسبت ہے اور جناب شاد کا پایۂ شعر کیا ہے۔بقول مقدمہ نگار جناب شاد کے سلک سخن میں قصائد۔مثنویاں۔رباعیات۔غزلیں۔افراد سب کچھ ہے اور آپ کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہیں ہے۔اِس کے دیکھتے یہ مجموعہ ایک وسیع خرمن میں سے ایک خوشہ کا مصداق ہے یہ بھی قدردانان شاد کے ہاتھوں تک جس دشواری سے پہونچا ہے اس کا دلچسپ خلاصہ یہ ہے کہ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ مصنف

نظر ثانی کرانے اور نیز حک و اصلاح کے اُن اشارات سے مصنف نے نظر در نظر کے بعد کاغذوں کے حواشی اور اطراف میں وقتاً فوقتاً بنائے تھے مرتب و جامع اصحاب نے اُن سے پہلوتہی کی اور یہ اصحاب اُس کی یہ معذرت پیش کرتے ہیں کہ نظر ثانی اور اشارات و اصلاحات کو سمجھنے کے لئے یہ مجموعہ سپرد کیا جاتا تو ہماری محنت بھی اُسی طرح دریا برد ہوجاتی جس طرح اِس سے پہلے مصنف کی کئی محنتیں غایت احطیت کی بنا پر غارت ہوچکی ہیں۔ اِس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی رائے اور احتیاط کے خلاف یہ مجموعہ شائع ہوا ہے۔مگر ہم حیران ہیں کہ اِسے غایت احتیاط کہیں یا اِن بزرگوں کی کمزوری اور یہ خوف کہ کہیں ہدف اعتراض و نشانۂ ملامت نہ بنیں۔حالانکہ یہ نہیں جانتے کہ انسان خطا و نسیان سے مرکب ہے احتیاط کی بھی حد ہوتی ہے۔اہل ذوق اب لفظی فروگذاشتوں سے زیادہ تخیل علو مذاق اور جذبات کو دیکھتے ہیں۔یہ وہ زمانہ نہیں کہ اِس سے ڈرا جائے۔بہرحال جو حضرات جناب شاد کے قدردان۔عمدہ تغزل۔اعلیٰ مذاق۔شاعری کے دلدادہ ہیں۔وہ اِس مجموعہ کو مغتنم سمجھیں کیونکہ اگر اس کی طباعت و اشاعت خود جناب شاد کے دست اختیار میں ہوتی تو شاید ہماری آنکھیں اِس سے ہمیشہ محروم رہتیں۔اِس باب میں جناب شاد کی نیت بھی (خدا نخواستہ) بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کا شاہد خود اُن کا یہ شعر ہے—

دفتر شعر کو یوں رکھتا ہوں اب بستوں میں
جیسے میت کو بہ حسرت کوئی کفناتا ہے

جناب شاد کی عمر اِس وقت اُسی (۸۰) سال کی ہے اور غالباً مولانا ندوی کا یہ خیال صحیح ہو کہ اب جناب شاد کا کوئی ہم عصر شاید نہ نکل سکے۔اِس لحاظ سے بھی کلام شاد قدر و عزت کا مستحق ہے۔لیکن اصل قدر اِس وجہ سے ہونا چاہئے کہ اِس میں شعر کی تقریباً کل خوبیاں پائی جاتی ہیں۔اعلیٰ مذاق۔

شاعری-مضامین عالیہ-خیالات کی لطافت-بیان میں سادگی و صفائی اور ساتھ ہی الفاظ کی صحت-محاورات کا تتبع-فارسی ترکیبوں کا استعمال کے ساتھ استعمال ہے اور بقول مولانا ندوی اِس لفظی حیثیت سے شاد کو لکھنؤ کا اور معنوی حیثیت سے دلی کا شاعر کہیں تو بجا ہے-اُن کے کلام میں قدیم دلی کا رنگ سخن بہت زیادہ نمایاں ہے-بندش-ترکیب اور زبان قدیم شعرا کی سی معلوم ہوتی ہے-دلی کی ویرانی کے بعد لکھنؤ اور دوسرا مرکز عظیم آباد ہی تھا اس دور میں اچھے اچھے اُردو کے شاعر پیدا ہوئے-مگر اب شاد ہی کی ذات رہ گئی ہے-جناب شاد ابتدا میں فریاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے پھر مونس لکھنؤی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے-لیکن مقدمہ نگار صاحب نے خدا جانے اِس حقیقت کو کیوں پردۂ خفا میں رکھنا پسند کیا حالانکہ جناب شاد نے اکثر مقطعوں میں مونس کو اِس طرح یاد بھی کیا ہے-مثلاً فرماتے ہیں—

انیس سے بھی سخن سنج نے ثنا کی شاد
یہ چند شعر جو مونس کو ہم سنانے لگے
مجھی پہ کیا ہے عدو تک ہے معترف بخدا
زبان حضرت مونس کا شاد کیا کہنا
ہمیشہ مونس مرحوم یاد آئیں گے شاد
نہ دل سے محو یہ انداز گفتگو ہوگا

گو بقول مقدمہ نگار یہ دیوان شاد کے بلا انتخاب اور نا مرتب کلام کا ایک مختصر مجموعہ ہے اُن کی شاعری کا مکمل نمونہ نہیں-پھر بھی اس میں اہل ذوق کے لئے بہت کچھ سامان دل چسپی موجود ہے-میر کے زمانہ کا انداز خصوصاً بہت پایا جاتا ہے-مثلاً—

موج و مجنوں کی جدائی ہے بہت شاق مجھے
زندگی کرنے سے بھی شاد دم اُکتاتا ہے

زندگی کرنا میر ہی کے زمانہ کا محاورہ ہے۔اب زندگی گزارنا بولتے ہیں اور مثلاً ـــ

اِسی کوچہ میں رہبر کو بھی رستہ سدہ نہیں ملتا
خودی اے شاہ انساں کی سمجھ کا واک ہوتی ہے

سدہ کا استعمال میر ہی کے زمانہ کا سا ہے بہت سے ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن کو اب بعض تنگ نظر مقامی شعراء دہلی و لکھنؤ نے ترک کردیا ہے اور اُن کے ترک پر بڑے فخر ومباہات کا اظہار کیاجاتاہے۔جیسے پر بمعنے مگر اور اُس کا مخفف پہ۔یاں۔واں۔تاک۔وغیرہ۔طباعت کی بھی بعض فاش غلطیاں محسوس ہوتی ہیں مثلاً ـــ

اے ازلی الوجود اے ابدی البقا
بے ادبانہ نہ چل حلقۂ عبدیت میں آ

مصرعۂ ثانیہ میں عبدیت کسی صورت نہیں کھپتا۔مصرعہ غیر موزوں ہوا جاتاہے۔غالباً (حلقۂ عبدی) ہوگا۔بعض اور بھی قابل ذکر مقام نظر آتے ہیں۔مثلاً ـــ

ادق مضموں کہاں اور اُس میں یہ لفظوں کی شیرینی
نکالا جوئے شیر اِس کوہ سے اے شاہ کیا کہنا

اس شعر میں جوئے شیر کو مذکر کہا ہے۔حالانکہ "جو" مونث ہے۔ممکن ہے سہو کتابت و طباعت ہو۔ایک جگہ تلچھٹ کو ترچھٹ کہا اور مذکر باندھاہے۔یہاں کتابت وطباعت کی غلطی نہیں کہہ سکتے۔شعر یہ ہے ـــ

زلال پیرمغاں دے چکا تھا رندوں کو
جو تہ نشیں تھا وہ ترچھٹ مجھے نچوڑ دیا

صحیح اور فصیح تلچھٹ ہی ہے۔تل (تلا۔تلی) اور چھٹ (چھٹا ہوا۔چھٹی ہوئی) سے مرکب ہے۔ممکن ہے ترچھٹ بہار کی یا قدیم زبان ہو۔کیونکہ بعض الفاظ میں ل کا ر سے بدل ہوجاتا ہے اور بول چال میں عوام اکثر الفاظ میں ل کی جگہ ر

بول جاتے ھیں اور ممکن ھے کہ کسی نے مذکر بھی کہا ھو مگر اب بالاتفاق یہ لفظ تلچھٹ اور مونث ھے - ایک جگہ مسالہ کو مصالح کہا ھے - گو اصل مصالح ھے مگر بول چال میں مسالہ ھی ھے - کوئی مصالح - مصالحہ نہیں کہتا - شعر یہ ھے —

شکستہ جام ھمیشہ شکستہ ھے ناصح
ھزار تونے مصالح لگا کے جوڑ دیا

اِسی قسم کے بعض اور الفاظ ھیں جیسے

جو کچھہ سہایا آپ نے دل اُس کو سہ گیا
ھے یہ کہ مرنے والے کی طینت میں شر نہ تھا
غم فراق میں اے آسماں نہیں موقوت
وہ جو سہائیں غریبوں کو ھر طرح سہنا

سہانا - سہنا کا مصدر متعدی زبانوں پر نہیں ھے - قدیم بول چال میں شاید ھو مگر یہ بہت اچھا لفظ اور بول چال میں لانے کے قابل ھے - ایک شعر ھے -

وُہ زلفیں بے محابا آئینے سے جھک کے کہتی ھیں
کہاں دیکھا ابھی اے آنکھہ والے پیچ و خم میرا

کہاں دیکھا ھے - محاورہ ھے - ضرورت شعری نے (ھے) کے حذف پر مجبور کیا - اور ایک شعر ھے —

ھوا سرسبز اُمیدوں کا نہ اپنی جب کوئی دانہ
بہت رویا کیا منہ دیکھہ کر اَبرِ کرم میرا

راقم کا خیال ھے کہ دوسرے مصرعہ میں بہت رویا - چاھئیے - یا - دیر تک رویا کیا - ایک مصرعہ میں لفظ (ابھی) مشدد معلوم ھوتا ھے حالانکہ دوسرے مصرعہ میں غیر مشدد ھے —

آکے گلی میں دو قدم ابھی بڑھے تھے اھل شوق
پھول گیا ابھی سے دم ناقۂ عرش تاز کا

اول مصرعہ میں ابھی کو غیر مشدد پڑھئے تو موزونیت میں ضرور فرق آتا ہے۔ ممکن ہے عروض نے اسے جائز رکھا ہو۔ اور کسی زحاف سے تعبیر کردیا ہو مگر خوشگوار نہیں بلکہ ناگوار ہے۔ ایک شعر میں ردیف ٹھیک نہیں بیٹھتی اور یہ وہ نقص ہے جسے ہمارے قدیم خیال کے شاعر گناہ کبیرہ اور بہت مذموم جانتے ہیں۔ شعر یہ ہے۔

بڑھائے جس نے قدم حد سے جانب دنیا
تمام عمر گرفتار مکر و کید ہوا

دوسرے مصرعہ میں ہوا خلاف محاورہ ہے۔ تمام عمر کو گرفتار ہوا۔ یاتمام عمر گرفتار رہا اہل زبان بولتے ہیں۔ قدردانان شاد شاید اِسے نہ مانیں۔

دماغ عرش پہ اپنا پہونچ گیا ساقی
کہاں سے اِن کٹی نظروں میں یہ اثر آیا

کٹیلی نظر۔ کٹیلی نظریں تو البتہ سنا اور دیکھا ہے۔ مگر کٹی نظریں۔ نظر سے نہیں گزریں۔ شاید بہار میں بولتے ہوں یا بہت قدیم زبان ہو جو اب بالکل متروک ہے۔

شاد کے آگے بھلا کیا ذکر یار
نام اِدھر آیا کہ اُس نے رودیا

اُس نے رودیا۔ میں نے رودیا۔ یہ نے کا استعمال اگرچہ جائز رکھا گیا ہے۔ مگر قباحت سے خالی نہیں۔ کانوں کو ناگوار ہے۔ میں رودیا۔ وہ رودیا۔ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور سنئے—

رند پھیلائے ہیں چلو کو تکلف کیسا
ساقیا ڈھال بھی دے جام خدا ساز آیا

چلو کے ساتھ پھیلانا۔ خلاف محاورہ معلوم ہوتاہے۔ ڈھالنا بھی نامانوس اور غالباً قدیم زبان ہے۔ اِن معمولی مسامحات سے قطع نظر کیجئے۔ تو کلام شاد میں جیسا کہ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں بیش از بیش سامان دل چسپی ملتاہے۔ چند اخلاق

و عرفان کے نمونے ملاحظہ ہوں—

جہاں ہے مکتب عبرت سبق ہے چپ رہنا
بڑا گناہ یہاں ہے الف سے بے کہنا
موج فنا مٹا نہ دے نام و نشاں نمود کا
دیکھ حباب کی طرح شوق نہ کر نمود کا

دیوان اس حقیقت نما مطلع سے شروع ہوتا ہے—

کلید اشعار دلکش قفل معنی ذہن انساں کا
انہیں شعروں سے کُھل جاتا ہے ذوق ارباب عرفاں کا

قومی و ملی رنگ میں ڈوبے ہوئے۔اخلاق و دعوت عمل کی تعلیم دینے والے اشعار بھی ہیں جن کی طرف زمانہ شعرا کو لایا اور لا رہا ہے۔فرماتے ہیں—

جان صداقت پہ دے صدق ہے فطرت تری
زیست کی پروا نہ کر زیست ہے دام فنا
مورد آفات رہ ظلم کا تابع نہ بن
بھول نہ بھولے سے بھی واقعۂ کربلا
گلشن حق الیقین سامنے آنکھوں کے ہے
چہرے سے اپنے ہٹا پردۂ بیم و رجا
خاک کے پتلے سنبھل خاک کا پتلا نہ بن
تیری تو مسند ہے عرش خاک کجا تو کجا

اِس غزل کے اکثر شعر درس حقیقت اور دعوت عمل ہیں اور فرماتے ہیں—

تربت پہ بلائے گا اُن کو یہ خام خیالی ہے دل کی
وہ گھر میں کوے کا کیا جاکر جس نے سر میداں کچھ نہ کیا

———:o:———

آقا نہ عراق و شام و عجم۔دنیا نہ ہوئی ویراں تو کیا
جل تھل نہ لہو سے تونے بھرا تو خون مسلماں کچھ نہ کیا

—:o:—

نہ کر یہ دھیان کہ معدوم محض تو ہوگا
برنگ سبزۂ نوخیز پھر نمو ہوگا

یہ پوری غزل اخلاق و عرفان کی عمدہ تصویر ہے –

—:o:—

سبق السعی ملی کا بھلایا شاد کیوں تم نے
گلہ کس کا تمہیں خود پائے حواب آلود نے مارا

—:o:—

زمانہ جن کو مٹاچکا ہے مٹائے جاتا ہے آج تک بھی
جئیں گے اک روز مرکے پھر وہ انہیں کی ہمت عیاں رہے گی

—:o:—

ایک آدھ شعر لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم کے رنگ میں بھی نظر آتا ہے مثلاً ایک مقطع ہے—

نہ پوچھو مصاحبن قوم کی اے شاد حالت کو
کمیٹی میں رزولیشن کی ہے بھرمار چندا ہے

مگر بات یہ ہے کہ جناب شاد کا یہ رنگ ہی نہیں ہے۔جناب شاد نے شعراء قدیم کی سنت جاریہ کے موافق ناصح و واعظ کی بھی خبر لی ہے۔بادہ و ساقی کو بھی سراہا ہے۔مگر بڑی خوبی یہ ہے کہ سنجیدگی و متانت کہیں ہاتھ سے نہیں گئی ہے اور بحیثیت مجموعی کلام شاد میں بہت کم ایسے شعر ہیں جو نظر انتخاب میں نظری ہوسکیں۔مذاق کا ابتذال شروع سے آخر تک کہیں نظر نہیں آتا۔اب چند تغزل کے نمونے ملاحظہ ہوں—

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا میرا میں باز آیا
مغبچے ہیں متحیر متبسم ساقی
پینے والے تجھے پینے کا نہ انداز آیا

———:o:———

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا
اُبھر اُبھر کے یہ کہتی ہے دل کی بیتابی
برا ہے بات کا جی میں بہت لئے رہنا

اِس غزل میں اکثر شعر بہت پاکیزہ نکالے ہیں—

خدا کرے کہ اب اُس کا عوض ہو دلکو نصیب
جہاں میں جتنے مصیبت کے دن تھے بھر آیا
رہا بھرے ہوئے دل کا نشاں ہے ماتھے پر
کہاں کا داغ کہاں دفعتاً اُبھر آیا

———:o:———

آخر میں ہم جناب شاد کے ایک نہایت لطیف مستزاد سے چند شعر لکھ کر ناظرین سے داد طلب ہیں —

دل تو بدنام ہے خود شاد عبث اُس کا گلا — کہتے آتی ہے حیا
یہ اُمیدیں یہ تمنا جنھیں برسوں پالا — یہ کب اپنی ہیں بھلا
وہ تری کج روشی کج کلہی کینہ وری — دلبری عشوہ گری
کون غش کھا کے گرا کون سر راہ گرا — پھر کے دیکھا نہ ذرا
ہاں مارا تری آنکھوں نے جو کی پھر کے نگاہ — نہ ملی دل کو پناہ
یار کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا — لاکھ روکا نہ رکا

رس بھری ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل — آگئے پھول میں پھل
اک یہ اجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا — اور سوکھا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائیں وہ پپیہوں کی پکار — دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یونہیں رونے میں کٹا — کیا کہیں چپ کے سوا
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی — بے پئے متوالی
سانولا رنگ نمک ریز جراحات جفا — اف کہاں دھیان گیا
آنکھیں روئی ہوئی آواز ہے بھرائی ہوئی — باتیں شرمائی ہوی
اِس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتا — شاد قسمیں تو نہ کھا

سبحان اللہ کیا متزاد ہے ہم ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ کلام شاد ضرور خریدیں اور پڑھیں۔ لکھائی چھپائی معمولی ہے اور قیمت ۲ روپیہ بلحاظ حجم زیادہ ہے —

(ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اُردو پٹنہ عظیم آباد)

(مع)

سیر المصنفین

(جلد اول)

اس کتاب کے مولف مولوی محمد یحیی صاحب تنہا بی۔اے ہیں۔اس میں اُنھوں نے اُردو نثاروں کے حالات اور اُن کی تالیف و تصنیف سے بحث کی ہے۔ شعرا کے تذکرے ہماری زبان میں بہت سے لکھے گئے ہیں لیکن اب تک اُن ادیبوں کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی تھی جن کا کلام نثر میں ہے۔جناب تنہا صاحب نے یہ بہت اچھا کام کیا ہے اور ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔یہ پہلی جلد ہے اور اس میں انھوں نے تین دور قائم کئے ہیں۔پہلا دور سنہ ۱۷۹۷ء سے سنہ ۱۸۳۹ء

تک-دوسرا دور سنه ۱۸۳۶ ع سے سنه ۱۸۵۷ع تک اور تیسرا دور سنه ۱۸۵۷ع سے سنه ۱۹۱۴ع تک اور چوتھا دور سنه ۱۹۱۴ع سے آغاز ہوتا ہے-اس جلد میں صرف پہلے دو دور ہیں-قابل مولف کی رائے میں نثر کا دور گویا کلکتے کے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے شروع ہوا ہے-اس سے قبل کی نثر کا بھی سرسری سا ذکر کیا ہے یعنی صرف مرزا رفیع سودا اور اُن سے قبل فضلی کی نثر کا نمونہ دیا ہے-اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے مؤلفوں اور مترجموں کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور انہیں کے ساتھ میر انشاالله خاں-مولوی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر اور مولوی اسمعیل شہید کی نثروں کے نمونے بھی درج ہیں-اس دور کے مصنفوں کے حالات بہت کم ملے ہیں-دوسرے دور میں فقیر محمد خاں گویا-مرزا رجب علی بیگ سرور-مرزا غالب-ماسٹر رام چندر-مولانا غلام امام شہید-خان بہادر منشی غلام غوث بے خبر-منشی امیر احمد مینائی کے حالات اور اُن کے کلام کے نمونے ہیں —

کتاب کے شروع میں تمہید کے نام سے تقریباً ایک جز کا ایک مضمون ہے جس میں یہ بحث کی ہے کہ اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے-اس کے بعد رسم الخط اور اُردو لٹریچر کا ذکر کیا ہے-اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے ابتدا میں اُردو کی پیدائش پر چند صفحے لکھے ہیں اور پھر پہلا دور شروع ہو جاتا ہے —

پہلے دور کا لکھنا بہت مشکل کام ہے-اس کے لئے موجودہ کتابوں میں سامان کم ملتا ہے جو کچھ آب حیات یا دوسری کتابوں اور رسالوں میں ملا وہ لکھ دیا ہے ذاتی تحقیق بہت کم ہے-اس کے لئے بہت مہلت اور وقت درکار تھا-ورنہ اس قدر جلد ایسی کتاب تیار نہیں ہو سکتی تھی-قابل مولف نے اگرچہ بعض مقامات میں حوالے دئے ہیں اور کہیں کہیں سرسری طور سے ماخذ کا ذکر کر دیا ہے لیکن بعض جگہ اُن سے فرو گزاشت ہو گئی ہیں-کئی مقام اس کتاب

بہت ایسے نظر آئے جو دوسروں سے نقل یا اخذ کئے ہیں مگر مطلق حوالہ نہیں دیا مثلاً فورٹ ولیم کالج کے مولفین اور تالیفات کا اکثر حصہ "رسالہ اُردو" کے مضمون سے منقول یا ماخوذ ہے مگر کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔دوسروں کی تحقیق سے فائدہ اُٹھانا بیشک جائز ہے لیکن اُن کی محنت کو تسلیم نہ کرنا ظلم ہے—

چونکہ بعض حصوں کی بنیاد آب حیات پر ہے اس لئے کہیں کہیں وہی قصے دہرا دئے ہیں جو مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔حالانکہ اُن کی صحت میں بہت کچھ شبہ ہے یہی حالت بعض اور منقولی حصوں کی ہے جن کے بعض بیانات بعد تحقیق سے غلط ثابت ہوئے ہیں لیکن قابل مولف نے اِتنی تکلیف گوارا نہیں کی کہ بعد تلاش اس کی تصحیح کر دیتے۔ دوسروں کی عبارت بجنسہ نقل کر دی ہے —

بہرحال کتاب اور مولف کی محنت قابل قدر ہے۔جو کچھ قابل مولف نے اس میں جمع کر دیا ہے اور کوشش سے جو سامان فراہم کیا ہے وہ بہت غنیمت ہے اور چونکہ اُردو نثر نگاروں کے حالات میں یہ پہلی کتاب ہے اِس لئے امید ہے کہ اُردو ادب کے شایق ضرور اس کی قدر کریں گے—

لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے۔تعداد صفحات ۲۲۴۔دو روپئے میں منیجر دارالاشاعت غازی آباد (ممالک متحدہ آگرہ) سے مل سکتی ہے—

نقش فرنگ

(اقصاے مغرب کی سیر کے دلاویز تاثرات)

قاضی عبدالغفار صاحب کے نام سے کون واقف نہیں۔جمہور و صباح کے کالموں میں اُن کے قلم نے جو جو گلفشانیاں کی ہیں اُس کا لطف اِس کتاب میں آگیا۔

سابق وزیر اعظم انگلستان-مسٹر لائڈ جارج کے بلاوے پر سلطنول خلافت کمیٹی کی طرف سے خلافت کے معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے جو جماعتصاحب انگلستان تشریف لے گئے تھے اِن میں قاضی صاحب بھی تھے- قاضی صاحب اِس وفد کے سکریٹری تھے اِن ایام میں اُنھوں نے لندن اور انگلستان کے مقامات کے علاوہ پیرس-روما اور سوئٹزرلینڈ کی بھی سیاحت فرمائی-یہ کوئی معمولی سفرنامہ نہیں ہے بلکہ یورپ میں جاکر جوکچھہ انھوں نے دیکھا اور اُس سے جو خیالات اُن کے دل میں پیدا ہوئے اُن کی تصویر ہے جس میں اُن کے قلم نے طرح طرح کی گلکاریاں کی ہیں- یورپ کے شہروں میں پیرس اور یورپ کی اقوام میں فرانسیسی اُنھیں سب سے زیادہ پسند ہیں-وہ فرانسیسیوں کی بے تکلفی-اخلاق اور زندہ دلی کے بہت مداح ہیں- پہلے روز جب وہ بمبئی سے روانہ ہوئے ہیں تو جہاز میں چند فرنگی خاتونوں کے لباس-اُن کی خودآرائیوں اور کرشموں کو دیکھہکر اس قدر طیش میں آگئے تھے کہ گویا آپے سے باہر ہوگئے تھے (اور جیسے پڑھکر مولوی عبدالماجد صاحب کو بھی جلال آگیا تھا) پیرس کی رعنائیوں اور دلکشیوں کے سامنے وہ سب بھول جاتے ہیں اور بے اختیار اُن کی داد دینے لگتے ہیں—

وزیر اعظم سے وفد کی ملاقات بہت ہی پر لطف لکھی ہے-روما پہنچ کر سلطنت روما کی تاریخ انہیں یاد آجاتی ہے اور وہاں کی بعض قدیم عمارتوں اور آثار کو دیکھہ کر بعض تاریخی مناظر اس خوبی سے لکھے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے سماں سا کھچ جاتا ہے-اسی طرح وفد کے حالات-ترکوں کی ملاقات-اتحاد اسلامی کے متعلق اپنے ذاتی حالات-دعوتوں کے ذکر-معاشرت کی کیفیت عجب انداز سے بیاں کی ہیں-اور شروع سے آخر تک ہر بیان جوش سے لبریز ہے—

کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے اور بہت اچھی چھپی ہے-دارالاشاعت پنجاب سے ایک روپیہ چارآنہ میں مل سکتی ہے—

نور اللغات

ابتدا میں اُردو لغت کی کتابیں اہل یورپ اور خاص کر انگریزوں نے لکھیں-جن میں ڈاکٹر ہنٹر-ڈاکٹر ہیرس-ڈاکٹر گلکرسٹ-ڈاکٹر فوربس-جان شکسپیر-ڈاکٹر فیلن اور پلیٹس کی زیادہ مشہور رہیں-اہل زبان نے اُس طرف بہت بعد میں توجہ کی اور حیرت کی بات ہے کہ اہل زبان کی کتابیں اکثر ناقص اور ناقابل التفات ہیں-البتہ مولوی سید احمد مرحوم کی کتاب فرہنگ آصفیہ ایسی ہے جو مکمل اور مستند کہی جاسکتی ہے اگرچہ وہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں اور بہت کچھ اصلاح طلب ہے-لیکن اِس میں شک نہیں کہ مرحوم نے اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دی اور اِس سے ملک کو بے حد فائدہ پہنچا-اُردو زبان کو ابھی صحیح مستند اور مکمل لغت کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے-کوئی زبان اِس سے بے نیاز نہیں ہوسکتی اور جس زبان میں اعلیٰ درجہ کی محققانہ لغت کی کتابیں نہیں ہیں وہ زبان مہذب نہیں کہلا سکتی-ہمیں اِس سے حقیقی مسرت ہوئی کہ مولوی نورالحسن صاحب نیر ایک مدت سے اُردو لغت کی ترتیب اور تکمیل میں مصروف ہیں اور اِس وقت اُس کا پہلا حصہ جس میں پہلے دو حرف الف اور بے ہیں چھپ کر شایع ہوگیا ہے-اِس میں ہر لفظ پر تفصیل سے بحث کی ہے-چنانچہ یہ حصہ بڑی تقطیع پر ۷۲۱ صفحے پر ہے-مولف کی محنت اور تحقیق قابل داد ہے-جہاں تک ممکن ہوا ہے ہر لفظ کی اصل بھی ساتھ ساتھ لکھ دی ہے-ہماری لغت کی کتابوں میں ہندی الفاظ کی طرف سے عموماً بے توجہی کی گئی ہے لیکن اِس لغت میں اکثر ہندی الفاظ کا مادہ بتا دیا گیا ہے اور ہر لفظ کے تحت میں اِس کے محاورات تفصیل کے ساتھ دئیے ہیں اور ہر لفظ اور ہر محاورے کے لئے مستند شعرا اور اہل زبان کے کلام سے سند بھی بیان کردی ہے-اِس میں ہمارے لغت نویسوں نے بہت افراط سے

کام لیا ہے۔مگر لفظ کے لئے سلسلہ میں شعر کی ضرورت نہیں ہے۔اِس لغت میں بھی اس کی پیروی کی گئی ہے۔مثلاً بڑ (برگد) کے لئے اسنا کے شعر کی ضرورت نہ تھی—

ہمارے لغت نویسوں نے صرف تحریری زبان کو پیش نظر رکھا ہے اور اِس کی وجہ ظاہر ہے کہ بول چال کی زبان ہر حصے میں اِس قدر مختلف ہے کہ ہر مقام کے الفاظ لغت میں لکھنا ممکن نہیں۔لیکن کیا یہ درست نہو گا کہ اگر کوئی لفظ کسی مقام پر ایسا بولا جاتا ہے جس کا مترادف دلی۔لکھنؤ کی زبان میں نہیں پایا جاتا۔تو اُسے لغت میں داخل کر لیا جائے ؟ یہ امر اُن صاحبوں کے لئے قابل غور ہے جو اپنی زبان کی لغت لکھنا چاہتے ہیں—

جب دو یا دو سے زائد الفاظ مل کر ایسی ترتیب سے استعمال ہوں جو اہل زبان بولتے ہیں اور اِس میں کسی قیاس یا تغیر و تبدل کو دخل نہ ہو یا جب یہ ایسے معنے پیدا کریں جو حقیقی معنوں سے الگ ہوں تو وہ محاورہ کہلاتا ہے۔لیکن جب یہ عام یا حقیقی معنوں میں استعمال ہوں تو وہ محاورہ نہیں کہلاتا۔مثلاً فاضل مولف نے بڑا کی تحت میں بڑا نکیلا ہے۔بڑا ہی سخت ہے۔بڑا تقدیر والا ہے۔وغیرہ جو محاورے لکھے ہیں وہ بالکل غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں۔یہاں بڑا بطور صفت یا تمیز کے نکیلا۔سخت اور تقدیر والا کے ساتھ عام معنوں میں استعمال ہوا ہے اور کوئی خاص معنے پیدا نہیں کرتا۔ورنہ اگر اِس قسم کے جملے اور الفاظ لکھنے کا التزام کیا جائے تو کتاب اِس قدر ضخیم ہوجائے گی کہ اُس کے لئے بیسیوں مجلدات کی ضرورت ہوگی۔اِسی طرح آپ کی شکایت میرے سر آنکھوں پر۔آپ کا منہ ہے وغیرہ۔جو محاورے لکھے گئے ہیں۔ اُن کے متعلق یہ امر قابل غور ہے کہ آیا محاورۂ آپ کے تحت میں آنے چاہئیں یا نہیں کیونکہ یہ محاورے صرف " آپ " سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ دوسری ضمیروں اور اِسموں کے ساتھ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ہماری رائے

میں پہلا محاورہ "سر آنکھوں" اور دوسرا "منہ" کے تحت میں آنا چاہئے —

ھلتی یا کسی دوسری زبان کا غیرمانوس لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اہل زبان ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اُسے جائز نہیں خیال کرتے۔ لیکن عربی فارسی اِس قید سے مستثنیٰ معلوم ہوتی ہے۔ مصنفین ثقیل سے ثقیل اور غیر مانوس عربی فارسی کے لفظ بے تکلف اپنی تحریروں میں استعمال کرجاتے ہیں اور شعرا تو قصائد میں بالکل آزاد ہیں۔ اِس نظر سے اگر عربی فارسی کے لفظ اُردو لغت کی کتابوں میں داخل کئے جائیں تو عربی فارسی کے لغات نصف سے زیادہ اردو کی لغت میں آجائیں گے۔ مثال کے طور پر لفظ "استتار" ہے جو فاضل مولف نے اِس لغت میں لکھا ہے اور سند میں "نوازش" کا شعر تحریر فرمایا ہے۔ یہ لفظ اردو زبان کے لئے بالکل غیرمانوس ہے اور ہم نے اردو تحریروں میں کہیں اِس کا استعمال نہیں دیکھا اور اُردو تو اُردو، عربی فارسی میں بھی شاذ ہی استعمال ہوتا ہے۔ نوازش کا شعر اس کے لئے سند نہیں ہوسکتا۔ ہماری رائے میں اردو لغت میں عربی فارسی کے صرف وہی الفاظ داخل کرنے چاہئیں جو یا تو اُردو زبان میں خاص معنوں میں استعمال ہوتے ہیں یا عام بول چال اور تحریر میں آتے ہیں۔ خاص الفاظ کے لئے عربی فارسی کی لغت کی کتابیں موجود ہیں —

کتاب کے دیباچے میں لایق مولف نے متروکات کی ایک فہرست دی ہے۔ متروکات کا مسئلہ بھی بہت ٹیڑھا ہوگیا ہے۔ بعض اساتذہ نے بعض الفاظ متروک کردئے ہیں اور اپنے کلام میں استعمال نہیں کئے۔ ان کے شاگردوں نے بھی اِس کی تقلید کی اور اِس طرح متروکات کی تعداد بڑھتی گئی۔ ہماری رائے میں کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ فلاں لفظ آج سے متروک ہے۔ الفاظ کی حالت بھی جانداروں کی سی ہے۔ بڑھتے گھٹتے ہیں۔ صورت بدلتے ہیں۔ حیثیت میں فرق آجاتا ہے۔ بعض نام پیدا کرتے ہیں بعض گمنام ہوجاتے ہیں رذیل سے شریف اور شریف سے رذیل ہوجاتے ہیں اور بعض ایک مدت کے بعد مرجاتے ہیں

لیکن وابستہ الفاظ ہوتے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ تعجب ہے کہ بعض کی یا بقیہ
عبارتیں طرح سے ہوتی۔ حالانکہ شاعر ہی کو ان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور
یوں ہی تو قافیہ یہ الفاظ کلام میں حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً "پر" لیکن کے معنوں میں
متروک بتایا جاتا ہے۔ نثر میں متروک ہو تو ہو لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نظم میں
متروک کر دیا جائے۔ کس قدر مختصر اور خوبصورت لفظ ہے اور ہر لحاظ سے
لیکن سے بہتر ہے۔ شاعر اسے بلا تکلف استعمال کر سکتا ہے بھانا بھی متروک ہے۔
حالانکہ اس کے بجائے اردو میں کوئی لفظ نہیں۔ پسند آنا اور پسند کرنا میں اختیار
اور ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور "بھانا" وہاں استعمال ہوتا ہے جو کوئی شے "بغیر
ارادہ و اختیار کے خود بخود دل کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ "پرے"
کا لفظ بھی متروک ہے۔ لیکن جب یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی بجائے کیا استعمال
کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ "اُدھر" مگر پرے اور اُدھر کے معنوں میں بہت
فرق ہے۔ اُدھر سمت کو بتاتا ہے اور پرے بعد کا اظہار کرتا ہے۔ "مت" بھی متروک
سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ اس کے معنے خاص ہیں "نہ" یہ کام نہیں دے سکتا "نہ"
افعال کی عام نفی کے لئے ہے اور "مت" نہی کے واسطے مخصوص ہے۔ اسی طرح
بہت سے لفظ مثلاً خاطر۔ سو۔ تو۔ ناؤ۔ ماندہ جانا۔ بھلا (بمعنی اچھا) کا نتھ وغیرہ وغیرہ
متروک قرار دئے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے متروک ہونے کی کوئی اور وجہ نہیں
معلوم ہوتی سوائے اس کے کہ لکھنؤ کے بعض شعرا نے ان کا لکھنا ترک کر دیا۔ اور
ظاہر ہے کہ یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی۔ یہ بحث طویل ہے یہاں اس کی
گنجائش نہیں۔ انشاءاللہ آیندہ کسی وقت اس پر علیحدہ بحث کی جائے گی۔

الفاظ کے اعراب کا جو طریقہ لائق مولف نے اختیار کیا ہے اس میں کسیقدر
تکلف اور دقت ہے۔ آج کل جو طریقہ رائج ہوگیا ہے وہ زیادہ آسان ہے۔

ہم فاضل مولفہ کو اس کوشش اور محنت پر جو انہوں نے اس کتاب کی
تالیف میں برداشت کی ہے مبارکباد دیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب

موجودہ حالت کی کتابوں میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور بعض وجوہ سے سب میں بہتر ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اِس کا کام جاری رہیگا اور جلد تکمیل کو پہنچے گی۔ ایسی کتابوں کی ملک کو بہت ضرورت ہے —

مولف سے نیر پریس پاٹانالہ لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

حکایات پنجاب

یہ پندرہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جو سید عبدالقادر صاحب ایم-اے پروفیسر اسلامیہ کالج-لاہور نے انگریزی سے ترجمہ کی ہیں-کہانیاں اُسی قسم کی ہیں جو کبھی بڑی بوڑھیاں بچوں کو سنایا کرتی تھیں-افسوس کہ اب یہ عزیز رسم اُٹھتی جاتی ہے یا اُٹھ گئی ہے-اِس کی قائم مقام اب اِس قسم کی کتابیں ہوں گی-کہانیاں دلچسپ ہیں اور لڑکے لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل ہیں-ترجمہ بھی پروفیسر صاحب نے سلیس زبان میں اچھا کیا ہے-البتہ دو ایک جگہ بعض الفاظ یا ترکیبیں اُن کے قلم سے محاورے کے خلاف نکل گئی ہیں-مثلاً (۱) دو ماہ کے بعد ملکہ "کو" بچہ پیدا ہوا-(۲) جس "نے" چاروں ہتیار پہنے ہوئے ہیں-(۳) لڑکے "گندم" کی روٹی کھایا کرتے تھے-(اِس موقع پر گندم کا لفظ مناسب نہیں معلوم ہوتا-گیہوں کہتے تو بہتر ہوتا) (۴) "اُسے" اپنا وعدہ بھول گیا تھا-اِسی طرح اُنھوں نے "ترکھاں" کا لفظ استعمال کیا ہے جو غالباً پنجابی میں بڑھئی کے معنوں میں آتا ہے —

بہرحال کتاب دلچسپ ہے اور بچوں کے لئے بہت اچھی ہے-امید ہے دوسری اشاعت میں اِن خفیف غلطیوں کی اصلاح کردی جائے گی —

چھوٹی تقطیع پر ۲۰۲ صفحے ہیں-کہیں کہیں سادہ تصویریں بھی دی ہیں کاغذ اور چھپائی اچھی ہے-قیمت ایک روپیہ چار آنہ میکملن اینڈ کمپنی سے مل سکتی ہے —

باغباں

یہ ہندوستان کے نامور شاعر ڈاکٹر رابندرا ناتھہ ٹیگور کی نظموں ۲ ترجمہ ہے۔انگریزی میں یہ نظمیں " گارڈنر " کے نام سے چھپی ہیں۔ترجمہ اچھا اور صاف ہے۔ٹیگور کی نظموں اور اُن کی خاص طرز تحریر سے اُردو داں اصحاب بخوبی واقف ہوچکے ہیں لہذا اُس پر کچھہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کتاب بھی میکملن اینڈ کمپنی نے چھاپی ہے۔قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔۔

دختر سمرنا

یہ کتاب صوفی پرنٹنگ کمپنی کے سلسلۂ مطبوعات کی ۴۸ ویں کڑی ہے اور خالدہ ادیب خانم وزیر معارف انگورہ کی کتاب" قمیص من نار" کا ترجمہ ہے۔موصوفہ بڑی زبردست ادیب ہیں۔اُن کا طرز تحریر نہایت دلکش ہوتا ہے اور آسانی کے ساتھہ ترجمہ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ان کی اِس کتاب کا ترجمہ اِس سے پہلے بھی " پیراھن آتشین " کے نام سے ہوچکا ہے اور ملک میں عام طور پر پسند کیا گیا۔زیر تبصرہ ترجمہ مولوی غلام ربانی صاحب لودھی علیگ کا کیا ہوا ہے۔۔

کتاب ایک طرح کا روزنامچہ ہے۔جس میں ایک مجروح ترکی افسر بیامی نے جنگ یورپ کے خاتمہ سے لیکر کمالیوں کی فتح تک کے تمام واقعات بہت ہی موثر پیرایہ میں درج کئے ہیں۔جو حضرات کمالیوں کی صحیح تاریخ پڑھنا چاھتے ہیں۔اُن کو اِس کتاب سے بہت کچھہ مدد ملے گی۔۔

ترجمہ صاف اور سادہ ہے۔لیکن کہیں کہیں جملے پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۹۷ " اس کی یہ نگاہیں میرے نزدیک اس طرح رائگاں جاتی تھیں جس طرح ایک ایسے شخص کو روٹی کے بجائے سیم وزر سے لاد دیا جائے جو ایک صحرا میں بھوک سے مرا جارہا ہو " ۔۔

لیکن اِن چند معمولی اُردو الفاظوں کے علاوہ ترجمہ میں اور کوئی نقص نہیں ہے-جن لوگوں کو ترکی فوج کی اندرونی زندگی اور عام ترکی معاشرت سے دلچسپی ہے اُن کے لئے اِس کا مطالعہ ضرور دلچسپ ہوگا- کاغذ لکھائی چھپائی معمولی- صوفی پرنٹنگ کمپنی پنڈی بہاؤالدین سے مل سکتی ہے- قیمت درج نہیں—

(و)

تیغ کمال

یہ کتاب راشد الخیری صاحب کی تازہ ترین تالیف ہے اور صوفی پرنٹنگ کمپنی کی طرف سے شایع ہوئی ہے—

کتاب میں جیسا کہ خود اُس کے نام سے ظاہر ہے-مدبرین یورپ کی ریشہ دوانیوں اور مصطفی کمال پاشا کی فتوحات کا تذکرہ ہے-اگر اِن چیزوں کو محض افسانے کی حیثیت سے بیان کردیا جاتا تو ہمیں کچھ اعتراض نہوتا- لیکن بدقسمتی سے اِس میں تاریخی واقعات اور دور حاضر کی یورپی سیاسیات کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے- جو افسوس ہے کہ کہیں بھی کامیاب اور قرین قیاس نہیں ہے---

معمولی افسانوں کی طرح تاریخی ناولوں کا بھی ایک پلاٹ ہوتا ہے اس کے ضمن میں مختلف تاریخی واقعات جمع کردئیے جاتے ہیں-باوجود کوشش کے ہمیں اِس کتاب میں کوئی مرکزی پلاٹ نظر نہیں آتا اور نہ مختلف حصوں میں کوئی ربط ہی پایا جاتا ہے-کہیں (غالباً پیرس میں) لائڈ جارج-مسیو برایند اور کرزن سیاسی امور پر عوام کی طرح گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں-کہیں قسطنطنیہ میں جنرل ہیرنگٹن اور داماد فرید پاشا بحث میں مشغول نظر آتے ہیں-اِن مدبروں کی مکالمت جیسی کچھ غیر مدبرانہ اور بعید از قیاس ہے وہ ذیل کے اقتباسات سے معلوم ہوجائے گا—

صفحہ ۷ کرزن-ہاں تو اب جرمن اور ترکی کاکیا حشر ہو؟

براینڈ-ترکی کا تو خاتمہ کردینا چاہئے

لائڈ جارج-ایسی سزا ملنی چاہئے کہ عمر بھر یاد کرے

براینڈ-نہایت نمک حرام قوم ہے

....

کرزن-ایشیاے کوچک میں تھوڑا سا حصہ دیدینا چاہئے

لائڈ جارج-وہ بھی برائے نام

—:o:—

صفحہ ۲۶ داماد فرید پاشا-توفیق پاشا بھی تو انسان ہے

شہزادہ عبدالمجید-اور آپ؟

فرید-میں بھی

شہزادہ-اِس انسان کے ساتھہ قوم ہے-آپ کے ساتھہ دشمنان قوم

فرید-آپ کی گفتگو بہت سخت ہے

شہزادہ-ختم کردیجے

یہ وزیر اعظم ترکی اور سلطان کی گفتگو ہے اور کس قدر قرین قیاس اور مدبرانہ!

—:o:—

کتاب کو مقبول بنانے کی غرض سے حسن و عشق کی داستان بھی شامل کردی گئی ہے-شاہ یونان کی بھتیجی "کونکوئسٹ" (Conquest) ہیروئن ہے-اٹلی-فرانس اور برطانیہ کے شہزادے اُس کے پاس پیغام بھیجتے ہیں-خدا معلوم فرانس میں دوبارہ شاہنشاہیت کب سے قائم ہوگئی-اگر "مرسیو پوانکار" بھی پیغام بھیجتے تب بھی غنیمت تھا-لیکن بد قسمتی سے صدر جمہور کی مدت عہدہ صرف پانچ سال ہوتی ہے-سمجھہ میں نہیں آتا کہ یہ زبردست فروگذاشت جو معمولی تعلیم یافتہ اور اخبار بیں شخص بھی نہیں کرسکتا

ملاسہ راشدالخیری سے کیوں کر ہوئی - اور اسی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے - آئندہ چلکر کونکوئسٹ مسلمان ہوجاتی ہے - اُس کے قتل کا حکم ہوتا ہے - غازی مصطفی کمال پاشا ساحل یونان سے بذریعہ سرنگ قصر شاہی تک پہونچتے ہیں اور اُسے بچا لیتے ہیں اور ملکہ راشدالخیری صاحب کو انگورہ کی مسجد میں نماز پڑھتی نظر آتی ہے - لیکن صفحہ ۱۰۲ پر جناب مولف صاحب کا حافظہ انہیں دھوکا دیتا ہے اور ہمیں "اسٹینڈرڈ ہیرلڈ" کے حوالہ سے یہ خبر معلوم ہوتی ہے کہ " وہ ۱۷ جولائی کو جہاز کے ذریعہ سے انگورہ پہونچی اور رومال محبت " (!!) مصطفی کمال پاشا کی خدمت میں پیش کیا - کاش "مصور غم صاحب" دلی کی معاشرت ہی کی تصویریں کھینچتے رہتے اور سیاسیات اور تاریخی واقعات کی الجھنوں میں نہ پڑتے -

کتاب اسی قسم کے بے سر و پا واقعات سے لبریز ہے - جن کو بخوف طوالت ہم یہاں قلمبند نہیں کرسکتے پلاٹ کے علاوہ کتاب کی زبان بھی کہیں کہیں اصلاح طلب ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے اصرار پر بہت جلد لکھی گئی ہے —

کاغذ لکھائی چھپائی بہت معمولی - صوفی پرنٹنگ کمپنی پنڈی بہاؤالدین پنجاب سے مل سکتی ہے - قیمت درج نہیں —

(و)

خمخانۂ کیفی

یہ جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی کی چند نظموں کا مجموعہ ہے جو صاحبزادہ محمد عمر اور میاں نورالہی صاحب نے کسی ترکیب سے حضرت کیفی کی بیاض سے نقل کر کے شایع کر دی ہیں - حضرت کیفی ایک کہنہ مشق اور بلند خیال شاعر ہیں - اُن کی طبیعت اور شاعری کا رنگ عارفانہ اور حکیمانہ ہے - شروع میں خاں بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر بی - اے ممبر کونسل عالیہ ریاست جموں و کشمیر نے بہت دلچسپ اور اچھا دیباچہ لکھا ہے - اِس کے بعد

اِس مجموعہ کے مرتب صاحبوں نے بھی ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں حالی کی اُردو شاعری پر سر سری طور سے بہت اچھی بحث کی ہے—

اِس مجموعے میں چند ترکیب بند۔ ترانۂ حقیقت۔ پاؤل۔ عشق۔ محبوب کی یاد۔ خیر مقدم گرامی۔ هفت بند کیفی اور اِن کے علاوہ ادب اور شعر کی تجدید۔ نیا زمانہ اور چند غزلیں ہیں—

یہ کلام پڑھنے کے قابل ہے۔ اِس میں قدیم و جدید رنگ ساتھہ ساتھہ نظر آتا ہے۔ زبان کے ساتھ خیالات کا لطف خاص انداز رکھتا ہے۔ یہ مجموعہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لوهاری دروازہ لاهور سے چھہ آنہ میں مل سکتا ہے—

همارا گھر

یہ تین ایکٹ کا نیا "سوشیل ڈراما ہے" جس کے لکھنے والے جناب عبدالطیف صاحب شاد ہیں۔ ڈرامے کے نام اور سر ورق پر جلی قلم سے "سوشیل ڈراما" لکھا ہوا دیکھکر همیں بہت خوشی ہوئی تھی کہ ہمارے جدید ڈراما لکھنے والوں کو سماجی ناٹک تصنیف کرنے کا شوق پیدا ہوا اور اسی امید میں کہ اِس نئے ناٹک میں همیں هندی معاشرت کی جیتی جاگتی بولتی تصویریں نظر آئیں گی هم نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ لیکن بد قسمتی سے ہماری یہ امید پوری نہو سکی۔ مانوس اور سچی تصویروں کے بدلے همیں اِس کتاب میں اپنی سماج کے ایسے بھیانک اور غیر فطری مناظر نظر آئے جن کا وهم و گمان بھی نہ تھا—

سب سے پہلے هم ڈرامے کی کتھا (Plot) سناتے ہیں:—

دیانند۔ سدانند اور برجیشر تین بھائی ہیں۔ دیانند کانپور کا ایک شریف مہاجن ہے۔ سدانند بیرسٹر ہے اور یہی شخص اِس کتھا کا راون ہے۔ برجیشر ایک لاأبالی۔ قوم پرست۔ آریہ سماجی نوجوان ہے جو اپنی سماجک دھن میں اپنی محبوب منگیتر سرسوتی کو بہن بنا لیتا ہے۔ بھگوانداس اِن تینوں بھائیوں کا

پورا وفادار ملازم ہے۔ دیانند ایک بڑی جائداد کا مالک ہے۔ لیکن روشن بینک کا دیوالہ نکل جانے کی وجہ سے وہ اپنی ذاتی جائداد کو قرضداروں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ سدانند دھوکے سے اس سے بے دخلی کا کاغذ لکھا لیتا ہے۔ برجیشر کو چوری کے الزام میں گرفتار کرادیتا ہے اور اپنی بڑھیا ماں اور دیانند کی بیوی اور بچے کو مکان سے باہر نکال دیتا ہے۔ ماں بھائی اور بھاوج صدموں سے مر جاتے ہیں۔ سدانند بھائی کے بیٹے کو زہر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن خود اسکی بیوی سروجنی اُسے بچا لیتی ہے اور شوہر کے تھپڑ سے ہلاک ہوتی ہے۔ ان اعمال بد کی پاداش کے طور پر سدانند آگ میں جل کر ہلاک ہوتا ہے آخر میں برجیشر اور سرسوتی ملتے ہیں بینک کی ڈوبی ہوئی رقم مل جاتی ہے اور ہندو۔مسلم اتحاد پر بھگوانداس اور برجیشر کے خسر مسٹر ونایک (مجسٹریٹ) کی تقریروں پر قصہ ختم ہو جاتا ہے —

یہ ہے اِس ناٹک کی کتھا جسے مختصراً یہاں پیش کیا گیا اس میں جذبات کی کشمکش اور سیرت نگاری کی تلاش فضول ہے صرف ایک خواہش "حب دولت" ہے اور اسی کے مظاہرات کو بہت مبالغہ کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ اگر جزئیات پر نظر ڈالئے تو غیر فطری واقعات تضاد اور بے ربط تقریروں کا وہ طومار نظر آتا ہے کہ جی گھبرا اُٹھتا ہے "کانپور کا شریف مہاجن" جس روز اپنی ماں کو لیکر کاشی کی تیرتھ کو جانا چاہتا ہے اسی روز وہ دھت شرابی نظر آتا ہے جو کبھی تو اہل زمانہ کے برے لچھنوں پر جلے کٹے فقرے کہتا ہے کبھی "دیوانہ بکار خویش ہوشیار" کی طرح اپنے بھائی سے بے دخلی کا کاغذ چھین لیتا ہے اور کبھی بلند پایہ فلسفیانہ اشعار پڑھتا ہے! —

———:o:———

پہلے سین میں کانپور کے کسی کھلے ہوئے میدان میں قوم پرستوں کا جلسہ

نظر آتا ہے۔ صدر بھی ہے۔ سکریٹری بھی ہے۔ مقرر بھی ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد یہ "جلسۂ عام" صرف پانچ آدمیوں کی مکالمت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اسی طرح سے مسٹر وفایک حکومت کے ہوا خواہ ہیں۔ جج ہیں مجمع عام میں قوم پرستوں کی مخالفت کرتے ہیں لیکن جونہی کہ وہ برجیشر کو چوری کے الزام میں چھ ماہ کی قید کا حکم سنا چکتے ہیں ویسے ہی بر سر اجلاس "وایسرائے کے وارنٹ" کی بنا پر "بغاوت کے جرم میں" گرفتار ہو جاتے ہیں مکافات عمل کا کیا انوکھا طریقہ ہے؟ لیکن ذرا ٹھیرئیے! تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ "پارلیمنٹ کے فرمان" کی بنا پر رہا کردئے جاتے ہیں لیکن اب قوم خواہ بن کر نکلتے ہیں کیونکہ جیل میں برجیشر انہیں تلقین کر چکا ہے بچارے جج صاحب کو مصنف صاحب نے محض اس وجہ سے جیل خانے بھجوا دیا کہ ان کی "قلب ماہیت" کی معقول توجیہ ہو سکے!۔۔

ڈرامے کی زبان خاص طور پر قابل غور ہے۔ گزشتہ پانچ سالوں میں قوم پرستی۔ سوراج۔ ترک موالات وغیرہ کی جو لہریں اُٹھیں اُنہوں نے ہمارے ڈراما نویسوں کو اُردو کے ساحل سے ہٹاکر ہندی اور سنسکرت کے میدانوں میں پہنچا دیا۔ حشر اور منشی عباس وفا کے ڈرامے اِس میدان میں ایسے پھولے پھلے کہ ان لوگوں نے اپنی تصنیفات میں اُردو کی حیثیت "اُرد پر سفیدی" کی سی کردی۔ لیکن منشی عبداللطیف شاد نے رد عمل کا آغاز کیا ہے۔ اِن کے ڈرامے کے سب اشخاص ہندو ہیں۔ لیکن اِن کی بول چال ایسی ہے کہ جس پر ندوۃ العلما اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل رشک کریں تو بجا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر گفتگو اشعار میں کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:—

مسٹر وفایک اپنی بیٹی سرسوتی سے غصہ کی حالت میں یوں کلام کرتے ہیں:—

"میں تمہاری زبان سے بد مذہبی کا فلسفہ نہیں سننا چاہتا۔ میں یہ بیہودہ علمیات و طامات۔ یہ سوفسطائی لغویات نہیں پسند کرتا"

---o---

سدانند کی بیوی سروجنی اپنے دیور کی طرف داری ان الفاظ میں کرتی ہے:—

"اُس کے ذہن میں اتنی جودت اور دراکیت نہیں ہے کہ وہ ایمان کو ایک طبعی دیانت اور خدا کو عالم اسباب کی ایک آخری علت کہے"

---o---

سدانند کے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ ایسے موقعوں پر انسان الفاظ کے بدلے چیخوں اور بے تکے حرکات و سکنات پر اُتر آتا ہے لیکن سدانند کے الفاظ ملاحظہ ہوں:—

"او آگ بجھانے والے سائب الفار! کیمیاوی جوہر! چل نکل اور تو بھی عنصر ناری کے التہاب کو سائب کر ڈال" اس جمعیت خاطر کی داد نہ دینا ظلم ہے!

---o---

بھگوان داس ملازم ہے۔ لیکن (شاید لکھنؤ کے قرب کی وجہ سے) "ایثار" "شکم پرور" "حرمت مآب" "اجرام سماوی" اور ایسے دوسرے الفاظ بہت بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ ذیل کے جملے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعری منطق اور فلسفہ میں بھی دخل رکھتا ہے۔—

لفظ سے مدلول اور مدلول سے دلالت صاف نظر آنے لگی ہے—

نغمہ سے حسن اور حسن سے نغمہ جھلکنے لگا—

---o---

یہ محض چند مثالیں ہیں۔ ورنہ پوری کتاب اسی قسم کی گفتگو سے بھری

ہوگئی ہے۔انگریزی ڈرامے میں جن چیزوں کو "مغالطۂ مکان و زماں" (Fallacies of time and place) کہا جاتا ہے وہ دوسرے اُردو افسانوں اور ناٹکوں کی طرح اِس میں بھی موجود ہیں۔جا و بے جا ہر گفتگو کی تان قومیت پر ٹوٹتی ہے جو شاید مقبولیت کی ضمانت ہے—

———:o:———

یہ ہے "ہمارے گھر" کی حالت-جو ایک گھر کے بھیدی نے بیان کی ہے۔ افسوس ہے کہ طوالت کے خیال سے ہم اِس سے زیادہ مفصل تبصرہ نہیں کرسکتے ورنہ یہ کتاب ہمارے ملک کے ڈراما نویسوں کے لئے سبق آموز ہوتی۔لیکن مصنفین سے زیادہ عوام کے خیال کی اصلاح ضروری ہوتی ہے۔معمولی افسانے اور ڈرامے ہی عوام کے مذاق کا چربہ ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ انہی کے مصنفین کو اپنے حسن و قبح سے واقف ہونا چاہئیے تا کہ بجائے اس کے کہ قبولیت عامہ کی لہر اپنی رو میں انہیں بہا لے جائے اُن کی تصانیف عوام کے مذاق کو اپنے سانچے میں ڈھا لیں۔اسے سنواریں اور اس کا معیار بلند کریں۔اُردو ادب میں ناٹک اور افسانوں کی جو درگت ہے اُس کی بڑی ذمہ داری اتنی زیادہ غریب مصنفین پر عاید نہیں ہوتی جتنی کہ عوام پر۔ہمیں امید ہے کہ جناب مصنف صاحب جنہیں اظہار خیال پر کافی قدرت ہے جو زبان کے ماہر ہیں اور جن کا ذوق اعلیٰ معلوم ہوتا ہے اپنی موجودہ تصنیفات میں ہماری مخلصانہ تنقید کو مد نظر رکھیں گے۔ان کی طبیعت میں جولانی ضرور ہے اور جولانی میں بگاڑنے اور سنوارنے دونوں کے لچھن ہوتے ہیں۔کاغذ لکھائی۔چھپائی اچھی ہے۔جناب مصنف سے "نمبر ۷۰ نیا قاضی محلہ متصل مسجد بمبئی نمبر ۹" کے پتہ سے مل سکتی ہے۔قیمت درج نہیں ہے—

———:o:———

لیلیٰ

(یا محاصرۂ غرناطہ)

یہ لٹن کا ایک ناول ہے جس کا اُردو ترجمہ سید امتیاز علی صاحب تاج نے شایع کیا ہے۔سنہ ۱۳۱۱ ہجری میں سید محمود مرحوم نے اِس کا ترجمہ شروع کیا تھا اور تھوڑا تھوڑا کر کے تہذیب الاخلاق میں چھپوایا۔صرف تین فصلوں کا ترجمہ ہوا اور ناتمام رہ گیا—

یہ ایک تاریخی ناول ہے جس میں مسلمانوں کی حکومت اندلس کا آخری منظر دکھایا گیا ہے۔لٹن کو اِس قسم کے ناول لکھنے میں کمال ہے وہ تاریخ کو اِس خوبی سے فسانہ بنادیتا ہے کہ پڑھنے والا تاریخ و فسانہ میں مشکل سے تمیز کرسکتا ہے۔اِسی لئے تاریخی ناول لکھنا بہت مشکل ہے۔جو لوگ مسلمانوں کی حکومت ہسپانیہ سے ذوق رکھتے ہیں وہ اِسے پڑھ کر بہت لطف حاصل کریں گے—

ترجمہ بہت صاف ستھرا اور شگفتہ کیا گیا ہے سید امتیاز علی صاحب اُن ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں جو اُردو زبان کی اچھی خدمت کر رہے ہیں کتاب بہت اچھی چھپی ہے ۲۶۲ صفحے قیمت دو روپئے دارالاشاعت پنجاب لاہور سے مل سکتی ہے—

انوری بیگم

یہ ناول طیبہ بیگم مرحومہ دختر جناب نواب عمادالملک بہادر کا لکھا ہوا ہے—مرحومہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون تھیں۔اِس سے قبل بھی اُن کے ایک ناول کا تبصرہ اِس رسالہ میں ہوچکا ہے اِس ناول میں حیدرآباد کے ایک شریف خاندان کا حال ہے—جس سے معلوم ہوگا کہ اِس زمانے میں معاشرت اور خیالات میں کیا کیا تغیرات ہوئے ہیں۔کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لائق مصنفہ نے اپنے ہاں کی سوسائٹی کو کس قدر غور کی نظر سے

دیکھا ہے۔پرانے توہمات اور تعصبات اور جدید خیالات کو باتوں باتوں میں بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔حقوق و تعلیم نسواں پر ضمناً جہاں کہیں ذکر آگیا ہے۔بڑی خوبی سے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔شادی کا معاملہ ہمارے خاندانوں میں بہت ہی ٹیڑھا ہوتا ہے اور اِس میں لڑکی لڑکے کی راے کو مطلق کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔ماں باپ کبھی تو عزیز داری کے خیال سے اور کبھی اپنی ضد سے اِس قسم کی شادیاں کر دیتے ہیں جو آخر میں بڑی تباہی اور مصیبت کا باعث ہوتی ہیں۔اِس ناول میں انوری اور سجاد۔احمدی اور جعفر کی شادیاں ایسی خوبی سے کی ہیں کہ جن میں افراط و تفریط دونوں نہیں۔نہ تو عام رواج کے موافق جس میں جانوروں کی طرح جوڑے ملا دئے جاتے ہیں اور نہ انگریزوں کی سی آزادی۔اِس مشکل مسئلہ کو اِس سلیقہ سے حل کیا ہے کہ شادی در حقیقت خانہ آبادی معلوم ہوتی ہے جگہہ جگہہ ماماؤں کی زبانی ٹھیٹ دکنی زبان کو بہت ہی خوبی سے ادا کیا ہے۔ناول کا قصہ اگرچہ سادہ ہے لیکن بہت دلچسپ ہے۔خاندان کی معاشرت۔رسم و رواج۔تعلیم و تربیت۔آپس کے تعلقات۔یہ ساری باتیں اِس طرح لکھی ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے ایک سماں کھنچ جاتا ہے۔کتاب کی زبان بہت صاف ستھری ہے۔اِس قسم کے پاکیزہ ناولوں کی ہمارے ملک کو بہت ضرورت ہے اور اِن سے جو عمدہ اخلاقی اثر پیدا ہوتا ہے وہ خطبوں اور وعظوں سے نہیں ہو سکتا۔

تاریخ

تاریخ الامۃ جلد پنجم

اِس جلد میں دولت عباسیہ کے عہد انحطاط کو نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اور خلفا کے عہدوں کو بیان کرنے میں نہایت محنت سے کام

پایا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ممالک اسلام کی مختلف سلطنتوں کے قیام اور ان بادشاہتوں کے واقعات درج ہیں جو مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں ترکوں کے استیلا اور ان کی سازشوں کے مفصل بیان سے مولف کا وسیع مطالعہ ظاہر ہوتا ہے۔ دیالمہ۔ سلاجقہ اور خوارزمیوں کی کشمکش کے واقعات سلسلے سے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ وزارت میں جو تغیر و تبدل ہوتا رہا اور جو اسکے موقتی اسباب ہوتے تھے وہ بھی نظر انداز نہیں ہوئے ہیں۔ مولف نے فوجی قوت کو بھی بیان کیا ہے۔ کہیں کہیں حکومت کے موازنہ پر بھی نظر ڈالی ہے ایک جگہ خلیفہ کے ذاتی اخراجات بھی بیان کئے ہیں دوسری تاریخوں کے مقابلہ میں ایک نئی بات اس میں پائی جاتی ہے یعنی احوال خارجیہ کا ذکر ہے قوت علویہ کے عنصر کو نہایت صراحت سے درج کیا گیا ہے جو فرقے اس زمانہ میں پیدا ہوئے ان کی شورشیں ہر عہد میں تفصیل سے دی گئی ہیں۔ قرامطہ۔ باطینہ اور حبشیوں بالخصوص فرقۂ مقدم الذکر کی بغاوتوں اور ان کے اثرات سے بحث کی گئی ہے۔ یونانیوں کے ساتھ جو لڑائیاں ہوتی رہیں ان کی حیثیت الگ قائم رکھی گئی ہے۔ غرضیکہ تہذیب بغداد کے زوال کے متعلق جملہ واقعات نہایت صراحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ مگر موجودہ زمانے کے تاریخی نقطۂ نگاہ سے کتاب میں کچھ قصے کی سی حیثیت پیدا ہوگئی ہے بڑی خامی یہ ہے کہ قدیم مورخین کی نہ کوئی سند درج ہے اور نہ کہیں اقتباس یا حوالے سے کام لیا گیا ہے جسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ کتابیں مدارس عالیہ کی جماعتوں کے لئے تالیف کی گئی ہیں اگر کوئی قوم ایک زمانے تک دنیا کے بہت بڑے حصے پر حکمراں رہی ہو اور تہذیب و تمدن کی تشکیل میں اُس کا بہت بڑا حصہ ہو تو اُسکی تاریخ بیان کرتے وقت یہ لازم ہے کہ اُس مملکت کے نظم و نسق اور سیاسی نظم پر بحث کی جائے اِس کتاب میں یہ فروگزاشت ہوئی ہے —

نیز اُس زمانے کے تمدن و معاشرت پر بھی بحث نہیں کی گئی۔ اگر تاریخ

قوم کی ہے تو اُس کے تمدن و معاشرت کو ضرور بیان کرنا چاہئیے۔خواہ اِس میں اختصار سے کام لیا جائے۔تا کہ یہ معلوم ہو کہ کن موافق و مخالف اسباب سے ایک تمدن یا تہذیب پیدا ہوئی۔اِس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر عہد میں اِس تمدنی ترقی یا تنزل کو بیان کیا جائے۔تمدن کے کسی خاص شعبے میں ایک خاص زمانے تک جو شکل پیدا ہو جاتی ہے اسے اس زمانے کے اخیر میں مختصراً مع اسباب کے بیان کرنا چاہئیے اور جہاں اس کا زوال شروع ہوتا ہے یا تہذیب کے اس شعبے میں تغیر یا انقلاب ہوتا ہے وہاں اُس زوال۔تغیر یا انقلاب کو بالتفصیل بیان کرنا چاہئیے۔زیر تبصرہ کتاب میں اِس بیان کی عدم موجودگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ الامۃ نہیں ہے بلکہ تاریخ خلفاے اسلام ہے—

تاریخ لکھتے وقت ہمیں نہایت محنت سے واقعات کی چھان بین کرنی چاہئیے اور جن قوموں کو اِس قوم سے خاص واسطہ رہا ہے ان کے تعلقات پر ایک گہری نظر ڈالنی چاہئیے۔مولف نے اِن تمام فرقوں اور مخالف قوتوں کی تحقیر کی ہے جو حکومت بغداد سے نبرد آزما تھے۔کئی جگہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ قرامطہ کے متعلق صفحات ۸۱ و ۹۹ ملاحظہ ہوں—

صفحہ ۸۱ " لوگ نماز پڑھ کر واپس آرہے تھے۔اُنہوں نے جس کو پایا قتل کرنا شروع کیا "

صفحہ ۹۹ " جو ملا۔اُس کو مار ڈالا "

صفحہ ۵۲ " آخر کار اللہ تعالی نے فوج کو فتح اور نصرت عطا فرمائی اور سنہ ۲۷۰ ع میں یہ کذاب مارا گیا "

صفحہ ۱۳۱ " آخر کار اللہ تعالی نے اِن کی مدد کی۔رومیوں میں وبا پھیل گئی۔جس کی وجہ سے وہ محاصرہ اٹھاکر چلے گئے "

یہ صرف چند اقتباسات ہیں۔اِن کے علاوہ متعدد مقامات پر باطنیوں اور

وسیلوں کی تکذیب کی گئی ہے۔ اگر ہم قدیم عیسائی مورخین کی تاریخوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہی بات نظر آتی ہے—

سٹینلی لین پول حاجب المنصور کی وفات پر ایک راہب کا فقرہ اقتباس کی صورت میں درج کرتا ہے " ۱۰۰۲ ع میں المنصور کا انتقال ہوا اور وہ جہنم میں مدفون ہوا۔"

سر ولیم میور " آخر کار صلیب نے ہلال پر فتح پائی "

دیگر عیسائی تاریخوں میں کئی واقعات اسی طرح پر دئے گئے ہیں مورخین کا اِس قسم کی تاریخیں لکھنا آنیوالی نسلوں کے حق میں کانٹے بونا ہے۔

مملکت عباسیہ کے زوال کے اسباب بیان کرنے میں فلسفۂ سیاست کو بالکل نظرانداز کردیاگیا ہے۔صلیبی جنگوں کو کوئی اهمیت نہیں دیگئی۔ان کے اسباب و علل پر بہت کم بحث ہوئی ہے۔جواثرات ان جنگوں کے یورپ کے سیاسیات و تمدن پر پڑے۔اِن کا کہیں ذکر نہیں ہے۔اِن جنگوں کو قرامطہ۔ باطیلہ یا دیگر ایسے مخالف عناصر کی طرح بیان کیاگیا ہے اور زیادہ اهمیت نہیں دی گئی—

کتاب کی عبارت ایسی ہی ہے جیسی کہ تاریخوں کی ہونی چاهئے اور اس میں ربط و سلاست پائی جاتی ہے۔مگر استدلال سے معرا ہے—

مولف نے واقعات کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن اقتباسات کے نہ ہونے کی صورت میں کہیں کہیں الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں بالخصوص قرامطہ کے بیان میں۔

تمام تاریخی پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے بعد ہمارا یہ خیال ہے کہ باوجود خامیوں کے اِس کتاب سے اردو کی اسلامی تاریخوں میں ایک اضافہ ہوا ہے جو تمام لوگوں کیلئے بہت کچھ فائدہ مند ہے—

یہ کتاب جامعہ ملیہ علی گڑھ نے شایع کی ہے - قیمت دو روپیہ ہے

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے بھی مل سکتی ہے

ہند عہد اورنگ زیب میں

یہ کتاب جناب مرزا یار جنگ بہادر (مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب) نے تحریر فرمائی ہے جس میں دس باب ہیں - پہلے نو باب درحقیقت تمہیدی ہیں اصل باب جس سے کتاب کی غرض و غایت متعلق ہے دسواں ہے جس میں ہندو مسلمانوں کے مسئلۂ اتحاد پر ہر پہلو سے غور کیا گیا ہے - کتاب پڑھنے کے بعد ہمیں اِس بات سے خوشی ہوئی کہ مرزا صاحب نے اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے بحث کی ہے نہ کسی پر حملہ کیا ہے نہ کسی کو الزام دیا ہے بلکہ بہت نرمی اور شایستگی سے ہر پہلو پر غور کیا ہے - اُن کی تحریر کا ایک ایک لفظ اُن کی نیک نیتی اور صفاے دل کی شہادت دیتا ہے - آخر میں اُنھوں نے خلوص کے ساتھہ یہ درخواست کی ہے کہ دوسرے اصحاب بھی اس مسلہ پر اپنی آزادانہ راے کا اظہار فرمائیں تاکہ آئے دن جو جھگڑے ٹنٹے ہمارے ملک میں بپا ہوتے رہتے ہیں اُن کی جڑ کٹ جائے اور اہل وطن صلح و آشتی کے ساتھہ رہنے سہنے لگیں —

اِس کتاب کی تحریر کا باعث مسٹر جے آر راے صاحب کا مضمون ہوا جو زمانہ میں شایع ہوا تھا - اس مضمون میں مسٹر راے نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کے خطوط کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ عہد مغلیہ میں رشوت کا بازار گرم تھا - رعایا تنگ دست اور مفلوک الحال تھی - تجارت پر بےجا کی قیود عائد تھیں - صداقت نابود تھی - انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنی دشوار تھی ملک میں رہزنوں کا زور تھا - زمین کا بڑا حصہ ویران اور غیر آباد تھا - تعلیم

کا نام و نشان نہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔اس کے جواب میں مرزا صاحب نے یہ چند باب لکھے ہیں۔ فاضل مولف کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ "یہ مضمون تاریخ کی وقعت نہیں رکھتا ہے اور نہ اس میں مورخ کی حیثیت سے عہد اورنگ زیب کے تمام واقعات پر گہری تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے" اور یہ بالکل صحیح ہے۔ انہوں نے مستر رائے کے الزامات کے جواب میں صرف اورنگ زیب کے عہد کو لیا ہے جو سب سے زیادہ اعتراضات کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور اپنی تائید کے لئے انہوں نے نہ تو مسلمانوں کی تاریخوں کا حوالہ دیا ہے نہ ہندؤں کی تاریخوں سے مدد لی ہے اور نہ انگریزی تاریخوں پر نظر ڈالی ہے۔ بلکہ ان سب سے قطع نظر کر کے انہوں نے ایک ایسے شخص کے بیانات پیش کئے ہیں جس نے اس عہد کے واقعات اپنی آنکھوں دیکھے ہیں۔ جو اگرچہ ایسٹ انڈیا کا ملازم تھا مگر اس نے اپنی تحریر میں انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ ایسے شخص کی شہادت اُن تاریخوں اور مضامین کے مقابلے میں بہت زیادہ قابل وقعت ہے جن کی بنیاد زیادہ تر قیاس اور جانبدار روایتوں پر ہے—

اِس شخص کا نام الگزنڈر ہملٹن تھا۔ یہ ایک انگریز سیاح اور سوداگر تھا یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا سنہ ۱۶۸۸ ع میں جو اورنگ زیب کا زمانہ تھا بہت سا سوداگری مال لیکر چند توپوں اور تھوڑے سے فوجی سپاہیوں کے ساتھ اپنے ملک سے چلا اور تمام ساحل افریقہ و عرب و ایران میں تجارت کرتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ تخمیناً ۳۵ برس تک ہندوستان اور اس کے گرد و نواح میں زندگی بسر کی اور اپنا سفرنامہ لکھا۔ اسی سفرنامہ سے فاضل مولف نے عہد اورنگ زیب کے بہت سے حالات اور واقعات پیش کئے ہیں جنہیں پڑھ کر بہت سی غلط فہمیاں خود بخود رفع ہو جاتی ہیں—

ہم ذیل میں اُس کے چشم دید حالات کے بعض اقتباس پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ جو کچھ اُس نے دیکھا بجنسہ بغیر کسی تعصب اور جانبداری

کے لکھ دیا ہے مثلاً سب سے پہلے وہ سندھ کے ایک شہر ٹھٹہ میں پہنچا۔اس کے متعلق وہ لکھتا ہے:—

"ٹھٹہ شہر علوم فقہ و فلسفہ و سیاسیات کے لئے مشہور ہے۔ان علوم میں لڑکوں کی تعلیم دینے کے لئے تقریباً چار سو کالج یہاں ہیں"—

مذہبی رواداری کے متعلق لکھتا ہے کہ

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ہندؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طور سے برتی جاتی ہے۔وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اُسی طرح سے مناتے ہیں جیسے اگلے زمانہ میں مناتے تھے جبکہ بادشاہت خود ہندؤں کی تھی۔وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن اُن کی بیویوں کو اجازت نہیں کہ شوہروں کے مردوں کے ساتھ ستی ہوں"—

جب سورت میں پہنچتا ہے تو مذہبی حالت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے —

"اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی سخت جھگڑے ان کے اعتقادات اور طریقۂ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا اِن لوگوں میں مفقود ہے"—

اِس نے ملک کی خوش حالی۔ارزانی اور ثروت کے جو حالات لکھے ہیں اُنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے اور ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔مثلاً وہ لکھتا ہے کہ ایک ٹن نمک ایک کراؤن (دو تہائی روپئے) میں آتا ہے۔کٹک میں مکھن ایک آنے میں ایک پونڈ۔ڈھاکہ میں دو آنے میں سو مچھلیاں آتی تھیں جو اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ان میں کی دو مچھلیاں آدمی کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہوتی تھیں اور ایک روپیہ میں پانسو آسی پونڈ چاول ملتے تھے—

اِسی طرح اُس نے ملک کے امن و امان- تجارت- حرفت و صنعت- مہمان نوازی- یہاں کے باشندوں کے اخلاق- یوروپین تجار سے اورنگ زیب کے برتاؤ کے متعلق بیسیوں واقعات لکھے ھیں- ایک جگہ وہ لکھتا ھے کہ "سیاہ فام ھندوستانیوں میں رشوت ستانی اس سے زیادہ نہیں جتنی کہ گورے چمڑے والوں میں ھے" ملک کے امن و امان کی بہت تعریف کرتا ھے اور لکھتا ھے کہ "یہاں ڈاکہ اور قتل کی خبریں بہت کم سنی جاتی ھیں- ایک غیر ملک کا باشندہ اِس ملک میں چلا جائے تو کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ھے اور کیوں جاتا ھے" وہ یوروپین تجار سے اورنگ زیب کے منصفانہ برتاؤ کی تعریف کرتا ھے اور یوروپین تجار کی پالیسی اور اخلاق کو شرمناک بتاتا ھے اور اس کی تائید میں اُس نے متعدد واقعات بیان کئے ھیں--

کیا اچھا ھوتا اگر فاضل مولف اسی کے ساتھ ایک دوسرے یوروپی سیاح کے بیانات بھی اپنی کتاب میں درج کر دیتے جو نہ کسی کا ملازم تھا نہ تاجر تھا بلکہ اپنے گھر سے دنیا کی سیاحت کی خاطر نکلا تھا اور جس نے اورنگ زیب سے خلوت اور عام دربار میں ملاقات کی عزت حاصل کی تھی یہ شخص اٹلی کا رھنے والا اور سول لا کا ڈاکٹر تھا- دنیا کی سیر کرتا ھوا یہ ۱۳ جون سنہ ۱۶۹۳ع میں ھندوستان پہنچا اور دسمبر سنہ ۱۶۹۹ع تک یہیں رھا- وہ ۵ مارچ سنہ ۱۶۹۴ع کو گوا سے اورنگ زیب کے اردوے معلیٰ کی طرف روانہ ھوا جو اس وقت گلگلا میں تھا (غالباً یہ مقام بیجاپور کے قرب و جوار میں معلوم ھوتا ھے) رستے میں جہاں کہیں اُسے موقع ملتا چوری چھپے بتوں کو توڑ جاتا تھا- آخر ۱۷ مارچ کو منزل مقصود پہنچا- ۲۱ مارچ کو بادشاہ سے خلوت میں ملاقات ھوئی اور اِس کے بعد دربار عام میں بھی حاضر رھا- یہ حالات اُس نے بڑے لطف سے لکھے ھیں- بادشاہ نے اُس سے مختلف قسم کے سوال کئے اور ھنگری اور ترکی کی لڑائی کا حال پوچھا اور دول یورپ کے حالات دریافت کرتے رھے- یہ

سیاح (جمیلی کیری) اورنگ زیب کی مذہبی رواداری کی بہت تعریف کرتا ہے،وہ کہتا ہے کہ 'اورنگ زیب کی فوج کے عیسائی افسروں نے میری بڑی خاطر مدارات کی اور اُنھوں نے کہا کہ اس بادشاہ کی ملازمت ایک طرح کی مسرت اور خوشی ہے کیونکہ اول تو کوئی بادشاہ اپنے سپاہیوں کو اتنی تنخواہ نہیں دیتا اور جب وہ کبھی لڑنا نہیں چاہتے یا ٹھیک طور سے پہرہ نہیں دیتے تو صرف یہی سزا دی جاتی ہے کہ اس روز کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے جس روز ایسا واقع ہوتا ہے۔اُن کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی۔ فوج میں رومن کیتلک والوں کا ایک گرجا تھا جس میں دو پادری مذہبی خدمت انجام دیتے تھے۔اُس نے یہ بھی دیکھا کہ ایک عیسائی کپتان نے دو مسلمانوں کو شراب نوشی کی سزا میں بندھواکر پٹوایا اور ان دونوں نے کپتان کا اس مناسب سزا پر شکریہ ادا کیا۔وغیرہ وغیرہ.........

بہر حال ان چشم دید بیانات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں پوری مذہبی رواداری تھی اور وہ اس قدر متعصب نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔

اب ہم دسویں باب پر آتے ہیں جو کتاب کی جان ہے اور جس کی خاطر یہ سب کچھ لکھا گیا ہے۔اس باب کے لایق مولف نے تین حصے کئے ہیں۔پہلے حصے میں انھوں نے گزشتہ ابواب کا خلاصہ بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ عہد مغلیہ بھی اہل ہند کے لئے اسی طرح قابل فخر ہونا چاہئے جیسا کہ اشوک یا چندر گپت کا زمانہ اور ہندؤں کا یہی نقطۂ نظر ہونا چاہئے۔دوسرے حصے میں اِس امر پر بحث کی ہے کہ مسلمانوں کا نقطۂ نظر کیا ہونا چاہئے۔اول خلافت پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ سیاسی خلافت محال ہے۔تمام عالم کے مسلمانوں کا نہ پہلے کبھی کوئی سیاسی خلیفہ تھا اور نہ اب ممکن ہے اور اگر سیاست خلافت سے نکال لی جائے تو پھر خلافت کوئی چیز نہیں رہتی۔غرض مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر

ں مولف کی راے میں یہ ہونا چاہئے کہ "وہ بلا لحاظ مذہب و ملت اپنے تمام
اہوان وطن کے ساتھ ایک ہی کشتی میں بیٹھا تصور کریں اور وہ کشتی
دوستان ہے" گویا ہندوستان کی ذلت اور تباہی اُن کی ذلت اور تباہی اور
دوستان کا عروج اُن کا عروج ہو۔ تیسرے حصے میں نفاق کے نتائج اور باہمی
ماد کی تدبیر پر بحث کی ہے۔ اتحاد کی تدابیر مفصلۂ ذیل بتائی ہیں —

اصلی تدبیر اُن کی راے میں یہ ہے کہ ہندوستان کی صحیح تاریخ
ندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی جائے جس میں نہ تعصب کو دخل ہو اور نہ
لط فہمی کا امکان اور ایسی ہی تاریخیں مدارس کے نصاب میں داخل کی
ائیں۔ اُن کا خیال ہے کہ باہمی اتحاد کو سب سے بڑا صدمہ ایسی تاریخوں سے
پنچا ہے جن میں حقیقت اور صداقت کو چھپا کر تعصب کا بیج بو دیا ہے۔ اس
صل تدبیر کے بعد چند اور چھوٹی چھوٹی تدبیریں بھی بتائی ہیں۔ مثلاً اضلاع
ی کانگریس کمیٹیاں مقامی ضروریات اور حالات کے رو سے اتحادی تجاویز
عمل میں لائیں۔ اخباروں میں اتحادی مضامین کی بھرمار کی جائے۔ دہلی کی
اتحادی کانفرنس کی تجاویز پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ کانگریس کی
رکنیت کے لئے یہ شرط لازم قرار دی جائے کہ ہر رکن اتحاد پر ایک مضمون
لکھ کر کسی اخبار میں شایع کرے یا کانگریس کمیٹی میں پیش کرے۔ قابل
مولف کا مقصد اِس سے یہ ہے کہ قبل اِس کے کہ کوئی شخص انڈین نیشنل
کانگریس میں شرکت کی درخواست پیش کرے وہ اتحاد و اتفاق کے مسئلہ پر
غور کر کے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرلے۔ ہندو مسلمانوں کے لئے علیحدہ
علیحدہ مدارس کا اصول درست نہیں۔ ان کے بچوں کو ایک جگہ تعلیم دی جائے
تا کہ بچپن سے باہم محبت اور دوستی کے خیالات پیدا ہو جائیں۔ جیسا کہ پہلے
دستور تھا اب بھی کوشش کی جائے کہ ہندو مسلمان آپس میں ملیں جلیں
ایک جگہ اُٹھیں بیٹھیں۔ غرض جہاں تک ممکن ہو ایک دوسرے سے ملنے جلنے

کے موقع پیدا کئے جائیں۔مولف کی راے میں اتحاد قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کے جداگانہ حق میں ہاتھہ نہ لگانا چاہئے۔یہ بھڑوں کا چھتہ ہے اور جو قراردادہ لکھنؤ میں ہو چکی ہے اُسی پر قائم رہنا چاہئے۔اُن کے خیال میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب سے وہی فائدہ ہوگا جو انگلستان کی پارلیمنٹ کو مختلف فریقوں کے وجود سے ہوتا ہے یعنے متضاد قوتوں اور کششوں میں اعتدال پیدا کرنا۔آخر میں فاضل مولف نے اپنا ذاتی عقیدہ یہ بیان کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ہو کر رهیگا۔خدا کرے ایسا ہی ہو—

یہ تجویزیں جو اُوپر بیان ہوئی ہیں بہت اچھی ہیں اور جناب مرزا صاحب کے خلوص پر دلالت کرتی ہیں لیکن کیا اس پیچ درپیچ مسئلہ کے حل کرنے کے لئے جس نے اس وقت ایک عجیب ناگوار صورت اختیار کرلی ہے کافی ہیں؟ اصل اور بڑی تجویز یہ بتائی گئی ہے کہ ہندوستان کی تاریخیں سچائی اور صداقت کے ساتھہ لکھی جائیں۔یہ بہت عمدہ تجویز ہے۔لیکن اتنی مدت کے بعد جب کہ زہر سرایت کر چکا ہے اب اس ذریعہ سے اتحاد اور اتفاق قائم کرنا آسان نہیں۔اس کے لئے ایک زمانہ چاهئے۔قطع نظر اِس کے ان تجویزوں کے عمل میں لانے کی کوئی صورت نہیں بتائی گئی —

ہم اکثر اگلے زمانے کی محبت و الفت کا ذکر حسرت سے کرتے ہیں (اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالت دیکھہ کر دل کو ٹھیس لگتی ہے) اور حیرت کرتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا اور دل سے یہ آرزو کرتے ہیں کہ پھر وہی لیل و نہار ہوں۔وہی محبت و آشتی ہو۔وہی دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات اور باهمی موانست ہو۔ہمارے اخباروں اور تقریروں میں یہ خیالات اور یہ تمنائیں بار بار دهرائی جاتی ہیں۔بیشک یہ باتیں نیک نیتی پر محمول ہو سکتی ہیں مگر حقیقت سے بعید ہیں۔ہم یہ نہیں دیکھتے کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہے۔نہ وہ اگلا سا نظام حکومت ہے۔نہ وہ آئین و قوانین ہیں۔نہ وہ معاشرت ہے۔نہ

وہ چاہتے ہیں۔ایسی حالت نہیں کیونکر ممکن ہے کہ وہی حالات پیدا ہو جائیں جو پہلے تھے۔اس وقت ہم پر ایک جدید حکومت فرمانروا ہے جس کے تحت ہم نے حقوق طلبی کا نیا سبق سیکھا ہے۔تعلیم کا ڈھنگ بالکل بدل گیا ہے۔زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب نمایاں ہے۔جو پہلے رعایا اور حاکم تھے اب خواجہ تاش ہیں۔اس لئے نہ وہ تعلقات قائم رہ سکتے ہیں اور نہ وہ معاشرت باقی رہ سکتی ہے۔لیکن اتحاد کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ مقابلہ ایسے سے ہے جو ہم سے کہیں افضل ہے —

ہندو مسلمانوں میں جو جھگڑے اور فساد ہوتے رہتے ہیں اُن میں سے اکثر بلکہ سب کے سب مذہبی سمجھے گئے ہیں۔ہندوستان عام طور پر ایک مذہبی ملک سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کے باشندے مذہب و تصوف میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر باتیں جو مذہب کے نام سے مشہور ہیں محض تعصبات اور توہمات ہیں۔جس ملک کے اتحاد کا انحصار معبدوں کے سامنے باجے بجانے۔پیپل کی ٹہنیوں کے کاٹنے اور گائے کے ذبح پر ہو وہاں اتحاد ہونا معلوم۔تعجب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے سردار اور رہنما اتحادی کانفرنسوں اور انجمنوں میں اُنہیں توہمات اور تعصبات پر جوش و خروش سے بحثیں کرتے اور اُنہیں قواعد کے تحت میں لانا چاہتے ہیں حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو کسی قاعدے کی پابند نہیں ہو سکتیں۔توہمات اور تعصبات کی اصلاح کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ان کا استیصال ہے۔اگر ہمارے رہنما بھی اِن توہمات پر ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں جیسا کہ عوام تو اُن پر افسوس ہے اور اگر وہ ان باتوں کو مہمل سمجھتے ہیں اور پھر اُن کی حمایت کرتے ہیں تو اس سے زیادہ افسوس ہے۔سر سید احمد خاں مرحوم نے جب اپنا کام شروع کیا تو سب سے پہلے اُنہوں نے توہمات اور تعصبات کی جڑ کاٹنی شروع کی اور مخالفت اور بدنامی کی کچھ پروا نہ کی اور یہی صحیح

طریقہ اصلاح کا ہے۔شاید ہمارے رہنما ڈرتے ہیں کہ اگر ان باتوں کی مخالفت
کی گئی تو اُن کی ہردلعزیزی اور شہرت میں فرق آجائیگا۔لیکن ایسی شہرت
اور ہردلعزیزی جو اس قسم کے توہمات پر مبنی ہے قائم رہنے والی نہیں۔
رسوائی کہیں نہ کہیں اس کی تاک میں لگی ہوئی ہے۔اس لئے ہماری راے
میں اتحاد کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ان تعصبات اور توہمات
سے بالا ہو جس کا تعلق نہ کسی خاص مذہبی انجمن سے ہو نہ کسی سیاسی
کانفرس سے۔وہ آزادانہ کام کرے اور اہل ملک کی آنکھیں کھولے کہ وہ کن
مہملات میں مبتلا ہیں اور اپنی اِن حرکات سے ملک کو کیا نقصان پہنچا رہے
ہیں۔وہ ایک معتدبہ سرمایہ جمع کرکے اعلیٰ درجہ کا اخبار اور رسالہ جاری
کرے اور رفتہ رفتہ ہر صوبے کی مقامی زبان میں اسی قسم کے اخبار اور رسالے
شایع کئے جائیں۔وہ ان تمام تعصبات اور توہمات کو نہایت تحمل اور شایستگی
سے رفع کرنے کی کوشش کرے۔ہندوستان کی تاریخ کے متعلق صحیح اصول پر
تحقیق کا کام کرے اور ملک میں رواداری اور بلند نظری کے خیالات پھیلائے۔
اگر چند عالی خیال اصحاب اخلاقی جرأت سے کام لیکر کھڑے ہو جائیں تو
سیکڑوں آدمی اُن کا ساتھہ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے اور جب لوگوں کو اُن
کی راستی اور خلوص پر یقین ہو جائیگا تو اُن کے قول پر بہ نسبت کسی دوسری
جماعت کے زیادہ اعتماد ہوگا۔وہ ملک میں ایک زبردست قوت ہو جائیگی
اور ان تمام تجویزوں کو زیادہ خوبی سے انجام دے گی جس کی تمنا فاضل
مولف نے اپنی کتاب میں ظاہر کی ہے۔ورنہ اگر فساد کی اصل بنا قائم رہی
اور دونوں جانب سے یہی مطالبات پیش ہوتے رہے تو مصالحت کی جتنی کوششیں
کی جائیں گی وہ سب بیکار ہوں گی۔اگر فاضل مولف اس بات پر آمادہ ہوں تو
اس جماعت کے پروگرام پر تفصیلی بحث بعد میں ہو سکتی ہے—

" البیان المغرب فی اخبار المغرب "

علامہ ابن العذاری المراکشی کی کتاب البیان المغرب فی اخبار المغرب کا ترجمہ جو پروفیسر جمیل الرحمن صاحب ایم-اے وغیرہ وغیرہ پروفیسر تاریخ اسلام جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے اصل عربی سے اُردو میں کیا ہے اور تنقید کے لئے ہمارے پاس بھیجا گیا ہے-ہم نے اِس ترجمے کا اکثر حصہ اصل عربی سے مقابلہ کرکے دیکھا- بحیثیت مجموعی ترجمہ غنیمت ہے-زبان بھی صاف ہے مگر افسوس ہے کہ ترجمہ کی صحت کا لحاظ نہیں رکھا گیا-کیونکہ متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں فاضل مترجم نے اصل کتاب کے سمجھنے میں غلطی کی ہے جس سے ترجمہ کچھہ کا کچھہ ہوگیا ہے-اِس سے ہماری نیت خدا نخواستہ فاضل مترجم یا اُردو ترجمہ کی تنقیص نہیں ہے کیونکہ علم کی خدمت جس حد تک اور جس طرح بھی کوئی کرے بہر حال قابل قدر ہے اور اُمید ہے کہ یہی کوشش آگے چل کر اُنہیں صحیح معنے میں مستند مترجم بنا دے گی—

ذیل میں ترجمہ کی چند کمزوریاں بطور نمونہ پیش کی ہیں تا کہ آئندہ جب مترجم صاحب کو کتاب کی دوبارہ اشاعت یا نظر ثانی کا موقع ملے تو وہ ان اسقام سے اُسے پاک کرنے کی کوشش فرمائیں—

اردو ترجمہ صفحہ ۱۳ " جب جرجیر نے دیکھا کہ مسلمانوں پر اُس کا رعب طاری ہوگیا ہے " اصل عربی عبارت " فلما رای جرجیر العرب اشتد رعبہ "—

صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہئے " جب جرجیر نے عربوں کو دیکھا وہ سخت مرعوب ہو گیا " اِس ترجمہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ فاضل مترجم نے ترجمہ بالکل الٹا کیا حالانکہ عربی جملہ بالکل آسان اور واضح ہے—

اُردو ترجمہ صفحہ ۱۵ " مسلمانوں کے رسالہ اور پیدل فوج نے سبیطلہ کے قلعہ کی جانب پیشقدمی کی-رومی قلعہ میں داخل ہونے سے مانع آئے "

اصل عربی عبارت " و سبقت خیول المسلمین و رجالهم الی حصن سبیطلة فمنعوهم من دخوله "

صحیح ترجمہ مسلمانوں کا رسالہ اور پیدل سپاہ اُن سے پہلے سبیطلہ کے قلعہ پہنچ گئی اور اُنہوں نے کفار کو اُس قلعہ میں داخل نہ ہونے دیا—

فاضل مترجم نے یہاں ترجمہ میں لغزش کھائی ہے جس سے اصل مفہوم بالکل بدل گیا حالانکہ سبقت- کا فعل خود اِس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ مسلمان اُن سے پہلے پہونچے اور اُنہوں نے اِس شکست خوردہ فوج کو جو قلعہ میں پناہ لینا چاہتی تھی اُس سے باز رکھا جو آگے کی عبارت سے بالکل صاف ہو جاتا ہے—

صفحہ ۲۸ میں فاضل مترجم نے مسجد جامع کی صفت جلیل القدر لکھی ہے- " وہاں ایک جلیل القدر مسجد جامع بھی ہے " اصل عربی میں صرف اتنا ہے و بها جامع جلیل-جس کا ترجمہ عظیم الشان اور وسیع سے کرنا چاہئے ہماری نظر سے مسجد کی یہ صفت اُردو زبان میں نہیں گزری—

صفحہ ۳۰ میں فرماتے ہیں جن سے ہم نے بہت سے عہد نامے اور وعدے کئے ہوئے ہیں- یہ جملہ محاورۂ زبان اُردو کے بالکل خلاف ہے—

صفحہ ۵۷ " بشر نے کہا دشمنوں سے جاکر کہدے کہ وہ نہ مریں "

اصل عربی عبارت میں ہے " فقال لها قولی للاعداء لایموت " جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ بشر نے اپنی جاریہ سے کہا کہ دشمنوں سے جاکر کہہ دے کہ امیر ابھی مرتے نہیں "

یہاں خاص بات قابل لحاظ یہ ہے کہ لایموت فعل واحد ہے بھلا " اعداء " جو جمع ہے وہ اُس کا فاعل کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ صرف و نحو کی ایسی غلطی ہے جو شاید مبتدی بھی نہیں کرے گا—

صفحہ ۵۹ میں ایک شعر کا ترجمہ ملاحظہ ہو—

اصل عربی شعر جو ترجمہ میں بھی نقل کر دیا گیا ہے—

"قنا مهتم علا بعين جليته واقتم كذا ما قد علمنا لنا فعل"

فاضل مترجم نے اِس کا ترجمہ کیا ہے "تم نے ہمارے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں حالانکہ تم کو ہمارے کارنامے معلوم ہیں"—

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسرے مصرع کا یہ ترجمہ مترجم کے ذہن میں کہاں سے آیا حالانکہ اس کے بہت ہی صاف معنے یہ ہیں "اور ہمیں پہلے سے معلوم ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہو" اِس سے نہ صرف ترجمے کی غلطی بلکہ فاضل مترجم کے ذوق و دانش کا بھی پتہ چلتا ہے ترجمہ کا ایک اور مقام قابل لحاظ ہے—

صفحہ ۹۱ "طنجہ اور گرد و نواح کے علاقہ کے عامل عمر بن عبداللہ المرادی نے سوءسیرۃ کا اظہار کیا صدقات اور عشر کے معاملہ میں لوگوں پر تشدد کیا اور سب پر اِس زعم میں اضافہ کیا کہ تمام بربری مال غنیمت اور مسلمانوں کے فئے میں داخل ہیں چنانچہ ان کی تقسیم کا ارادہ کیا۔یہ ایک ایسا فعل تھا جس کا ارتکاب اس سے پہلے کسی عامل نے نہ کیا تھا۔وہ لوگ صرف اُن ہی بربریوں کو اپنا خمس سمجھتے تھے جنہوں نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔عمر کے اِس مذموم فعل کا نتیجہ یہ ہوا ...."

اصل عربی عبارت یہ ہے۔—

"ثم ان عمر بن عبداللہ المرادی عامل طنجۃ و ماوالاھا اساءالسیرۃ وتعدوٰ فی الصدقات والعشر واراد تخمیس البربر و زعم انھم فی المسلمین وذلک مالم یرتکبہ عامل قبلہ وانما کان الولاۃ یخمسون من لم یجب الاسلام وفکان فعلہ الذمیم سببا"

اِس عبارت کا صحیح ترجمہ کیا جاتا ہے تا کہ ناظرین کو اُن فاحش غلطیوں کا علم ہوجائے جو فاضل مترجم نے اپنے ترجمہ میں کی ہیں:—

"عمر بن عبداللہ المرادی نے جو طنجہ اور اُس کے ملحقہ علاقہ کا عامل تھا ظلم و زیادتی شروع کی صدقات عشر میں اضافہ کر دیا بربروں سے خمس لینا چاہا کیوں کہ اُس نے یہ گمان کیا کہ بربر مسلمانوں کی غنیمت جہاد ہیں حالانکہ اس سے پہلے کسی عامل نے ایسا گمان اُن کے متعلق نہیں کیا تھا اور اِس وقت تک جتنے والی ہوچکے تھے وہ سال گذاری میں پانچواں حصہ صرف اُن بربروں سے وصول کرتے تھے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور اُس کا یہی قبیح فعل سبب بن گیا........."

تاریخ اسلام کا ہر طالب علم اسے خوب جانتا ہے کہ مسلمان مسلمانوں سے عشر اور غیر مسلم سے خمس خراج میں وصول کرتے تھے۔اگر تاریخ اسلام کا پروفیسر اِس مقام پر تخمیس کا ترجمہ ایک جگہ "اُن کی تقسیم" اور دوسری جگہ "اُن کو اپنا خمس سمجھتے تھے" کرے تو اِس سے زیادہ قابل افسوس بات کوئی نہیں ہوسکتی —

چونکہ یہاں اِس ترجمہ کی نظر ثانی مقصود نہیں ہے بلکہ محض سرسری تبصرہ ہے اِس لئے ہم مذکورۂ بالا مثالوں کے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ سارا ترجمہ اسی قسم کی لغزشوں سے مملو ہے۔اسی طرح زبان اور انشا کی جا بہ جا غلطیاں موجود ہیں—

ہم پروفیسر جمیل الرحمن اور اُن کے فاضل والد اور بھائی کی اُن قابل قدر مساعی کا دل سے اعتراف کرتے ہیں جو اُنہوں نے تاریخ اسپین کے متعلق فرمائی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھہ ہماری یہ دلی تمنا اور درخواست ہے کہ بجاے جلد جلد ترجمہ کرنے کے صحت کا زیادہ خیال رکھیں تو بہتر ہوگا—

کتاب مقتدر حکیم الرحمن صاحب بی۔اے نصیر کاٹیج ربانی روڈ لاہور کے پتہ سے طلب کی جاسکتی ہے۔۳روپیہ ۸ آنہ اسکی قیمت ہے —

مذہب

کشاف الہدیٰ

مقدمہ

کتاب الہدیٰ - مرتبۂ مولوی سیٹھہ یعقوب حسن صاحب

قیدخانہ بعض اوقات موجب برکت ثابت ہوا ہے - بڑے بڑے لوگوں نے جن پر ایسی مصیبت نازل ہوئی ہے اپنے زمانۂ قید میں ایسے ایسے کام کئے ہیں جو زمانہ میں یادگار رہے ہیں۔ کچھہ عرصہ ہوا یہ مصیبت ہماری قوم کے بزرگوں پر بھی نازل ہوئی۔ ان میں سے اکثر نے قید میں رہکر مذہب کی تحصیل کی یا مذہبی مسائل پر غور کیا۔ مولوی سیٹھہ یعقوب حسن صاحب بھی اُنہیں بزرگوں میں ہیں۔ اُنہوں نے قیدخانے میں ایک جامع کتاب لکھدالی - جس کا نام کتاب الہدیٰ ہے - اور کتاب زیر تبصرہ اِس کا مقدمہ ہے اسکا مقصد صرف کتاب الہدیٰ کی ترغیب و تعارف ہے اِس میں کوشش کی گئی ہے کہ تمام اخلاقی سیاسی مذہبی معلومات کا ذخیرہ صرف قران سے اخذ کیا جائے اور قران کے تمام اہم ترین مضامین و مباحث کی واضح تفصیل پیش کی جائے اِس مقصد کے لئے بڑی احتیاط کے ساتھہ شان نزول اور مضامین کی پریشان ترتیب اور تقسیم کو موزوں اور مرتب ضابطے اور قاعدے کے ساتھہ جمع کیا گیا ہے —

مولف نے تمام مجمل اور مبہم آیات کی تفصیل کے لئے ہم مضمون آیتوں کو ایسی ترتیب کے ساتھہ جمع کر دیا ہے جس سے وضاحت مضمون کے ساتھہ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ احکام قرانی کے تدریجی منازل کیا ہیں۔اِس سے عبادات۔ معاملات۔ معتقدات کی حقیقی حالت اور نوعیت و کیفیت عیاں ہوتی ہے —

قران کے نزول - وحی - نزول وحی کی کیفیت - وحی باللفظہ - الہام - القا پر معنی خیز بحث کی گئی ہے - قران اور دیگر الہامی کتابوں کا مقابلہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے - توراۃ - انجیل - زبور و دیگر کتب قدیمہ سے قران کا توازن کرکے

اُس کی جامعیت اور افضلیت کا کافی ثبوت دیا گیا ہے۔ عرب کی جغرافیائی حالت عرب و دیگر ممالک کی مروجہ زبان۔ انداز معاشرت وتمدن ودیگر ماحول کو بڑی سلاست سے واضح کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ عربی زبان ھی میں قرآن کا اتارا جانا مصلحت تھا ـــ

نیز یہ کہ قرآن معجزۂ نبوت ہے کیونکہ آنحضرت اُمی تھے۔ قرآن میں بہت سے ایسے مضامین کتب سابقہ کے موجود ھیں جن سے اُس زمانہ کے علماء بالکل نابلد تھے۔ طرز کلام اور گوناگوں مضامین کا انتظام معجز ہے۔ قرآن میں ابتدا سے آجتک کوئی اختلاف نہیں ھوا۔ اسکے بعد قرآن کے وقتاً فوقتاً اُتارے جانے کی مصلحت پر بحث کرتے ھوئے قرآن کی کتابت۔ تعلیم و حفظ۔ ترتیب۔ جمع مصحف صدیقی و مصحف عثمانی کا فرق بتاکر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مصحف عثمانی بے کم و کاست وھی قرآن ہے جو آنحضرت کے وقت تھا۔ پھر فن کتابت کی ایجاد اور اسکی مختصر تاریخ بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہے۔ آخر میں اصل کتاب (کتاب الہدیٰ) کا ٹائٹل مع دیباچہ مولانا سید سلیمان ندوی بہاری۔ مکمل فہرست مضامین اور اصل کتاب کا ایک جز بطور نمونہ نقل کردیا گیا ہے جس سے کتاب الہدیٰ کا بخوبی اندازہ ھوسکتا ہے ـــ

مقدمہ قابلیت۔ محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اور اس میں بڑی جگرکاوی کی گئی ہے۔ اس میں تمام مسلمان اور غیر مسلم افراد کے لئے معلومات قرآن کا اچھا خاصہ مواد موجود ہے۔ کہیں کہیں زبان کے اسقام اور طباعت کی غلطی نظر آتی ہے مگر یہ چنداں قابل خیال نہیں ہے ـــ

تاھم مولف صاحب کی جگرکاوی۔ محنت اور تحقیق قابل داد ہے اور کتاب اپنے انداز بیان ومضامین کے لحاظ سے خوب ہے۔ حجم سب ملاکر ۳۰۰ صفحہ سے زیادہ ہے۔ کاغذ عمدہ اور طباعت بھی اچھی خاصی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ دفتر اشاعت ۷ سیڈ نہم روڈ مدراس سے مل سکتی ہے ـــ

یسرنا القرآن

یہ قاعدہ اِس غرض سے لکھا گیا ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد بچے قران خود سمجھ کر آسانی سے پڑھ سکیں۔ ہمارے ہاں بچوں کو قاعدہ اِس بری طرح سے پڑھایا جاتا ہے کہ اُن کی سمجھ میں خاک نہیں آتا اور جو اُستاد بتاتے ہیں اُسے بے سوچے سمجھے رٹ لیتے ہیں۔ یہ قاعدہ صاحبزادہ پیر منظور محمد صاحب نے اِس طریقے سے لکھا ہے کہ بچہ تدریجی طور سے سمجھ کر پڑھ سکے۔ الفاظ کی ترتیب بھی ایسی رکھی ہے کہ پہلے آسان آسان لفظ ہیں اِس کے بعد رفتہ رفتہ مشکل الفاظ کی مشق ہے اور الفاظ بھی ہر سبق میں اس طرح رکھے ہیں کہ اگر بچہ اُن پر قادر ہو جائے تو قران خود بخود پڑھ سکتا ہے۔ چھپائی اِس قدر صاف اور بین ہے اور الفاظ کی تحریر اِس قدر کُھلی ہے کہ پڑھنے میں بہت سہولت ہے۔ اعراب ہر حرف پر الگ الگ کُھلے کُھلے لکھے ہیں تاکہ اُن کے ملانے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو —

اِس قاعدہ کے بعد پڑھنے کے لئے قران شریف کے پارے بھی اِسی سلیقہ اور خوبی کے ساتھ چھاپے ہیں۔ کاغذ بھی بہت اچھا لگایا ہے۔ ہماری رائے میں قران پڑھنے والے بچوں کے لئے یہ قاعدہ اور یہ پارے سب سے بہتر ہیں —

قاعدہ کی قیمت ساڑھے پانچ آنے —

پارہ آلم و سیقول اور عم اعلیٰ کاغذ پر آڑھائی آنے فی پارہ۔ پورہ قران شریف اسی طرز کا مجلد پانچ روپیہ —

ملنے کا پتہ۔ منشی محمد لعل خاں صاحب ادیب۔ سناتوریم۔ مدن پلی ضلع چتور —

مُتفرق

اُردو آموز (Urdu simplified)

انگریزوں یا انگریزی داں اصحاب کو اُردو سکھانے کے لئے اگرچہ سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔لیکن یہ کتاب جس کے مولف دنیش چندردت صاحب ایم۔اے۔ایم۔آر۔اے۔ایس۔پروفیسر سینٹ جان کالج کلکتہ نے تالیف فرمائی ہے اپنی نوعیت میں سب سے ممتاز ہے۔اِس قسم کی کتابیں ہماری نظر سے بہت سی گذری ہیں لیکن کوئی کتاب جو ایسی جامعیت اور خوبی سے لکھی گئی ہو اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔اِس میں صرف و نحو۔ترجمہ۔انشا۔سب کچھہ آگیا ہے۔ ابتدا آسان آسان مشقوں سے کی گئی ہے۔اِس کے بعد درجہ بدرجہ مشق کے لئے ایسے سبق دئے ہیں جن میں زبان کے تمام قواعد آگئے ہیں اور اُن کے ساتھہ ساتھہ وضاحت کے لئے ایسی مثالیں دی ہیں کہ قاعدے خود بخود سمجھہ میں آجاتے ہیں۔روز مرہ اور محاورات کا استعمال اِس خوبی سے کیا گیا ہے کہ اهل زبان بھی داد دے۔عروض پر بھی دو سبق دئے ہیں اور اِس کی تفہیم کا ایسا سہل طریقہ اختیار کیا ہے جس میں ایک قسم کی جدت پائی جاتی ہے۔ان تمام باتوں کے علاوہ اُردو زبان کے نکات۔مختلف فوائد۔نازک فروق۔ الفاظ و محاورات کا استعمال اور اور بہت سی ایسی کام کی باتیں بتائی ہیں کہ سوائے ایسے شخص کے جس نے مدتوں غور و فکر سے زبان کو حاصل نہ کیا ہو کوئی نہیں بتا سکتا۔ہمیں حیرت ہے کہ ہندو بنگالی کو اُردو کے روز مرہ اور محاورات پر اِس قدر عبور کیوں کر حاصل ہوا۔معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اِس زبان کا مطالعہ بہت محنت اور غور و خوض سے کیا ہے۔کتاب کے آخر میں اُردو سے انگریزی اور انگریزی سے اُردو کی ایک مختصر فرہنگ بھی لگادی ہے جس میں اکثر ضروری اور کار آمد الفاظ آگئے ہیں —

جو انگریزی داں حضرات اُردو زبان حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں اِس سے بہتر کتاب نہیں مل سکتی —

کتاب تقریباً چار سو صفحہ پر ہے قیمت (تین روپیہ) سکۂ انگریزی —

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے —

Wit Humour and Fancy of Persia.

یہ کتاب مہرجی بھائی نوشیرواں جی دو کا ایم اے کی تالیف کی ہوئی ہے۔ پہلی مرتبہ صاحب موصوف نے Wit and Humour of the Persians کے نام سے ایک کتاب سنہ ۱۹۰۲ ع میں لکھی تھی۔ زیر تبصرہ تالیف اسی کا دوسرا اڈیشن ہے اور اس مرتبہ اس میں بہت کچھہ اضافہ کیاگیا ہے —

ہر زبان میں متین اور سنجیدہ تحریروں کے علاوہ کچھہ نہ کچھہ حصہ ظریفانہ نظم و نثر کا بھی ہوتا ہے اور جس قدر جو زبان زیادہ ترقی کرتی ہے۔ اس کی ظرافت اور خوش طبعی بھی نکھرتی جاتی ہے۔ زیر تبصرہ نسخہ میں جناب مولف نے قدیم اور جدید شعراے فارسی کے کلام سے وہ نظمیں منتخب کی ہیں جن میں ظرافت۔ خوش طبعی یا اصنات صنائع کے نمونے نظر آتے ہیں۔ نظموں کے علاوہ نثر کے لطیفے اور ظریفانہ حکایتیں بھی ہیں —

جناب مولف کی محنت قابل داد ہے۔ مختلف مستند کتابوں اور تذکروں سے مدد لی گئی ہے اور اِن سب کی ایک فہرست بھی دیدی گئی ہے —

کتاب انگریزی زبان میں ہے۔ لیکن فارسی کلام کے جملہ اقتباسات اصل زبان میں بھی دئے گئے ہیں۔ ہر مثل کا انگریزی ترجمہ بھی دیاگیا ہے۔ ایرانی شعرا کے علاوہ۔ اکبر۔ بیربل۔ ملاد وپیازہ۔ جہانگیر۔ نورجہاں۔ زیب النسا کے قصے بھی نظر آتے ہیں۔ اِن میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اگرچہ زبان زد عام و خاص ہیں لیکن

اُنکی صداقت تحقیق طلب ہے - مثلاً نورجہاں اور کسی شاعر کی گفتگو - نورجہاں شاعر کو دیکھکر کہتی ہے —

زمیں ترقید و پیدا شد سرخر

شاعر جواب دیتا ہے :- شمیدہ بوے مادہ آمدہ نر

یا زیب النسا کی حاضر جوابی کے قصے علمی تحقیق سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو یہ ظرافت اور زندہ دلی کی اچھی مثالیں ہیں اور یہی کتاب کا اصل مقصد ہے ہماری رائے میں یہ کتاب فارسی ادبیات کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے بہت دلچسپ ہے - کتاب مجلد ہے - پانچ روپئے میں جناب مولف سے ذیل کے پتہ پر مل سکتی ہے —

THE SWADESHI MILLS Co. Ltd.

NAVSARI BUILDINGS, HORNBY ROAD, FORT,

BOMBAY.

جدید رسالے

نوید

یہ رسالہ انجمن ترقی اُردو پٹنہ (عظیم آباد) کی جانب سے شایع ہوا ہے - اِس کا مقصد "صوبۂ بہار کے نوجوانوں میں زبان اُردو کا صحیح مذاق پیداکرنا اور ماہرین فن کی ادبی خدمات کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر زندہ اور روشناس کرنا ہے" - انجمن کا یہ کام بہت قابل قدر ہے اور اس نے اپنے مقاصد کو عمل میں لانے کی کوشش بھی کی ہے - چنانچہ حضرت شاد کا کلام ابھی انجمن کی طرف سے شایع ہے اس رسالے میں حضرت وحید مرحوم کی ایک غزل بھی شایع ہوئی ہے - حضرت وحید

ایک قابل خیال شاعر تھے-افسوس ہے کہ ان کا کلام ضایع ہوگیا-اس رسالے میں علاوہ دوسرے ادبی مضامین کے ایک مضمون صوبۂ بہار اور اُردو پر ہے- نیو کالج پٹنہ کے ایک شاعرے کی غزلوں کا انتخاب بھی درج ہے-ہمیں اُمید ہے کہ یہ رسالہ ترقی کریگا اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا-بہار میں اس قسم کے رسالوں اور اُردو زبان کی ترقی کی کوششوں کی بہت ضرورت ہے—

یہ رسالہ حضرت ساقی کی اڈیٹری میں ماہانہ شایع ہوتا ہے-سالانہ چندہ چار روپیہ ہے—

سفیر التجار

یہ ماہانہ رسالہ دہلی سے شایع ہوتا ہے جس میں تجارت کے متعلق مختلف مفید معلومات اور مضامین شایع ہوتے ہیں-رسالہ بہت اچھا چھپتا ہے اور نقشے تصویریں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں-جن اصحاب کو تجارت کا شوق ہے اُن کےلئے یہ بہت کارآمد ہے سالانہ چندہ چار روپیہ ہے—

کشاف

یہ ماہوار علمی اور ادبی رسالہ چھوٹی تقطیع پر امرتسر سے شایع ہوتا ہے-اِس میں نظم و نثر کے دلچسپ مضامین ہوتے ہیں-علمی مضامین کے علاوہ فسانہ اور تنقید کا حصہ بھی ہے-مالک و اڈیٹر-ایم محمد الدین غریب اور آنریری اڈیٹر غلام حسین بشر ہیں-سالانہ چندہ ایک روپیہ بارہ آنہ—

تاج

تاج حیدرآباد دکن نے میلاد نمبر خاص اہتمام سے شایع کیا ہے سرورق خوبصورت چھاپا ہے-نظم و نثر کے مختلف مضامین جو میلاد خاتم النبیین سے متعلق ہیں ۳۲ ہیں-تمام مضامین مطالعہ کے قابل ہیں اور بہت خوبی سے لکھے گئے ہیں- ضخامت بھی معمول سے بہت زیادہ ہے-حضرت وفا اڈیٹر کی محنت اور

کوشش بہت قابل قدر ہے۔یہ حیدرآباد کا بہترین رسالہ ہے۔لکھائی اور
چھپائی کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ حیدرآباد کے دوسرے رسالوں سے بہتر ہے

مطبوعات انجمن

جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا۔نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاصکر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا۔کتاب کے ابتدائی حصہ میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے۔جو ہمارے اہل وطن کے لئے بہت سبق آموز ہے۔اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے۔ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات ہے۔خاصکر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں (حجم ۲۸۲ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کلدار

سرگزشت حیات یا آپ بیتی

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو ونما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔حیات کی ابتدائی حالت سے لے کر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا ہوا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا۔یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے

(حجم ۲۰۰ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار۔۔

تذکرۂ شعرائے اردو

مولفۂ میر حسن دہلوی۔میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ان کی مثنوی بدر منیر کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے۔یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر طبع کی گئی ہے۔میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے۔اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے۔قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنہ کلدار۔

غیر مجلد ایک روپیہ ۴ آنہ کلدار۔۔

تاریخ تمدن

سرتامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا

ترجمہ ہے۔ الف سے ی تک تمدن کے ہر
مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث
کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید
میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے
اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب
اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔
حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ
مجلد دو روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد
۲ روپیہ کلدار —

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور
سائنس داں حکیم ہکسلے کی کتاب کا
جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔
اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے
لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے
قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار۔
مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار —

القول الاظہر

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الارا تصنیف
فوز الاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب
فلسفۂ الہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے
اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو
منطبق کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد
۸ آنہ کلدار مجلد ایک روپیہ کلدار —

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی
کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو
جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو
جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور
کتاب ایک نعمت ہے قیمت غیر مجلد
۱۰ آنہ کلدار —

قاعدہ و کلید قاعدہ

یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد
اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے
جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم
ہونی چاہئے ان کی تشریح کے لئے ایک
کلید بھی تیار کی گئی ہے۔ قاعدہ
غیر مجلد ۲ آنہ کلدار۔ کلید قاعدہ
غیر مجلد ۳ آنہ کلدار —

فلسفۂ تعلیم

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور
مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے غور
و فکر کا بہترین کارنامہ۔ والدین و معلم
کے لئے چراغ ہدایت ہے۔ تربیت کے
قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ
مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم
ہوتی ہے۔ اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔ قیمت
مجلد ۳ روپیہ کلدار۔ غیر مجلد ۲ روپیہ
۸ آنہ کلدار —

دریائے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر
انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے۔ اردو
صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ
کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے
متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج
ہیں۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ
کلدار مجلد ۲ روپیہ کلدار —

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو
صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل

ترجمہ کئی ہیں۔کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی ملسلک ہے۔قیمت غیر مجلد ۲ روپیہ کلدار مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

مشاہیر یونان و روما

ترجمہ ہے۔سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔وطن پرستی اور بے نفسی عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے۔قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپیہ کلدار۔مجلد ۴ روپیہ کلدار جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

اسباق النحو

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین صاحب بی اے کی تالیف ہے اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۶ آنہ کلدار حصۂ دوم غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

علم المعیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں۔اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔ حجم ۵۸۸ صفحے قیمت مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر۔تحقیق صداقت کا مرادف ہے۔ یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن۔ معاشرت - اصول - اخلاق - مذاہب و خیالات کا مرقع ہے۔حصۂ اول مجلد ۳ روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار —

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے۔مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار —

رسالۂ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے۔علمی اصطلاحات سے معرا۔طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار—

دیباچۂ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا۔پانی غذا۔لباس۔مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے ملک کی بہترین تصنیف ہے اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔حجم ایک ہزار صفحے۔قیمت مجلد چار روپیہ—

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے۔ بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار—

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے۔اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں۔نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔مولانا محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔قیمت مجلد دو روپیہ ۴ آنہ کلدار—

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے قیمت مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ کلدار—

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مولف "یہ بالکل نیا موضوع ہے۔میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں"۔ اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے۔سابقوں اور لاحقوں۔اردو مصادر اور ان کے

[illegible] سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں۔ اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں۔ لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں اور ہمارے حوصلے بلند کردئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوئے ھچکچاتے تھے۔ مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔ اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے۔ تعداد صفحات ۳۰۵ قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ کلدار—

نفح الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے۔ خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے۔ علامۂ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۶۰۴ قیمت مجلد چھہ روپیہ ۸ آنہ کلدار—

محاسن کلام غالب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے۔ یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا۔ صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں بعض قدیم اقوام۔ سلطنت کلدانی۔ آشوری۔ بابل۔ بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت۔ عقائد۔ صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دئے ہیں۔ اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے حالات کی وضاحت کے لئے جابجا تصویریں دی گئی ہیں۔ صفحہ ۲۷۴۔ قیمت مجلد دو روپیہ ٦ آنہ کلدار—

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے۔ کہاں سے آتی ہے کیا کام آسکتی ہے۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے۔ قیمت دو روپیہ ۴ آنہ کلدار—

——:o:——

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں
(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

(دارالمصنفین اعظم گڈھ)

۱- سیرۃ النبی حصۂ اول ۴ روپیہ
۲- سیرۃ النبی حصۂ دوم ۳ روپیہ ۸ آنہ
۳- شعرالعجم مکمل ۵ حصے ۱۳ روپیہ
۴- سفرنامہ مولانا شبلی ۲ روپیہ
۵- علم الکلام ۲ روپیہ
۶- الکلام ۲ روپیہ
۷- کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- اسوۂ صحابہ مکمل دو حصہ ۸ روپیہ
۹- انقلاب الامم ۲ روپیہ
۱۰- برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱- مکالمات برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۲- مثنوی بحرالمحبت ۱۲ آنہ
۱۳- تفسیر ابومسلم اصفہانی (عربی) ۲ روپیہ
۱۴- سیرالصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنہ
۱۵- روح الاجتماع ۲ روپیہ
۱۶- ابن رشد ۴ روپیہ

(مطبع کاویانی - برلن)

۱- موش و گربہ (فارسی) ۵ آنہ ۶ پائی
۲- زادالمسافرین (فارسی) ۸ روپیہ
۳- گلستان (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۴- تیاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۵- تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۶- نصاب الصبیان (فارسی) ۱ روپیہ
۷- رہنمائے پسران (فارسی) ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ
۹- ہزار و یک سخن (فارسی) ۱۱ آنہ

(جامعہ ملیہ - علی گڈھ)

۱- الخلافت الکبریٰ ۵ روپیہ
۲- الصراط المستقیم ۲ روپیہ
۳- بصائر ۹ آنہ
۴- سیرۃ الرسول ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- خلافت راشدہ ۲ روپیہ
۶- خلافت بنی امیہ ۱ روپیہ ۸ آنہ
۷- خلافت عباسیہ ۲ روپیہ
۸- خلافت عباسیہ بغداد ۲ روپیہ
۹- مبادی معاشیات ۱ روپیہ
۱۰- انتخاب مہر (از نورالرحمن صاحب) ۱ روپیہ
۱۱- قواعد عربی ۲ روپیہ
۱۲- عرض جوہر ۸ آنہ
۱۳- مجموعہ کلام جوہر ۶ آنہ
۱۴- اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۴ آنہ
۱۵- ازہار العرب ۸ آنہ
۱۶- انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیہ
۱۷- ترکوں کی کہانیاں ۴ آنہ
۱۸- خطبہ شیخ الہند ۲ آنہ

۱۹- [illegible] حکیم اجمل خاں صاحب
۴ آنہ
۲۰- ہمارے نبی ۸ آنہ
۲۱- تاریخ ہند قدیم ۱ روپیہ
۲۲- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر
۱۲ آنہ

(نظامی پریس - بدایون)

۱- قاموس المشاہیر جلد اول ۲ روپیہ
۲- نکات غالب مجلد ۱ روپیہ
۳- دیوان غالب مشرح مجلد دو روپیہ
۸ آنہ
۴- دیوان جان صاحب مجلد ۱ روپیہ
۸ آنہ
۵- دیوان درد ۱ روپیہ ۴ آنہ
۶- دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن)
۱ روپیہ ۸ نہ
۷- خطوط سرسید قسم اول ۳ روپیہ
۸- خطوط سرسید قسم دوم ۲ روپیہ
۹- لیتھوگرافی مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ
۱۰- انتخاب زرین مجلد ۲ روپیہ
۱۱- مراثی انیس جلد اول مجلد
۱۰ روپیہ
۱۲- مراثی انیس جلد دوم قسم اول
۸ روپیہ قسم دوم ۴ روپیہ
۱۳- تذکرۃ الصلحا ۸ آنہ
۱۴- کنز التاریخ ۱ روپیہ ۸ آنہ

(دائرۂ ادبیہ - لکھنؤ)

۱- مکاتیب امیر مینائی ۲ روپیہ ۸ آنہ
۲- مکاتیب اکبر ۱ روپیہ
۳- مینائے سخن ۱ روپیہ
۴- حزن اختر ۸ آنہ
۵- درس عمل ۴ آنہ
۶- خواتین انگورہ ۱ روپیہ
۷- بیگمات بنگال ۲ آنہ
۸- اسلام کا اثر یورپ پر ۳ آنہ
۹- مشرقی ترکستان ۲ آنہ
۱۰- سیاحت زمین ۱ روپیہ
۱۱- سیاحت ہوا ۱ روپیہ

الناظر پریس - لکھنؤ

۱- تاریخ عرب ۷ روپیہ ۸ آنہ
۲- موازنہ انیس و دبیر ۳ روپیہ
۳- مقدمہ شعر و شاعری ۱ روپیہ ۴ آنہ
۴- اصول النسخ ۲ آنہ
۵- مسلمانان اندلس ۱ روپیہ ۸ آنہ
۶- اسرار رنگون ۱ روپیہ
۷- ہوم رول ۵ آنہ
۸- خوان دعوت ۱ روپیہ
۹- مصنوعی شوہر ۴ آنہ
۱۰- وکرم اروسی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱- مسلمانوں کی تہذیب ۲ آنہ
۱۲- الاحسان ۸ آنہ

(دوسری قابل قدر کتابیں)

۱- رسائل شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۲- کتب خانہ اسکندریہ ۵ آنہ
۳- مسدس حالی ۱۲ آنہ
۴- جنگل کی پہلی کہانی ۵ آنہ
۵- بادل کے بچے ۱ روپیہ
۶- بانگ درا ۳ روپیہ
۷- یادگار غالب ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- مجموعہ نظم حالی ۸ آنہ

۹-اکبری اقبال ۳ آنہ

۱۰-الفاروق ۳ روپیہ

۱۱-اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ۸ آنہ

۱۲-نظم شبلی ۴ آنہ

۱۳-نفس اللغۃ ۱ روپیہ

۱۴-ترانۂ شوق ۱ روپیہ ۸ آنہ

۱۵-خوبی سخن ۸ آنہ

۱۶-دیگر ممالک میں قطع تعلق ۱۰ آنہ

۱۷-آزادی اسلام ۴ آنہ

۱۸-مصطفیٰ کمال پاشا ۱ روپیہ ۸ آنہ

۱۹-گوکھلے کی تقریریں ۱۲ آنہ

۲۰-سلف گورنمنٹ ۶ آنہ

۲۱-عالم خیال ۸ آنہ

۲۲-حیات خسرو ۸ آنہ

۲۳-نظام حیات انسانی ۸ آنہ

۲۴-فرہنگ فارسی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ

۲۵-فرہنگ عربی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ

۲۶-اسلامی حکومت ۲ آنہ

---:o:---

دیوان غالب جدید و قدیم

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بےحد انتظار تھا۔ اس میں مرزا غالب کا قدیم وجدید تمام کلام موجود ہے۔ مرزا صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم مجلد ۵ روپیہ کلدار۔ غیر مجلد ۴ روپیہ کلدار (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار)

مکاتیب

نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر۔ دلچسپ۔ پر از معلومات اور بہترین مجموعہ۔ مرتبہ مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ ریاست بھوپال ۱ روپیہ

---:o:---

المشتہر

انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

اُردو

۱-یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری-اپریل-جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا—

۲-یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی-حجم کم از کم ایک سو اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو صفحے ہوگا—

۳-بنظر احتیاط رسالہ ذریعۂ رجسٹری بھیجا جاتا ہے—

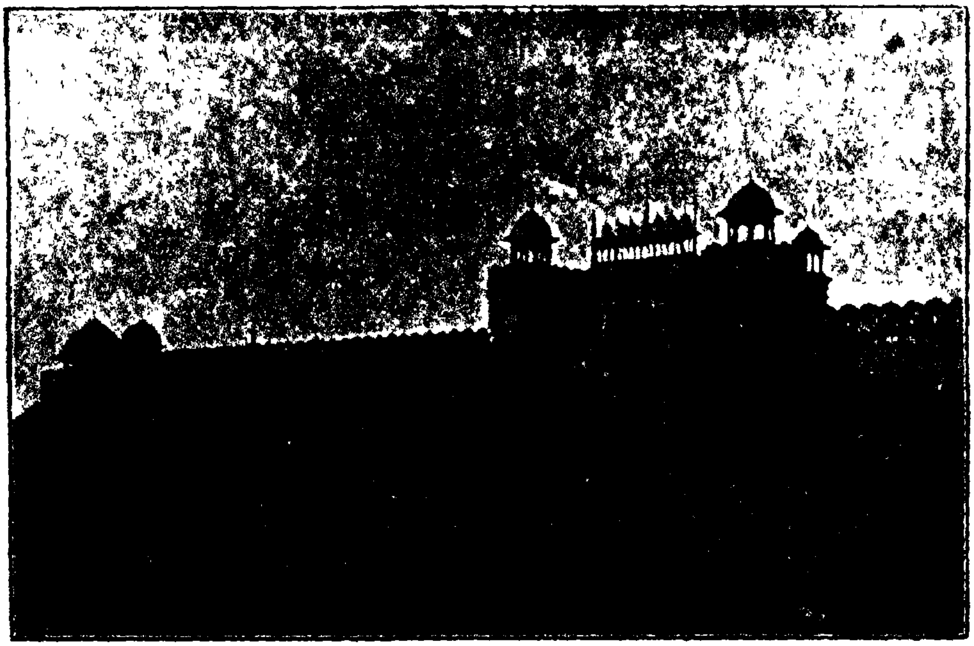
۴-قیمت سالانہ چھہ روپیہ کلدار-محصول ڈاک وغیرہ ملا کر آٹھہ روپیہ کلدار (سکۂ عثمانیہ سات روپیہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر نو روپیہ سکۂ عثمانیہ)

۵-تمام خط و کتابت:-مولوی عبدالحق صاحب بی-اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئیے—

(باهتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس-اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

جلد پنجم　　اپریل سنہ ۱۹۲۵ء　　حصۂ ہیجدہم

اُردو



انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرستِ مضامین

ربندرا ناتھہ ٹیگور

کی شہرۂ آفاق تصنیف

گیتان جلی

از

(ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم)

(۱)

جب ربندرا ناتھہ ٹیگور کی کتاب " گیتان جلی " (نیاز نغمہ) شایع هوئی میں انگلستان میں موجود تھا۔جس طرح شورش و انقلاب کے بعد سیاسیات کے عالم میں هر شے زیر و زبر هو جاتی هے ٹیگور کی آمد اور فتوحات نے قلمروئے سخن کو درهم برهم کر دیا تھا۔ڈبلو۔بی ییٹس W.B.Yeats آئرلنڈ کے افسرالشعرا ارنسٹ رهس Ernest Rhys ویلز کے ادیب محترم اور خود ملک الشعرائے انگلستان اُن کو موجودہ زمانہ کی شاعری کا تاج پیش کر رهے تھے۔کپلنگ Kipling نے تاب نہ لاکر اِن تمام هنگاموں سے دور خاموشی میں پناہ لے لی تھی۔ایک شب ایک بزم شعرا میں جانے کا اتفاق هوا۔وهاں ایک نوجوان شاعر نے جن کی ذات سے آئندہ انگریزوں کو بڑی اُمیدیں هیں کہا " جس دن سے ٹیگور کا کلام شایع هوا هے میں نے قلم هاتھہ سے رکھہ دیا هے اور اسی سوچ میں هوں کہ آخر کیا کہوں "—

اِس کے بعد جب میں انگلستان سے المانیہ واپس آیا وہ ہیں وہ زمانہ تھا کہ " نوبل انعام " کو عطا ہوئے دس بارہ روز گذرے تھے-ٹیگور کا نام زبان زد تھا اور ہر کہ ومہ کے لب پر یہی تذکرہ تھا- علمی اور شاعرانہ دنیا میں نیا کیا چرچے تھے-ہفتہ بھر کے اندر گیتان جلی ترجمہ ہوکر شایع ہوگئی تھی اور میہنہ کے ختم تک " باغبان " اور " ہلال " کے تراجم کے طبع ہوجانے کا اشتہار تھا-ایک روز میں ایک دکان میں جہاں میں اکثر کتابیں خریدا کرتا تھا داخل ہوا-دوکان‌دار نے اپنے خریداروں سے از راہ فخر کہا " یہ ٹیگور کے ہم وطن ہیں " ہر طرف سے مجھہ پر یورش ہونے لگی اور " آپ کو اور ہندوستان کو مبارک ہو " کی صدائیں بلند ہوئیں —

ایک خاتون (گیتان جلی کتابوں میں سے اٹھا کر)-" یہ تراجم درست بھی ہیں یا نہیں ؟ "

ایک صاحب-" گیتان جلی کے لفظ کی ترکیب از روے قواعد کیا ہے؟ "

ایک دوسری خاتون-(گیتان جلی میں دکھلا کر)-" کیا حضرت مصنف کی صورت بالکل ایسی ہی ہے ؟ ماشاالله کیا پاکیزہ " ہندوالمانی ، خد و خال ہیں- "

میں نے بہ مشکل تمام ٹیگور کے ان غائبانہ مداحوں سے رہائی پائی-—

چار پانچ روز میں سنا کہ شاہ سیکسنی کے حکم سے مجارستان (ہنگری) کی مشہور زمانہ مغنیہ نے گیتان جلی کے چیدہ مقامات حفظ کر شاہی سرود خانے میں سنا کر بے حساب داد حاصل کی—

ایک مہینہ کے اندر اندر علاوہ " باغبان " اور " ہلال " کے تراجم کے ربندرا ناتھہ کی سوانح عمری بھی شایع ہوگئی—

یہ دو ممالک کی چشم دید حالت ہے اور اقالیم میں بھی ایسی ہی قدر و منزلت ہوئی-اہل فرانس کو نہایت وثوق سے یقین تھا کہ " نوبل انعام "

اناطول فرانس Anatole France کو ملے گا۔ لیکن باوجود مایوس ہونے کے رہ قدردانی میں کسی سے کم نہیں رہے۔یورپ کی کوئی زبان ہی شاید ایسی ہو جس میں ٹیگور کا مجموعۂ نظم ترجمہ نہ ہوگیا ہو۔رومانی۔سربی۔مجاری (ہنگیرین) زبانوں تک میں ترجمہ کا مجھے ذاتی علم ہے—

(ب)

جب میں ہندوستان واپس آیا تو میرا خیال تھا کہ یہاں کی علمی دنیا میں بھی یہی حالت ہوئی ہوگی اور ٹیگور کے اعجاز قلم نے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہوگا - لیکن یہاں عام طور پر تعلیم یافتہ جماعت کو ٹیگور کے نام تک سے ناآشنا اور خواص کو اُس کی خوبیوں کا منکر پایا۔یہاں کے علمی طبقوں میں یہ حالت دیکھی کہ سخن فہموں کو داد تک دینے سے اغماض تھا۔خود بنگال میں ندائے مخالفت بلند پائی۔ع " چو کفر ازکعبہ برخیزد کجاماند مسلمانی " ہندوستان کی منطق یہ ہے کہ ٹیگور اور اقبال ہمارے ملک کے لحاظ سے بڑے شاعر نہیں ہیں لیکن اُن کا یورپ کے شعرا سے مقابلہ کرنا اور اُن کو مغنیان فرنگ کا ہمپایہ خیال کرنا یا استغفراللہ اُن سے ارفع اور اعلیٰ قرار دینا نہ صرف سوے ادب بلکہ گناہ ہے۔کہاں ہندوستان کی تیرہ خاک کہاں یورپ کی خاک کا۔یہ خاک اور وہ عالم پاک۔یہاں کے ساکنوں کو وہاں کے مکینوں سے نسبت ہی کیا ہے۔اگر یورپ خود ٹیگور کی تعریف میں رطب اللسان ہے تو یہ کسر نفسی بھی کوئی مغربی ادا ہے اور اس میں بھی کوئی راز ہے ورنہ ہندکی خاک سے کوئی فرزانہ کب اُٹھ سکتا ہے—

میں نے کہا کہ دعوے الفت۔مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کسقدر غلط

ایک صاحب نے جو انگلستان کی ایک معروف کلیہ کے فرزند ہیں اور انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتے ہیں فرمایا "ٹیگور کے خیالات عیسویت کے خیالات ہیں جو اُس نے برہمو سماج کے ذریعہ سے ورثہ میں پائے ہیں

اهل یورپ نے مصلحتاً ربندرا ناتھ کو مشہور کیا ہے - ٹیگور کی شہرت سے درحقیقت تبلیغ دین مسیحی مقصود ہے "اس اعتراض کا بہترین جواب گیتانجلی کے محض سرسری مطالعہ سے کافی اور شافی مل سکتا ہے - جس بنگال کا ٹیگور فرزند ہے وہ وہ بنگال ہے جو" چیتنیادیو "اور" چندراسین "کے مشہور ناموں سے منسوب ہے - جس شخص نے ٹیگور کے والد ماجد" دوندرا ناتھ ٹیگور "کی سوانح عمری کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ ٹیگور کا مذہب اپنشدوں کی لافانی تعلیم کے سوا کسی اور عقیدہ پر مبنی نہیں —

ایک اور نہایت ذی علم نوجوان نے جن کا مطالعہ نہایت ہی وسیع ہے اور جو اکثر مغربی اور مشرقی ادب سے واقف ہیں فرمایا کہ میں ٹیگور میں کوئی نئی بات نہیں دیکھتا - یہ تمام خیالات قدیم ہندو اور جدید ہندی شاعری میں موجود ہیں - یہ اعتراض ایسا ہی ہے جس طرح کوئی شخص " میر درد " " خواجہ حافظ " اور " حکیم سنائی " کے کلاموں میں اس وجہ سے کہ تینوں تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں امتیاز نہ کرسکے - یہ بجا ہے کہ ٹیگور کی بہت سی تشبیہات " کالیداس " سے مشابہ ہیں لیکن یہ محض اس وجہ سے ہے کہ دونوں خاص ہندی استعارات سے کام لیتے ہیں - یہ درست ہے کہ ٹیگور کے بہت سے خیالات " کبیر " سے ملتے ہیں لیکن اِس کا باعث صرف یہ ہے کہ دونوں کا کلام جوش و سپاس الٰہی میں ہے - انگلستان میں بھی چند اشخاص نے جن کی تعداد دو تین سے زیادہ نہیں ٹیگور کے کمال کا انکار اِسی پیرایہ میں کیا ہے - ایک صاحب ٹیگور کو " شیلے " Shelley کا خوشہ چیں بتلاتے ہیں اور ایک اور " فرانسیس ٹامپ سن " Francis Thompson کا مقلد خیال کرتے ہیں —

(ج)

میں نے خود ایک زمانہ ہوا " گیتانجلی " کا ترجمہ کرنے کا قصد کیا تھا - میرا ارادہ تھا کہ ترجمہ نظم معرا (غیر مقفیٰ) میں کروں تاکہ جہاں تک ہوسکے کلام کی

خوبی قائم رہے۔ لیکن چونکہ ٹیگور کے کلام کو ترجمہ میں ادا کرنے میں اس کی وقعت کے لحاظ سے ایسی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی جس کا میں متحمل نہ ہوسکا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ دس پندرہ مقامات ترجمہ کرکے رہ گیا۔ یہاں بطور نمونہ کے ایک مقام کا ترجمہ درج کرتا ہوں—

گیتان جلی مقام ۹۰

موت دستک دیگی جس دم تیرے دروازہ پہ آ
کیا تواضع اپنے مہماں کی بجالائے گا تو ؟
مرحبا! سلطان من حاضر ہے مینائے حیات
نوش عیش اور نیش غم دونوں کا یہ آمیزہ ہے
عمر کا میری ہے حاصل بس یہی لبریز جام
نوش جاں حاضر جو ہے بہر کرم فرمائیے

جہاں مجھے ملک کی ناقدردانی کا افسوس رہتا تھا وہیں اپنی بے کمالی کا بھی رنج تھا لیکن وہ بربط جس پر ٹیگور کے ترانۂ توحید کی شورانگیز لے بلند ہو میری آغوش میں نہ سماتا تھا۔ میری ارضی طبیعت اُس کی سماوی علویت کی تاب نہ لاسکی۔ لیکن الحمداللہ جس کام کو میں نہ کرسکا اُس کو ایک قابل ادیب نے پورا کیا—

(ل)

نسل شام کے اجداد نے عرب کے اُس دشت ناپیدا کنار کے آغوش میں تربیت پائی تھی جو ایک شیشۂ ساعت کی طرح تھا اور جس میں وقت مدام ریگ افشانی میں مشغول رہتا تھا۔ اِس صحرائے سموم میں ویرانی کے سوا کوئی آباد نہ تھا جب سموم رک جاتی تھی تو ہر جانب ایک پر رعب فضا پھیلا خاموشی مسلط ہو جاتی تھی۔ کیسی درندہ کی ہولناک چیخ تک سکوت کو نہ توڑتی تھی۔ یہاں

قدرت محض آفتاب-ماهتاب-ستاروں اور ریت کا مجموعہ تھی-سورج کی تاب و تابش میں بھی ایک جلوۂ قہر تھا-ریت کی طپش جان اور آرام کی دشمن تھی چاند ستارے خوبصورت ضرور تھے مگر بے فائدہ اس لئے گو نسل شام نے کواکب پرستی کی بنیاد ڈالی لیکن اُن کے دل نے اپنے عقیدے پر خود گواهی نہ دی حضرت ابراهیم نے جو تقریر شمس و قمر کے طلوع و غروب اور ستاروں کو دیکھہ کر کی وہ تمام نسل شام کی فریاد تھی جو دلوں سے زبان تک آگئی تھی گویا توحید یعنی یکتائی کا خیال قدرت نے اُن کے دلوں میں خود ودیعت کر رکھا تھا-آفتاب کا ثانی کوئی نہ تھا ماهتاب اپنی مثال نہ رکھتا تھا ازل اور ابد کے تصورات بھی تمثیلاً دل میں موجود تھے کہیں سے کہیں نکل جانے پر بھی مینائے لاجورد اور سراب دشت رفاقت نہ چھوڑتے تھے نہ صورت بدلتے تھے اس لئے جب اُن کو ایک ایسی هستی سے آگاہ کیا گیا جو علائق دنیا اور قیود عالم سے آزاد هے سب سے بالا موجودات سے ارفع-ازلی-ابدی-اور یکتا هے اور جو مہر و ماہ-ریگ و دشت-عرش و فرش سے لا تعلق هے جس کا علم قیاس و گمان بلکہ وهم سے برتر هے تو اُنہوں نے بدل تسلیم کرلیا یہی مطلوب تھا جس کی اُن کو تلاش تھی —

آریا نسل کے اسلاف نے جو ایران اور وسط ایشیا سے هندوستان کی جانب آئے اُن عظیم‌الشان بیابانوں کو جن کو قدرت نے شیر و اژدر کی نشیمن گاہ بنایا تھا اپنی فرودگاہ مقرر کیا-دامن همالیہ اور بندرابن کے قدرتی سرسبز سائبان معبد اور مندر قرار دئے گئے-جدھر نظر اُٹھتی تھی آب رواں اور سبزہ زار پیش نگاہ تھا-هر پیکر محسوس میں خدائی کار فرما نظر آتی تھی اور هر میدان و جبل دریا اور رود آب سے انا الحق کی صدا بلند هوتی تھی گونا گوں اثمار شیریں من و سلوی کا کام دیتے تھے اور برفاب سے لبریز چشمے پیاس بجھاتے تھے-قدرت خود قاضی‌الحاجات تھی-طیور کی زمزمہ سنجی بزم

سماع اور شاہدان گل کی حسن آرائی محفل وجد تھی۔کثرت میں ذات باری بلکہ آشکارا نظر آتی تھی —

جب عربوں کا فارس پر اور مسلمانوں کا ہند پر تسلط ہوا تو ان دونوں مذہبی خیالات کا بھی ایک دوسرے پر تصرف ہوا۔اس سے ایران میں تصوف نے فروغ پایا لیکن فطرتاً تصوف آریا نسل کے عجمی مسلمانوں کی طبائع سے زیادہ رابط تھا۔عربی الخیال مسلمانوں نے عموماً اپنی قدیم اسلامی روایات کو قائم رکھا۔شاعری ایک وسیع حد تک مذہب کی تابع ہے اس لئے ایک جانب تو صوفی شعرا – ع "خود کوزہ خود کوزہ گر خود گل کوزہ" خود رند و سبوکش کی تفسیر بیان کرنے لگے دوسری جانب اسلامی شعرا ان الفاظ کو ورد کرتے رہے

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وهم
وز هرچه خوانده ایم و شنیده‌ایم وگفته ایم

اُردو شاعری میں بھی جو فارسی کا تتبع ہے یہی دوئی کی کیفیت موجود ہے ایک فریق فارسی "همه اوست" اور ایک عربی "همه اوست" کا قائل ہے اس کے مقابل میں ہندو شاعری کی بنیاد ابتدا ہی سے "وحدت الوجود" پر مبنی ہے-ٹیگور کی شاعری ہندی شاعری ہے—

(٤)

فیضی کا سر دیوان یہ شعر ہے—

یا ازلی الظہور یا ابدی الخفا
نورک فوق النظر حسنک فوق الثنا

خواجہ میر درد اپنا کلام یوں شروع کرتے ہیں—

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے
کیا تاب گذر ہووے تعقل کے قدم کا

ٹیکی ٹیگور فرماتے ہیں میں ایک جام سفال ہوں جس کو وہ رند حقیقی رنگا رنگ مے سے معمور کرتا ہے توڑ دیتا ہے اور پھر اعجاز کوزہ گری سے وجود میں لا کر الوان شراب سے لبریز کر دیتا ہے۔ نہ میرا کوتاہ پیمانہ بھرتا ہے نہ وہ میکش سیر ہوتا ہے۔ یہ ہماری ازلی اور ابدی لب بوسی ہے —

خوشی تیری اِسی میں ہے بنا اک جام گل مجھ کو
بھرے خالی کرے ہردم زلال زندگانی سے

یا کہتے ہیں دنیا ایک صنم کدہ ہے میرا صورت گر خزد میرا عاشق ہے
اس کا ذی حیات مس میرے تمام اعضا پر محیط ہے

یا کہتے ہیں میں وہ منتظر عورت ہوں جو اپنے شیام سندر کے انتظار میں سونی سیج پر طوفانی راتوں میں اُس کی آمد کی گھڑیاں گنتی رہتی ہے
وہ کسی جنگل کے کنار بعید کسی تاریکی کے پر پیچ عمق سے آنے والا ہے
آہ وہ بھی کیا ستم ظریف ہے ہمیشہ اس وقت آتا ہے جب میں تھک کر سو جاتی ہوں اور
اپنے بربط کے نغموں سے میری نیند کو بھر دیتا ہے اور میں اُس کا دیدار چوک جاتی ہوں جس کی سانس میری نیند کو چھو چھو جاتی ہے

جب صبح کو عورتوں کے ساتھ پانی بھرنے جاتی ہوں تو کنوئیں پر جہاں " ببلا " اور نیم کے درخت ہیں وہ آتا ہے اور ہتھیلیاں جوڑ کر مجھ سے پانی مانگتا ہے۔ اُس کی طلب میں کیا شیرینی ہے یہ حلاوت عمر بھر میرے دل سے نہ جائے گی—

جب میں کاسۂ گدائی لے کر نکلتی ہوں تو وہ بادشاہوں کا بادشاہ

پی کر زریں رتھ میں سوار ایک عجب آن بان سے سامنے سے آکر میرا راستہ روک لیتا ہے اور مجھے دیکھ کر مسکراتا ہوا لپکتا ہے۔ اُتر آتا ہے میں خیال کرتی ہوں کہ میری حیات کا لمحۂ خوش کامی آگیا اور امید کرتی ہوں کہ اب دولت چاروں طرف بکھر جائے گی لیکن ناگہاں وہ خود اپنا ہاتھ میرے سامنے بھیک کے لئے پھیلا دیتا ہے۔

یا کہتے ہیں عالم ایک محفل سماع ہے۔فرش زمیں سے عرش بریں تک عالم امکاں ترانۂ معرفت سے لبریز ہے—

بشنو از نے چوں حدیث می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

اور وہ " نے " میں خود ہی ہوں—

پھرا اِس نے کو تو لے کر ہر اک کہسار و وادی میں
اِسی میں کی ہے دم تونے ہمیشہ تازہ موسیقی

یا کہتے ہیں کہ نہیں میں تو مغنی ہوں جس کی ملازمت حضور الہی میں نغمہ سنجی ہے—

جب تو دیتا حکم ہے مجھ کو کہ ہوں نغمہ سرا
فخر سے دل میرا سینہ میں سما سکتا نہیں

جب سب مغنی اپنا راگ ختم کر چکتے ہیں تو بربط نواز عالم خود بربط اٹھا لیتا ہے۔اُس وقت کی کیفیت بیان سے باہر ہے—

سرود تیرا کرے ہے روشن تمام عالم کو اے مغنی
ہے روح نغمہ رواں فلک پر مثال تار حیات دایم
رواں ہے گو سنگ ہوں مزاحم ترے ترانہ کا پاک دریا
ہے کیسی دل میں مرے تمنا شریک تیرے سرود میں ہوں

صوت سرمدی کو سن کر طائر روح عرش آشیاں ہونا چاہتا ہے —

اے طائراں قدس را افزودہ عشقت بالہا
درحلقۂ سودائے تو روحانیاں را جالہا

چنانچہ کہتے ہیں—

طائر بازو کشادہ سینۂ دریا پہ جوں
میں بھی خوش خوش ہوں رواں پیش نظر ہے آشیاں
کر وسیع شہپال نغمہ عرش تک آیا ہوں میں
تیرا پابوس مقدس تو کہاں اور میں کہاں

وہ نغمہ جو اس محفل میں بجتا ہے سرود حقیقت ہے - اِس سلطان الاذکار میں کوئی صدا یا ندا نہیں

مرے نغمہ کی آرائش نہیں جز عین عریانی
لباس اور ظاہری زینت سے تن اُس کا مبرا ہے
نہیں شبنم صفت اک پیرھن تک وصل میں حائل
نہ زیور جو تری سرگوشیوں میں غل سے حارج ہو

گویا بقول نظیر اکبرآبادی—

دل اُن کے تار ستاروں کے تن اُن کے طبل طنبورے ہیں
منہ چنگ زباں دل سارنگی یا گھنگرو ھاتھ کمانچے ہیں
بن تاروں تار ملاتے ہیں تب ذرت نرالا کرتے ہیں
بن ہاتھوں بھاؤ بتاتے ہیں بن پاؤں کھڑے گت بھرتے ہیں
جس گت پر اُن کا پاؤں پڑا اُس گت کی چال نرالی ہے
جس محفل میں وہ ناچے ہیں وہ محفل سب سے خالی ہے
ہیں راگ اُنہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ اُنہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت بے سر تال ہوئے بن تال پکھاوج ناچے ہیں

یا کہتے ہیں کہ عالم ایک باغ ہے جس میں میری ہستی ایک آرزو مند پھول

سے مشابہ ہے—

اِس ڈرا سے پھول کو بھر قبول
شاخ سے چن لینے میں مت دیر کر
ورنہ مجھ کو خوف ہے اے گلعدار
خشک ہو یہ خاک میں مل جائے گا
گو پریدہ رنگ ہے اور بو نحیف
رحم کر اور توڑ لے قبل از غروب
وقت ہے باقی عبادت کا ہنوز
بتکدہ میں کردے دیوں پر نثار

(و)

ٹیگور کا علم الاخلاق اپنشدوں کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اپنشدوں کی تعلیم روحانیت کی تائید اور مادیت کے بطلان میں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ روحانیت کیا ہے اور مادیت کیا ہے ؟

گیتان جلی کے مترجم نے اپنے دیباچہ میں نئی روشنی کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو ترک روحانیت پر بجا ملامت کی ہے اور اُن کی مغربیت کو جو ایک انجذاب عدا بانہ اور تقلید فلاسفانہ ہے قابل نفریں جنون اور دیوانگی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اُن کی تحریر واضح اور عیاں نہیں ہے اور اُن کے مافی الضمیر سے کافی اطلاع نہیں دیتی—

اپنشدوں کے روحانی فلسفہ کے متعلق اکثر ہندو مفسرین اس مغالطہ میں پڑ گئے ہیں کہ وہ دنیا کو محض مایا تصور کرتے ہیں اور صرف ترک دنیا کو "نروان" حاصل کرنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ اِس مغالطہ سے رہبانیت کا خیال ہندوؤں کے اعتقاد میں راسخ ہوگیا ہے اور حیات ملکی اور ملی بجائے

جهد للبقا میں صرف هونے کے منتشر اور ضائع هورهی هے-مسلمان بھی لفظ " روحانیت " کو غلط قناعت اور بے محل استغنا کے معنوں میں استعمال کرتے هیں—

ٹیگور کا هرگز یہ عقیدہ نہیں—

ٹیگور کا مذهب " جبریہ " نہیں بلکہ " قدریہ " هے وہ اپنی کتاب الاخلاق " سادهنا " میں کہتے هیں—

ماسوا کا اک جز هونے کی حیثیت سے انسان نوامیس الہیہ اور قوانین قدرت کا ضرور مطیع هے لیکن بالذات " انا " قطعاً آزاد هے—

سریکرشن مهاراج نے جو یہ فرمایا هے کہ میں افعال سے بالا هوں اِس کا یہ مطلب نہیں کہ کامل بشر بیکار اور بے شغل زندگی بسر کرتا هے بلکہ یہ مطلب هے کہ جهاد زندگی اور تنازع الحیات میں کامیابی اور ناکامی کے خیال سے آزاد هوکر بے لوث کوشش کرنی چاهئیے-ٹیگور " سادهنا " میں بیان کرتے هیں—

"زندگی کی خوشی کام میں هے-کام میں ایک عجب لذت هے-یہ لذت تکمیل حیات میں ممد اور معاون هے" کوئی ذی حیات اس قدر محنت اور مشقت نہیں کرتا جس قدر انسان-اور یہی انسان کے اشرف المخلوقات هونے کی دلیل هے-زندگی تغیرات باطنہ کو تغیرات خارجہ سے مماثل اور مناسب کرنے پر منحصر هے-همارے ملک میں لوگ حصول طاقت اور حصول وسعت کے روحانی اصولوں کو بھول گئے هیں-لوگ " برهما " سے صرف مراقبہ سے معرفت حاصل کرنا چاهتے هیں اور عالم کے کون و فساد میں جہاں اُس کی ذات ذرہ ذرہ میں مصروف جهد هے اس کو دیکھنے سے

گریز کرتے ہیں اِس یک طرفہ کیفیت سے ہندوستان کے مزاج میں ایک مجذوبیت پیدا ہوگئی ہے جس نے ہمیں دین اور دنیا دونوں سے کھو دیا ہے —

اگر کوئی شخص "گیتان جلی" کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ٹیگور کی تعلیم اعتکاف نشینی اور چلہ کشی ہے تو اِس سے زیادہ کوئی اور غلطی ممکن نہیں۔ صومعہ نشینی گناہ ہے کیوں کہ معرفت الٰہی کام میں ہے آرام میں نہیں۔ جو زن و فرزند۔ فرائض زندگی اور علائق دنیا سے بھاگتا ہے وہ خود خدا سے بھاگتا ہے۔ چنانچہ "گیتان جلی" میں کہتے ہیں —

یہ عبادت نغمہ و سرود یہ تسبیح خوانی چھوڑ۔ دروازہ بند کرکے
خانقاہ کے سنسان اور تاریک گوشے میں تو کس کی پرستش
کر رہا ہے ؟
آنکھیں کھول۔ دیکھ تیرا خدا تیرے روبرو نہیں —
وہ تو وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں ہل چلا رہا ہے۔ جہاں
سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے۔ وہ تو اُن کے ساتھ دھوپ
اور بارش میں ہے۔ اُس کا ملبوس خاک سے اٹا ہوا ہے۔ یہ خرقۂ
سالوس اُتار کے پھینکدے اور اُسی کی طرح خاک زمین پر اُتر آ۔

زاہدانہ یا فلسفیانہ گوشہ نشینی ایک ابدی قبر ہے آزاد وہ ہیں جو بنی نوع کو ظالمانہ قیود سے آزاد کرتے ہیں جو حریت کے علم بردار ہیں جن کا لقب فاتح ہے جن کو خدا نے اپنی تیغ دوھردار عطا کی ہے —

میرا خیال تھا کہ میں تجھ سے وہ گلاب کا ہار مانگوں گی
جو تیری گردن میں ہے لیکن ہمت نہ ہوئی۔ بالآخر صبح کی
منتظر رہی کہ جب تو جانے لگے گا تو بستر پر جو چند اجزا اس
کے رہ جائیں گے لے لوں گی۔ ایک بھکاری لڑکی کی طرح میں نے

صبح کو تلاش کی کہ ایک یا دو ھی باقی ماندہ پریشاں پنکھڑیاں مل جائیں ؟ لیکن مجھے کیا ملا ؟ تیری محبت کی کونسی نشانی میں نے پائی ؟

نہ وہ پھول ھے نہ کوئی خشبودار مسالہ نہ کوئی عطر کا ظرف۔

وہ تیری زبردست تلوار ھے شعلہ کی طرح چمکدار اور گرج کی طرح وزنی وہ تیری خوفناک تلوار ھے—

جن کے لئے زندگی ایک روز مشقت ھے اُن کے لئے موت ایک پر راحت شب آرام ھے۔موتِ شبستان وصل کا دروازہ ھے—

پھول گوندہ لئے گئے ھیں ھار دولہا کے لئے طیار ھے۔شادی کے بعد دلہن اپنا گھر چھوڑ دیگی اور اپنے مالک سے تنہا رات کے سناٹے میں ملے گی--

فرانسیسی مجلس علمی کی تاریخ

مترجمہ

(جناب مولوی سید وہاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج)

فرانس کی مجلس علمی صرف اسی حیثیت سے دلچسپ نہیں ہے کہ اُس کا بانی ایک مشہور شخص تھا- یا یہ کہ مختلف مشاہیر نے اپنی دماغی کاوشوں سے اس میں چار چاند لگا دئیے ہیں-اس کی دلچسپی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ صرف یہی مجلس اپنی نوعیت میں قدیم زمانہ سے اب تک بجنسہ چلی آرہی ہے-پچھلے چند ہفتوں سے انگریزی اخبارات اور رسالوں میں یہ بحث چل رہی ہے کہ انگریزی ادیبوں کی بھی ایک مجلس قائم کی جائے-اس میں شک نہیں کہ یہ بحث اپنی ابتدا کے لحاظ سے فضول اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بے اثر ضرور ہے لیکن چونکہ بعض ہنگامہ آرا ادیب اسی مجلس کی ہیئت اور انتظام کو بطور نمونہ پیش کرتے رہتے ہیں-اس لئے شاید ان چیزوں پر نظر ڈالنا خالی از نفع نہ ہوگا—

اب سے ڈھائی صدی پیشتر جب یہ مجلس قائم ہوئی تھی فرانس میں نوابی اور جاگیرداری کا دور دورہ تھا-پرانی نسل برسر حکومت تھی اور پرانے ہی قانون نافذ تھے-اس کے ڈیڑھ سو سال بعد انقلاب عظیم کی آندھی کچھ ایسی اُٹھی کہ اس نے ملک کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک نہ صرف قدیم شاہی نسل اور اشرافیت کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑ پھینکا-بلکہ

اُن تصورات اور طرز خیالات کا بھی خاتمہ کر دیا جو اس وقت تک رائ
آتے تھے-اس میں شک نہیں کہ تباھی و بربادی کی اس خاک سے ایک لئے فر
نے جنم لیا-لیکن پرانی انجمنیں ھمیشہ کے لئے سولی ھو چکی تھیں او
رہ گئی تھیں وہ زمانے کے اقتضاء سے اپنا روپ بدل چکی تھیں--

اگر چہ (جیسا کہ آگے چل کر معلوم ھوگا) تھوڑی دیر کے لئے فرانس
مجلس عامی کو بھی طوفان کے تھپیڑوں کے آگے سر جھکانا پڑا-لیکن اُسے
زیادہ صدمہ نہ پہنچا اس کی اندرونی قوت ویسی ھی باقی رھی جیہ
قیام کے وقت تھی اور آج تک ھے-وھی تنظیم ھے-وھی قواعد و ضوابط-اراکی
وھی تعداد جس میں آج تک کبھی اضافہ نہ ھوا-یعنی "ابدی چالیس"--

یوں تو شروع ھی سے اس انجمن پر متعدد حملے ھوئے اور اسکے د
کثیر تعداد میں اور پرجوش رھے ھیں-لیکن اتنے بے شمار خطرات کا
اسے کبھی نہیں کرنا پڑا جتنا کہ آج کل ھے-حقیقت یہ ھے کہ جوں جوں موجو
صدی * کا خاتمہ نزدیک آتا جاتا ھے ویسے ھی جمہوریت کی روح قوی ترہ
جاتی ھے اور "تعمیر" کی بجاے "تخریب" کا رنگ زیادہ گہرا جھلکتا
آتا ھے-یہ خصوصیت فرانس میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ھے جہاں پ
چیزوں کو سرے سے اُکھاڑ پھینکنے کا شوق ناقابل یقین شدت اختیار کئے ھوئے
فرانسیسی مجلس علمی اس سیلاب سے کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی-اسپ
ھرطرف سے حملے ھو رھے ھیں-اکثر ادیب جنھیں قدرتاً اسکے حامیوں
ھونا چاھئے تھا-مخالفین کے جتھے میں کھڑے دکھائی دیتے ھیں اور تعصب
جنبہ داری کا الزام لگا کر اسے برا بھلا کہتے ھیں-دوسرے گروہ کو ان مخا
حملوں کا سبب پہلے گروہ کی محرومی نظر آتی ھے اور یہ کہ ان لوگو

---

* یہ مضمون انگلستان کے مشہور رسالہ "Black Wood's Edinburgh Magazine" میں سنہ ۱۸۹۱ ع میں لکھا گیا تھا--

مجلس کے اعزازات کے قابل خیال نہیں کیا گیا۔اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ مجلس اپنی زندگی کے دن پورے کر چکی ہے؟ یا بقول میکالے نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح یہ بھی گرداب حوادث سے اُبھر آئے گی اور جس طرح کہ گذشتہ صدی کے سیاسی تغیرات سے متاثر نہ ہوئی ہے آئندہ بھی کامیاب رہے گی اور پہلے کی طرح فرانسیسی ادب کی تاریخ میں صف اول میں اپنی جگہ قائم رکھے گی؟—

انجام جو کچھ بھی ہو اس مجلس کی موجودہ حیثیت بغایت دلچسپ ہے اگر ایک طرف اس کی سند کو مشتبہ سمجھا جاتا ہے اور اس کے دعووں کا مضحکہ اُڑتا ہے تو دوسری طرف اس کے اعزازات کے حصول کی جتنی کوشش آج ہوتی ہے پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی اور اس کی خالی جگہ پر کرنے اور اس کی عمارت کے مشہور "گنبد" کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے جتنے حریف آج میدان میں اُترتے ہیں اتنے پہلے کبھی نہ ہوں گے—

اگرچہ اس مجلس کا قیام فرمان شاہی کی رو سے سنہ ۱۶۳۵ء میں ہوا لیکن دراصل اس کے قیام کی مدت اس سے پانچ چھ سال قبل کی ہے اور اس میں "حسن اتفاق" اور ارادہ دونوں کا یکساں دخل ہے اس مشہور و معروف مجلس کی ابتدا بہت معمولی تھی۔سب سے پہلے ہمیں اس انجمن کی اصلی روح "مالھرب" (Malherbe) کے چھوٹے سے کمرے میں اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہے جس کی کل کائنات چند پھوس کی کرسیاں تھیں! اس مختصر کمرے میں شہر "پیرس" کے علمی افراد جمع ہوا کرتے تھے اور عام دلچسپی کے موضوعوں پر بحثیں رہا کرتی تھیں۔ناظم حلقہ کی رائیں (جو خود بھی شاعر اور نقاد تھا) سنی جاتی تھیں اور اس مختصر جماعت کا کوئی شخص اگر کوئی تصنیف پیش کرتا تھا تو اس پر تنقیدیں ہوتی تھیں۔خیالات ہی کو نہیں بلکہ زبان اور اسلوب بیان کو بھی سختی کے ساتھ جانچا جاتا تھا۔یہ امر اس بات کا ثبوت ہے

کہ شروع ھی سے فرانسیسی ادیبوں نے حسن صورت کو اپنا مطمح نظر بنایا اور آج تک ان کے ادب میں خیالات کی اتنی پروا نہیں کی جاتی جتنی کہ ان کے لفظی ملبوسات کی —

سنہ ۱۶۲۹ء میں جب "مالہرب" کا انتقال ھوا تو اس مختصر جماعت کے لئے جس کے افراد شہر کے دور دراز اور مختلف مقامات پر رھتے تھے آپس میں ملنا جلنا دشوار ھو گیا - بالاخر یہ طے پایا کہ سب لوگ ھفتہ میں ایک مرتبہ "ایم - کونرارت" (M. Conrart) کے مکان پر جمع ھوا کریں اس لئے کہ اس کا محل وقوع کسی قدر مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور "ادبی مباحث پر بحث کیا کریں اور سب سے زیادہ کوشش اس امر کی کریں کہ فرانسیسی زبان کی پاکی اور صحت میں ترقی ھو" —

ابتدا میں یہ مختصر جماعت صرف نو افراد پر مشتمل تھی "کونرارت" کے علاوہ "ایم - شاپلین" (Chapelain) بھی تھا جس کی سند ھر جگہ قابل قبول تھی جو تمام یورپ کے علمی افراد سے خط و کتابت رکھتا تھا اور اندرون و بیرون فرانس اس کی رائے کو ملہمانہ وقعت دی جاتی تھی - دوسرے اراکین یہ تھے - گودو (Godeu) - دی مالویل (De Maleville) - ھیبرٹ برادران جن میں کا چھوٹا بھائی ایبے دی کے ری سی (Abbe de Cerisy) کے نام سے مشہور ھے - ایم ژیری (Giry) ایم دی سیری زے وغیرہ - یہی وہ مرکز تھا جس سے فرانسیسی مجلس علمی کا آغاز ھوا - چند سالوں تک یہ لوگ اپنے جلسے کس مپرسی کی حالت میں کرتے رھے لیکن سنہ ۱۶۳۴ء میں ایم بواس رابرٹ کے ذریعہ سے لوئیس سیزدھم کے ذی اقتدار وزیر کارڈینل ری شی لیو (Richielieu) کو بھی ان جلسوں کی اطلاع ھوئی - بواس رابرٹ اس مجلس کے ایک رکن سے نارڈ کا دوست تھا - کارڈینل ری شی لیو کا مقرب خاص بھی تھا اور پیرس کے حالات سے اسے مطلع کرتا رھتا تھا —

وہ کونسا جذبہ تھا جس نے ری شی لیو جیسے شخص کو اس گمنام جماعت کا حامی اور سرپرست بنا دیا؟ کیا یہ بھی ہر بات میں پیش پیش رہنے کی سنک کا ایک کرشمہ تھا؟ یا ادبی شہرت کی خواہش اس کا سبب تھی؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ری شی لیو کا جو وقت سیاسی داؤں گھات اور قتل کے حکمناموں پر دستخط کرنے سے بچتا تھا وہ شعر گوئی میں صرف ہوتا تھا! یا پھر یہ کارڈینل نے بھی دوسرے طباع لوگوں کی طرح اپنی الہامی قوت سے اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ آج کی یہ حقیر جماعت مستقبل کی بڑی علمی انجمن ہوگی اور خود اس کا نام اس کے ساتھ منسلک ہو کر بقائے دوام کا مستحق ہو جائے گا!!

بہر حال جو کچھ بھی اصلی سبب ہو کارڈینل نے بواس رابرٹ کے ذریعہ اپنی سرپرستی کا پیغام پہنچوایا۔ یہ دریافت کیا کہ کیا تم لوگ اپنی اس جماعت کو فرمان شاہی کے ذریعہ سے تسلیم کرانا چاہتے ہو اور بادشاہ سے اس فرمان کے حاصل کرنے کا وعدہ کیا —

اس پیغام کا سب سے پہلا اثر اراکین پر یہ ہوا کہ اُن میں انتہائی سراسیمگی پیدا ہو گئی۔ خوفناک کارڈینل اور ایک علمی انجمن کے معاملات میں دخل دے! تب تو آج سے آزادی اور باہمی خلوص کو خیرباد کہدینا چاہئے!! ان خیالات سے پریشان ہو کر انجمن نے اس اعانت کو قبول کرنے سے انکار ہی کر دیا ہوتا لیکن شاپلین نے جس کا حصہ انجمن کے معاملات میں اس وقت سے بہت ممتاز نظر آتا ہے۔ تقریر کی۔ اُس نے اِس ناعاقبت اندیشی کے انکار کی سختی سے مخالفت کی اور ایسے زبردست شخص کی دشمنی کے نقصانات بتائے۔ اُس نے کہا "کارڈینل نے ایک تجویز پیش کی ہے۔ اُس کی سرپرستی ہماری معاون ہو سکتی ہے۔ اُس کی مخالفت ہمیں بلا شبہ غارت کر دے گی......... ہم کو منظور ہی کرنا چاہئے" دوسرے افراد نے اس رائے کے آگے سر تسلیم خم کیا

اور بالاتفاق رائے یہ طے پایا کہ انجمن کی طرف سے کارڈینل کو ایک خط لکھا جائے اور اس سے عنایت اور سرپرستی کی درخواست کی جائے۔ایم سی زی زے نے یہ خط مارچ سنہ ۱۶۳۴ع میں لکھا۔وہ اُس وقت انجمن کا ناظم تھا اور بواس رابرٹ سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا—

کارڈینل نے اس خط کا نہایت عطوفت آمیز جواب بھیجا۔اُس نے وعدہ کیا کہ منشور شاہی بہت جلد حاصل کیا جائے گا اور اس نے انجمن کو نصیحت کی کہ اس مدت میں اراکین کی تعداد میں حسب صواب دید اضافہ کر لینا چاہئے۔اپنے طور پر ایک دستورالعمل مرتب کرنا چاہئے اور کسی نام کا انتخاب بھی کر رکھنا چاہئے۔چنانچہ کئی نئے اراکین داخل کئے گئے اور قدرتی طور پر ڈی بواس رابرٹ کا نام پہلے منتخب کیا گیا۔نام کا انتخاب بھی ایک اہم کام تھا بڑے بڑے زبردست نام پیش کئے گئے۔لیکن انجمن نے حسن انتخاب سے کام لیکر سب رد کر دیا اور ”مجلس علمی فرانس“ سیدھا سا نام منظور کیا گیا اور اسی نام سے یہ مجلس ہمیشہ مشہور رہی ہے۔اراکین مستعدی کے ساتھ دستورالعمل کی ترتیب میں مشغول ہوگئے۔اس کام کے لئے تین افراد کا انتخاب خاص طور پر کیا گیا۔لیکن دوسرے افراد کو بھی عام دعوت تھی کہ اپنے خیالات اور تجاویز تحریری صورت میں پیش کریں۔آخر میں ان سب کو ترتیب دیکر پچاس ضوابط کا ایک دستورالعمل تیار کیا گیا۔اکثر دفعات معمولی تھیں۔لیکن بعض نہایت اہم بھی تھیں۔مثلاً تمام اراکین مجلس کی کامل مساوات۔اگر اس وقت کا لحاظ کیا جائے جب کہ طبقہ بندی کا بہت زور شور تھا تو یہ دفعہ ایک بڑی رعایت نظر آتی ہے۔مجلس کی مقدس حدود کے اندر سب برابر تھے۔گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا مصنف۔بڑے بڑے اسقفون۔ذی اقتدار وزرا۔سربرآوردہ ڈیوک اور خود شاہزادوں کے برابر کا مرتبہ رکھتا تھا۔مشہور و معروف کانڈے (Condé) کی ممبری اور خود ہمارے زمانے میں ڈیوک آمیں کی شرکت اس مساوات کا بیّن

ثبوت ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب لوئی چہاردہم کا مشہور وزیر کولبرٹ (Colbert) مجلس کا رکن ہوا تو اکثر رفقائے مجلس نے اُسے "مان‌سی‌نی‌یار" (Monsignuor) "حضور" کہہ کے مخاطب کیا لیکن کولبرٹ نے جواب دیا کہ اس حلقے میں دوسروں کی طرح میں بھی صرف "صاحب" موسیو (Monsieur) ہوں!"

انتظام کی بہتری کے خیال سے یہ بھی طے پایا کہ مجلس خود اپنے حلقے میں سے تین عہدہ دار منتخب کرے۔ایک ناظم۔ایک چانسلر اور ایک معتمد۔اول الذکر دو عہدہ داروں کا انتخاب بذریعہ قرعہ ہوتا تھا اور ان کی مدت عہدہ تین ماہ ہوتی۔معتمد کا منصب اس کی حین حیات تک رہتا تھا اور اس کا انتخاب رایوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا یہی تینوں عہدے آج تک باقی ہیں لیکن اب ناظم اور چانسلر کا انتخاب بھی رایوں کے ذریعہ سے ہوا کرتا ہے —

جب دستورالعمل تیار ہوگیا تو منظوری کی غرض سے ری شی لیو کے پاس پیش کیا گیا۔اس نے جملہ ضوابط کو سوائے ایک کے منظور کر لیا اور یہ استغنا اس کے لئے قابل تعریف ہے۔جس ضابطہ کو اس نے رد کیا اُس کا منشا یہ تھا کہ "موجودہ اور آئندہ تمام اراکین اپنے سرپرست کے محاسن کی وقعت کریں اور اسے عزت کے ساتھہ یاد کریں" چونکہ کارڈینل کا اعتقاد تھا کہ استحسان اور شکرگزاری کے جذبات قانون کے پابند نہیں ہو سکتے اس لئے اس نے اس ضابطہ ہی کو قلمزن کر دیا —

ضوابط مجلس کی رو سے کارڈینل ری شی لیو کو بانی اور سرپرست کی حیثیت دی گئی اور اس ادارۂ علمیہ کی مہر پر ایک طرف ری شی لیو کا چہرہ کندہ کیا گیا جس کے نیچے تاریخ قیام درج تھی دوسری جانب پھولوں کا ہار بنایا گیا اور چاروں طرف یہ عبارت کندہ کی گئی "بقائے دوام"۔یہی وجہ ہے

کہ اس مجلس کے اراکین کو مشترکہ طور پر "ابدی" کہا جاتا ہے۔ شاہ لوئی سیزدہم کے منشور کی رو سے جنوری سنہ ۱۶۳۵ء میں یہ مجلس "مجلس علمی فرانس" کے نام سے قائم ہوئی۔ ری شی لیو اس کا بانی ہوا اور اراکین کی تعداد چالیس مقرر کی گئی اور اس میں اج تک اضافہ نہیں ہوا ہے۔

مجلس نے جن ضوابط کو منظور کیا تھا اور فرمان شاہی کی رو سے جن کی تصدیق کی گئی تھی ان کی مجموعی تعداد جیسا کہ کہا جا چکا ہے پچاس تھی اراکین کی مساوات کے علاوہ مجلس کو انتخاب اراکین کی بھی کامل آزادی عطا کی گئی تھی لیکن ایک اور دفعہ سے اس میں کسی قدر ترمیم کی گئی تھی اس کا منشا یہ تھا کہ " تا وقتیکہ کوئی شخص سرپرست کی منظوری نہ حاصل کر لے اُس کا انتخاب رکنیت کے لئے نہیں کیا جاسکتا" ری شی لیو نے جو اپنی مدۃالعمر انجمن کا سرپرست رہا اس دفعہ کا آزادانہ استعمال کیا اور انتخابات میں اس کا اثر بہت نمایاں رہا ہے۔ بعد ازاں جب بادشاہ وقت کو مجلس کا سرپرست بنایا گیا تو شاہی تردید انتخابات کو مسترد کر سکتی تھی لیکن اس کی نوبت شاذ و نادر آنے پائی اگر ایک طرف مجلس اس بات کا خاص لحاظ رکھتی تھی کہ ایسے لوگوں کا انتخاب عمل میں نہ آئے جو غیر معمولی طور پر "ناخوشگوار" ہوں تو دوسری جانب بادشاہ بھی مجلس کی آزادی میں زائد از ضرورت دخل اندازی سے محترز رہتا تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ لوئی چہاردہم کو یہ معلوم ہوا کہ ایک رکن کو بالاتفاق رائے منتخب کر لیا گیا ہے تو اس نے اپنے اعتراضات واپس لے لئے۔ نوئی پانزدہم کی سرپرستی کے زمانہ کا ایک واقعہ بھی اسی قسم کا ہے—

———:o:———

آج کل "سرپرست" کے عہدہ کا ذکر نہیں آتا تاہم ایک حد تک مجلس سردار قوم کے حکم کو تسلیم ضرور کرتی ہے خواہ وہ صدر جمہوریت ہو یا

شاہنشاہ۔جب عوام کو کسی جدید انتخاب کی اطلاع دی جاتی ھے تو سب سے پہلے یہ ضابطہ کے الفاظ اب تک نظر آتے ھیں کہ "اس انتخاب کے لئے سردار ملک کی اجازت حاصل کی جا چکی ھے" یہ بھی دستور چلا آتا ھے کہ شرکت کے بعد جدید رکن کا تعارف مجلس کا ناظم اور معتمد صدر بادشاہ وقت سے کراتا ھے اور اسے اپنی تقریر کی (جو شرکت کے وقت کی جاتی ھے) ایک نقل گزراننی پڑتی ھے آج کل یہ رسمی باتیں چنداں اھمیت نہیں رکھتیں اس وجہ سے کہ اراکین مجلس کو کسی خاص صدر سے ذاتی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ھے لیکن فرانس میں جب "شاہنشاہیت ثانوی" کا دور تھا اس وقت اس کی حیثیت خاص طور پر نازک اور پریشان کن تھی۔اس وقت "والی میں" جو جو ناظم مجلس تھا سابق روایات کے بموجب توی لیرز (قصر شاہنشاھی) جانا پڑتا تھا اور جدید اراکین کو بادشاہ کے سامنے پیش کرنا پڑتا تھا۔لے کاردینل۔دی براگلی۔پرووسٹ پاراڈول اور جواس فاورے اسی طرح پیش کئے گئے تھے—

اگر چہ مجلس اپنے اراکین کا انتخاب کرتی ھے لیکن وہ اپنی طرف سے کبھی اعزازات پیش نہیں کرتی جو لوگ اس مشہور مجلس میں شریک ھونا چاھتے ھیں انہیں باضابطہ داخلہ حاصل کرنا پڑتا ھے۔یہ قاعدہ تقریباً ابتدا سے چلا آتا ھے۔کہتے ھیں کہ بہت قدیم زمانے میں ایک دفعہ مجلس نے ایک شخص کے لئے اپنے یہاں کے اعزازات پیش کئے۔لیکن اُس نے سیاسی وجوھات کے بنا پر اُن کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اُس انکار کو مجلس کے لئے باعث توھین سمجھا گیا اور یہ طے پایا کہ آئندہ سے اس کا موقع نہ آنے دیا جائے۔ابتدا میں داخلہ کی اجازت حاصل کرنے کے لئے صرف معتمد کو ایک معمولی خط لکھنا کافی ھوتا تھا۔لیکن رفتہ رفتہ داخلہ کا طریقہ پیچیدہ ھوتا گیا اور ھر امیدوار کا یہ فرض تھا (اور آج تک ھے) کہ وہ "ملاقاتیں" کرے۔یہ ملاقاتیں باری باری سے ھر رکن مجلس کے ساتھ کرنا پڑتی تھیں اور اس کی موافق رائے کی استدعا کی جاتی

تھی-چاہیں ملاقاتیں کرنا پڑتی تھیں: یا یہ کہو کہ اُٹھانیں-اس لئے کہ تاوقتیکہ کم از کم ایک جگہ خالی نہ ہو-داخلہ ہو ہی کس طرح سکتا تھا—

اکثر لوگوں کے لئے جو اپنی قابلیتوں کے اعتبار سے مشہور " گنبد " ے نیچے جگہ پانے کے مستحق تھے یہ ضوابط بسا اوقات شدید رکاوٹ بن جاتے تھے-بقول ایک فرانسیسی کے "مجلس کے دروازے بہت پست ہیں اور اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ بغیر دیوار سے سر ٹکرائے ہوئے اُن میں سے نکل سکے تو اُسے بہت جھکنا پڑتا ہے"—

اب ہم اُس خاص مقصد سے بحث کرتے ہیں-جس کی تکمیل کے لئے یہ مجلس وجود میں آئی تھی-اس کے قیام کی خاص غایت کی منشور شاہی میں صاف طور پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ " اُس کا کام یہ ہے کہ کہاں احتیاط و کوشش سے فرانسیسی زبان کو ترقی دی جائے-اُس کو کثافتوں اور آلائشوں سے پاک کیا جائے-الفاظ کا استعمال معین کیا جائے-مختصر یہ کہ زبان کو فصیح اور علوم و فنون کی بحث کے قابل بنایا جائے "—

اس زمانہ میں یہ مقصد ہمیں کچھ زیادہ اعلیٰ و ارفع نظر نہیں آتا-لیکن اُس وقت جب زبان کافی طور پر معین نہ تھی-صورت برعکس تھی اور خود " رلی شی لیو " کے خیال میں یہ اعلیٰ ترین خدمت تھی جو یہ مجلس انجام دے سکتی تھی—

مذکورۂ بالا اغراض کی تکمیل و ترقی کے لئے یہ بھی طے کیا گیا کہ مجلس ایک لغت مرتب کرے-ایک قواعد زبان کی کتاب بھی لکھے اور فصاحت اور شاعری پر بھی رسالے شایع کرے-ہم یہ کہدینا چاہتے ہیں کہ نظم-فصاحت یا قواعد پر کوئی کتاب کبھی نہ لکھی گئی اور ان چیزوں کو قواعد و ضوابط کی پابندیوں میں جکڑنا ممکن بھی نہ ہوسکتا تھا-اس لئے کہ یہ چیزیں اُسی وقت

کسی قابل کہی جاسکتی ہیں جب آزادانہ و بلا قیود و شرائط خدا داد ذہانت سے پیدا ہوں۔ لغت کا آغاز البتہ ہوا اور اسے اس مجلس کی اہم ترین اور مفید ترین کاوش کہا جاسکتا ہے —

یہ سمجھہ رکھنا چاہئیے کہ مجلس کی کاوشوں سے ہماری مراد افراد مجلس کی مشترکہ مساعی سے ہے۔ ورنہ انفرادی طور پر اس کے اراکین نے جو کچھہ خدمات کیں اُس کی تشریح نہ صرف بے محل ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ اِس لئے کہ اس کی پیدائش کے وقت سے بجز چند مستثنیات کے وہ جملہ اہل قلم افراد اس کے اراکین رہ چکے ہیں جنھوں نے دنیاۓ علم میں کچھہ بھی مرتبہ حاصل کیا ہے اور اُن کی تصنیفات کی تاریخ لکھنا گویا فرانسیسی ادب کی تاریخ لکھنا ہے —

سنہ ۱۶۳۵ ع میں شاپلین * سے درخواست کی گئی کہ وہ لغت کا ایک خاکہ مرتب کرے۔ بعدازاں اُس کی اور دوسرے اراکین کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ لیکن کام کی رفتار بہت سست رہی۔ حتی کہ بعض ظریفوں نے اس سستی سے عاجز آکر مجلس کو " نکموں کی مجلس " کا نام دے ڈالا۔ لغت کے کام میں " واگی لاس " نے بھی اہم حصہ لیا۔ وہ اس کمیٹی کا صدر تھا جس کے ذمہ لغت کے خاکوں کی تیاری تھی اور مجلس کے ہر اجلاس میں یہ خاکے پڑھکر سنائے جاتے تھے۔ " واگی لاس نے سنہ ۱۶۴۹ ع تک جو اس کی وفات کا سال ہے۔ کامل دس برس کمال جانفشانی سے کام کیا اور اُس کی زندگی ہی میں کسی قدر کام ہو چکا تھا۔ لیکن اُس کے انتقال کے بعد سے یہ برابر سست ہوتا رہا —

---

* شاپلین کی تجویز جس پر لغت کی پہلی اشاعت میں عمل کیا گیا تھا موجودہ ترتیب سے مختلف ہے ۔ بجاۓ تہجی کی ترتیب کے الفاظ کی ترتیب مادوں کے لحاظ سے کی گئی تھی ۔ دوسری اشاعت میں یہ ترتیب خارج کردی گئی اور ترتیب تہجی قائم کی گئی —

محض اِس غرض سے کہ " واگی لاس " اپنا تمام وقت لغت کو دے
" ری شی لیو " نے اُس کا وظیفہ جو پہلے جاری تھا لیکن پھر بند ہو چکا
دوبارہ جاری کر دیا - جب وہ " کارڈی نیل " کا شکریہ ادا کرنے گیا تو
ذیل لطیفہ آمیز گفتگو ہوئی " کارڈی نل " متانت آمیز تبسم کے ساتھہ اُس
ملنے کے لئے بڑھا اور کہا " ایم- واگی لاس مجھے اُمید ہے کہ آپ لغت میں
Pension (پنشن) لکھنا نہ فراموش کریں گے " واگی لاس نے جھک کر تہ
ادا کی اور کہا " تقدس مآب ! لفظ پنشن سے کہیں زیادہ مجھے لفظ Gratitude
(شکر گزاری) لغت میں لکھنے کا خیال رہے گا " کہتے ہیں کہ ایک مر
" کولبرٹ " جو خود ایک رکن تھا - کمیٹی کے فقدان جوش کی وجہ سے مایوس
اور چونکہ بحیثیت ایک عملی شخص ہونے کے وہ یہ چاہتا تھا کہ ہر کام جو
کے لائق ہے فوراً ہو جانا چاہئے - اس لئے وہ دفعتاً مجلس کے دفتر میں پہ
گیا - اُس نے دیکھا کہ سب لوگ لفظ Ami کی تحقیق میں بہت مصروف ہیں -
اُس نے اُن کی بحثیں سنیں اور بطور خود اس کا بھی اندازہ لگا لیا کہ مح
ایک لفظ کی تعریف میں کس قدر غور و فکر - عرصہ اور محنت کی ضرو
ہے - تب اُس کو اقرار کرنا پڑا کہ فی الحقیقت اُس کے قیاس کے مقابلہ میں
کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اور وہ بغیر زجر و توبیخ کئے ہوئے واپس ہوا —

———:o:———

لغت کا کام کچھہ اوپر تیس سال بعد یعنی سنہ ۱۶۷۲ ع میں ختم ہوا اور ا
کے دو سال بعد ہی شاپلین نے جو ابتدا ہی سے اس کے ترقی دینے والوں میں سے
اور جسے مرتے دم تک لغت کے ساتھہ گہری دلچسپی رہی انتقال ک
بد قسمتی سے جب لغت مکمل ہو چکی تو یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کے ابتدا
حصے جو اُس وقت مرتب کئے گئے تھے جب کہ فرانسیسی زبان نے کوئی مع
صورت اختیار نہ کی تھی متروکات سے بھرے ہوئے ہیں چنانچہ پوری لغت

نظر ثانی اور کہیں کہیں نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت ہوئی۔اس کام میں بیس سال اور صرف ہوگئے اور یہ لغت اپنی مرتب و مکمل حیثیت میں سنہ ۱۶۹۴ ع سے قبل (یعنی اپنی ابتدا کے پچاس سال بعد) شایع نہ ہوسکی اٹھارویں صدی میں اس کے جدید اڈیشن وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ایک اور اڈیشن سنہ ۱۸۳۵ ع میں نکلا اور جدید ترین یعنی ساتواں اڈیشن سنہ ۱۸۷۷ ع میں شایع ہوا۔اشاعت کے بعد ہی سے یہ کتاب فرانسیسی زبان کا معیار تسلیم کی گئی اور آج تک مستند چلی آتی ہے۔جو لفظ اس کے صفحات میں نہ پایا جائے اُس کے لئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُسے باقاعدہ طور پر باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ڈون کورت اس خیال کا مخالف ہے۔اس کی رائے ہے کہ "چونکہ فرانسیسی زبان اپنے سرمایہ کے اعتبار سے السنۂ جدیدہ میں سب سے زیادہ غریب ہے اس لئے کم ازکم میں کسی ایسے لفظ کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرسکتا جس میں اداے مطلب کی صلاحیت پائی جائے۔خواہ اُسے مجلس علمی کی گاڑی میں سوار ہونا* نہ نصیب ہوا ہو" —

لغت کی بحث ختم کرنے سے پہلے اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ مجلس نے ایک جدید اور جامع ترین لغت مرتب کرنے کا خیال کیا تھا۔چنانچہ کام بھی شروع کردیا گیا تھا۔لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کی تکمیل میں کئی سال صرف ہوجائیں گے کچھ عرصہ ہوا کہ "مجلس" علمی اس کام سے دست بردار ہوگئی ہے—

زبان کی نشو نما کے خیال سے ایک قاعدہ یہ بھی مقرر کیا گیا تھا کہ

---

* یہ فقرہ کسی قدر تلمیح طلب ہے—شاہ لوئی چہاردہم کے عہد حکومت میں یہ دستور تھا کہ جب بادشاہ ہوا خوری کو جاتا تھا تو اپنے ساتھ چند خاص خاص اور منظور نظر مقربین کو بٹھا لیتا تھا—پس یہ جملہ " شاہی گاڑی میں سوار ہونا " الطاف و مراحم خسروانہ کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے—

ہر رکن باری باری سے ہفتہ میں ایک مرتبہ پوری مجلس کے سامنے
کیا کرے -اس رسم کو تو بہت جلد ترک کر دیا گیا- لیکن ایک اور رسم
مجلس سے آج تک بدستور چلی آرہی ہے -یعنی جدید اراکین کے استقبا
وقت تقریروں کا ہونا -ابتدا میں یہ جلسے مخصوص حیثیت رکھتے تھے
بقول پرالت (جوکہ پریوں کی کہانیوں کا مشہور مصنف ہے) جو تقریر ا
اپنے داخلہ کے وقت کی تھی وہ اگرچہ اپنی فصاحت کے اعتبار سے سب کو
آئی لیکن خود اسکو یہ افسوس رہا کہ ایک محدود جماعت ہی نے اسے
چنانچہ اُس نے تجویز کی کہ آئندہ سے اس قسم کے استقبالی جلسے عام ہوا ک
اُس کی درخواست منظور کی گئی اور آج تک یہ کیفیت ہے کہ جب کبھی م
علمی کسی جدید رکن کا استقبال کرتی ہے تو عوام کی طرف سے بہت
دلچسپی اور جوش کا اظہار کیا جاتا ہے -خواتین خاص طور سے شرکت ک
بے چین رہتی ہیں اور ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے ہفتوں پہلے سے کوششیں سا
شروع ہوجاتی ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ موقع بھی کچھ کم تفریح آور اور م
انگیز نہیں ہے -کیونکہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ان تقریروں کو خطابت
فصاحت کا شاہکار کہا جاسکتا ہے اور پرانے زمانہ کی طرح جب بو
کی تابش الفاظ اور ریسی نی کی فصاحت لوگوں کو مسحور کردیا کرتی
آج بھی ری نین کی شوکت الفاظ اور پے لی ران کی ظرافت سامعین سے خ
تحسین وصول کیا کرتی ہے -جدید رکن کی تقریر ہمیشہ اپنے مرحوم پیش رو
تعریف میں ہوتی ہے اور اس مشہور مجلس کا فصیح ترین رکن مجلس
طرف سے اس کا جواب دیتا ہے ــ

———:o:———

قیام مجلس کے کچھ عرصہ بعد ری شی لیو کی سرپرستی کے زمانہ
وہ واقعہ پیش آیا جو (Cid) سڈ کے واقعہ کے نام سے مشہور ہے -سنہ ۱۳۶

میں یہ ناٹک جو کارنیلی کا شاہکار ہے پہلی مرتبہ کھیلا گیا۔اسے ہاتوں ہاتھ لیا گیا اور نوجوان مصنف کو پوری شہرت حاصل ہوئی۔ لیکن ری‌شی‌لیوکو یہ کھیل کچھہ زیادہ پسند نہ تھا۔اور اس نے شدت سے اپنی ناراضی کا اظہارکیا۔ غالباً اس ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ فرانس میں خانہ جنگیوں کا بہت کچھہ زورشور تھا اور کارڈی‌نیل ری‌شی‌لیو نے اس کی روک تھام میں اپنی پوری قوت صرف کی تھی۔لیکن اس المیہ کی دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک خانہ جنگی کا واقعہ بطور پلاٹ کے موجود ہے * —

یم اسکدری نے جو خود بھی ایک بلند پایہ مصنف تھا اس ڈرامے پر سختی سے تنقید کی۔اس کی کچھہ وجہ تو اُس کا اپنا علمی رشک تھا اور کچھہ کارڈی‌نیل کی خوشنودی کو بھی اس میں دخل تھا۔ری‌شی‌لیو نے مجلس علمی سے خواہش کی وہ اس کتاب کے متعلق اپنی رائے ظاہرکرے۔انفرادی طور پر اکثر اراکین مجلس سڈ کو پسند کرتے تھے۔مثلاً جب ایبے ڈی کے ری سی سے کسی نے اس کتاب کے متعلق رائے دریافت کی تو اُس نے جواب دیا " کاش میں اس کا مصنف ہوتا " لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ری‌شی‌لیو جس چیز کا آرزومند ہے وہ آزادانہ تنقید نہیں۔بلکہ عیب جوئی ہے اور چونکہ وہ مجلس کے اتنے بڑے محسن کو ناراض کرنا نہ چاہتے تھے۔لہذا بہت عرصہ تک یہ عذر کرتے رہے کہ " ضوابط مجلس اس وقت تک کسی کتاب پر تنقید کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ خود مصنف تنقید و تبصرہ کی خواہش نہ کرے "—

لیکن بھلا ری‌شی‌لیو کب کسی عذر کو سنتا تھا۔وہ برابر مصر رہا۔اس نے

---

* بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ری شی لیو Cid کی مقبولیت کو حسد کی نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ جیسا کہ ہم اس سے قبل بتا چکے ہیں۔ اُسے بھی علمیت کا دعویٰ تھا اور اُس نے بھی ایک سے زیادہ ناٹک مکمل طور پر لکھے ہیں جو کہ قصر ہی میں کھیلے گئے تھے۔علاوہ اس کے اس نے چند ڈراموں کا خاکہ بھی مرتب کیا ہے —

بوا س رابرٹ کو کارنیلی کے پاس بھیجا اور اُس سے بجبر تلقید کی اجازت حاصل کی۔کارنیلی نے جن الفاظ میں اجازت دی وہ یہ تھے "اراکین مجلس کا جوجی چاہے کریں اور چونکہ بقول آپ کے تقدس ماب کو بھی اُن کی راے معلوم کرنے کا اشتیاق ہے۔لہذا مجھے کچھ کہنا سننا نہیں ہے" اب تو بمجبوری مجلس کو تنقید کرنی پڑی۔لیکن چھ مہینے سے پہلے اُن کی آخری راے کسی کو معلوم نہ ہوسکی۔شاپلین نے حسب دستور اس مرتبہ بھی نہایت سرگرمی سے ساتھ کام کیا اور وہ یاد داشت جو کارڈی نیل کے ملاحظہ کے لئے پیش کی گئی تھی اسی کی مرتب کی ہوئی تھی۔ان یاد داشتوں میں سڈ کے اکثر حصوں کو ہدف ملامت بنایا گیا اور جوکچھ باقی رہاتھا اس کی مٹی ادھوری تعریف کرکے خراب کی گئی* —

اس فیصلہ کی کل وجز غرض کارڈی نیل کی خوشنودی حاصل کرنا تھی۔ کیونکہ اکثر اراکین مجلس اور خود شاپلین بھی اپنے نبج کے خطوط میں کارنیلی کی تصنیف کے مداح نظر آتے ہیں۔مذکورۂ بالا یادداشت بعدکو " سڈ پر مجلس علمی کے خیالات " کے نام سے علیحدہ شایع ہوئی۔مجلس علمی کی کوئی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں کہی جاسکتی جب تک وہ سڈ کے واقعہ پر روشنی نہ ڈالے۔ شروع ہی سے یہ واقعہ مجلس علمی کے مخالفوں کے ہاتھوں میں ایک کارآمد حربہ بنا ہوا ہے۔مجلس علمی میں آزادی راے کے فقدان کو وہ اسی واقع سے ثابت کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ اُس ملقادانہ بلکہ غلامانہ روش کو مطعون کرتے رہتے ہیں جوسرپرست مجلس (یعنی ری شی لیو) کے مقابلہ میں ظاہر کی گئی۔خواہ وہ سرپرست وزیر سلطنت یا خود شاہنشاہ ہی کی حیثیت کیوں نہ رکھتا ہو۔اس موقع پر شاپلین نے سب اراکین سے زیادہ ہوشیاری سے کام کیا۔

---

* مجلس علمی نے جس پہلو کو سامنے رکھکر سڈ پر اعتراضات کئے۔وہ یہ تھا کہ " یہ تصنیف اصول فن کے منافی ہے "—

بہت خوبی کے ساتھ ہوا کے رخ اپنا جہاز چلایا۔ ریشی لیو کے نام جو خطوط
نے لکھے ہیں وہ انتہا درجہ کے خوشامدانہ ہیں اور انہیں پڑھکر تعجب
ہوتا ہے کہ حقیقی قابلیت اس طرح سے اقتدار کے سامنے سرنیاز جھکانے [illegible]
ہے یہ سہی۔ لیکن ہمیں اس معاملہ میں سختی کے ساتھ گرفت بھی نہ کرنا چاہئے
کیونکہ لاکھ کچھ ہوں پھر بھی انسان ہی تھے اور تقاضائے بشریت سے مجبور
یاد رکھو کہ یہ وقت وہ تھا جب کہ ادیب اور ادبیات کسی کی کچھ زیادہ
پروا نہ کی جاتی تھی اور اُن کے سرپرست کا اقتدار ہمہ گیر تھا!

بہرحال مجلس علمی نے بہت جلد سلطنت میں اپنا اثر پیدا کرلیا اور
کی برکت سے طبقۂ اعلیٰ کے افراد میں بھی علم کی چاٹ پیدا ہوگئی جو بلند
مرتبہ اس نے اُس زمانہ میں حاصل کیا تھا وہ کبھی اس کے ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔
اور اُن ممالک کی فہرست میں جہاں خداداد ذہانت اور فطری طباعی کو
ان کے مناسب حال رتبہ دیا جاتا ہے فرانس کا نام سب سے اُوپر لکھا ہوا
نظر آئے گا۔

سنہ ۱۶۴۲ ع میں جب ریشی لیو کا انتقال ہوا تو چانسلر سی گی ر
جو پہلے سے مجلس کا رکن بھی تھا سرپرست بننے کی دعوت دی گئی۔ اُس نے
اسے قبول کیا۔ لیکن ساتھ ہی حق رکنیت سے دست بردار ہوگیا تاکہ آپس میں
کوئی فرق مساوات محسوس نہ ہوسکے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مجلس علمی کو ایک ٹھکانے کا مکان نصیب ہوا۔
ابتداء قیام سے اِس کے جلسے کسی نہ کسی رکن کے مکان پر ہوا کرتے تھے اور اس
انتظام میں ہمیشہ ردوبدل کی ضرورت رہا کرتی تھی۔ سی گی یر نے خود
اپنا محل پیش کیا اور اُس وقت سے تیس سال تک وہیں جلسے ہوتے رہے۔ مجلس
علمی اپنے جدید سرپرست سے اتنی خائف نہ تھی جتنی کہ کاردی نل سے۔

اگرچہ مجلس چانسر کی بہت کچھہ تعظیم کرتی تھی اور تمام مقدا
مسائل پر اُس کی راے کو قطعی تسلیم کرتی تھی۔لیکن " خود چا
کبھی مجلس کی آزادی میں دست اندازی نہ کی " —

سنہ ۱۶۷۲ ع میں جب اُس کا انتقال ہوا تو مجلس علمی بہت کچھہ
حاصل کر چکی تھی بہت سے مشاہیر عصر اسکے اراکین کی صف میں مل
خود شاہ لوئی چہاردہم نے جسکے شباب و عظمت کا آفتاب اسوقت نصف
پر تھا سرپرست بننے کی خواہش کی۔مجلس نے اس شرف کو بہت خو
فخر کے ساتھہ منظور کیا اور سب اراکین ایک ساتھہ مل کر بادشاہ
اداکرنے کے لئے قصر شاہی میں حاضر ہوئے۔

— :o: —

لوئی اُن کے ساتھہ کمال اخلاق سے پیش آیا جب اُس کی نظر اپنے
وزیر " کول برٹ " پر پڑی جو رکن مجلس علمی کی حیثیت سے اپنی
موجود تھا تو اُس نے اُسے حکم دیا کہ جن ممبروں سے میں واقف نہیں
اُنہیں باری باری سے میرے حضور میں پیش کرو۔پھر اُسے علیحدہ
" مجھے بتلاؤ کہ میں ان اصحاب کے ساتھہ کس تلطف سے پیش آؤں " حقیقت
ھے کہ کولبرٹ نے اپنا تمام رسوخ ادب و فن کی ترقی میں صرف کیا
ھمیشہ علم کا زبردست حامی و سرپرست رہا —

خود بادشاہ بھی مجلس کے ساتھہ مراحم خسروانہ سے پیش آتا رہا۔اُ
انجمن کے لئے ایک شاہی محل وقف کردیا اور اس کے فرمان کے
اُس وقت سے مجلس علمی کے جلسے قصر " لوور " کے دارالشوریٰ میں ہو
شاہ لوئی ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتا تھا۔مثلاً پہلے صرف ناظم
کو آرام کرسی ملتی تھی اور دوسرے اراکین کے لئے چھوٹی چھوٹی کر
تھیں جو بقول مورخ مجلس علمی " بہت تکلیف دہ تھیں " کاردی نل

اسکریس نے شہنشاہ کے حضور میں عرضداشت پیش کی کہ " بوجہ ضعف و کبرسنی مجھے بھی آرام کرسی مرحمت فرمائی جائے ورنہ حاضری سے قاصر رہوں گا " بادشاہ نے نہ صرف اس درخواست کو منظور کیا بلکہ اپنے محل سے چالیس آرام کرسیاں بھجوادیں تا کہ آپس میں رقابت نہ پیدا ہونے پائے "چالیس آرام کرسیوں" کا محاورہ اسی وقت سے رائج ہے اور اکثر مجلس علمی اسی نام سے مخاطب کی جاتی ہے —

--- o ---

اگر کارڈی نیل ری شی لیو نے مجلس علمی کو سلطنت میں باثر بنا دیا تھا تو شاہ لوئی نے جس کا قول تھا کہ "میں خود ریاست ہوں" اُسے بڑھا کر اپنے ذاتی مرتبہ کی بلندی تک پہونچا دیا۔ اُس کا حکم تھا کہ ہر دربار اور دوسری رسومات سلطنت کے موقع پر چھ ارکین مجلس علمی کی نمائندگی کیا کریں۔ مختصر یہ کہ مجلس علمی کے لئے جسے وہ "میری مجلس!" کہا کرتا تھا وہ کوئی رعایت اٹھا نہ رکھتا تھا —

کہتے ہیں کہ شاہ لوئی کو فصاحت اور شاعری کا خاص شوق تھا۔ لیکن بقول مورخ " جب یہ چیزیں اُس کے لئے استعمال کی جاتی تھیں تو یہ شوق عشق کی حد تک پہنچ جاتا تھا " چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ اِس زمانہ میں جس کا حال ہم اب لکھہ رہے ہیں انجمن کے مقاصد و اغراض وہ نہ رہے تھے جو قیام کے وقت تھے۔ فصحاے مجلس فتوحات شاہی کے اعلان سے کبھی نہ تھکتے تھے اور شعراے مجلس کو سواے اوصاف شاہی کی قصیدہ خوانی کے اور کوئی کام نہ تھا —

حق یہ ہے کہ یہ شوق آستاں بوسی جو پرستش کی حد تک پہونچ گیا تھا آج کل نہ صرف نا قابل یقین بلکہ مضحکہ خیز نظر آتا ہے اور اس شاندار ادارۂ علمی کے دامن پر ایک بدنما دھبہ معلوم ہوتا ہے ہم صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت احساسات کی عام رو یہی تھی اور یہ مجلس بھی اپنا دامن

اس سے نہ بچا سکی۔ دفتر سے لیکر اعلیٰ تک ہر طبقہ دیوتا کی طرح شاہ لوئی چہاردہم کی پرستش کرتا تھا اور جب رے سینی جیسے بلند رتبہ شاعر کی نسبت ہم یہ پڑھتے ہیں کہ وہ محض اس صدمہ کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکا کہ "بادشاہ نے اس پر نظر عتاب ڈالی تھی" تو ہمیں اس جوش عقیدت کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے—

———:o:———

فتاب شاهنشاهیت کی ضیاباریوں نے (شاہ لوئی Sun-King بادشاہ سورج کہلاتا تھا) مجلس علمی کے حق میں مسیحائی کی اور اس میں شک نہیں کہ یہ زمانہ فرانسیسی ادبیات کی تاریخ میں عہد زرین کہلائے جانے کا مستحق ہے۔کیا مجلس علمی اپنے منشاء تخلیق یعنی فرانسیسی زبان کی ترقی کو پورا کر چکی تھی؟ بیشک۔کیونکہ اس کے پینتیس سالہ قیام میں زبان نے زبردست ترقی کی تھی بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ارتقاء اور حسن کی معراج پر پہونچ گئی تھی۔بوسوے کے پر شکوہ خطبات اور رے سینی کے المیہ قصوں کی فصاحت یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں آج تک کوئی نیچا نہ دکھا سکا اور جن کی نظیر شاذ و نادر ملتی ہے—

———:o:———

اس اثنا میں فرانس میں ایک ایسا روح پرور جھونکا آیا جس نے فرانسیسی ادبیات کے حق میں اعجاز مسیحائی کا کام کیا۔ملک میں ہر طرف سے خداداد ذھانتیں اُبھرنے لگیں اور اُنھوں نے دنیا کے سامنے ایسی تصنیفات پیش کیں جو رہتی دنیا تک باقی رہیں گی۔خود مجلس علمی کی چار دیواری کے اندر رے سینی۔بوالے لو۔لابروای یر۔فی نی لون اور ان سب کے سرتاج یعنی بوسوے جیسے با کمال پیدا ہوئے۔فی الحقیقت یہ صدی ایک یادگار صدی ہے اگر ایک طرف شاہ لوئی کی فتوحات تھیں تو دوسری طرف آسمان علم کے درخشاں ستاروں

نے اس میں چار چاند لگا دئے تھے—

———:o:———

اراکین علمی کو معاوضہ سب سے پہلے کولبرٹ کے زمانے سے ملنا شروع ہوا جب کارڈی نیل نے اس مجلس کا افتتاح کیا تو اس وقت کسی قسم کا معاوضہ مقرر نہ تھا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ری شی لیو میں سخیرانہ جذبات کی کمی تھی کیونکہ وہ خود اکثر علمی افراد کو وظائف دیا کرتا تھا بلکہ اس کی اصل غرض یہ تھی کہ یہ مجلس ایک آزاد جماعت رہے اور بوالہوس لوگ ہوس زر سے اس میں شرکت کی کوشش نہ کریں لیکن کولبرٹ انتہا درجہ کا با عمل شخص تھا جب اس نے اراکین کی حاضری کو ابتر دیکھا۔کیونکہ بقول مورخ "کچھ لوگ اس وقت داخل ہوتے تھے جب دوسرے رخصت ہوتے تھے" تو اُس نے ایک رجسٹر حاضری تیار کرایا اور ہر ممبر سے درخواست کی گئی کہ وہ داخل ہوتے ہی اپنا نام اس پر لکھ دیا کرے۔اس کے حکم کے بموجب مجلس کے ہر اجلاس کے موقع پر چالیس چاندی کی ٹکیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔جو لوگ غیر حاضر ہوتے تھے اُنہیں کچھ نہ ملتا تھا اور اُن کا حصہ مساوی طور پر حاضرین میں تقسیم ہو جاتا تھا۔کہتے ہیں کہ ایک موقع پر صرف ایک ضعیف العمر رکن حاضر تھا اور کمال مسرت کے ساتھ چالیسوں ٹکیاں سمیٹ کر لے گیا—

کولبرٹ کے اس خیال کی اکثر اراکین نے بھی مخالفت کی کیونکہ وہ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں مجلس کی آزادی میں کوئی خلل نہ واقع ہو لیکن چونکہ خود یہ رقم بہت حقیر تھی یعنی زیادہ سے زیادہ چند سو فرانک سالانہ۔اس لئے آخر سب نے اس اختراع کو قبول کر لیا۔اس بحث کو چھوڑنے سے پہلے ہم اتنا اور کہدینا چاہتے ہیں کہ آج کل اراکین کو سالانہ پچاس پونڈ ملتے ہیں۔اس کے علاوہ ہر ماہ کے آخر میں کچھ معمولی سی رقم ان لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے جن کی حاضری سب سے زیادہ باقاعدہ رہی ہو۔اس سے صرف ٹکیوں

کی قدیم رسم کا باقی رکھنا مقصود ہے—

—:o:—

لوئی چہار دہم کی وفات کے بعد اس کے جانشین لوئی پانز دہم ا
شانز دہم باری باری سے مجلس کے سرپرست رہے۔یہ مجلس بھیثیہ
جماعت کے اُن ادبی خیالات کی مخالف نہ تھی جو اٹھارھویں صدی میں
اُبل پڑے۔مذہب فلاسفہ کے تمام خاص خاص افراد سوائے روسو کے اس
کے نیچے جگہ پا چکے ہیں۔لوئی ہفدہم کا زمانہ بھی مجلس کے لئے سکو
اطمینان کا زمانہ ثابت ہوا لیکن اس کے برے دن تیزی کے ساتھ نزد
جا رہے تھے اور جس انقلاب نے کہ شاہنشاہیت کو اُکھاڑ پھینکا اور مٹ
مٹا دیا اُس سے بھلا فرانس کی سب سے بڑی مجلس کس طرح بچ سکتی تھ
تو یہ مجلس اپنی فیاضی اور رحم کے جذبات کے لئے ہمیشہ مشہور رہی
اس موقع پر یہ خاص طور سے مستحق ستائش و تعظیم ہے۔اگرچہ اس
اراکین کے سروں میں انقلاب کی ہوا کسی قدر سمائی ہوئی تھی لیکن ا
کا ایک فرد بھی اُس خونی جماعت کا شریک کار نہ ہوا جس نے شاہ لو
موت کا فتویٰ کردیا تھا اور فرانس کے مایۂ ناز فرزندوں کو سولی پر
دیا تھا—

—:o:—

سنہ ۱۷۹۳ء میں جسے بجا طور پر آشوب فرانس (Reign of Terror
نام دیا جاتا ہے اس مجلس کے معدودے چند اراکین پیرس میں باقی رہ گئے
بعضوں کا انتقال ہو چکا تھا اور اُن کی جگہیں خالی تھیں۔کچھ موت کے
اُتار دئے گئے تھے اور کچھ جلا وطن ہو چکے تھے پھر بھی جو کچھ دو چار ار
بچے تھے وہ حسب دستور ہفتہ میں ایک مرتبہ اکھٹا ہوا کرتے تھے مارانتہ نے
اس وقت ناظم کے فرائض انجام دیتا تھا جب یہ دیکھا کہ اب طوفان آنے ہی وا

تو اس نے کمال حزم و دوراندیشی سے انجمن کے تمام کاغذات فرامین وغیرہ ایک محفوظ مقام پر رکھدئے اور اس طرح اُنھیں تباہی سے بچا لیا۔کیونکہ ۸ اگست سنہ ۱۷۹۳ ع کو ایک فرمان صادر ہوا کہ یہ انجمن ایک بے فائدہ چیز ہے لہذا اسے توڑ دیا جائے۔مجلس کے دروازے مقفل کر دئے گئے اور اعلان کر دیا گیا کہ "مجالس علمی نیز تمام علمی انجمنوں کا مال و اسباب سب جمہوریت کی مالک ہو گیا ہے"۔

لیکن خدا خدا کر کے یہ پر آشوب زمانہ ختم ہوا اور اس مجلس کی تنسیخ بھی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ دو سال کے اندر ہی اندر یعنی سنہ ۱۷۹۵ ع میں مجلس ملیہ کے حکم کی بنا پر ایک مجلس قائم کی گئی اور اس کی بدولت اُن تمام مجلسوں کو جو دو سال پہلے فنا کر دی گئی تھیں نئے سرے سے زندگی ملی۔اس نئی انجمن کو (L' Institut d' France) "ادارۂ علمیۂ فرانسہ" کا نام دیا گیا۔اسے تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ان میں سے ایک کسی حد تک مرحوم مجلس علمی کی نمائندگی کرتا تھا۔

سنہ ۱۸۰۳ ع میں جب نپولین اول صدر اعظم ہوا تو اس نئی انجمن میں بہت کچھ اضافہ اور ترمیم ہوئی۔اس وقت اس کے چار شعبہ کئے گئے اور قدیم مجلس علمی کو ایک علیحدہ شعبہ یعنی نمبر ۲ دیا گیا اور اس کا نام "شعبہ زبان و ادبیات فرانسہ" رکھا گیا اور دراصل یہ شعبہ مجلس علمی ہی تھی جس کا نام بدل دیا گیا تھا۔اسی زمانہ میں بہت سے پرانے قواعد و ضوابط دوبارہ رائج کئے گئے۔

نپولین مجلس علمی کے احیاء کا موید تھا لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی آرزو تھی کہ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی وہ سیاہ سفید کا مالک رہے اور کبھی

کبھی تو وہ بہت سخت گیر سالک ثابت ہوتا تھا-پھر بھی ان اراکین مجلس کو ہزار آفرین ہے جنھوں نے اُس کی خواہشات کو اپنے ضمیر کے منافی پا کر اُن کی سختی کے ساتھہ مقابلہ کیا-دلیل نے اُس کے مظالم کی قصیدہ خوانی سے صاف انکار کر دیا-سوارڈ پر جب ڈیوک آن گین کی پھانسی کے بعد زور ڈالا گیاکہ وہ ایک مضمون لکھے تاکہ عام احساس وفاداری میں جہاں رخنہ پڑ گیا ہے پھر استحکام پیدا ہو جائے تو اُس نے بھی صاف انکار کر دیا- لیکن ان سب سے زیادہ دلیرانہ مقابلہ شاتوبرایاں نے کیا-اُس کے انتخاب کے بعد ایک دن اُس کے استقبال کے لئے مقرر کیا گیا اور اس موقع کے لئے اُسے حسب دستور ایک خطبہ تیار کرنا پڑا-نپولین نے اس کی نقل بغرض ملاحظہ طلب کی-اس خطبہ کا اکثر حصہ آزادی کی تعریف میں تھا-اس کا ذکر نہایت پر جوش الفاظ میں کیا گیا تھا اور علم کی نمو کے لئے اُسے اُتنا ہی ضروری بتایا گیا تھا جتنی کہ ہوا زندگی کے لئے ہے-اس خطبہ کا خاتمہ اس طرح ہوا تھا " پس آزادی علم و فن کی فطری دولت ہے اور جب اسے جمہور کے درمیان سے بزور بھگا دیا جاتا ہے تو یہ جمہور ہی میں پناہ لیتی ہے" نپولین اسے پڑہ کر آگ بگولہ ہو گیا-اُس نے کہا "اگر یہ خطبہ عوام کے سامنے پڑھا گیا ہوتا تو میں مجلس علمی کو نیست و نابود کر ڈالتا اور شاتوبرایاں کو تاریک ترین تہ خانہ میں پھنکوا دیتا" اُس نے فوراً ناظم مجلس کو طلب کیا اور اُس سے کہا "کیوں جناب! یہ آپ کی مجلس کو سیاسی مجلس بننا کب سے نصیب ہوا؟ یہ نظمیں لکھے اور زبان کی غلطیاں درست کرے لیکن اگر اُس نے اپنی حد سے آگے پائوں بڑھائے تو بہت جلد ڈھکیل دی جائے گی وغیرہ" بالآخر مسودہ شاتوبرایان کے پاس واپس بھیج دیا گیا-خود نپولین نے اپنے قلم سے اس کی تصحیح کی تھی اور قابل اعتراض مقامات کو بڑی بڑی ترچھی لکیروں سے کاٹ دیا تھا-مجلس کی خواہش تھی کہ شاتوبرایاں دوسرا خطبہ تیار کرے لیکن اس نے سرکشی کے ساتھہ انکار

کردیا۔ اگرچہ اُس کا انتخاب فسخ نہیں کیا گیا تاہم اس کی توثیق بھی نہ ہوسکی اور جب تک کہ سلطنت کا خاتمہ نہ ہو گیا اُس نے مجلس میں جگہ قبول نہ کی۔ عود شاہنشاہیت کے بعد مجلس کو سابقہ حقوق حاصل ہوئے۔اُس کے پرانے ضوابط پھر رائج ہوئے اور اس کا قدیم نام "مجلس علمی" جو اس کے کارناموں سے مشہور ہو چکا تھا لیکن انقلاب کے بعد سے مٹا دیا گیا تھا اُسے دوبارہ ملا۔ شاہ لوئی میزدہم نے حسب روایات قدیم اس کی سرپرستی قبول کی اور اس کے بعد اُس کا جانشین چارلس دہم سرپرست ہوا۔

وہ فرمان شاہی جس کی رو سے لوئی هیزدهم نے اس مجلس کی تجدید کی تھی ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۱۶ع کو صادر ہوا لیکن اس تجدید کی یاد کے ساتھ ملی جلی چند افسوس ناک واقعات کی یاد بھی اسی وقت سے چلی آتی ہے۔ بنا بر حکم شاہی اراکین کی فہرست سے گیارہ نام خارج کر دئے گئے گویا کہ یہ لوگ ہمیشہ کے لئے مجلس سے باہر کر دئے گئے۔اسی حکم کے بموجب چند نئے اراکین زبردستی شریک مجلس کئے گئے حتی کہ کسی رسمی انتخاب کی بھی زحمت گوارا نہ کی گئی۔ہمیں شاید اس صراحت کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہے کہ خارج شدہ راکین وہ تھے جو یا تو انقلاب پسند جماعت میں شریک تھے یا پھر شاہ نپولین کے حامیوں میں سے تھے! اور ان کی جگہ جن اراکین نے لی وہ سب کے سب انتہا درجہ کے "شاہ پسند" تھے اور ان میں سے اکثر کی شرکت کا سبب ان کی ادبی خصوصیات اتنی نہ تھیں جتنا کہ ان کے سیاسی رجحانات۔یہ ایک ایسا غیر منصفانہ طرز عمل تھا کہ اس کی طرف سے چشم پوشی کرنا کسی صورت سے ممکن نہیں ہے اور یہ بات کہ مجلس نے اپنے ضوابط اور آزادیوں کو اس طرح پامال ہوتے ہوئے دیکھا اور کسی قسم کا احتجاج نہ کیا اس قدیم مجلس کے دامن پر ایک نہایت بدنما دھبہ بنکر آج تک قائم ہے۔

لیکن جب چارلس دهم کے زمانه میں سنه ۱۸۲۷ع میں فرانسیسی حکو
کی طرف سے مجلس نائبین کے سامنے ایک تحریک پیش کی گئی جس سے ا
کی آزادی میں خلل واقع هوتا تھا تو مجلس علمی کا رویه مذکورہ بالا ا
عمل سے مختلف تھا۔ ابھی مجلس نائبین اس قانون کے مسودہ پر غور بھی
نه پائی تھی که مجلس نے متفقه طور پر اس دست اندازی کے خلاف ا
احتجاج بلند کی۔ جتنے اراکین پیرس میں موجود تھے اُن سب کا ایک
کیا گیا۔ ایم بدک ری تیلی نے ایک پر زور تقریر کی۔ اُس نے کہا "کہا ہا
وقت اس کا مجاز ھے که جب اس کا جی چاھے فرانس میں آزادی خیالا
سلب کرے" اس تقریر کے خاتمه پر بالاتفاق راے یه طے پایا که بادشاہ کے
میں ایک عرضداشت پیش کی جائے۔ اس کو مرتب کرنے کی غرض سے تین ا
کا انتخاب عمل میں آیا۔ ناظم مجلس نے عرضداشت پیش کرنے کی غر
باریابی کی اجازت طلب کی لیکن بادشاہ نے اُس سے ملنے سے انکار کر د
تین اراکین نے اس تحریک میں نمایاں حصه لیا تھا اُن کے ساتھہ بہت
سختی کی گئی اور اُنھیں عہدوں سے برطرف کر دیا گیا تاهم یه تجویز
نه هو سکی اور مجلس نائبین کی مخالفت کی وجه سے حکومت نے اُسے
لے لیا —

———:o:———

اس واقعه کے بعد هي سے نه صرف مجلس علمی کے تفکرات اور تقر
میں بلکه اُس کے اراکین کے انتخاب میں بھی ایک آزادی کی روح کا
هوئی دکھائی دینے لگی۔ اس موقع پر همیں اِس تحریک کا ذکر کرنا
جو کچھه سال پہلے سے چلی آرهی تھی اور جس نے علمی افراد کے درمیا
طرح کی جنگ پیدا کر دی تھی۔ هماری مراد اُس نئے مذهب ادبیات سے
دفعتاً " عود شاهنشاهی " کے پہلے سال میں نمودار هوا اور جسے قدیم

ادبیات سے ممتاز کرنے کی غرض سے " رومانیت " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور پرانے قواعد و ضوابط کے پیرووں کو قدیم یا کلاسک مذہب ادبیات کا نام دیا گیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ انگریزی ادبیات نے جو کچھہ اثر فرانسیسی دماغ پر کیا وہی آگے چل کر اس تحریک کا سبب ہوا۔" شاتوبرایاں "اور " مادام استیل " کی تصانیف نے اس اثر کو اور تقویت دی اور در اصل یہی دونوں اس مذہب کے امام اول کہے جاسکتے ہیں۔" مادام استیل "ہی نے سب سے پہلے لفظ رومانیت استعمال کیا۔برق و رعد کا شور تو سنہ ۱۸۲۰ ع ہی سے سنائی دے رہا تھا۔لیکن سنہ ۱۸۲۴ ع میں یہ طوفان اپنی انتہائی شدت کے ساتھہ اُٹھا۔اس ادبی جنگ کا خاص سبب " آگر " معتمد مجلس علمی کی ایک تقریر تھی۔جس میں بھری مجلس میں اس نئی تحریک کو ہدف ملامت بنایا گیا تھا اور رومانیوں (Romanticists) کو " ادبی بدعتیوں " کا لقب دیا گیا تھا۔" آگر " کا حصہ اس ادبی پیکار میں بہت کچھہ پر جوش رہا ہے —

مجلس علمی نے بحیثیت جماعت ان مناقشات میں کوئی حصہ نہ لیا۔کیوں کہ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے بغیر مصنف کی خواہش کے کسی تصنیف پر تنقید و تبصرہ کرنا قواعد مجلس کے منافی تھا۔علاوہ ازیں مجلس نے اس معاملہ میں غیر جانبدارانہ روش کو پسند کیا اور اس خوف سے کہ کہیں اُس کے وقار اور شان میں کوئی خلل نہ واقع ہو اِس جھگڑے " سے الگ تھلگ رہی اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ کچھہ اسی مرتبہ نہیں بلکہ ہمیشہ یہ مجلس قدیم روایات کی دلدادہ رہی ہے اور ہر نئی تحریک کو خاص کر اُس کے آغاز کے وقت مشتبہ نظروں سے دیکھتی رہی ہے۔ہاں تو اگرچہ مجلس علمی نے اجتماعی طور پر اپنا دامن بچائے رکھا لیکن انفرادی طور پر اُس کے اراکین علی‌الاعلان میدان کار زار میں اُترآئے اور اس نئی تحریک کے شدید ترین مخالف اکثر اراکین مجلس ہی تھے۔لیکن رفتہ رفتہ مجلس میں وسعت نظر پیدا ہونے لگی۔

"شاتوبرایاں" تو بہت پہلے سے رکن تھا۔ سنہ ۱۸۲۵ ع میں "کاسی مر دی لادین" بھی منتخب ہوگیا اور سنہ ۱۸۲۸ ع میں "ایم لبرون" بھی رکن بنا لیا گیا اور اگر "بریں جر" نے مقابلہ سے انکار نہ کیا ہوتا تو وہ بھی ضرور ہی منتخب ہو جاتا—

———:o:———

اپریل سنہ ۱۸۳۰ ع میں "یم-دی-لامارتین" کا انتخاب عمل میں آیا-یہ ایک اہم واقعہ تھا کیوں کہ اِس نے ثابت کردیا کہ خواہ ظاہری طور پر نہ سہی لیکن باطناً مجلس علمی بھی اس جدید مذھب کے لائق اور باکمال افراد کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ھے - جیسا کہ خود "لامارتین" نے اپنی تقریر میں کہا "اس انتخاب سے یہ ثابت ہوگیا ھے کہ مجلس مشاھیر عصر میں سے کسی کو بھی رکنیت سے محروم رکھنا نہیں چاھتی" اور یہ کہ اُس کے دروازہ بلا قید مذھب تمام اھل علم کے لئے یکساں طور پر کھلے رھیں گے-کچھھ عرصہ کے بعد "وکٹر ھیوگو" بھی رکن بنا لیا گیا-حالانکہ کچھھ دنوں پہلے اُس کے ناٹک "ھر نانی" پر ھر طرف سے شدید مباحثے و مناظرے ہوتے رھے تھے-پرانے نظام سلطنت کے بگڑ جانے کے بعد سے سرپرست کے عہدہ کی کچھھ زیادہ قدر نہ رھی تھی لیکن اور حیثیتوں سے آج کی مجلس علمی ویسی ھی ھے جیسی کہ "ری شی لیو" نے قایم کی تھی اور جو کہ لوئی چہاردھم کے زمانہ میں معراج کمال پر پہونچ گئی تھی-حسب دستور اسکے اجلاس پورے سال بھر ھفتہ میں ایک مرتبہ ھوتے ھیں-کیونکہ یہ مجلس کسی قسم کی کوئی تعطیل نہیں مناتی- تقسیم انعامات کے زمانہ میں ھفتہ میں دو مرتبہ اجلاس ھوتا ھے-جس مجلس کی ابتدا اتنی حقیر تھی اور جس کے اراکین غریب اور معمولی حیثیت کے اھل علم تھے وھی مجلس آج نہ صرف ایک زبردست علمی جماعت ھے بلکہ ساتھہ ھی ساتھہ بہت کچھہ دولت مند اور بااثر بھی ھے-اکثر لوگوں نے اس کے نام کو انقطار عطیہ

ے ھیں۔اس میں بہت کچھ انعامات بھی تقسیم کئے جاتے ھیں اور ان کی
ں کو آرزو رھا کرتی ھے۔ ھرفرانسیسی اھل علم اسکے مشہور گنبد * کے
جگہ پانے کو علمی شہرت کی معراج تصور کرتا ھے —

—:0:—

آغاز قیام مجلس سے لے کر موجودہ زمانہ تک اس کی تاریخ دیکھہ لینے
د اب ھم کس نتیجہ پر پہونچتے ھیں ؟ کیا اس کے منشاء قیام کی تکمیل
ی ھے ؟ کیا آج بھی یہ اُسی شہرت کی حقدار ھے جو اسے قدیم زمانہ میں حاصل
؟ کیا اُس نے کچھہ مفید خدمات انجام دیں اور اب بھی دے سکتی ھے ؟
ین کے حملوں کے باوجود ھمارا خیال ھے کہ ان سب سوالات کا جواب
ت میں دیا جا سکتا ھے۔ ھم دیکھہ ھی چکے ھیں کہ اِس انجمن کے قیام کے بعد
سے فرانسیسی زبان نے ترقی شروع کی اور رفتہ رفتہ وضاحت معانی۔
رتاب۔ صحت اور فصاحت کے اعتبار سے نیز سلاست کے ساتھہ اظہار خیال پر
ر ھونے کی حیثیت سے اس زبان کا شمار بہترین السنۂ جدیدہ میں ھونے
ر آج بھی ھوتا ھے —

ھم یہ بھی دیکھہ چکے ھیں کہ اسی مجلس علمی کی بدولت ادبیات اور
وں کو جو پہلے کس مپرسی کی حالت میں پڑے ھوئے تھے۔ بلند ترین رتبے
عزتیں حاصل ھوئیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسی کے اثر سے ملک کے اعلیٰ
ں میں علم کی وقعت اور محبت پیدا ھوئی۔اس کے علاوہ اس مجلس نے ان لوگوں
سرپرستی اور مدد کی جن کی ذھانت پردۂ گمنامی میں چھپی ھوئی تھی
جو اُس کی دستگیری کے بغیر یا تو عمر بھر بے دست و پا رھتے یا پھر

---

* سنہ ۱۸۰۸ع سے مجلس علمی کے جلسے قدیم قصر مازارین میں ھوتے ھیں۔یہ
ہور گنبد اسی قصر کے اوپر ھے —

ناچار خدایان سلطنت کے دروں کی خاک اڑاتے اور اُن سے مدد کے طالب ہوتے —

لیکن ان سب باتوں کے باوجود مخالفین کے اکثر حملوں کو حق بجانب ماننا پڑتا ہے۔وقتاً فوقتاً اس مجلس میں بے جا اعتراض اور تنقیص کی روح موجود رہی ہے جس نے بجائے زبان کو ترقی دینے کے بعض صورتوں میں اُسے سرمایۂ علمی سے محروم رکھا ہے۔یہ مجلس پسندیدہ سے پسندیدہ اختراع اور ایجاد سے خائف رہی ہے گویا کہ اُس کی علمی شان اور بزرگی کو اُسے تسلیم کرنے سے کسی قسم کا ضرر پہونچتا۔اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس نے بادشاہوں اور وزیروں کے سامنے بھی بعض اوقات سر اطاعت خم کیا ہے اور اکثر صورتوں میں یہ اطاعت غلامی کی حد تک پہونچ گئی ہے۔اس کا بھی ہم دعویٰ نہیں کرسکتے کہ اُس کے انتخابات میں ہمیشہ حق و قابلیت کا خیال رکھا گیا ہے۔ایسی مثالیں بھی نظر آتی ہیں جن میں مستحق افراد کو رکنیت سے محروم رکھا گیا ہے۔ کبھی کبھی رائے دینے میں خانگی سازشیں اور سیاسی مصلحتیں علمی استحقاق واستعداد پر غالب آئی ہیں۔لیکن اِن سب اور ان سے بھی زیادہ اعتراضات کو بھی اگر تسلیم کرلو تو بھی اچھائیوں کا پلہ برائیوں کے مقابلہ میں بھاری نظر آتا ہے اور ایسا ہونا ممکن ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے کیوں کہ اس مجلس کی ڈھائی سو سالہ زندگی میں فرانس کے اعلیٰ ترین دماغ اس میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ایسے ایسے خداداد ذکاوت اور جودت رکھنے والے افراد اس کے رکن ہوئے ہیں جن کا پایہ تقریباً علم کے ہر شعبہ میں نہایت بلند تھا۔جس مجلس کے ایسے اعضاء اور ارکان ہوں وہ لازمی طورپر اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔چنانچہ یہ مجلس بھی حقیقی معنوں میں اعلیٰ ہے۔اُس کے افراد نرے ذکی اور ذہین ہی نہ تھے بلکہ وہ دیانت دار۔مخلص اور عالی ہمت بھی تھے۔وہ جری بھی تھے

اور اپنی جرات کا استعمال مجلس کی آزادی کی حمایت میں کرتے رہے۔یہی سب باتیں ہیں جنہوں نے مل جلکر اس مجلس کو اعلیٰ بنادیا ہے۔مجلس علمی کے جدید ترین مورخ فابر ے کے بقول " فرانسیسی مجلس علمی نے بہت سے طوفانوں کے تھپیڑے سہے ہیں اور بہت سے انقلابات اور سیاسی اُتار چڑھاؤ سے بچ بچ کر نکلتی رہی ہے اور ہم کو پوری اُمید بلکہ یقین ہے کہ جب تک فرانسیسی قوم زندہ ہے یہ مجلس بھی زندہ اور قائم رہے گی "۔

یکم مئی سنہ ۱۸۹۰ ء کی تاریخ اس نئے مقرر کی گئی تھی کہ ایم۔ایمیلی آژیر مشہور ڈراما نویس کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس پر کسی نئے رکن کا انتخاب عمل میں آئے۔مزارین کے گنبد کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے اتنی سخت جنگ شاید پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی اور شاید پہلے کسی خالی جگہ کے لئے اتنے اُمیدوار میدان میں نہ اُترے ہوں گے۔ تیرہ افراد ایک جگہ کے لئے مقابلہ کر رہے تھے۔

اب وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ ریشی لیو کی مرضی یا کسی بادشاہ وقت کا حکم مجلس کے انتخابات پر اثر ڈال سکے۔اب تو صدر جمہوریت کسی طرح کا دخل نہیں دیتا۔ہاں سیاسی وجہ یا اور دوسرے اسی قسم کے اسباب اب بھی اراکین مجلس میں تفرقہ ڈال دیا کرتے ہیں۔داد ے کا مشہور افسانہ " غیر فانی " کہیں کہیں سے پردہ ہٹاکر ہمیں پس پردہ حالات کی ذرا سی جھلک دکھا دیتا ہے اور اگرچہ اس قصہ میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے پھر بھی اتنا یقینی ہے کہ ہر انتخاب کے موقع پر سازشوں کی گرم بازاری ہوتی ہے اور رایوں پر بہت سے اثرات ڈالے جاتے ہیں۔جس یکم مئی کا ہم نے ذکر کیا اُس دن یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی تھی۔میدان مقابلہ خوب گرم تھا اور عرصہ تک گرم رہا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔انتخاب کے لئے ضروری تھا

کہ کم از کم بیس رائیں (یعنی نصف مجلس سے ایک زیادہ) حاصل کی جائیں اور کسی ایک امیدوار کو بھی اتنی رائیں نہ مل سکیں—

چونکہ جنگ کی شدت کا اندازہ پہلے ھی سے سب کو تھا اس لئے جملہ ارکین اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ اُنتالیس " غیر فانیوں " میں سے صرف ایک یعنی ڈیوک آمیل موجود نہ تھا کیوں کہ وہ اُس وقت سسلی میں تھا۔ ایم ری نین بھی لوگوں کے کندھوں پر سوار ھوکر اپنی رائے دینے آگئے تھے۔ حالانکہ شدید وجع مفاصل میں گرفتار تھے۔لیکن غیر حاضر رھنا انھیں کس طرح گوارہ ھوسکتا تھا۔ ٹھیک ایک بجے جلسہ کی کارروائی شروع ھوئی۔ سب سے پہلے معتمد مجلس علمی نے وہ خط پڑھکر حاضرین کو سنائے جو تیرہ اُمیدواروں نے مجلس کے نام لکھے تھے۔ پھر قدیم دستور کے موافق حاضرین کو ھدایت کی گئی کہ جملہ رائیں " کامل آزادی اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے " دی جائیں۔ رائیں لی گئیں۔ سات مرتبہ رائیں لی گئیں۔ لیکن نتیجہ ھمیشہ وھی رھا یا یوں کہو کہ کچھہ نہ رھا۔ کیوں کہ کسی مرتبہ بھی کسی اُمیدوار کو دس سے زیادہ رائیں نہ مل سکیں۔ ساتویں مرتبہ رائے طلب کرلینے کے بعد جب ناظم مجلس نے دیکھا کہ جلسہ کو مزید طول دینا فضول ھے تو اُس نے تجویز کی کہ انتخابات کی تاریخ بڑھادی جائے اور یہ تجویز بالاتفاق رائے منظور ھوئی—

———:0:———

امیدواران رکنیت میں تنوع کی کوئی کمی نہ تھی۔ مقابلہ کرنے والوں میں صرف مورخ اور ادبی نقاد ھی شامل نہ تھے۔ بلکہ افسانہ نگار شعرا۔ سائنس داں۔ ڈراما نویس سب ھی تھے۔ بعض زبردست استعداد رکھتے تھے۔ بعضوں کا مبلغ علم معمولی تھا۔ کچھہ ایسے بھی حضرات تھے جن کے نام سے خود فرانس میں بھی زیادہ لوگ واقف نہ تھے۔ مشہور اُمیدواروں میں ایم زولا بھی تھا۔ اکثر لوگوں کو تعجب بھی ھوا کہ اُس نے " غیر فانیوں " میں شامل ھونے

ب کس طرح دیکھ لیا : اُس کی تصانیف کے حسن و قبح سے تو ہم کو کچھ
سروکار نہیں ہے ہاں اتنی بات مسلمہ ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی تو ایسی
ہے جو علمی کہی جا سکے '—

'اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کی آخری تصنیف سے پہلے کی کتاب یعنی
،ا ' خواب " مجلس علمی کے اعزازات حاصل کرنے کے خیال سے لکھی
ے۔ جو کچھ بھی ہو اتنا ضرور ہے کہ اس کی مذکورۂ بالا تصنیف اور
ی تصانیف کے درمیان وہی فرق ہے جو دن رات۔ نور اور ظلمت میں
ہے۔ ایک موقع پر جب ایم زولا کے کسی دوست نے اُس سے دریافت کیا " کیا
سمجھتے ہیں کہ آپ کو کوئی موقع ہے؟ " تو اُس نے جواب دیا یہ تو میں
ہوں کہ مجھے اس مرتبہ کسی قسم کا موقع نہیں ہے۔ لیکن میں نے مستقل
، کی نیت کر لی ہے اور آخیر میں مجھے کامیابی کی اُمید بھی ہے۔ میرا
، ہے کہ ہر شخص کو خاص کر ہر صاحب فن کو اُن تمام ممکنہ اعزازات کے
ں کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جن کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہو۔
ب کے لئے مجلس علمی میں جگہ پانا اعلیٰ ترین ادبی اعزاز ہے اور میں نے
رہ کر لیا ہے کہ اُس کے لئے ضرور کوشش کروں گا " —

———— :o: ————

انھیں امیدواروں میں ایک اور افسانہ نگار پیری لوتی بھی تھا۔ اس کی
یفات میں ہمدردی کا رنگ بہت گہرا جھلکتا ہے۔ وہ ایک قدیم ہیوجی ناث
ندان کا رکن ہے۔ جس نے کئی صدی قبل جزیرۂ اوبی ران میں پناہ لی تھی۔
اُسے " بحری شاعر " کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ باعتبار عہدہ وہ ایک بحری
سر ہے * —

* ابھی حال ہی میں پیری لوتی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس مصنف کو ترکوں سے
(باقی صفحہ آئندہ)

اجنبی سرزمینوں اور دور دراز سمندروں سے-ہر اُس جگہ سے جہاں
اُس کی بحری زندگی کے انقلابات اور اتفاقات اُسے لے گئے ہیں وہ سوغات کے
طور پر ایسی یاد اور ایسے ایسے بیانات محفوظ کرکے لایا ہے جو اپنے اچھوتے پن
اور اپنی دکھہ بھری رقت کی وجہ سے بہت دلکش ہیں-اُس کی تازہ ترین تصنیف
" Le Roman en Enfant " (ایک بچہ کا افسانہ) میں ہمیں پرانے ہیوجی ناٹ
خاندانوں کے مرقع نظر آتے ہیں جو ہوبہو سترھویں صدی کے کسی انگریز
خاندان کی تصویریں معلوم ہوتی ہیں-انجیل کا پرانا خاندانی نسخہ جسکو
چھوٹے بڑے سب بہت احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں-فرشتہ صورت وادی
جو سخت گیر بھی ہے اور رحمدل بھی اور ایسی ہی دوسری چیزوں کا بیان
کمال رقت اور لطافت کے ساتھہ کیا گیا ہے-ایک نہ ایک دن لوتی ضرور چالیس
کے مجمع میں نظر آئے گا لیکن اس مرتبہ نہیں!—

———:◆:———

ایک اور اُمیدوار ایم برونی تی یر تھے-یہ ایک زبردست نقاد ہیں-
رسالہ Revue dex deux Mondes میں ان کے مضامین اکثر چھپتے رہتے ہیں
اور بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں-لیکن جو دو اُمیدوار رکنیت کے لئے
سخت مقابلہ کر رہے تھے وہ ایم لاویسی اور ایم تھیورو ڈانگن تھے-یہ دونوں
کے دونوں اعلی پایہ کے مورخ ہیں-اول الذکر سوربون میں تاریخ کے پروفیسر
ہیں اور تاریخی مباحث پر قابلیت کے ساتھہ قلم اُٹھاتے ہیں-اِس کے علاوہ انھیں
با اثر دوستوں کی حمایت بھی حاصل ہے-جنہوں نے کہ ان کی کامیابی کے لئے

بہت محبت تھی اور اکثر اپنے ناولوں میں اس نے اُن کی معاشرت کی تصویریں
دکھائی ہیں-اس کی کچھہ ناولوں کا ترجمہ فارسی میں بھی ہوچکا ہے "پریزوبہار
ناکام" ایسا ہی ترجمہ ہے-اس کی دوسری ناولیں یہ ہیں - Le Marriage de Loti;
Mon Frere Ives; Propos d' Exil; Madame Chrisantheme.

کوئی مقابلہ اُٹھا نہیں رکھا ہے-لیکن تھیورو دانگان کے حقوق ایم لادیسی سے بہت بڑھے ہوئے ہیں-کئی سال سے اُنکی جانشین ہونیوالے رکن مجلس کی سی تسلیم کی جاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اُن کی تاریخی خدمت اُنہیں ہر طرح سے اس اعزاز کا اہل بناتی ہیں۔ "جولائی کی شہنشاہیت کی تاریخ " اُن کی خاص تصنیف ہے اور اُنہیں ممتاز مورخوں کی صف میں شامل کر دیتی ہے-صرف فصاحت اور زبان کی دلکشی ہی اس تصنیف کی خوبیاں نہیں ہیں بلکہ دیانت-غیر جانبدارانہ نظر اجتہاد و آزادی آرا بھی اس کی نمایاں خصوصیتیں ہیں—

مذکورہ بالا اُمیدواروں کے علاوہ عین انتخاب کے وقت رکنیت کے ایک اور اُمیدوار پیدا ہوگئے-یعنی ایم ڈی فرے سینے وزیر اعظم و وزیر جنگ فرانس! اُن کی کامیابی شروع ہی سے یقینی سی ہوگئی-کیونکہ ادبی قابلیت کے علاوہ خود اُن کے عہدہ کا اثر کتنا بڑا تھا-مختصر یہ کہ گیارہ دسمبر کو دوبارہ انتخاب ہوا اور ایم فرے سینے کو رایوں کی مقررہ تعداد مل گئی یعنی نصف سے ایک زیادہ-حاضرالوقت اراکین کی تعداد ۳۸ تھی اور اُن میں سے ۲۰ نے اُن کے موافق رائیں دیں-ہم اتنا اور بتلائے دیتے ہیں کہ ایم فرے سینے کا " توشۂ علمی " * نہ تو بہت بھاری ہے اور نہ کچھہ زیادہ اہم-کچھہ رسالے علمی مباحث پر ہیں اور شاید ایک کتاب ہے جو سنہ ۱۸۷۰ ع کی جنگ کے بعد لکھی گئی تھی-اس آخرالذکر تصنیف کی بہت کچھہ تعریف کی جاتی ہے-کم از کم اُن کی جماعت کا یہ خیال ہے کہ ایم-فرے سینے کچھہ ملکی اور عام خدمات کی بجاآوری کے بھی دعویدار ہوسکتے ہیں-مجلس علمی کے دروازے ہمیشہ

---

* اُمیدواروں کی تصانیف اور دیگر علمی خدمات-اسناد و غیرہ کو مجموعی طور پر اُن کا Literary Bagol کہا جاتا ہے —

خدمت عامہ کرنے والوں کے لئے کھلے رہے ہیں-خواہ یہ خدمت قلم کے ذریعہ سے کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو—

——§•§——

مجلس علمی کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُس کا افتتاح مناسب ساعت میں کیا گیا-اُس نے کسی حدتک فرانسیسی زبان کو معین کردیا ہے اور ادبیات پر بھی اُس کا اثر کچھہ معمولی نہیں ہے-مرور زمانہ اور روایات نے فرانسیسی ادیبوں کے لئے اس کی رکنیت کوایک قابل آرزو چیز بنادیا ہے- لیکن اس رکنیت سے عملی فائدہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ مقبولیت اور عام رائے بھی اس کی شریک ہو-انگریزی ادب بجا طور پر یہ فخر کرسکتا ہے کہ اگر کوئی بڑی سے بڑی مجلس علمی بھی قایم کی جائے تو بھی اُس میں ان انگریزی ادیبوں کی سمائی نہیں ہوسکتی جو بجاطور پر رکنیت کے مستحق ہیں-انگریز مصنفین بغیر غور وتامل کے اپنے آزادانہ شریف اور ہمہ گیر پیشہ کو کسی ایسی مجلس کا پابند نہیں بناسکتے جس کا مقصد حیات صرف "جکڑبندی" اور تحدید ہو اور اگر ایسی مجلس قائم بھی ہوجائے تب بھی ہمارا موجودہ ادب جس حالت میں ہے اُس کے اعتبار سے ایسی مجلس صرف خارجی وقار اور ظاہری عزت کا ذریعہ ہوسکتی ہے اور بس—

جیت کی کنجی

از

(جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب)

ہے ایک پہیلی اپنا جینا ایک معمہ مر جانا
اک راز یہاں کا آنا جانا
خون جگر پینا بوجھنا اس کا مفت کا گویا غم کھانا
آخر یہی جانا کچھ نہیں جانا

—)(•)(—

زیست کے معنے ہیں درد کا سہنا سکھ کا اٹھانا مردانہ
ڈر کو کچل دینا ڈر کا مٹانا
جاں ہتھیلی پر رکھنا جینا ہارنا جی کا مر جانا
جاں کا کھو دینا جاں کا پانا

—)(•)(—

سکھ کا ملنا ہے بس اتنا ہی سکھ کام کی ہے تیاری
سکھ سے تازہ دم کام کے قابل
دن بھر کام کا پھل رات کی نیندیں نیند کا ثمرہ بیداری
سکھ یا دکھ یکساں سم قاتل

—)(•)(—

دکھ اک سکھشا ہے بن دکھ جان کو آرام نہیں چین نہیں
سکھ خواب ہے گویا دکھ بیداری
ہر کام میں دکھ ہے دکھ میں سکھ ہے کر کام نہیں چین نہیں
ہے کام کی جگ میں برکت ساری

(•)

کام عبارت ہے سرگرمی سے کام دماغی بجلی ہے
اس زور سے ہر مشکل ٹلتی ہے
سارے زوروں کا زور یہی ہے جیت کی کنجی ہے
کام سے دنیا آگے چلتی ہے

ادبیات ایران در زبان مشروطه

(ذیل کا مضمون ایران کے مشہور اہل قلم رشید یاسمی کا لکھا ہوا ہے۔ رشید ایک روشن خیال پرجوش نوجوان ہیں اور ایرانی ادبیات میں ان کی حیثیت متجدد کی سی ہے۔ آپ تو قدماے ایران کے ساتھ بھی بہت محبت ہے۔ آپ صاحب تالیفات بھی ہیں جن میں تذکرہ ابن یمین خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ کی فارسی نثر ایک مخصوص انداز رکھتی ہے۔ رشید شاعر بھی ہیں اور اُنکی نظمیں ایرانی ادبیات میں وہی درجہ رکھتی ہیں جو اقبال کا اُردو نظم میں ہے۔ ہم آقا میرزا محمد تقی صاحب علمی شیرازی پروفیسر اورنگ آباد کالج کے ممنون ہیں جنھوں نے اپنی عنایت سے یہ مضمون رسالہ اُردو کے لئے لکھوایا۔ ترجمہ کے مقابل اصل فارسی تحریر بھی درج کردی گئی ہے تاکہ زمانۂ حال کے ایک نامور ایرانی ادیب کی انشاپردازی کا نمونہ معلوم ہوجائے —

مولوی سید وہاج الدین صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج نے ازراہ عنایت اس کا ترجمہ اُردو میں کر کے دیا ہے —

(اڈیٹر)

امروز عهد تحول زبان فارسی هست ایرانیان پس از آشنائی به ادبیات اروپائی احتیاج به یک تجدد

آج وہ زمانہ ہے کہ فارسی زبان اپنا چولا بدل رہی ہے۔ یورپی ادبیات سے واقف ہوکر اب ایرانیوں نے بھی

کاملے را احساس نمودند- شخص تا
محصور عادات و رسوم خود هست
هیچ نمی تواند عیوب انها را فهمیده
و در رفع نواقص خود کوشش نماید-

اروپا هر چند بطور خیلے ناقص
ولے باز تا درجۂ قابل توجهی بایرانے
فهمایند که غیر از کلمه بازی نزعے
دیگر هم از چیز نویسی وجود دارد
و قبل از رعایت الفاظ که قالب هاے
بے روح هستند توجه بمعانی باید
منظور نویسنده باشد ادبیات قدیم
ایران بر این خط سیر نموده و ایرانے
در حالتے که تجدد میکرد و ظاهرا
اروپا را سر مشق خود قرار میداد
اصولاً پیروی از بزرگان قدیم خود کرده
و بر طریقه انها سلوک می نمود
فاصله چهار صد سال که میان آن عهد
و این دوره واقع بود البته بسهولت
طے نمی گشت ادبیات صفوی و زند
و قاچار بآسانی فراموش نمی شد
قاچار میان فکر جدید خواهی و عادت
قدیم پرستی یک جداول تسکین
نا پزیرے دوام یافت—

یہ محسوس کرلیا ہے کہ اُن کی ادبیات
میں پوری طرح تبدیلی ہونا چاہئیے-
آدمی جب تک اپنی عادتوں اور
رسموں میں پھنسا رہتا ہے اِن چیزوں
کی برائیاں نہیں سمجھہ سکتا اور
نہ اپنی خامیوں کے دور کرنے کی کوشش
کرسکتا ہے—

یورپ نے خواہ اُس کا طریقہ کتنا
ہی ناقص کیوں نہ کہا جائے لیکن
پھر بھی بہت کچھہ قابل توجہ پیرایہ
میں ایرانیوں کو یہ بات سجھائی کہ
انشاپردازی سے مراد صرف کلمہ
بازی اور لفاظی ہی نہیں- بلکہ کچھہ
اور بھی ہے- نیز یہ کہ الفاظ کی رعایت
سے پہلے (جن کی حیثیت محض قالب
بے روح کی سی ہے) لکھنے والے کو
معانی پر توجہ کرنی چاہئیے- ایران
کی قدیم ادبیات اسی راستہ پر تھی
تھی اور خود ایران جدید بھی اگرچہ
جدت پسندی پر آمادہ تھا اور بظاہر
یورپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا
لیکن اصولاً اپنے پرانے بزرگوں کی
پیروی کرتا تھا اور اُنھیں کی دکھلائی

یک مسئله از نویسندگان در آثار
نثر قید سجع و مراعات النظیر و سایر
قیود را در هم شکستند نویسندگی
منحصر شد از بیان معانی و توجه
بالفاظ و زینت جمله متروک ماند
یعنی نویسنده اول فکر می کرد چه می
خواهد بنویسد بعد کلماتی برای بیان
آنها استخدام می نمود و این بر خلاف
روش سابقین بود —

عیب بزرگی که درین تجدد پیدا
شد این بود که مثل همیشه و همه جا
زمام نویسندگی بدست جوانان افتاد
که متاسفانه و طبیعتاً از معلومات
گذشته و نگارش پیشین چندان اطلاع
نداشتند فضلا و ادبائی که در ادب
ماضی دست داشتند پس یک مقاومت
مایوسانه مغلوب شدند و گوشه گرفته
و با چشمی منتقد و ناراضی بقلم
جوانان نگران شدند طبقهٔ جوان هم که
یکباره بر ادب گذشتگان پشت پا زده
و بر خود حتم کرده بود که لفاظی را
مهمل گذاشته و معانی را بآسانی‌ترین
عبارتی بیان کند دو چار دو مشکل شد

ہوئی شاعرانہ پرگام زن تھا۔قدیم و
جدید عہد کے درمیان جو چار سو سال
کا فاصلہ حائل تھا وہ آسانی سے کیونکر
طے ہوسکتا تھا۔صفوی-زند اور قاچار
کے عہدوں کی ادبیات کو بھول جانا
آسان نہ تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ جدت
پسندی کے رجحان اور قدامت پرستی
کی عادت کے درمیان ایک بڑی
جنگ چھڑ گئی —

———:o:———

انشاپردازوں کا ایک ایسا گروہ
وجود میں آیا جس نے اپنی تصنیفات
سے سجع مراعات النظیر اور تمام
پابندیوں کو نکال پھینکا۔انشاپردازی
بیان معانی کی مرادف قرار پائی
اور الفاظ پر توجہ کرنا اور جملوں
کو سنوارنا متروک ہوگیا۔لکھنے والے
پہلے یہ سوچتے کہ کیا لکھا جائے اور
پھر اُسے بیان کرنے کے لئے کلمے ڈھالے
جاتے اور یہ طریقہ قدیم روش کے
خلاف تھا—

اس دور تکوین میں جو سب سے
بڑا عیب پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ہر

طریقه فرسولی نظم و نثر قدیم که
زیبائی ظاهر داشت از و پوشیده مانده
و برای پوشاندن معانی بفقر سهر می
مبتلا گشت و معانی نیز که مطمح نظر
بود متاسفانه بیک خواهش عاشقانه
نصیب او نمی شد محتاج بسعی و صبر
و صرف عمر بسیار بود و بدیهی است
که این سه عامل کمتر در دسترس
جوان می آید —

اروپائی که او را مفتون میکرد
فقط یک آئینه بود که اشعهٔ خورشید
علم را بطور مبهم و خیره کننده بچشم
او میفرستاد و حقائق را در حجاب
نور شدید از نظر او مخفی میداشت -

جوان نه گزشته را لایق پیروی
می دانست و نه از اروپا می توانست
چنانکه باید معانی و علوم اخذ
نماید وقتی که رشتهٔ الفاظ گسیخته
شد و فکر نویسنده را نه سجع مدد
کرد و نه معانی راهنمای نمود معلوم
هست چه اغتشاشی رخ خواهد داد
دیگر نه معانی فارسی ماخوذ از اروپا
لفظ متناسبی پیدا کردند و نه الفاظ

زمانے اور ہر جگھہ کی طرح ایران
میں بھی تصنیف و تالیف کی باگ
جوانوں کے ہاتھوں میں آگئی جو
قدرتی طور پر معلومات گزشتہ اور
زمانہ سابق کی تحریروں سے کچھہ
زیادہ با خبر نہ تھے۔وہ فاضل اور
ادیب بزرگ جن کو قدیم ادب میں
دسترس حاصل تھی مایوسانہ مقابلہ
کے بعد ہار مان گئے اور اس میدان
سے الگ ہٹ کر غصے اور عیب جوئی
کی نگاہوں سے نوجوانوں کے قلم کو
دیکھنے لگے۔اِس طبقہ کو جس نے
دفعتاً ادبیات قدیم کو ٹھکرا دیا تھا
اور لفاظی کو مہمل سمجھنے اور
مطالب کو آسان ترین عبارت میں
بیان کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا دو
دقتوں کا سامنا کرنا پڑا:—

ایک طرف تو قدیم نظم و نثر
کا ڈھلا ڈھلایا طریقہ جو ظاہری
زیبائش رکھتا تھا اُن کی نظروں سے
چھپ گیا اور وہ اپنے مطالب کے لباس
کے بارہ میں زبردستی فقیر بن کر
رہ گئے او دوسری طرف افسوس ھے

به تسلسل طبیعی و عادی خود عود نمودند چه بسا افکار تازه و بدیع که از نارسائی الفاظ مستور ماندند! و چه بسا الفاظ زیبا که بعلت تزلزل معانی بی تاثیر شدند! ادبیات ایران یک خرمن کوبیده شبیه گشت که دانه ها را یک مرض بفاتی بیمغز کرده باشد بقسمیکه هر چند در ظاهر هیکل خرمن امید بخش و چشم پر کن باشد پس از باد دادن و جدا کردن کاه هیچ چیز مثبت و مفیدی بدست دهقان نمی رسد —

متجددین با تعجب و تاسف برین پیش آمد نگاه می کردند و با وسایلی که بی مطالعه بعمل گزاشته می شد بدا کارانه در تداوی این بیمار مبادرت میورزیدند از استعمال الفاظ اروپائی افراط کردند نه تنها ازین جهت که از الفاظ مناسب زبان خویش غفلت داشتند بلکه باین امید که در الفاظ اروپائی یک اثر فوق العاده موجود باشد انها می دیدند که همین الفاظ در آن قطعه دنیا آثاری عجیب

که اُن کے حسب مقصد مطالب بھی محض عاشقانہ آرزو سے حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ اُنہیں حاصل کرنے کے لئے کوشش۔ صبر اور بڑی عمر صرف کرنے کی ضرورت تھی اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں عامل جوانوں کے قبضہ میں بہت کم ہوتے ہیں —

جس یورپ نے جوانوں کو رجھا لیا تھا فقط ایک ایسا آئینہ تھا جو آفتاب علم کی شعاعوں کو مبہم اور خیرہ کن بنا کر اُن کی آنکھوں پر ڈالتا تھا اور حس نے تیز روشنی کا پردہ ڈال کر حقائق کو اُن کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا —

نوجوان نہ تو گزشتہ ادبیات کو قابل پیروی سمجھتے تھے اور نہ جیسا کہ چاہئے یورپ ہی سے معانی و علوم اخذ کر سکتے تھے۔ جب الفاظ کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور لکھنے والے کی مدد کے لئے نہ تو سجع ہی موجود ہوتا ہے اور نہ مطالب ہی اُس کی ہدایت کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کیا کچھہ میل اور آمیزش پیدا نہیں ہوتی

میکنند ولے معانی آنها در زبان فارسی بے رنگ و بے اثر می مانند پس همان الفاظ را عین بکار بردند تا از تاثیر ساحرانہ آنها ادبیات روحے بگیرد لیکن علاوہ بر ضررے کہ ورود لغات اجنبی بر زبان فارسی می رسانید مسلم شد کہ در لفظ بے سابقہ و بے رابط با تمامّ جملہ هیچ اثرے نہ ساحرانہ و نہ عادے موجود نیست و بنابر قول قدما بہ تحقیق رسید کہ : ع:

"هر چیزی بجاے خویش نیکوست"

---:0:---

ترجمہ شروع شد - ولے دریک دائرہ تنگے کہ ازحدود قصہ و ادبیات ابتدائی ملل اروپا تجاوز نمی کرد یعنی حدے کہ الفاظ عادی و رائج براے تعبیر و ترجمہ آن کفایت کند واحتیاج بہ لغات و اصلاحات عالیہ نیفتد —

این توجہ معتقدانہ باروپاے سطحی و اعراض از گزشتہ ادبے درایران هنوز دوام دارد فقط یکدستہ درین سالهاے اخیر آشنائی

پھر نہ تو یورپ سے مستعار لئے ہوئے فارسی مطالب اپنے مناسب الفاظ ہی پیدا کرتے تھے اور نہ الفاظ اپنے فطری اور بندھے ہوئے تسلسل کے ساتھ ذہن میں اُبھرتے تھے - کیسے کیسے تازہ خیالات محض الفاظ کی نا رسائی کی وجہ سے چھپے رہے ! اور کتنے ہی خوبصورت الفاظ مطالب کے تزلزل کے باعث بے تاثیر رہ گئے ! ایرانی ادبیات کی حالت اُس خرمن کی سی ہو گئی جس کے دانوں کو گھن لگ گیا ہو یعنی جو بظاہر تو خرمن کی صورت رکھتا ہے اور دیکھنے میں بھرا پرا معلوم ہوتا ہے لیکن پھٹکنے کے بعد سوائے بھوسے کے کوئی مفید اور کام کی چیز دہقان کے ہاتھ نہیں لگتی —

جدت پسندوں نے اس نئی اُفتاد کو تعجب اور افسوس کے ساتھ دیکھا اور اُن وسائل سے کام لیکر جن پر بغیر غور و خوض کے عمل کرلیا گیا تھا - تندہی کے ساتھ اس بیمار کے علاج کی کوشش کرنے لگے - اُنھوں نے یورپی الفاظ کو کثرت سے استعمال کرنا شروع کیا

پاروپا را بدرجه صمیمیت رسانیده وپیش ازسایرین باعماق آن فرو رفته ودرهمان وقت بگزشته ایران نظرے پرتنفر انداختند وسعی کرده اند حقایقی را که متجددین صدر مشروطیت از شدت حرارت تجدد خواهی نمی دیده اند کشف کرده آشنائی قطع شده را بازبان خود محکم سازند یعنی هم اروپا وهم ایران قدیم را با نظر صرافانه بنگرند از ظاهر زیبائے اروپا خیره نمی شدند و از صورت پرچین ادبیات ماضی مایوس ورمیده نگردند به بینند حقیقت امر کجاست؟ برتری دبی اروپا گزشته از تجمل درچیست ؟ و پستی ادب ایران غیراز پیری و غیر از لباس ژنده درجه ؟

این طبقه از متجددین کشف کردند که ادبیات ایران این قدرها محکوم و سزاوار منفوریت نیست۔ کتب قدیمه فراموش شده بها نشان می دهند که پیش از دورۂ لفاظی این چهارصد سال

اُس کی وجہ صرف یہی نہ تھی کہ وہ خود اپنی زبان کے مناسب الفاظ سے ناواقف تھے۔بلکہ اُنہیں یہ اُمید بھی تھی کہ یورپی الفاظ میں ضرور کوئی غیر معمولی اثر موجود ھوگا۔ وہ دیکھتے تھے کہ یہی الفاظ اُس قطعۂ دنیا (یورپ) میں عجیب اثر رکھتے ھیں لیکن فارسی زبان میں آکر اُن کے معنی میں وہ رنگ اور اثر باقی نہیں رھتا۔لہذا اُنہوں نے یہی الفاظ استعمال کرنے شروع کردئے تاکہ اُن کی ادبیات بھی اِن کے طلسمی اثر سے جی اُٹھے۔اِن اجنبی لغات کی درآمد سے فارسی زبان کو جوضرر پہونچا وہ ظاهر ہے۔لیکن ساتھ ھی اُن پر یہ حقیقت بھی آشکارا ھوگئی کہ انوکھے الفاظ میں جو پورے جملے کے ساتھ کوئی ربطہ نہ رکھتے ھوں کوئی طلسمی یا طبعی تاثیر نہیں پائی جاتی۔اب انہیں قدما کے اس قول کی صداقت معلوم ھوئی کہ : ع ھر چیزی بجاے خویش نیکوست—

—:o:—

گزشتگان ما نظم و نثر طبیعی موثرے
داشته اند که امروز نیز باوجود
فراموش شدن سبک جمله بندی
وطرز اداے معانی هرکسے که اندک
وقوفے براِدبیات قدیم بیابد
از خواندن آثار گزشتگان متاثر
شود —

این اشخاص فکرکردند که اثر
بخشی عمیق ترین خاصیت ادبیات
است وبرتری ادبیات مغرب زمین
از همین اثرے که در روح می کند
و از این نتیجه گرفته که یک رویه
مشترک میان قدماے ایران و اروپاے
این قرن موجود است و آن متابعت
از طبیعت و مطابقت با حقیقت است
هر گاه که یک روحے نظماً یا نثراً
سخن می گوید البته زبان او را روح
هاے دیگر می فهمند و متاثر می شوند
و بالعکس هر وقت زبانے بقوت لفاظی
و فریب ظاهر سازی بخواهد بیان
خود را کلام روح جلوه دهد ابداً در
ارواح شنوندگان و خوانندگان
اثرے نکرده و دروغش را فروغے

ترجمه شروع هوا لیکن اس کا
دائرہ بہت تنگ رها یه اقوام یورپ
کے افسانوں اور اُن کی ابتدائی
ادبیات کی حد سے آگے نه بڑھا-
یعنی اسی حد تک رها جهاں تک
که روز مرہ استعمال کے الفاظ تعبیر
و ترجمه کا ساتهه دیں اور اعلیٰ لغات
اور اصطلاحات کی ضرورت نه پڑے—
سطحی یورپ کی طرف یه عقیدت
مندانه توجه اور ادبیات قدیم کی
طرف سے بے اعتنائی ایران میں ابهی
تک باقی هے-صرف ایک گروہ ایسا
هوا هے جس نے اِس اخیر زمانے میں
یورپ سے واقفیت پورے طور پر
حاصل کرلی هے-یه لوگ دوسروں
کے مقابله میں ادبیات یورپ کی تهه
میں بہت زیادہ دور تک گئے هیں-
اس کے ساتهه هی ساتهه اُنهوں نے
ایران قدیم پر نفرت آمیز نظر
نهیں ڈالی هے-بلکه اُن حقائق کو
آشکارا کرنے کی کوشش کی هے جنهیں
درمیانی عهد مشروطه کے جدت پسند
اپنی جدت پسندی کے جوش میں دیکهه

نظراهنه بوده و باز یکبار دیگر قول پیشینیان را تصدیق کردند که : ع :

سخن کز دل برون آید نشیند لاجرم بردل " ۔

چون اروپا را بهتر شناخته بودند یافتند که در آنجا هم هر نویسنده صاحب نفوذ در روح خوانندہ نمی شود و معدودے ازو هستند که ترجمان کلام جانها هستند و میان جانها رابطۂ گفتگو واقع می کردند میان تفاوتے که تجدد خواهان اول دیدند ادبیات ما و خارجیان تشخیص

هی نہ سکے تھے اور اِس طرح سے اپنی زبان کے ساتھہ محبت کی جو رسم ٹوٹ گئی تھی اسے پھر استوار کیا ہے یہ یورپ اور ایران قدیم دونوں کو نقادانہ نظروں سے پرکھتے ھیں اور نہ تو اُس کی ظاهری زیبائش سے اُن کی آنکھیں خیرہ ھوتی ھیں اور نہ اِس کا جھریوں دار چہرہ دیکھہ کر اِس میں مایوسی اور وحشت پیدا ھوتی ھے یہ لوگ صرف یہ دیکھتے ھیں کہ حقیقت امر کہاں پائی جاتی ھے ؟ دھوم دھام سے قطع نظر کرکے یورپی ادبیات کی فوقیت کس چیز کی وجہ سے ھے ؟ اور پیری اور لباس کی کہنگی کو اگر خارج از بحث قرار دے لیا جائے تو ادبیات ایران کی پستی کی علت کیا رہ جاتی ھے ؟—

جدت پسندوں کے اس گروہ نے یہ بات دریافت کرلی کہ ایرانی ادبیات اس قدر محکوم اور لائق نفرت نہیں ھے-پرانی بھولی ھوئی کتابوں سے پتہ ملتا ھے کہ اس چہار صد سالہ دور لفاظی سے قبل ھمارے

دادہ اند کاملاً مخصوص بودہ
و مزایائی کہ از اروپا دیدہ و معایبے
کہ در ادبیات ایران تمیز دادہ اند
سطحی و در درجۂ سوم و چہارم است

——:o:——

پس یکبار دیگر بایران عزیز خود
توجہ کردند مانند غواصے کہ صیدگاہ
ترک شدہ خود را باز یابد در دریا
فرو رفتہ اروپا و ایران قدیم عمقاً
عرصۂ غواصی آنہا شد و وفق دادن
ادبیات این دو کشور منظور نظر
آنہا گشت—

——:o:——

قدما فطری اور موثر نظم و نثر پر حاوی تھے اور آج بھی اگرچہ جملوں کی لطیف بندش اور ادائے معانی کے طریقوں کو لوگ بھلا بیٹھے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر شخص جسے قدیم ادبیات سے تھوڑا بہت بھی مس ہو جاتا ہے آثار قدما کے مطالعہ سے ضرور متاثر ہوتا ہے—

ان لوگوں نے یہ سمجھہ لیا کہ کسی ادب کی انتہائی خاصیت یہ ہے کہ اُس میں اثر بخشی پائی جائے اور سرزمین مغرب کی ادبیات کی فوقیت کا سبب اس کا یہی اثر ہے جو روح پر پڑتا ہے۔ اس سے ان لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ قدمائے ایران اور دور حاضر کے یورپی لوگوں میں ضرور ایک نہ ایک روش مشترک موجود ہے اور وہ "پابندی فطرت اور مطابقت حقیقت" ہے۔ جب کبھی کسی روح کی آواز نظم یا نثر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے توضرور ہے کہ دوسری روحیں اُس آواز کو سمجھیں اور اُس سے متاثر ہوں۔ برخلاف اس کے جب زبان یہ چاہتی ہے

اکنون گلبهٔ کوز کورانه اروپا
واسطه کشف مزایاے ادبیات قدیم
ایران رو بضعف نهاده و بدون انکار
نضل گذشتگان در اتصاف برتری هاے
ادبی اروپا باحتیاط و نظر انتقاد
مداومت دارد —

———:o:———

باین طرز گمان می رود که ایران
قدیم هر روز روشن تر گشته و طرز
هاے فهمیده اروپا مالوس و موافق
تر با زبان ما شده بالاخره ادبیات
ایران در همین نزدیکی ها ترکیبے
ضمیم از ادبیات هر دو کشور شده

که لفاظی کی قوت اور دکھاوے کے
فریب سے اپنے بیان کو کلام روح بنا کر
پیش کرے تو اُس سے سامعین اور
ناظرین کی روحوں میں کبھی کوئی
اثر پیدا نہیں ہوتا اور اس کے دروغ
کو فروغ نہیں نصیب ہوتا۔اس طرح
سے دوبارہ پرانے لوگوں کے اس قول
کی تصدیق ہوئی کہ —
ع " سخن کز دل برون آید نشیند
لاجرم در دل "

چونکہ ان لوگوں نے یورپ کو
اچھی طرح سے جان لیا-تھا اس لئے
انہیں یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ وہاں
کے ہر مصنف کی دھاک پڑھنے والے
کی روح پر نہیں بیٹھتی اور صرف
چندھی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو
روحوں کی گفتگو کی ترجمانی کرسکتے
اور جانوں کے درمیان رشتۂ گفتگو
قایم کرسکتے ہیں-اب ان کو معلوم
ہوگیا کہ جدت پسندوں کے پہلے
گروہ نے ہماری اور خارجی ادبیات
میں جو کچھ فرق نکالا تھا وہ تمام تر

هم سوانح کهنه برداشته گردد و هم معانی جدید مستقر شود—

—:o:—

این تجدد اخیر بیشتر در نثر روی داده و نظم ایران با جزئی استثنای یا در حال قبل از مشروطیت یعنی تقلید صورت و معنی قدما باقی است یا در حالت تجدد ناقص اوایل مشروطیت که گسیختگی کامل از قدیم است در گردش و انقلاب است—

—:o:—

مصنوعی تھا اور جو حلاوتیں انھوں نے یورپ سے پائیں اور جو جو عیب ایرانی ادبیات میں نکالے وہ سب سطحی اور تیسرے اور چوتھے درجہ کے ہیں—

اب یہ لوگ دوبارہ اپنے محبوب ایران کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُس غواص کی طرح جو شکارگاہ کو چھوڑکر اپنے آپ کو پھر دریامیں غوطہ لگاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یورپ اور ایران قدیم کی گہرائیاں اُن کی غواصیوں کی جگہ بنیں اور اِن دونوں ممالک کی ادبیات میں مطابقت پیدا کرنا اُن کا مطمح نظر ہوگیا۔ اب چونکہ قدیم ایرانی ادبیات کی حلاوتیں بھی لوگوں کو معلوم ہوچکی ہیں اس لئے یورپ کی کورانہ تقلید میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ آج کل ادبیات یورپ کی برتری ثابت کرنے کے لئے قدماکی بزرگی سے انکار نہیں کیاجاتا اور تقلید احتیاط اور نقادانہ نظر کے ساتھ کی جاتی ہے—

ان باتوں سے ہم قیاس کرسکتے

لیکن مسلّم است که نظم نیز پرده‌ے راه نثر را پیش گرفته و از هر دو حال خارج شده رو بتکامل خواهد نهاد—

---o---

شعراے عالیقدرے درین راه ندیشه می کنند و کارهاے آنها تا درجهٔ قابل ملاحظه شده است نام بردن از انها و از نثر نویسانے که چه در ترجمه و چه در تالیفات خود تجدد را تعدیل کرده و زبان را قوام بخشیده اندازموجب ریا میشود بهترین گواه

هیں که قدیم ایران نت نئی رونق حاصل کرے گا یورپ کی پسندیده روش بھی هماری زبان سے زیاده مانوس اور اس کے مناسب حال هوتی جائے گی اور رفته رفته دونوں ممالک کی ادبیت کی آمیزش سے ادبیات ایران کی ترکیب صحیح طریقه پر هوسکے گی ادھر پرانی رکاوٹیں دور هوں گی اور ادھر جدید محاسن کا تعین هوگا—

یه آخری جدت زیاده‌تر نثر میں هوئی هے اور ایرانی نظم (مستثنیات سے قطع نظر) یا تو اب تک ویسی هی هے جیسی که مشروطه سے پہلے تھی یعنی قدماکی ظاهری اور معنوی پیروی هنوز باقی هے۔یاپھر آغاز مشروطه کے وقت جو ناقص حالت تکون تھی یعنی روش قدیم سے پوری طرح علیحدگی اُس میں پڑی هوئی هے۔مختصر یه که گردش وانقلاب میں هے۔لیکن یه امر یقینی هے که عنقریب نظم بھی نثر هی کی شاهراه پر پڑ جائے گی اور (افراط وتفریط دونوں حالتوں سے علیحده

آثار آنہاست کہ بر ہیچ جویندہ اے

پوشیدہ نمی ماند—

———:o———

ہو کر کمال کو پہونچے گی۔شعرائے عالیقدر اسی فکر میں ہیں اور اُن کے کارنامے بہت کچھہ قابل ملاحظہ ہیں۔ اُن کو اور اُن نثرنویسوں کو جنھوں نے خواہ ترجمہ میں ہو یا ذاتی تالیفات میں جدت پسندی کے رجحان کو معتدل بنایا اور ہماری زبان میں چاشنی پیدا کی نام بنام بتلانا ریا پر محمول کیا جائے گا۔اُن کے بہترین گواہ خود اُن کے آثار ہیں جو کسی ڈھونڈنے والے کی نگاہوں سے چھپے نہیں رہ سکتے—

———:o:———

خطبات گارساں دتاسی

(بقیہ خطبہ پنجم)

علاوہ ان فسانوں کے جو منظوم ہیں اور جو عام قصوں پر مبنی ہیں اور بہت سے فسانے ہیں جن کے ہیرو اور ہیروئن چنداں مشہور نہیں۔ ہندوستانی زبان میں ان کی ایک بڑی تعداد ہے اور ان میں اکثر مشہور ہیں۔ یہاں میں چند فسانوں کے تذکرے پر اکتفا کرتا ہوں مثلاً قصہ بلند اختر جو میر نے بیان کیا ہے قصۂ رضواں شاہ جس کے میں نے دو اڈیشن دیکھے ہیں قصۂ چندر بدن اور مہیار جن کے متعدد اڈیشن ہیں قصۂ دلربا و دلارام جو موتی رام کی تالیف ہے قصۂ ماہ سیماب اور پری رخ جس پر وجہی نے ایک مثنوی لکھی ہے۔ فسانۂ عجائب جو سرور کانپوری کی تصنیف ہے اور جسے چہار درویش کے برابر شہرت حاصل ہوئی ہے —

میں ایسے قصے گنانے سے بدمزگی پیدا کرنا نہیں چاہتا میں نے اُن میں سے اکثر فسانوں کا ترجمہ اور خلاصہ کیا ہے جن کے دیکھنے سے ان کے طرز بیان اور ترتیب کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر ان قصوں کی ابتدا ہیرو یا ہیروئن کی جسمانی یا اخلاقی تعریف سے ہوتی ہے اس کے بعد ان کی پیچیدہ اور عجیب و غریب سرگزشت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس سے دونوں کے وصال میں موانعات پیدا ہوتے ہیں آخر میں عاشق و معشوق کی ثابت قدمی اور وفا کا تذکرہ ہوتا ہے جس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ بعض

اوقات مگر بہت کم ان افسانوں کا اختتام ناکامی اور فراق دائمی پر ہوتا ہے۔ میر کی مثنوی "دریاے عشق" مجروح کی "اعجاز عشق" اور راخی کی "مہر و ماہ" کا یہی حال ہے—

ہندوستانی ادب و شاعری کی ایک اور شاخ ہے جس میں اُن مناظر فطرت کی تصویر کھینچی جاتی ہے جن کا تعلق سال کے موسموں اور مہینوں کی خصوصیات سے ہوتا ہے-یہ نظمیں بارہ ماسے کہلاتی ہیں ان میں موسموں کی حالت کے بیان کے سوا اور کچھہ بھی نہیں پایا جاتا بعض اوقات اُن کا انداز بالکل ناٹک کا سا ہو جاتا ہے مثلاً یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ایک عورت کا شوہر سال بھر سے کسی دور دراز مقام پر ہے جس کے فراق میں یہ بیتاب ہے-اس ہجراں نصیب عورت کے شکووں کے ساتھہ ساتھہ نظم میں مناظر فطرت کی تبدیلیوں کا بیان بھی ہوتا ہے اسی کے ساتھہ خود کلامی کا دلفریب نمونہ بھی نظر آتا ہے پھر یہ عورت کسی طائر کو اپنا قاصد بنا کر شوہر کے پاس بھیجتی ہے یہ طائر اکثر وہ ہوتا ہے جس کے نغمے خاص طور پر مقبول خاص و عام ہیں (مثلاً کوئل-پپیہا-بلبل-شامہ-دوا) (ملاحظہ ہو ایشیاٹک جرنل سنہ ۱۸۵۰ ع جس میں میں نے ہندوستانی مکالموں کی تشریح کی ہے)—

اس مضمون کو متعدد شعرا نے بالتفصیل باندھا ہے اور ان میں مناظر فطرت کے علاوہ ہندؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی تہواروں کے تذکرے بھی آجاتے ہیں-اس قسم کی متعدد نظمیں ہیں جن میں سے اکثر کا ذکر میں نے اس سے پہلے کیا ہے—

بعض نظمیں بالکل نرالی ہیں جیسے "پھول چرتر" جس میں ہندوستان کے پھولوں کا ذکر ہے-اسلامی ادب میں ایک خاص قسم کی تصنیف ہوتی ہے جس میں متعدد افسانے مل جاتے ہیں یہ ہمارے ملک کے افسانوں سے بالکل جدا ہے-یہ متعدد افسانے ایک سلسلہ میں مربوط ہوتے ہیں جن میں وحدت

مضمون کی رعایت ہوتی ہے ایسے افسانوں کا نتیجہ کبھی اخلاقی کبھی فلسفیانہ اور کبھی مذہبی ہوتا ہے۔ اس قسم کی چند مشہور تصانیف "کشف الاسرار" منطق الطیر اور اخوان الصفا ہیں۔ ایسی اور بھی تصنیفیں ہیں جو کافی طور پر مشہور ہو چکی ہیں۔ اخوان الصفا ہندوستان میں اکرام علی کے عمدہ ترجمہ کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی ہے اس میں یکے بعد دیگرے کئی جانور آتے ہیں اور اپنے کمالات اور خوبیوں کا اظہار کرتے ہیں اور انسان سے دعوی ہمسری کرتے پائے جاتے ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے کہ جانوروں کے کردار میں خداوند عالم نے بہت سی ایسی باتیں رکھی ہیں جو ہمارے لئے قابل تقلید ہیں۔ اسی لئے انگریزی افسانہ نگار "گے" لکھتا ہے—

"شہد کی مکھی کی دائمی جد و جہد میری روح کو جگا دیتی ہے اور درس مشقت دیتی ہے۔ کون ہے جو دور اندیش چیونٹی کو دیکھکر مایحتاج کی فراہمی کا سبق نہ سیکھے گا۔ میرا کتا جو وفاداری میں تمام جانوروں سے ممتاز ہے مجھ میں وفا و عقیدت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ فاختہ سے مجھے مستقل مزاجی اور اہل خانہ سے سچی محبت کرنے کا سبق ملتا ہے اور آزاد پرواز والے پرندے مجھے پدرانہ فرائض کی تلقین کرتے ہیں"—

اس قسم کی تصانیف میں قصے کا حاصل یعنے اخلاقی سبق ضرور ہوتا ہے۔ اس صنف کی سب سے مشہور کتاب "پنچ تنترا" ہے یعنی پانچ باب۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے جس کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں ہوا اس کتاب کے اکثر قصے یورپ کی مختلف زبانوں میں مختلف صورتوں میں آگئے ہیں چنانچہ ہمارے یہاں کے مشہور مصنف لافونیٹی کی بدولت اس کا سب سے زیادہ مشہور افسانہ ہمارے ملک میں شہرت پا چکا ہے—

اہل ہند کو ناٹک کا اب بھی ویسا ہی شوق ہے جیسا اُن کے اسلاف کو تھا لیکن اس کا اہتمام خاص خاص مواقع پر ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں

کلکتہ کے ایک متمول مسلمان گھرانے میں یوسف زلیخا کا ناٹک ہوا تھا ایسے ناٹک کے کھیل اکثر مذہبی ہوتے ہیں اور عشرہ محرم میں ماتم حسین علیہ السلام کی سالانہ یادگار میں کئے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ ہیں جن میں آنحضرت صلعم کی وفات یا شہادت امام حسن علیہ السلام اور خاصکر شہادت امام حسین علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے* امام حسین کے سانحات اور ان کے مصائب ان ڈراموں کا خاص مضمون ہے۔اب رہے ہندو سو وہ خوشی کے تہوار مثلاً ہولی کے موقع پر اس قسم کے ناٹک کرتے ہیں۔ان ناٹکوں کو سوانگ کہتے ہیں بعض اوقات یہ بعینہ اُسی طرح فی البدیہہ موزوں کئے جاتے ہیں جس طرح ہم لوگ خانگی جلسوں میں دل بہلانے کے لئے چھوٹے چھوٹے افسانے گھڑ لیتے ہیں مگر ان ہندو ناٹکوں کی زبان شستہ اور مہذب نہیں ہوتی۔بایں ہمہ ان میں بھی بعض وقت وہی مضامین ہوتے ہیں جو سنسکرت کے ڈراموں میں پائے جاتے ہیں چنانچہ راگ ساگر "ہنومان ناٹک" کی مثال پیش کرتا ہے جو سنسکرت ڈراما سے لیا گیا ہے اور ولسن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے—

اس سے پہلے میں ذکر کرچکا ہوں کہ مشرق کے مسلمانوں میں ایک خاص شعبۂ تصنیف ہے جسے تذکرہ کہتے ہیں۔ایک دوسرا شعبہ انشا ہے جسے میں نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔انشا کے لغوی معنی ایجاد کرنے کے ہیں۔اس سے رقعات کی کتاب مراد ہے یا بالفاظ دیگر کسی مصنف کے قابل تقلید خطوں کا مجموعہ۔انشا خط نویسی میں عبارت آرائی سکھاتی ہے۔ہندوستان میں انشا کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔انشاے فیض (فیض نے پند نامۂ عطار کا ترجمہ بھی کیا ہے جو سنہ ۱۸۵۰ء میں بمقام کانپور طبع ہوا) انشاے خالق (کرامت اللہ)

---

* ہندوستان میں ایسا نہیں ہوتا شاید ایران میں محرم کے زمانے میں اس قسم کے ڈرامے ہوتے ہیں۔مترجم—

انشاے نظام الدین ساکن پونہ یہ زمانۂ حال کے مصنف ہیں اور انہوں نے حکایات لقمان کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ چرونجی لعل کی انشا بھی اسی زمانہ کی ہے اور یہ آگرہ میں بہ عنوان انشاے اُردو طبع ہوئی ہے۔ انشاے یوسف دکن یہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دکن کے مصنف ہیں۔ میں سب سے آخر میں انشاے ہرکرن کا ذکر کرتا ہوں جس نے فارسی زبان میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کا ترجمہ بھی ہندوستانی زبان میں ہوا ہے—

ہندوستانی زبان میں السنیات پر بہت سی کتابیں ملتی ہیں جو ایشیائی زبانوں کے سیکھنے والوں کے لئے بے حد مفید ہیں۔ میں صرف چند کے تذکرہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ مثلاً سنسکرت کی صرف و نحو کے متعلق ہندوستان میں ایک کتاب لکھی گئی ہے جس کا نام مفتاح اللغت ہے۔ سنسکرت کی صرف و نحو مولفۂ لٹھوکومادی کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے جو بنارس میں سنہ ۱۸۴۵ ع میں طبع ہوا صدرالافاضل فارسی زبان کی صرف و نحو ہے جو مظہرالدین نے لکھی۔ میزان فارسی یہ بھی اُردو میں ہے۔ مظہرالنحو عربی زبان کی نحو ہے اور اُردو میں لکھی گئی ہے۔ اُردو زبان کی ایک لغت جس میں شعرا کے کلام کے اسناد ہیں۔ لغت السعید بھی اُردو زبان کی لغت ہے۔ ایک اور اُردو لغت جو سنہ ۱۸۵۱ ع میں آگرہ میں طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ اُردو صرف و نحو پر کئی کتابیں ہیں جن میں سے ایک صہبائی کی ہے انہوں نے علم اللسان پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ”بھاشا پنگل“ جو بھاکا عروض پر ہے اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں—

آخر میں انگریزی صرف و نحو کی کتابوں کا ذکر کروں کا جو رام کرشن اور دیگر مصنفین نے ہندوستانی میں لکھی ہیں۔ تاریخ جس کا وجود سنسکرت میں صرف افسانوں کی صورت میں ہے ہندوستان کے موجودہ ادب میں ہر جگہہ نمایاں ہے۔ مگر اُس کی حیثیت معمولی ہے حالانکہ نظموں میں تاریخی واقعات کا تذکرہ کثرت سے کیا گیا ہے جن میں سے بیش قیمت معلومات

بہم پہنچاتے ہیں جو دوسری جگہ کمیاب ہیں—

میں نے ابھی تاریخی نظموں کے سلسلہ میں چند اور دوسروں کا نام لیا ہے۔چند کو راجپوتانہ کا ہومر اور تھوسیڈ ائڈیس کہا جاسکتا ہے۔تاریخی نظمیں بہت سی ہیں مثلاً لال کوی کی چرتر پرکاش جوچھتر شال راجہ بندھیلکھنڈ کی تاریخ ہے اور گوپاچک کتھا یا تاریخ گوالیار۔ایسی اور متعدد نظمیں ہیں مثلاً راجہ ویلاس جو رانہ راج سنگھہ راجہ میواڑ اور مشہور اورنگ زیب کے شاعر مان کبیشر نے لکھی۔ٹاڈ صاحب نے اپنی تاریخ راجستان میں اس سے بہت مدد لی ہے۔ھمیرراس جو ھمیر راجہ چتوڑ کی تاریخ ہے۔ہری چندر لیلا (تاریخ راجہ ہری چندر) سورج پرکاش (تاریخ خاندان سورج بنسی) کرن کی تصنیف ہے جو عمدہ شاعر اور بہادر سپاہی تھا۔یہ نظم در حقیقت ابھے سنگھہ راجہ میواڑ کی تاریخ ہے جس نے سنہ ۱۷۲۴ ع سے سنہ ۱۷۲۵ ع تک حکومت کی مگر کتاب میں بطور مقدمہ کے راٹھوروں کی عام تاریخ سے بحث کی گئی ہے جو سورج بنسی سے تعلق رکھتے ہیں۔دوسری نظم گرب چنتا منی یہ بھاشامیں ہے اور اس میں گجرات کے مشہور راجہ کرن کے حالات ہیں جس کو سلطان علاءالدین محمد شاہ سکندر ثانی نے دسویں صدی کے آخر میں شکست دی اور ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ایسی ہی ایک نظم راج پٹن (تاریخ میواڑ) رنچھوڑ بھٹ کی لکھی ہوئی ہے۔ایک اور نظم رشا بھاچرتر (ایک مشہور جینی بزرگ کی تاریخ) ہے ونس کلی یعنے شجرۂ خاندان بھوت کی تصنیف ہے۔ جے سنگھہ نے ایک تاریخی رسالہ بھی لکھا ہے جو کالپادروما کے نام سے مشہور ہے ہندوستانی زبان میں جتنی تاریخی نظمیں ہیں سب کی سب ہندوستانیوں کی ہیں انہوں نے اسلامی مضامین پر بھی خامہ فرسائی کی ہے—

مثلاً ہری ناتھہ کی لکھی ہوئی تاریخ محمد شاہ جس کا نام پوتھی

محمد شاہ ہے اس قسم کی جو کتاب اُردو میں ہے وہ یا تو ترجمہ ہے یا تالیف۔ البتہ چند رسالے ایسے ہیں جو خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور اُن سے الگ ہیں—

ان کے علاوہ میں اب اُن دلچسپ تاریخی کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو دہلی اور آگرہ پر لکھی گئیں۔ مثلاً آثار الصنادید اور تاریخ آگرہ وغیرہ۔کلکتہ نامہ بھی اسی طرز کی تصنیف ہے فرق صرف اتنا ہے کہ یہ منظوم ہے۔علی نامہ علی عادل شاہ کی سوانح حیات) واقعات کو رکھا جو نیپال کا صوبہ ہے جہاں کے راجہ نے اپنی سلطنت سارے نیپال میں پھیلا رکھی تھی۔ایک نظم تباہی سومنات پر ہے۔ایک تاریخ نور محمد کی ہے جس میں بنگال کے قیام فرنگ کے تذکرے ہیں۔اسی طرح دھرم نرائن کی تاریخ سندھیا ہے۔ان کے علاوہ ہندوستانی زبان میں تیمور۔بابر۔اکبر۔جہانگیر کے دلچسپ حالات ہیں جو یا تو فارسی سے ترجمہ کئے گئے ہیں یا اُس کے اتباع میں لکھے گئے ہیں مثلاً پتمبر سنگھ موہن لعل اور علی حزیں کے تذکرے—

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اہل مشرق میں تاریخ کا اتنا لحاظ نہیں رکھا جاتا جتنا کہ ہم میں ہے۔یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال کے ایک ہندوستانی مورخ نے اپنی کتاب کی سرخی کے لئے حافظ کا یہ شعر منتخب کیا ہے—

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نہ کشاید بہ حکمت این معمہ را

سفر ناموں کے سلسلے میں یوسف خاں لکھنوی کا سفر فرانس و انگلستان (سنہ ۱۸۳۸ ع) کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو دہلی میں شائع ہوا۔کریم خاں دہلوی کا سفرنامۂ لندن بھی قابل ذکر ہے۔صاحب موصوف نے سنہ ۱۸۴۰ ع میں لندن کا سفر کیا تھا۔اس کا ترجمہ میں نے اورینٹل ریویو میں شائع کیا ہے۔ ان میں سے قبل الذکر صاحب پٹھان قوم کے صوفی منش آدمی تھے۔ان کا عرف

کمل پوش ہے کیوں کہ یہ ہمیشہ کمل اوڑھے رہتے تھے—

مجھے ہندوستانی زبان کا تبصرہ ہندؤں اور مسلمانوں کے مذہبی فلسفہ سے شروع کرنا چاہئیے تھا کیوں کہ اِس موضوع پر بہت سی دلچسپ کتابیں موجود ہیں۔اہل ہنود کے فلسفۂ مذہب پر کبیر پنتھیوں سکھوں اور جینیوں کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔اِن میں غیر معمولی بات یہ ہے کہ اکثر کتابیں شیوائیوں کی ہیں مثلاً مہادیو ھرتر (تاریخ شیوجی) شیو لیلا مری تم (شیو جی کے لیلا کی خوشبو) گورا منگل (شیوجی اور پاربتی) کی شادی وغیرہ—

مسلمانوں کے فلسفۂ مذہب یعنے دینیات کے متعلق ہندوستانی زبان میں یا تو اسلامی مذہب یا عبادات پر کتابیں لکھی گئی ہیں یا ایسی کتابیں جن سے اُن کے اعتقادات کا سیاسی ارتقا ظاہر ہوتا ہے۔حضرت محمد صلعم۔ حضرت فاطمہ و امام حسن و حسین کے تذکرے ہیں۔نیز حضرت مسیح اور بی بی مریم کا ذکر بھی مسلمانوں نے اسی احترام و عقیدت سے کیا ہے حالانکہ وہ ہمارے مسئلہ تثلیث کے قائل نہیں—

ہندوستان میں شیعوں کی تعداد کافی ہے۔مگر دینیات پر ہندوستانی زبان میں زیادہ تصانیف سنیوں ہی کی ہیں۔کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو شیعوں کی وجہ سے وجود میں آئیں لیکن اسلامی دینیات میں سب سے زیادہ عجیب وہ کتابیں ہیں جو سید احمد کے فرقے (ہندی وہابیوں) اور روشنائی فرقے سے تعلق رکھتی ہیں یاجو اِن کتابوں کی تردید میں لکھی گئیں —

سیاست اور فقہ ہندوں میں بھی اسی طرح ملے جلے ہیں جس طرح مسلمانوں میں۔دیوانی قانون تو بالکل شریعت میں داخل ہے۔اس صنف کی چند عمدہ کتابیں ہندوستانی زبان میں ہیں مگر وہ سب ترجمے ہیں—

سائنس اور فنون پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں۔ایسی کتابیں زمانۂ حال

کی پیداوار ہیں اور انگریزی تصانیف کے ترجمے یا تقلید پر مبنی ہیں مگر یہ ترجمے ان باشندوں کے لئے بہت مفید ہیں جن کے لئے یہ لکھے گئے ہیں۔یہ ترجمے مختلف نوع کے ہیں جن سے ہندوستانیوں کو علوم کے مختلف شعبوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ان میں سے چند ایسے بھی ہیں جو زمانۂ حال کی بالکل تازہ تحقیقات سے بحث کرتے ہیں—

ان کتابوں میں جو ایسے مضامین پر لکھی گئی ہیں جن کا ذکر فقرۂ بالا میں کیا گیا ہے چند حقیقی تصنیف بھی ہیں بعض فن تعمیرات اور سنگ تراشی پر ہیں۔بعض میں درختوں اور جڑی بوٹیوں کے طبی خواص سے بحث کی گئی ہے جن سے مشرقی فن طب میں علاج کیا جاتا ہے۔علاوہ دوسری بوٹیوں کے چوب چینی کے خواص کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔چند کتابیں ایسی ہیں جن میں باز اور بھریوں کو شکار کے لئے تیار کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔یہ ان تصانیف سے بہت مشابہ ہیں جن سے دی ہیمر مرحوم نے ہم کو روشناس کرایا۔کچھ کتابیں مویشیوں کے علاج۔موتیوں کے اوزان اور قیمت۔شطرنج کے کھیل۔خواب کی تعبیروں اور فن طباخی پر ہیں—

ہندی ادب کی سب سے زیادہ اہم شاخ وہ ہے جس میں دیگر مشرقی زبانوں سے ترجمے کئے گئے ہیں۔ان ترجموں سے سنسکرت۔عربی۔فارسی جیسی قدیم زبانوں کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔کیونکہ اس میں اصلی تصانیف کے لطف کو برقرار رکھا گیا ہے۔جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ترجمے بھی اُسی ماحول۔مناظر اور رسم و رواج میں ہوتے ہیں جن میں اصل کتابیں لکھی گئی تھیں۔میں پہلے ان کا تذکرہ کرچکا ہوں اور اعادہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔مجھے ہندوستانی زبان میں ویدوں کے کسی ترجمے کا علم نہیں مگر ابھی ابھی ایک ترجمہ کا اعلان کیا گیا ہے جو ہندؤں کی مقدس کتابوں کے ایک طویل سلسلہ کا پہلا حصہ ہوگا۔ کلام مجید (قرآن) کے بہت سے ترجمے ہیں جن میں تصحیح کا بہت لحاظ رکھا گیا

ہے۔سید احمد نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ترجموں میں اکثر حاشیے اور تفسیر بھی دی گئی ہے ایک ترجمہ دھلی میں شائع ہوا تھا جس میں زیادہ رواداری پائی جاتی ہے کیونکہ اس میں سنیوں کے نقطۂ نظر سے بھی مطالب بیان کئے گئے ہیں اور شیعوں کے اعتقادات کے مطابق شرح بھی کی گئی ہے۔عشرت نامی ایک صاحب نے قرآن کی منظوم شرح لکھی ہے۔میں اس سلسلے میں یہ بھی بتانا چاھتا ہوں کہ ھندوستان کے لوگ ایرانیوں کے مثل اور ترکوں کے برخلاف اپنی مذھبی کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کو معیوب نہیں خیال کرتے اور ھندوستانی عورتیں جمعہ کے دن اسی طرح تلاوت قرآن کرتی ھیں جیسے کہ انگریزی عورتیں اتوار کے دن انجیل پڑھتی ھیں۔ھندوستانی عورتیں عام طور پر ترکی عورتوں سے زیادہ تعلیم یافتہ ھوتی ھیں جو سب سے زیادہ اپنے حسن کی وجہ سے مشہور ھیں—

سنسکرت کتابوں کے ترجموں میں سے میں "مہابھارت" "ھیتوپدیس ترک سلگرھا" کو پیش کرتا ھوں۔آخرالذکر کتاب ھندوستانی فلسفہ پر سنسکرت زبان میں اونم بھٹر نے لکھی ہے یہ کتاب بنارس میں ۱۸۵۲ع میں شائع ھوئی اور یہ ایک ھندیات کے محقق بیلنٹائن نامی کی کوششوں کا نتیجہ تھا جو میرے ایک دوست کپتان جے میچل کا بھتیجا (بھانجا) ھوتا ہے اس جلد میں اصل سنسکرت عبارت بھی ہے اور ھندی اور انگریزی ترجمہ بھی ہے۔ ڈرامے بھی لکھے گئے ھیں یعنی وہ خاص ڈرامے جن کا ترجمہ ولسن نے سنہ ۱۸۴۵ع میں دھلی میں کیا۔دوسرا ڈراما ماھمنا سٹوٹرا ہے۔جس کو سمر سنگھ نے سنسکرت سے ترجمہ کیا حالانکہ یہ تصنیف شیوائی ہے—

سنہ ۱۸۴۵ع میں دھلی میں رگھوبنس کے ترجمہ کا انتظام ھو رھا تھا جو کالیداس کی تصنیف بتائی جاتی ہے اور جس میں رگھو خاندان کے حالات

ہیں-ادھیاتما کی رامائن کا ترجمہ اور دوسرے تراجم بھی سنسکرت سے کئے جارہے تھے۔مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام پورا بھی ہوا یا نہیں۔دوسرے تراجم کا ذکر میں نے اپنے افتتاحی خطبے میں کیا ہے—

سنسکرت کے سلسلہ میں مجھے دوسری زبانوں مثلاً تلنگی۔بنگالی۔مرہٹی کے تراجم کا بھی ذکر کرنا چاہئے۔مرہٹی زبان میں دوسری کتابوں کے علاوہ ایک مشہور کتاب ستیانروپن (صداقت) ہے۔عربی ترجمہ کی خاص کتابیں کریم الدین کا ترجمہ تاریخ ابوالفدا سبحان بخش کا ترجمہ ابن خلکان۔اخوان الصفا کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔حدیث میں ایک مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف ہے۔فقہ میں ایک اور مشہور کتاب آداب القاضی ہے۔جو شہرت میں قدوری کی برابر ہے جس کا خلاصہ اُردو میں ہوا ہے—

دہلی میں چند صاحبوں نے مقامات حریری کے ترجمہ کا ارادہ کیا مگر ان لوگوں کو اُنہیں وجوہ کی بنا پر اس کام سے دستبردار ہونا پڑا جن کے باعث میں اس کتاب کے فرانسیسی ترجمہ کرنے سے باز رہا۔وجہ یہ ہے کہ ترجمہ میں ان صنائع کا برقرار رکھنا ناممکن ہے جو اس کتاب کی خاص خوبی خیال کی جاتی ہے—

ادب عربی کی مشہور کتاب "الف لیلہ" کا ترجمہ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں نے بھی کیا ہے۔مسلمانوں میں میں حسن علی خان کشمیری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ایک ہم عصر مصنف ہیں اور جو دہلی کالج کے پروفیسر تھے۔انہوں نے بہت سے ترجمے کئے ہیں۔دوسرے صاحب شمس الدین احمد ہیں جنہوں نے مدراس میں (۲۰۰ قصوں) کا ترجمہ شائع کیا۔یہ ترجمے کلکتہ والے ایڈیشن کا ہے جو لیتھو میں چھپا ہے اور Habicht اور Heicher کے اڈیشن سے مختلف ہے۔زمرۂ ہنود میں دیا شنکر نسیم ہیں جن کے ترجمے لکھنؤ میں سنہ ۱۲۴۴ ہجری مطابق سنہ ۱۸۲۸ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئے۔حال میں

۵۰ قصوں کے ترجمے دھلی میں شائع ھوئے ھیں نیز ایک انتخاب کتاب کی صورت میں چھپا ھے۔ علاوہ اس کے غنیم پسر تاجر کا بھی ایک قصہ شائع ھو چکا ھے۔

انجمن اشاعت علوم مفیدہ نے جس کا مقصد یہ ھے کہ ملکی زبانوں کے ذریعے سے ھندوستان کے باشندوں میں مفید علوم کی اشاعت کرے ابوالفدا کے جغرافیہ کا ایک ترجمہ شائع کیا ھے۔ اس انجمن نے رشیدالدین کی تاریخ مغلیہ کی۔ ابن خلدون کی تاریخ بربری اور دوسری مشہور کتابوں کی اشاعت کا اعلان کیا تھا مگر میرا خیال ھے کہ یہ ترجمے تکمیل کو نہیں پہنچے۔

فارسی زبان سے بہت سے ترجمے کئے گئے ھیں۔ میں چند مشہور فارسی کتابوں کا نام بتا سکتا ھوں مثلاً گلستاں جس کے متعدد ترجمے کئی کئی بار چھپے۔ بوستان سعدی جس کا ترجمہ مغل نے کیا۔ اس ترجمے نے بعض مبہم عبارتوں کے معانی کو صاف کردیا ھے۔ مشہور رزمیہ نظم شاھنامہ جس کا ترجمہ منشی نے خسروان عجم کے نام سے نظم میں کیا۔ محمد علی ترمذی اور سرور نے اس کے ترجمے سرور سلطانی کے عنوان سے نثر میں کئے ھیں۔ قصہ سہراب کا ترجمہ خاص طور پر قزیلی نے کیا ھے۔ اس کے علاوہ جلال الدین رومی کی مشہور کتاب مثنوی شریف کے متعدد ترجمے ھوئے ھیں۔ اس کا مکمل ترجمہ نشاط نے کیا اور کریم الدین نے اس کا ذکر کیا ھے۔ مثنوی کے انتخاب کا ترجمہ شاہ مستاں نے کیا جو کلکتہ میں سنہ ۱۸۴۵ ع میں طبع ھوا۔ یہ دونوں ترجمے نظم میں ھیں۔ ان کے علاوہ دوست نے پند نامہ عطار و پند نامہ سعدی۔ منطق الطیر۔ حسن و عشق۔ اظہار دانش کے ترجمے کئے۔ شرافت نے بہار دانش اور محمد اعظم کی تاریخ کشمیر کے ترجمے کئے۔ تاریخ کشمیر کے متعدد ایڈیشن شائع ھو چکے ھیں آخر میں میں تاریخ طبری کے ترجمہ کا ذکر کرنا چاھتا ھوں جو جعفر شاہ نے کیا۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت سی کتابیں ھیں۔

چند ھندوستانی تصانیف کے ترجمے بھی دوسری مشرقی زبانوں میں

ہوئے ہیں مثلاً ہماری زبان کی کتاب ست سائی کا ترجمہ سنسکرت میں "باغ و بہار" کا ارسلی میں-راگ درشن اور دوسری اردو کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا جسے مشرق کی لاطینی زبان کہنا چاہئے-مثلاً قصہ دھرم سنگھہ-افسانہ سورج پور جو اخلاقی افسانے ہیں-پہلی کتاب کا نام فارسی میں قصہ صادق اور دوسری کا شمس آباد ہے-ہندوستان میں مشرقی زبانوں کے ساتھہ انگریزی سے بھی ترجمے ہوئے ہیں جس کو نئے حکمرانوں کا ادبی خراج سمجھنا چاہئے-فرانسیسی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے ہیں-مثلاً عیسائی (کیتھالک) پادریوں کی کوشش سے فلوری کی "هستارکل کیٹیچزم" اور ہمارے مشہور مشرقی "دی ساسی" کی عربی قواعد کا ترجمہ دھلی میں تیار کیا جا رہا ہے-اسی طرح رالن کی مختصر تاریخ قدیم کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔ مگر ہندوستان میں فرانسیسی کتابوں کے ترجمے زیادہ تر انگریزی کی وساطت سے ہوئے ہیں-یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے ملک کے "ایلی دی بیوما" جیسے لائق مصنفین کو خبر بھی نہیں کہ ان کی تصانیف کا مطالعہ ہندوستانی کے ذریعہ سے آگرہ اور دھلی میں ہوتا ہے اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ سید احمد نے اپنی کتاب "تفسیر انجیل" میں عبرانی زبان سے انجیل کے ترجمے کا ارادہ کیا ہے —

یہ ترجمے جو ہندوستانیوں کو ہمارے علوم و فنون اور قدیم و جدید تاریخ مثلاً تاریخ یونان و روما سے روشناس کرانے کے لئے کئے جاتے ہیں یقیناً بہت مفید ہیں ان کی اہمیت اور بڑہ جاتی ہے جب دیکھا جاتا ہے کہ ترجموں میں رسیلاس-تزلماش-ویکار آت ویک فیلڈ-رابنسن کروسو-سفر نامہ بنیان۔ اکانامی آت ہیومین لائف جیسی اعلی ادبی تصانیف بھی شامل ہیں-ان تصانیف میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طور پر عیسائی مذہب کی تعلیم دیتی ہیں-یہ مذہب ایسا روح پرور درخت ہے کہ جس کی شاخیں

یہودا سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گئی ھیں۔عیسائی کتب کے ترجموں میں چند ایسی ھیں جو نہایت سلیس انداز میں ھمارے اصولوں کی تشریح کرتی ھیں یا ھماری مقدس کتابوں کو مختلف شکلوں میں پیش کرتی ھیں۔ بعض مسلمانوں کی دلائل کی تردید ․یں ھیں کیوں کہ مسلمانوں کا تعصب عیسائیت کے خلاف بہت سخت ھے—

مذھبی کتب کے ترجموں میں سب سے زیادہ دلچسپ امریکن پرسباتیرین پادریوں کا شایع کردہ ترجمۂ قرآن ھے جو سنہ ۱۸۴۴ ع میں بقام دھلی شایع ھوا۔اس کے ابتدا میں ایک مقدمہ ھے جس میں مسلمانوں کی غلطیوں پر بحث کی گئی ھے اور عیسائی مذھب کے مخالف اعتراضات کا جواب دیا گیا ھے متن قرآن کے معانی آیات قرآنی کی تفسیر بھی درج ھے—

ھندوستان میں اس قسم کا کام اول اول پروتسٹنٹ مشنری بنجمن شلز نے شروع کیا۔اسی مشنری نے بمقام ھیلی سنہ ۱۷۴۴ ع میں اس قسم کی کتاب قرآن پاک کے متعلق شایع کی تھی۔مذھبی ترجموں میں اینگلیکن لٹرجی کا ترجمہ اس واسطے کیا گیا کہ ھندوستانی اس کا مطالعہ کر سکیں۔ایک دوسری غایت اس کی یہ بھی تھی کہ کلکتہ اور دوسرے شہروں کے گرجاؤں میں جو دیسی عیسائیوں کے لئے قائم کئے گئے ھیں اینگلیکن لٹرجی کے مطابق ھندوستانی زبان میں اسی طرح عبادت کی جائے جس طرح لندن اور بیت المقدس میں یہودیوں کی آسانی کی غرض سے عبرانی زبان میں ھوتی ھے۔مذھبی گیتوں کے ترجمے بھی انگریزی بحروں کے مطابق ھندوستانی میں کئے گئے ھیں اور وہ گیت سینٹ پال اور وسٹ منسٹر کے گرجاؤں کی طرح ھندوستانی میں بھی گائے جاتے ھیں بعینہ جیسے پیرس کے پروتستانت فرقہ والوں نے فرانسیسی الفاظ جرمن سروں کے مطابق ترتیب دیکر قائم کئے ھیں—

کچھ دنوں پہلے ھندوستان میں قلمی کتابیں استعمال ھوتی تھیں۔

کیوں کہ چھاپہ کا رواج ہندوستان میں زیادہ نہ تھا اور مطبوعہ حروف کو بدنما اور بھدا تصور کیا جاتا تھا اور اس میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ نستعلیق خط کا حسن جو خوش خط قلمی نسخوں میں نظر آتا ہے چھپنے میں زائل ہو جاتا تھا اور شکستہ خط تو چھپنے میں اور بھی خراب ہو جاتا تھا خوش قسمتی سے لیتھو نے ان تمام مشکلات کا ازالہ کر دیا ہے۔ طباعت کا یہ طریقہ ہندوستان میں خوب مقبول ہوا۔ لیتھو گرافی کا پہلا مطبع دہلی میں سنہ ۱۸۳۷ ع میں قائم ہوا اور سنہ ۱۸۵۲ ع تک صوبہ شمال و مغربی میں ایسے ۳۴ مطبع قائم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ایسے مطبع شمال ہند کے تقریباً ہر شہر میں اور ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں قائم ہو گئے۔ صرف لکھنؤ اور کانپور میں ۲۳ مطبع تھے جہاں سے چند سال کے عرصہ میں صدہا کتابیں چھاپی گئیں اور بعض کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ آگرہ کے سرکاری گزٹ مورخہ یکم جون سنہ ۱۸۵۵ ع کی صرف ایک فہرست میں نقشوں اور لیتھو کے نمونوں کے علاوہ دو سو کتابوں کے نام تھے۔ ان میں اکثر کتابیں تو ایسی ہیں جن میں ہندوستانیوں کے لئے ادب سائنس اور فنون کی ابتدائی باتیں بیان کی گئی ہیں جو ہمارے لئے چنداں دلچسپ نہیں لیکن اسی کے ساتھ ان میں بہت سی کتابیں یورپ کے علما کے مطالعہ کے قابل بھی ہیں۔ مثلاً کریم الدین کے مرتب کئے ہوئے گلستان اور انوار سہیلی کے خلاصے۔ امین چند کا سفر نامہ جس میں پنجاب۔ کشمیر۔ سندھ دکن کے چند مقامات۔ خاندیس۔ مالوا اور راجپوتانہ کے دلچسپ حالات ہیں۔ چندو دیپکا۔ جس میں ہندی نگاری پر بحث کی گئی ہے اور جو یورپ میں بالکل مفقود ہے—

دہلی کی ایک انجمن نے ادبی اشاعت اور طباعت میں قابل تعریف کام کیا ہے یہ انجمن ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی ہے جس کے سکریٹری ابتدا میں دہلی کالج کے پروفیسر اور ہمارے ہم وطن مسٹر بوترس تھے۔

اس انجمن نے سنسکرت-عربی-فارسی کے آسان اور اچھے ترجمے کر کے هندوستانیوں کی ایک بڑی اور ضروری خدمت کی ان میں انگریزی کی چند بہترین کتابوں کے ترجمے بھی شامل هیں—

طباعت کے سلسلہ میں میں ایک خاص قسم کے ادبیات کا ذکر کرنا چاهتا هوں جو اب تک مشرق میں مفقود تھا مگر اب هندوستان میں نمایاں ترقی کر رها هے-میری مراد اخبارات و رسائل سے هے جن کا اثر هندوستانیوں پر کافی و وافی پڑا اور اس میں روز بروز اضافہ هوتا جاتا هے-میں پچاس سے زائد هندوستانی اخبارات سے واقف هوں-چند سال پہلے کلکتہ میں هندوستانیوں کے سولہ اخبار نکلتے تھے جن میں سے پانچ فارسی یا هندوستانی ۹ بنگالی اور دو انگریزی زبان کے تھے-مولوی نصیرالدین کچھہ دنوں تک اپنا رسالہ " مارتندا " نکالتے رهے جو پانچ کالموں میں پانچ زبانوں هندی-هندوستانی بنگالی-فارسی اور انگریزی میں شائع هوتا تھا-ابھی حال میں عورتوں کے لئے ایک رسالہ کی اشاعت کا اعلان هوا هے جو اُردو میں شائع هوگا-بمبئی میں اِس وقت تین چار اخبار عام هندوستانیوں کے لئے اور دو خاص مسلمانوں کے لئے نکل رهے هیں-ان کے علاوہ چار اخبار گجراتی میں پارسیوں کے او دو مرهٹی میں هندؤں کے شائع هو رهے هیں-چند هندوستانی رسالے مدراس سے نکلتے هیں اور اس سے زائد تعداد میں آگرہ-دهلی-میرٹھہ-لاهور-بنارس اور لکھنؤ سے-چند هندوستانی رسالے سریرام پور-کدر پور-مرزا پور بھرت پو ملتان-بریلی اور اندور سے بھی نکلتے هیں-اگر یہ تمام رسالے یورپ میں منگوائے جائیں تو یورپ کے اخباروں میں اشاعت کے لئے ان میں دلچسپ او عمدہ مضامین مل سکتے هیں—

نظم ھاشمی

از

(جناب مولوی سید ھاشمی صاحب- رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی
حیدر آباد- دکن)

چین ھوا کسے نصیب فرصت مستعار میں
نیند ھے ستر ماندگی دیدۂ ھوشیار میں
عالم ریب و رنج میں موت کا اعتبار ھے
ھے یہ دھنک اُمید کی مطلع پر غبار میں

——:o:——

خندہ و دست و پا زنی کا کوئی مدعا نہیں
دیکھ ظہور زندگی طفلک شیر خوار میں
فصل بہار کی ترنگ رنگ میں غرق ھوگئی
موج- جنون دشت کی چھپ گئی سبزہ زار میں

——:o:——

ناصیۂ سیاہ پر نور سجود ھاشمی
بن گیا آھن آئینہ شوق لقاے یار میں

طوطا کہانی اور سب رس

تحفہ کی جدید اشاعت (جلد اول نمبر ششم بابتہ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۳ ہجری) میں ایک مضمون بعنوان "طرز بیان" شایع ہوا ہے۔ جس میں ایک موقع پر طوطا کہانی کا نام آگیا ہے۔ وہاں مدیر تحفہ نے ایک طول طویل نوٹ (صفحہ ۲۵۴ سے صفحہ ۲۵۸ تک) اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ اس نوٹ کو بظاہر اصل مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محض اڈیٹر اُردو (مولانا عبدالحق بی۔اے) کی بعض تحریرات پر نکتہ چینی کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ مدیر تحفہ کی دانست میں اڈیٹر اُردو سے طوطا کہانی اور سب رس کے متعلق جو فرو گذاشتیں ہوئی ہیں اس نوٹ میں اُن کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور بقول مدیر تحفہ کے یورپین حضرات کی تحقیقات صادقہ سے اخذ کرکے اُنھوں نے جو اصلاحات پیش کی ہیں ان کی حقیقت سطور ذیل سے منکشف ہوگی —

مدیر تحفہ لکھتے ہیں کہ

"طوطا کہانی کا ماخذ ایک سنسکرت کتاب ہے۔ پہلے پہل ضیاءالدین نخشبی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کے دکنی اُردو ترجمہ کی نسبت مولوی عبدالحق صاحب گلشن ہند کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں دکنی زبان میں لکھا .... مسٹر آغا حیدر حسن دہلوی پھول بن پر مضمون لکھ رہے ہیں اس میں آغا صاحب نے ثابت

کردیا ہے کہ ابن نشاطی نے کوئی طوطی نامہ نہیں لکھا'' —

مدیر تحفہ اس بات کو نہیں مانتے ہیں کہ ابن نشاطی نے طوطی نامہ لکھا اور ان کے اس دعوے کی بنیاد آغا حیدر حسن دہلوی کے مضمون پر قائم ہے۔ چوں کہ آغا صاحب کا مضمون ابھی زیر اشاعت ہے اسی لئے ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ ان کے یہاں اس دعوے کی تائید میں کیا دلائل ہیں۔ لیکن یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ابن نشاطی کے طوطی نامہ سے انکار کرنا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔ اس طوطی نامہ کا ایک نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ چنانچہ میجر اسٹوارٹ نے اس کتاب خانہ کی جو فہرست لکھی ہے اس کے صفحہ ۱۸۰ پر اس کا مفصل تذکرہ مرقوم ہے۔ پروفیسر ٹاسی نے پیرس میں اور ڈاکٹر ولسن نے مدراس میں اس کے با تصویر نسخے دیکھے ہیں۔ اس وقت اس کا ایک نسخہ قطب شاہی کتب خانہ کا ڈاکٹر سید محمد قاسم صاحب معالج سمیات کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ آگے چل کر طوطی نامہ کی نسبت مدیر تحفہ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ —

''مولوی عبدالحق صاحب رسالہ اُردو بابتہ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء صفحہ ۴۹۹ میں حیدری کی تصنیفات گناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی ایک کتاب طوطا کہانی ہے جو فارسی طوطی نامی کا ترجمہ ہے۔ نخشبی کے طوطی نامہ کا خلاصہ محمد قاسم نے کیا تھا اس کا یہ ترجمہ ہے —

ہمارے پیش نظر طوطا کہانی کا ایک نسخہ مطبع محمدی بمبئی کا سنہ ۱۸۹۳ء کا چھپا ہوا ہے۔ اس کی پیشانی پر تحریر ہے کہ طوطا کہانی ترجمہ کیا ہوا منشی بے بدل شاعر بے مثل جناب منشی حیدر بخش المتخلص بہ حیدری کا طوطی نامہ فارسی قادر بخش کے سے۔ قادر بخش نے طوطی نامہ فارسی میں نہیں لکھا بلکہ دکنی اُردو میں لکھا ہے اس کا ایک نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ ہماری نظر سے بھی طوطی نامہ کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ سنہ ۱۱۴۲ ھ م سنہ ۱۷۳۱ء

گزرا ہے جس کو دکنی میں ملک محمد قادری نے لکھا ہے۔ جان گلکرسٹ نے حیدری سے جو طوطی نامہ کا ترجمہ لکھوایا ہے اس کے دیباچہ میں حیدری نے محمد قادری کا ذکر کیا ہے مگر دکنی میں نہیں لکھا۔ یہ ہے طوطا کہانی کی اصل"—

سطور بالا سے مفصلۂ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں—

۱- قادر بخش اور ملک محمد قادری دو مختلف مصنفین نے دو طوطی نامے لکھے—

۲- قادر بخش کا طوطی نامہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے—

۳- مدیر تحفہ نے ملک محمد قادری کا طوطی نامہ دیکھا ہے—

۴- قادر بخش اور محمد قادری کے طوطی نامے فارسی میں نہیں بلکہ دکنی میں لکھے گئے ہیں—

۵- حیدری نے محمد قادری کے طوطی نامہ سے طوطا کہانی لکھی ہے—

مدیر تحفہ سے طوطا کہانی کی حقیقت کے بیان کرنے میں ایک دو نہیں بلکہ متعدد لغزشیں سرزد ہوئی ہیں۔ اولاً یہ کہ قادر بخش اور محمد قادری کو دو مختلف مصنف سمجھا ہے حالانکہ ایک ہی مصنف ہے اور اس کا صحیح نام محمد قادری ہے۔ ثانیاً یہ کہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کے دکنی طوطی نامہ کو قادر بخش کی تصنیف بتایا ہے حالانکہ اس کے دیباچہ میں مصنف کا نام بصراحت محمد قادری تحریر ہے۔ ثالثاً یہ کہ محمد قادری نے طوطی نامہ دکنی میں نہیں لکھا بلکہ نخشبی کے طوطی نامہ کو فارسی میں خلاصہ کیا ہے اور اس فارسی خلاصہ کا دکنی میں ترجمہ ہوا ہے—

محمد قادری کا طوطی نامہ سترھویں صدی عیسوی میں تصنیف ہوا ہے۔ (Rieu, B. M., P. Ms., P 752) اس میں ۳۵ حکایات ہیں اور مسٹر گلاڈوین نے اس کو انگریزی ترجمہ کے ساتھ سنہ ۱۸۰۰ ع میں کلکتہ میں چھپوایا ہے۔ اس کے دیباچہ کی فارسی عبارت یہ ہے—

" بعد از جنس جاس ثنا و صنعت پیدا کنندۂ آسمان و زمین کیفیت و حقیقت این است که داستان قصہ ها و حکایات حضرت نخشبی رحمۃ اللہ علیہ که در طوطی نامہ بعبارت سخت و دقیق نوشته بودند ان را برائے منصل و بیان و از جهت معلوم شدن همه مردمان محمد قادری اصلح اللہ شانه از عبارت سلیس و آسان که مشتمل بر عبارت خطوط باشد و روزمرہ جواب و سوال که دولت مندان را لائق باشد نوشتۃ است "

عثمانیه یونیورسٹی لائبریری میں دکنی زبان کا جو طوطی نامه ہے وہ اسی فارسی خلاصه کا ترجمه ہے اور ۱۵ ربیع الاول سنه ۱۱۳۲ ھ کو تمام ہوا ہے۔اس میں بھی فارسی نسخه کے موافق ۳۵ حکایات ہیں۔اس کے دیباچه کی عبارت یه ہے —

" پچھے سیں طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے والے زمین و آسمان کے کیفیت و حقیقت یو ہے که داستان قصه ها و حکایات حضرت نخشبی رحمۃ اللہ علیہ کو بیچ طوطی نامے کے سات عبارت سخت و دقیق کے لکھے ہیں۔اس کے تئیں منصل و بیان وار واسطے معلوم ہونے تمام لوگاں کو محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبه اونو کا بیچ عبارت سلیس و آسان کے که ملی ہوئی اوپر عبارت خطاں کے ہوئے و روزمرہ جواب و سوال که دولت منداں کے تئیں لائق ہوئے لکھے ہیں "

محمد قادری کے طوطی نامه کو سنه ۱۸۰۰ ع میں گلاڈوین نے کلکته میں شائع کیا۔اس کے ایک سال بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے سنه ۱۸۰۱ ع میں بمقام کلکته حیدر بخش حیدری نے اس کا ترجمه اُردو میں کیا اور طوطا کہانی اس کا نام رکھا چنانچه طوطا کہانی کے دیباچه میں تحریر ہے —

" سید حیدر بخش متخلص حیدری شاہ جہاں آبادی تعلیم یافته مجلس خاص نواب علی ابراهیم خان بہادر مرحوم شاگرد غلام حسین خان غازی پوری دست گرفته .... صاحب والا شان جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقباله کا ہے۔اگرچه

تھوڑا بہت اپنے موافق اپنے حوصلہ کے عبارت فارسی میں بھی رکھتا ہے لیکن بموجب فرمائش صاحب موصوف کے سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری مطابق اٹھارہ سو ایک عیسوی کے حکومت میں مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ سے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین نخشبی ہے زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوئے معلی کے عبارت سلیس و خوب و الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا"—

بقول مدیر تحفہ کے طوطا کہانی کا جو نسخہ سنہ ۱۸۶۹ء میں مطبع محمدی بمبئی میں چھپا ہے اس کی پیشانی پر لکھا ہے کہ حیدر بخش حیدری نے اس کو قادر بخش کے فارسی طوطی نامہ سے ترجمہ کیا۔حقیقت یہ ہے کہ طوطی نامہ کے مصنف کا نام لکھنے میں اغلباً ان مطبع سے غلطی ہو گئی ہے اور بجائے محمد قادری کے قادر بخش لکھ دیا ہے —

---:o:---

مولانا عبدالحق صاحب نے سبرس پر جو مضمون لکھا ہے اس میں سنہ تصنیف کی نسبت لکھتے ہیں کہ میرے یہاں سبرس کے دو نسخے ہیں لیکن کسی میں بھی سنہ تصنیف مذکور نہیں ہے۔اس کے بعد مولانا نے اس عہد کے حالات پر نظر کر کے "از روئے قیاس یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ کتاب سنہ ۱۰۴۰ ہجری کے بعد لکھی گئی ہے —

مدیر تحفہ نے کتب خانہ آصفیہ کے ایک نسخہ میں کتاب کے اندر اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۴۵ ہجری دیکھا ہے۔اس میں اور مولوی صاحب کے قیاس میں ایسا بین فرق نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے سبرس کے عہد تصنیف پر کوئی تاریخی اثر پڑتا نظر آئے۔سچ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب کا استخراج اس لحاظ سے قابل تحسین ہے کہ انہوں نے کسی اندرونی شہادت سے فائدہ حاصل کئے بغیر محض واقعات کی بنا پر قیاس سے کام لے کر اس کا ایسا عہد تصنیف بیان کیا

جو خود مصنف کے بیان سے مغائر نہیں ہے۔ سنہ تصنیف کی بحث کے بعد مدیر تحفہ نے لکھا ہے کہ —

"رسالہ اُردو میں سبرس کی عبارت کا جو نمونہ دیا ہے ان نسخوں* سے مقابلہ کرنے پر جا بجا فرق نظر آتا ہے"

کسی کتاب کے دو قلمی نسخوں کو باہم مقابلہ کریں تو اُن میں ضرور فرق نظر آتا ہے۔یہ کوئی نئی اور قابل اعتراض بات نہیں ہے۔یورپ میں عربی۔ فارسی کی جو کتابیں چھپتی ہیں اُن کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلمی نسخوں کے اختلافات لفظوں تک محدود نہیں رہے بلکہ بڑی بڑی کئی کئی سطروں کی عبارتیں بھی ان میں ایک دوسرے سے مغائر نظر آتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ عربی فارسی کی جب کسی کتاب کو چھاپتے ہیں تو اس کے آخر میں اختلافات نسخہ کی فہرست بھی شامل کر دیتے ہیں۔اس کی ایک مثال شیخ فریدالدین عطار کا تذکرۃالاولیا ہے جس کو پروفیسر نکلسن نے شایع کیا ہے اور اس کے آخر میں نصف کتاب کے قریب قریب اختلافات نسخ کی فہرست شامل ہے۔یہی حال لباب الالباب کا ہے جس کو پروفیسر براؤن نے شایع کیا ہے۔اس کی پہلی جلد ۳۳۲ صفحات پر تمام ہوئی ہے اور اس کے آخر میں تین نسخوں کے اختلافات ۷۸ صفحوں پر بتائے گئے ہیں—

مدیر تحفہ لکھتے ہیں کہ

"مولانا نے سبرس کے ماخذ اور اس کے مصنف سے کوئی بحث نہیں کی ہے کتب خانہ آصفیہ کے مکمل نسخے کے خاتمہ پر لکھا ہے "الحمدالله والمنه بحق حبیبه کتاب سبرس تصنیف حضرت وجیه الدین گجراتی رحمة الله علیه بتاریخ شانزدهم روز سه شنبه شهر صفرالمظفر سنه ۱۲۹۵ هجری باختتام رسید"....................

---

* ان نسخوں سے کتب خانہ آصفیہ کے دو نسخے اور آغا حیدر حسن کا ایک نسخہ مراد ہے —

مولانا سبرس کو تصوف کی کتاب نہیں سمجھتے ہیں۔کتب خانہ آصفیہ کی فہرست جلد اول میں سبرس فن تصوف نمبر ۱۹۵ و ۱۳۲ پر رکھی گئی ہے اور مصنف کا نام وجہہ الدین لکھا گیا ہے"—

مدیر تحفہ کو معلوم ہو کہ کتب خانۂ آصفیہ کے مکمل نسخہ میں مصنف کا نام حضرت وجہہ الدین گجراتی نہیں ہے بلکہ صرف حضرت وجہہ الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہوا ہے البتہ کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں صفحہ ۲۱۵ پر سبرس کے مصنف کا نام صرف وجہہ الدین نہیں بلکہ وجہہ الدین گجراتی لکھا گیا ہے—

مدیر تحفہ نے مشکواۃ النبوت سے اخذ کرکے حضرت شاہ وجہہ الدین گجراتی کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ آپ احمدآباد میں سنہ ۹۰۹ ھ میں پیدا ہوئے۔شیخ محمد غوث گوالیری کے خلیفہ تھے۔سلخ محرم ۹۹۱ ہجری کو انتقال ہوا۔آپ کی تصنیفات سے کئی کتابیں مشہور ہیں مثلاً رسالہ حقیقت محمدیہ و شرح جام جہاں نما وغیرہ—

سبرس ۱۰۴۵ ہجری میں تصنیف ہوئی ہے اور اِس کے تصنیف ہونے سے سینتالیس سال پہلے ۹۹۸ ہجری میں حضرت وجہہ الدین گجراتی نے انتقال فرمایا ہے۔ایسی حالت میں سبرس کو حضرت وجہہ الدین گجراتی کی تصنیف سمجھنا ایک صاف و صریح غلطی ہے۔مدیر تحفہ نے سبرس کے خاتمے اور فہرست کتب خانۂ آصفیہ کے حوالہ سے مصنف سبرس کا نام وجہہ الدین یا وجہہ الدین گجراتی بیان کرنے کے بعد اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے—

"ان چیزوں پر غور و خوض کرنے سے سبرس کے ماخذ اور اُس کے مصنف کے متعلق ممکن ہے کہ ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں"—

لیکن ہماری رائے میں ایک صاف و صریح غلطی پر غور و خوض کرنے کے بعد کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی اُمید کرنا ایک فعل عبث اور لاحاصل

کوشش ہے—

مولانا نے اپنے مضمون میں سبرس کے مصنف کا نام وجہی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں گزرا ہے اور غواصی کا ہمعصر ہے۔مدیر تحفہ نے اس کو ناکافی سمجھا اور اس میں جو خامی رہ گئی ہے اسے پورا کرنے کا ارادہ کیا۔نہایت تعجب ہے کہ ان سے مولانا کی تحریر پر ایک حرف کا بھی اضافہ نہو سکا اور جو دوسروں سے نقل کیا تو وہ بھی غلط اور بے سروپا—

کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں سبرس کا فن تصوف میں رکھا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ کتاب حقیقت میں تصوف کی ہے۔کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں ایسی بہت سی کتابیں ہیں جو غلطی سے فن غیر متعلق میں درج ہوگئی ہیں۔عاقل خاں رازی کی پدماوت جس میں مصنف نے ہندوستان کے دو عاشق و معشوق منوہر و مد مالتی کا قصہ لکھا ہے (Ethe, I.O.P.Mss. 1634) کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں فن تصوف نمبر ۱۸۷/۲ پر درج ہے (ملاحظہ ہو فہرست جلد اول صفحہ ۴۰۶) ظاہر ہے کہ یہ ایک فسانہ ہے اور اس کو تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔لیکن غلطی سے یہاں درج ہوگیا ہے۔یہی کیفیت سبرس کی ہے۔اس میں اگرچیکہ مصنف نے اخلاق و تصوف کی متعدد باتیں ضمناً بیان کی ہیں لیکن مصنف نے ان باتوں کو مختلف عنوانات کے تحت میں نہیں لکھا ہے جیسا کہ بالعموم فنون کی کتابوں میں ہوتا ہے۔بر خلاف اس کے سبرس کی بنیاد ایک فسانہ پر رکھی ہے اور اس اعتبار سے اس کتاب کو تصوف کی کتاب کے بجائے فسانہ کی کتاب سمجھنا ہی زیادہ مناسب ہے—

مدیر تحفہ لکھتے ہیں کہ

"مولانا سب رس کے ضمن میں غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ۱۰۳۵ اور طوطی نامہ کا سنہ ۱۰۲۷ بتاتے ہیں۔غواصی خود سیف الملوک

و بدیع الجمال کا سن تصنیف اس طرح لکھتے ہیں—

برس یک ہزار اور ستاویس میں   کیا ختم یو نظم دن تیس میں

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غواصی نے اس سے پہلے کوئی مثنوی طوطی نامہ وغیرہ نہیں لکھی—

طوطی نامہ کا سنہ ۱۰۲۷ ھ دراصل سیف الملوک و بدیع الجمال کا سنہ ہے اور طوطی نامہ کا سن شاید ۱۰۳۵ ھجری ہو''

مدیر تحفہ نے سطور بالا میں جس شعر کا حوالہ دیا ہے وہ سیف الملوک و بدیع الجمال کے اس نسخہ سے منقول ہے جو سنہ ۱۳۰۰ ھ میں چھپا ہے ملاحظہ ہو نسخۂ مذکور کا صفحہ ۱۱۳ سطر ۱۹ اور اس نسخہ میں کثرت سے غلطیاں ہیں لیکن متعدد قلمی نسخوں میں جو ہماری نظر سے گزرے ہیں شعر مذکور اس طرح تحریر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے سنہ ۱۰۳۵ ھ میں تصنیف ہوئی ہے—

برس یک ہزار ہور پنج تیس میں
کیا ختم یو نظم دن تیس میں

اس میں شک نہیں کہ طوطی نامہ کا سنہ بیان کرنے میں ایڈیٹر اردو سے غلطی ہوئی ہے لیکن مدیر تحفہ نے جس سن کی نسبت گمان کیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ بلکہ غواصی نے طوطی نامہ میں بیان کیا ہے کہ یہ مثنوی سنہ ۱۰۴۹ ھ میں ختم ہوئی —

برس یک ہزار ہور چالیس پہ نو
ہوئے تھے یو موتیاں پوریاں ہوں نو

سنہ کے متعلق اڈیٹر اُردو کی یہ غلطی محض اتفاقی ہے کیوں کہ یہ شعر ہم نے خود انہیں کے نسخہ سے نقل کیا ہے—

"سبرس عنقریب انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہونے والی ہے اس

لحاظ سے ہماری رائے ہے کہ ان فروگزاشتوں پر ایک نظر ڈال لیجائے اور انہیں ترقی اردو اگر اپنی مصلحت کے خلاف نہ سمجھے تو ممبرس کو مسٹر آغا حیدرحسن دہلوی سے اڈیٹ کرا کے شایع کرے تو ممکن ہے کہ کوئی ایسی فرو گزاشت نہ ہوسکے"

مدیر تحفہ نے سب رس کی اڈیٹری کے لئے مسٹر آغا حیدر حسن کو تجویز کیا ہے جو دہلی کے باشندے ہیں۔ اُردوئے معلیٰ کی زبان ان کی مادری زبان ہے اور انہوں نے حیدرآباد آنے سے پہلے شاید ہی کسی وقت دکنی کا کوئی لفظ سنا ہوگا۔ بجائے ان کے اگر مدیر تحفہ کرنول۔ گوگی۔ شاہنور۔ یا بیجاپور کے کسی باشندے کا نام پیش کرتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ کیوں کہ یہاں کے باشندوں کی مادری زبان دکنی ہے اور یہ لوگ اس وقت تک ویسی ہی دکنی بولتے ہیں جیسی کہ غواصی۔ نصرتی۔ ابن نشاطی اور وجہی کی تصنیفات کی ہے اور ان تصنیفات کو صحیح طور پر پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کی ہم سے زیادہ قابلیت رکھتے ہیں--

(س-م-ن)

مجالس العشاق

دسمبر سنہ ۱۹۲۳ ع کے معارف میں کتب خانہ عبدالرحیم خان خانان کے متعلق مولوی حافظ نظیر احمد صاحب کا جو مضمون شایع ہوا ہے اُس میں کتاب مجالس العشاق کی نسبت لکھا ہے کہ یہ کتاب سلطان حسین مرزا بایقرا کی تصنیف ہے (معارف جلد ۱۲ نمبر ۶ صفحہ ۴۱۹) سلطان حسین سنہ ۸۷۳ ہجری سے سنہ ۹۱۱ ہجری تک خراسان میں برسر حکومت رہا ہے۔یورپ کے اکثر مستشرقین مثلاً چارلس ریو۔گستا وفلوگل وغیرہ نے بھی سلطان حسین ہی کو اس کتاب کا مصنف بتایا ہے اور خود کتاب مذکور کے دیباچہ میں بھی مصنف کا نام سلطان حسین تحریر ہے—

"محرر ایں انشا خاک راہ اولیا سلطان حسین ابن سلطان منصور ابن بایقرا (صح بایسنقر) ابن عمر شیخ ابن تیمور گورکان"

لیکن حقیقت میں یہ کتاب سلطان حسین مرزا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اسے میر کمال الدین حسین کازرگی نے سلطان حسین کے نام سے تصنیف کیا ہے۔ چنانچہ فردوس مکانی ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ (ولادت سنہ ۸۸۸ ہجری وفات سنہ ۹۳۷ ہجری) نے جو سلطان حسین کا معاصر ہے اپنی آٹو بیاگرفی میں ایک مقام پر اس کتاب کے مصنف کی نسبت بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ کتاب حقیقت میں امیر کمال الدین حسین کازرگی کی تصنیف ہے۔چنانچہ یہ بیان بابر کی اصل ترکی آٹو بیاگرفی جو بابر نامہ کے نام سے مشہور ہے صفحات

سنہ رجہ ذیل پر موجود ہے—

(۱) المنسکی Ilminsky ایڈیشن-طبع قازان سنہ ۱۸۵۷ ع صفحہ ۲۲۱

(۲) بیورج Beveridge ایڈیشن-جو لیڈن کے مطبع بریل میں گب میموریل Gibb Memorial کی طرف سے سنہ ۱۹۰۵ ع میں فوٹو لتھو گرافی میں چھپا ہے-ورق ۱۷۹ رخ اول—

ترکی زبان چونکہ ہمارے ملک میں بہت کم سمجھی جاتی ہے اس لئے ہم نے اس کے ترکی اقتباس کو قلم انداز کر دیا-لیکن بابر نامہ کے فارسی ترجمہ کی عبارت ذیل میں نقل کرتے ہیں-اس ترجمہ کو عبدالرحیم خان خانان نے سنہ ۹۹۸ هجری میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے لکھا ہے اور عام طور پر واقعات بابری یا توزک بابری کے نام سے مشہور ہے—

"دیگر کمال الدین حسین گازرگی بود-اگرچہ صوفی نبود-متصوف بود ....یک تصنیفی دارد مجالس العشاق نام-بنام سلطان حسین مرزا بستہ نوشتہ است-بسیار سست و اکثری دروغ و بے مزہ و بے ادبانہ حرفہا نوشتہ-از بعضے سخنان بوی کفر می شنوند-چنانچہ خیلے از انبیا و بسیارے از اولیا را بعشق مجازی منسوب ساختہ از برائے ہر کدام معشوقی و محبوبی پیدا کردہ-این عجب کورانہ امری ست کہ در دیباچہ سلطان حسین مرزا تصنیف و تحریر من است نوشتہ"

یہ ایک سب سے بڑی اور زبردست شہادت ہے اس بات کی کہ یہ کتاب سلطان حسین کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اسے میر کمال الدین حسین گازرگی نے سلطان حسین کے نام سے لکھا ہے-امین احمد رازی نے بھی اپنی کتاب ہفت اقلیم میں (جو سنہ ۱۰۰۲ هجری میں بمقام آگرہ تصنیف ہوئی ہے) اس کتاب کو میر کمال الدین حسین کی تصنیف بیان کیا ہے اور اقلیم سوم میں مشاہیر طبس کا تذکرہ بیان کرتے ہوئے امیر کمال الدین حسین کے حالات میں لکھا ہے—

"شرح منازل السائرین و مجالس العشاق در سلک مولفات امیر کمال الدین انتظام دارد"

میر کمال الدین حسین کے حالات خواجہ غیاث الدین خوندمیر نے اپنی مشہور تاریخ حبیب السیر میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں اور یہی حالات لفظ بلفظ ملحقات روضۃ الصفا میں بھی مذکور ہیں۔ جس کا اقتباس کسی قدر اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے --

(واضح ہو کہ میرخوند محمد بن خاوند شاہ بلخی المتوفی سنہ ۹۰۳ ہجری نے روضۃ الصفا کی صرف چھہ جلدیں لکھی ہیں۔ ساتویں جلد جس میں سلطان حسین مرزا کے حالات ہیں حبیب السیر سے نقل کرکے بعد میں بطور ملحقات کے اس میں اضافہ کر دی گئی ہے) --

امیر کمال الدین حسین ابیوردی در سلک فضلائے سادات خراسان منتظم بود۔ و در علنفوان اوان جوانی ازابی ورد به هرات آمد و به تحصیل علوم مشغول گشت۔ و در آں اثنا به مجلس شریف کیچک مرزا افتاد۔ و شاہزادہ او را مصاحب خود ساخته ابواب احسان بر روے روز گارش بکشاد۔ اما در وقتیکه مرزا کیچک عزیمت حج فرمود امیر حسین باوی موافقت نه نمود و بعد از رفتن شاہزادہ از توقف پشیمان شدہ از عقبش شتافت لیکن بحسب تقدیر ملک قدیر دراں سفر بلکه دیگر بخدمتش نتوانست رسید۔ و چوں حج اسلام گزاردہ مراجعت کرد و در تبریز بسعادت ملازمت سلطان یعقوب مرزا اختصاص یافت و چند سال دراں مملکت اوقات گزرانیدہ بوطن مالوف بازآمد و بخدمت امیر علی شیر پیوسته ملحوظ عین التفات شد۔ در اواخر اوقات حیات خاقان منصور (مراد از سلطان حسین مرزا) بهلغ شتافته سلطان بدیع الزمان مرزا اورا بشغلکی آستانه علیه شاهیه نصب کرد۔ و در سنه ۹۰۸ ثمان و تسعمائة آں منصب را بامر صدارت مبدل ساخت و در سنه ۹۱۰ عشر

وتسعمائة که بدیع الزمان میرزا در هراة بود امیر حسین از صدارت استعفا نموده بابی ورد رفت و یک دو سال بفراغت گزرانیده در سنه ۹۱۳ اربع عشر و تسعمائة محمد خان شیبانی اورا برسم رسالت متوجه درگاه عالم پناه نواب کامیاب شاهی (مراد از شاه اسمعیل صفوی) گردانید- و امیر حسین بسعادت ملازمت آستان ملایک آشیان مشرف گشته مشمول انعام و احسان شده مراجعت نمود- و در وطن مالوف و مسکن معهود یعنی ولایت ابی ورد رحل اقامت انداخت و در سنه ۹۲۰ عشرین و تسعمائة عالم آخرت را منزل ساخت و از جمله معمیات آنجناب این معما باسم شاه زمان بر خاطر بود ثبت افتاد—

شاه بازی که طرح عدل افگند   نام خود در نگین دولت کند

(حبیب السیر جلد سوم جزو سیم صفحه ۳۴۴-روضة الصفا جلد هفتم طبع بمبئی سنه ۱۲۷۱ صفحه ۷۹)

حکیم سید شمس الله قادری

تبصرے

ادب

تاریخ و سیرت

اخلاق و تعلیم

مذہب

متفرق

اُردو کے جدید رسالے

ادب

مکتوبات حالی

(مرتبہ جناب خواجہ سجاد حسین صاحب بی اے)

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ادب ہم اُن الوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کے حیرت انگیز جد و جہد۔قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح دنیا سے تاریکی کو مٹایا۔محبت ہم اُن سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت۔خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔اُن کے پاس سے جو اُٹھا کچھ لیکر اُٹھا اور اُن کے پاس جو گیا وہ کچھ بن کر آیا۔مولانا حالی اُن پاک نفوس میں سے ہیں جن کا ہم ادب بھی کرتے ہیں اور اُن سے محبت بھی۔اُن کے کلام نے اُردو شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور یہ اسی کا طفیل ہے کہ آج اُردو شاعری کا قدم ترقی کی طرف نظر آتا ہے اور اسی طرح ان کی متین اور جچی تلی نثر اور تنقید نے اُردو ادب میں ایسا بے بہا اضافہ کیا ہے کہ جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق کرتا ہے۔یہ چیزیں ہمارے دل میں اُن کا ادب و احترام پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف اُن کی سیرت ہے۔اُن کے پاکیزہ اخلاق اور اطوار۔اُن کی دلسوزی اور ہمدردی کا دلوں پر اثر پڑتا تھا۔وہ کوئی بہت بڑے جادو بیان یا خوش تقریر نہ تھے مگر اُن کی باتوں میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ لوگوں کے دل خود بخود اُن کی طرف کھچ جاتے تھے۔وہ کبھی کسی کی مذمت یا برائی سے اپنی

زبان آلودہ نہ کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی فحش گوئی اور خوش اسلوبی سے روکتے رہتے تھے۔یہاں تک کہ جن لوگوں نے اُن پر سخت اور بیجا تنقیدیں کیں اُن کو بھی اُنہوں نے سراہا۔اگر کوئی شخص ایسا کام کرتا اور کوئی ایسی چیز لکھتا جس میں ذرا بھی خوبی کا پہلو ہوتا تو اُس کی دل افزائی فرماتے اور خوش ہو کر تعریف کرتے تھے۔ہمدردی کا یہ حال تھا کہ دوسرے کا درد دیکھ کر خود تڑپنے لگتے تھے۔باوجود ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر ہونے کے مزاج میں بے حد انکسار اور فروتنی تھی۔یہ وہ خوبیاں تھیں جو دلوں میں گھر کر لیتی تھیں اور ان کی طرف سے محبت پیدا کرتی تھیں۔اگرچہ خطوں کے اس مجموعے میں جو اب چھپ کر شایع ہوا ہے زیادہ تر خط ایسے ہیں جو عزیز و اقارب کے نام ہیں اور جن میں روز مرہ کی معمولی باتیں آے دن کے آلام و افکار۔اپنی اور دوسروں کی بیماری اور مصیبت کا ذکر ہے مگر ان میں بھی ایک بات پائی جاتی ہے۔علاوہ ان کے بہت سے خط احباب اور ہم عصروں کے نام ایسے بھی ہیں جن میں اُن کے دلی خیالات اور اُن محاسن کا پتہ لگتا ہے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے—

ان میں سے اکثر خط اُس وقت کے ہیں جب وہ سر سید مرحوم کی سوانح عمری لکھ رہے تھے۔اس قابل قدر اور بے مثل کتاب کے لکھنے میں اُنہوں نے بے حد محنت اور جانفشانی اور کاوش سے کام کیا اور باوجود اپنی بیماری۔خانگی پریشانیوں اور جھگڑوں اور ایک نواسے کے لاعلاج مرض کے جس نے ان کی زندگی تلخ کر دی تھی وہ برابر اسے لپٹے رہے اور کئی سال تک خون جگر کھانے کے بعد اسے تمام کیا۔جو کتاب اس قدر دماغ سوزی۔زحمت اور مسلسل کوشش اور جگر کاوی کے بعد لکھی گئے تھی جب وہ شایع ہوئی اور اُن لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی ظاہر ہوئی۔جن سے خاص طور پر یہ توقع تھی کہ وہ اس کی قدر کریں گے اور جو سر سید مرحوم کے فدائی۔ساتھی اور ہمدرد تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اس کا قلق ہوا۔چنانچہ وہ ایک صاحب کو جو نواح علیگڈہ کے رئیس اور روشن خیال صاحب ذوق اور صاحب علم ہیں یہ لکھتے ہیں کہ ”ڈیڑہ مہینے سے زیادہ عرصہ ہو چکا کہ حیات جاوید کی جلدیں تینوں قسم کی ڈیوٹی شاپ میں پہنچ گئیں۔مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور وہاں سے منگوائی ہوں گی کیونکہ اگر مصنف قابل وقعت نہ تھا تو ہیرو بلا شبہ ایسا تھا کہ اس کی بائیوگریفی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہئے تھا مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی

یہ رتعتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹا دی ہے۔جن لوگوں سے یہ اُمید تھی کہ اس کتاب کے منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ان کی طرف سے سرد مہری کے سوا میں نے اب تک کچھہ نہیں دیکھا۔اگرچہ اس قلیل عرصہ میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہو گئی ہیں مگر ایسی قدردانی سے وہی شخص خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا اور کوئی مقصد حاصل نہیں کرتا۔بلا شبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی مگر میرا خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سر سید کا کوئی دوست اس کتاب کا بالکل نوٹس نہ لے۔اور اخباروں کو جانے دیجئے علیگڈہ انسٹیٹیوٹ گزٹ جس کو سر سید کی یادگار کہا جاتا ہے اور جس کا اہتمام محمڈن کالج کے آنریری سکریٹری اور سر سید کے جانشین اور اُن کے زبدۂ احباب کے ہاتھہ میں ہے آج تک حیات جاوید کی نسبت اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سر سید کی لائف جیسی کہ چاہئے تھی ویسی مجھہ سے نہیں لکھی گئی۔لیکن اسی کے ساتھہ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی نا قابلیت کے اس بار گراں کو اپنے ذمہ لیکر سر سید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبکدوش کیا ہے اور اس لئے میں اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سر سید کے احباب اگر اس تصنیف کو پسند نہ کریں گے تو اس کی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے۔مگر آج تک کسی نے اس کی بات بھی نہ پوچھی بلکہ بجاے امداد کے بعض اصحاب متوقع ہیں کہ اُن کی خدمت میں ایک ایک کاپی ہدیۃ پیش کی جائے۔.............صاحب نے سر سید کی زندگی میں وعدہ کیا تھا کہ پانسو روپیہ کی کتابیں خرید کر کالج کو دوں گا۔مگر میں سر سید کو اور اپنے تئیں بڑا خوش قسمت سمجھوں گا کہ جب یہ سنوں گا کہ اُنھوں نے کوئی کاپی ڈیوٹی سے خرید فرمائی ہے اور اس کو مطالعہ کے لائق سمجھا ہے۔آپ یقین جانئے کہ میں اس زمانہ کی لٹریری ترقی کے آگے ایسے لوگوں کی تحریرات کو جو میری طرح محض اُردو و فارسی کے مرد میداں ہیں لاشے محض جانتا ہوں۔مگر مکڑی جو اپنا جالا پورنے میں ملتہاے طاقت صرف کرتی ہے وہ اسی کو حریر و اطلس بلکہ ان سے بھی زیادہ گراں قدر تصور کرتی ہے"

یہ مولانا کے انتہائی رنج اور صدمے کا اظہار ہے ورنہ وہ ایسے نیک مزاج اور شریف النفس تھے کہ تحریر میں تو کیا زبان پر بھی کسی کی شکایت نہیں آتی تھی اور یہ بھی اُنھوں نے ایک خانگی خط میں لکھا ہے اور وہ بھی ایک

ایسے صاحب کو جو اُن کے اور اچھی کتابوں کے قدر داں تھے اور جن سے ایک حد تک بے تکلفی بھی تھی اور پھر وہ ایک عام حالت کا نقشہ ہے جس کا بیان کرنا کچھ ایسا معیوب نہیں ہو سکتا۔اگرچہ اس خط سے رنج اور صدمہ کا اظہار ضرور ہوتا ہے اور ایک طرح کی شکایت بھی پائی جاتی ہے لیکن دیکھا جائے تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی کے لئے دل شکن ہو۔اگر اُن کے بعض نامور ہم عصر مصنفین کی تحریروں یا خطوں سے مقابلہ کیا جائے جو اُنہوں نے ایسے موقعوں پر لکھی ہیں تو یہ تحریر کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کے صدمہ اور رنج کی انتہا یہ ہو وہ کیسا پاک سیرت ہوگا۔حقیقت یہ ہے کہ وہ سر سید کی دل سے قدر کرتے تھے اور سر سید کو مرے بھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا جب انہوں نے دیکھا کہ ابھی سے اُن لوگوں کا جو سید کی محبت اور جاں نثاری کا دم بھرتے تھے یہ حال ہے تو انہیں بہت شاق گزرا۔ گھاؤ تازہ تھا۔ پھوٹ پڑے—

اس خط میں ایک دوسری حقیقت کو بھی آشکارا کردیا ہے جو بہت ہی قابل افسوس ہے۔ہمارے ہاں کے متمول اور صاحب ثروت لوگ کسی کتاب کی قدر کرنا تو کجا خرید کر پڑھنا بھی نہیں جانتے اور اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ مصنف اُن کی خدمت میں اس کا نسخہ ہدیۃً پیش کرے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کی بہتر سے بہتر کتاب بھی اتنی نہیں بکتی جتنی دوسرے ممالک میں معمولی درجے کی کتابیں فروخت ہوجاتی ہیں۔سر سید کے احباب کی اِس بے اعتنائی کا اُن کے دل پر اس قدر اثر تھا کہ انہیں تاریخوں میں ایک خط میں جو اُنہوں نے اپنے ایک نیاز مند کے نام لکھا ہے اُس دکھڑے کو پھر رویا ہے۔چونکہ یہ ایسی بپتا ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں اس لئے اس خط کے ایک حصے کے نقل کرنے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی—

"میں ہرگز یہ خیال نہیں کرتا کہ میں نے اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگریفی لکھنے کا پورا پورا حق ادا کردیا ہے بلکہ مجھے اپنی کمزوریاں اور لغزشیں بخوبی معلوم ہیں اور میں علی الاعلان اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے اس بائیوگرافی کا حق ادا ہو نہیں ہوسکا۔لیکن میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا۔کسی متنفس نے قلم یا درم سے براہ راست اس کام میں مجھے مدد نہیں دی (الا ماشاءاللہ) پس اگرچہ یہ کام فی نفسہ کچھ قدر کے لائق نہ ہو مگر اس لحاظ سے کہ میں نے اس کے سر انجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف

کی یہ ضرور توجہ کے لائق ہے.......... میں اس موقع پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔جب میں نے مسدس مد و جزر اسلام کا پہلا اڈیشن نکالا اور اس کی ایک جلد سر سید مرحوم کے پاس بھیجی تو بغیر اس کے کہ میں نے اس مرحوم سے کوئی درخواست کی ہو فوراً مجھ سے پوچھا کی آپ نے اس کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں۔میں نے جواب لکھ بھیجا۔اُنہوں نے اُسی وقت ایک فہرست اپنے احباب کی مجھے لکھ بھیجی کہ اتنی جلدیں فلاں دوست کو اور اتنی فلاں کو اور اتنی وہاں اور اتنی وہاں بھیج دو اور اپنے دوستوں کو لکھ بھیجا کہ کتابیں پہنچتے ہی قیمت مصنف کے پاس بھیج دیجئے۔چنانچہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں جس قدر جلدیں چھپوائی تھیں سب فروخت ہو گئیں اور دوسرا اڈیشن چھپوانے کی ضرورت ہوئی۔افسوس ہے کہ یہ خیالات وہ شخص اپنے ساتھ لے گیا۔اب اُن کے بڑے بڑے ذی مقدور دوست اس بات کے متوقع ہیں کہ اُن کی جناب میں کتابیں مفت نذر کی جائیں۔بعضے قیمت بہت گراں بتاتے ہیں اور یہ تو کسی سے بھی اُمید نہیں کہ مصنف کی محنت کی کچھ داد دی جائے یا کچھ قدر کی جائے—

سوختیم و سوزش ما بر کسے ظاہر نشد
چوں چراغان شب مہتاب بے جا سوختیم"

یہ خط بہت پر درد ہے۔خط کیا ہے ہماری قوم کی ناقدر دانی کا مرقع ہے۔اگرچہ اس خط کو لکھے پورے چوبیس برس ہوئے ہیں اور ملک کے حالات میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوگیا ہے لیکن علمی قدردانی میں کچھ انیس بیس ہی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ " جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم "

علی گڈھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انہیں کمال ہمدردی تھی ان معاملات میں قلمے۔درمے۔قدمے ہر طرح کی مدد کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ان کی تائید اور ہمدردی میں ایسی ایسی بے مثل اور بیش بہا نظمیں لکھی ہیں کہ اُن کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔اُن کا ایک ایک شعر ہزاروں اور لاکھوں روپئے کے چندے پر بھاری ہے۔ان خطوں میں بھی کالج اور کانفرنس کا جا بجا ذکر آتا ہے اور جو کچھ اُن سے ہو سکتا ہے اس کے کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔خود شریک ہوتے ہیں۔دوسروں کو شرکت پر آمادہ کرتے ہیں۔چندے کرتے ہیں۔رائے دیتے ہیں۔دوسروں کو رائے دینے اور کام

کرنے کی ترغیب دیتے ھیں۔اس کہ وجہ یہ ھے کہ انھیں مسلمانوں کی تعلیم سے بے حد شغف تھا اور اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ بغیر تعلیم کے یہ قوم کبھی نہیں پنپنے کی۔اپنے وطن پانی پت میں انہوں نے تعلیم کی بہت کچھہ اشاعت کی۔اپنے خاندان والوں کے سوا دوسروں کو بھی۔تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور اُن کے لئے آسانیاں پیدا کیں اور ھر قسم کی مدد دی۔پانی پت میں ایک اچھا کتب خانہ بھی قائم کیا —

اِن خطوں سے مولانا کی بعض عادتوں اور خصلتوں کا بھی پتہ چلتا ھے اور جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف نہیں وہ بھی انھیں پڑھ کر بہت آسانی سے سمجھہ سکتے ھیں کہ اُن میں کس قدر ھمدردی اور شفقت تھی۔جب وہ اپنے کسی عزیز یا دوست کو دیکھتے تھے کہ اس سے کچھہ لغزش ھو گئی ھے یا کسی معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت ھے تو وہ اس قدر نرمی اور محبت سے سمجھاتے تھے یا اُس کا پیرایہ ایسا اختیار کرتے تھے کہ سننے والے کو کبھی برا نہیں معلوم ھوتا تھا بلکہ اُن کے کہنے کا اثر ھوتا تھا۔مثلاً وہ اپنے ایک دوست کو اُن کے فرزند کے متعلق لکھتے ھیں —

" معلوم نہیں کہ انہوں نے میرے عرض کرنے پر کوئی مشغلہ اختیار کیا یا نہیں۔اُن کو خدا تعالیٰ نے ایسی لیاقت دی ھے کہ ملک و قوم کو بہت کچھہ فائدہ پہنچا سکتے ھیں اور چونکہ عنایت الٰہی سے تلاش معاش کی ضرورت نہیں ھے اس لئے اُن کے علمی مشغلوں میں کوئی چیز مزاحم نہیں ھوسکتی۔ میرے نزدیک صرف کتابوں اور اخباروں کا مطالعہ کرنا اور کوئی علمی کام نہ کرنا اپنے علم کی نا قدر دانی اور اپنی قیمتی زندگی کو رائگاں کھونا ھے اس موقع پر میں اپنی ذیل کی رباعی لکھتا ھوں اور چاھتا ھوں کہ عزیز موصوف بھی اس کو پڑھیں اور اگر وہ در حقیقت سودیشی تحریک کو دل سے پسند کرتے ھیں تو اس رباعی پر عمل کریں۔رباعی یہ ھے —

یارو نہیں وقت عیش و آرام کا یہ
موقع ھے اخیر فکر انجام کا یہ
بس جب وطن کا جپ چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ھے کام کا یہ"

مولانا کا ایک نواسہ ھے جو ایک لا علاج مرض میں مبتلا تھا اور جوں جوں اس کے دورے بڑھتے جاتے تھے اس کا مزاج نازک ھوتاجاتا تھا۔مولانا اس کی اس طرح ناز برداری کرتے تھے کہ ماں باپ بھی نہیں کرسکتے۔دنیا بھر کا کوئی

علاج ایسا نہ تھا جو انہوں نے نہ کیا ہو ڈاکٹروں اور حکیموں کا تو کیا ذکر ہے اُن میں سے تو شاید ہی کوئی چھوٹا ہو اگر کسی اتائی کو بھی سن پاتے ہیں کہ وہ اس بیماری کا علاج کرتا ہے تو وہاں پہنچتے ہیں اگر کسی عامل کو سن پایا تو اس کے پاس دوڑے پھرتے ہیں۔کسی دوست نے کوئی نسخہ بتا دیا تو اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہیں۔غرض اس کی وجہ سے مولانا کی زندگی تلخ تھی۔وہ ایک بار اپنے چچا کے ہاں جاتا ہے۔اُس وقت مولانا نے اُسے خط لکھا ہے جس میں اُنہوں نے ددھیال اور ننھیال والوں کے برتاو کا فرق بتایا ہے اور پھر کس کس طرح یہ سمجھایا ہے کہ اُسے وہاں کس طرح رہنا چاہئیے۔اس میں ایسی کام کی۔تجربہ کی۔دور اندیشی کی باتیں لکھی ہیں کہ پڑھنے کے قابل ہیں اور ایسی صاف ستھری اور سادہ زبان میں لکھی ہیں کہ ایک بچہ بھی پڑھ سکے اور سمجھ لے اور اثر قبول کرے۔افسوس کہ یہ خط کسی قدر طویل ہے اور ہم اُسے نقل نہیں کر سکتے۔اگرچہ یہ معمولی باتیں ہیں لیکن انہیں چیزوں سے ایک انشا پرداز کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے--

اپنے ایک نیازمند کو لکھتے ہیں ''اسلام نمبر میں آپ کا مضمون پڑھ کر بہت لطف آیا۔نہایت پر زور مضمون لکھا ہے . . . . . آپ ہی کا حصہ تھا۔مگر برٹش فارن پالیسی پر اس میں جابجا نوک جھوک کی گئی ہے وہ سراسر خلاف مصلحت ہے . . . . میں نہیں جانتا کہ مضمون کا کس قدر حصہ باقی رہا ہے۔اس میں ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کا ذکر ہوگا یا نہیں۔اگر آپ کی یہی راست گفتاری رہی تو لللہ آپ اس سلسلہ کو چھیڑنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے'' نصیحت کی تلخی کو کس طرح تعریف کی شیرینی سے گوارا کر دیا ہے—

ایک دوست کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے۔تعزیت کا خط لکھا ہے۔اس میں تحریر فرماتے ہیں ''اگرچہ یہ موقع نصیحت و پند کرنے کا نہیں ہے مگر میں اس مقام پر خاموش نہیں رہ سکتا۔خدا کے تمام کام حکمت اور مصلحت سے بھرے ہوتے ہیں۔بہت سی باتوں کو ہم مکروہ جانتے ہیں مگر وہ ہمارے حق میں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔اتفاقات تقدیری سے جو آپ کو یہ آزادی حاصل ہو گئی ہے اس کی قدر کرنی چاہئیے اور اس سے کچھ کام لینا چاہئیے۔آپ کو معلوم ہے کہ سید احمد خاں صاحب نے جو اس قدر شہرت اور عزت ملک و قوم کی نظر میں حاصل کی اس کا کیا سبب ہے؟ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ صرف اس وجہ سے ان کو یہ رتبہ حاصل ہوا کہ اُن کی اہلیہ اُن کی جوانی میں مر گئی تھیں۔بہت سے لوگوں نے اُن کو دوسری شادی کی صلاح دی مگر اُنہوں نے ایک

نہ سانی اور اپنے بچوں کو اپنے کنار شفقت میں لیا اور اُن کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اور اپنی دماغی طاقتوں سے جو بسبب تجربہ کے اور زیادہ سرسبز اور شگفتہ ہو گئی تھیں وہ کام لئے جنھوں نے آج اُن کو تمام ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں مشہور اور نامور کر دیا۔اگر وہ دوسری شادی کر لیتے تو ہرگز یہ رتبہ ان کو حاصل نہ ہوتا۔آپ کے لئے یہ نہایت عمدہ موقع ہے کہ آپ ہمہ تن اولاد کی تربیت میں مصروف ہو جائیے اور نوکری بھی چاہے کرو چاہے نہ کرو اور اگر زیادہ ہمت ہو تو خود بھی تحصیل علم کرو اور ہرگز دوسرا خیال دل میں نہ لاؤ۔میں سچ کہتا ہوں کہ پھر نہ اولاد کی تم کچھ خبر لے سکو گے اور نہ اپنی زندگی کا کچھ مزا اُٹھاؤ گے بلکہ زندگی تلخ ہو جائے گی اور اولاد بے علم رہ جائے گی اور اُن کو آپ سے کچھ محبت اور اُلفت نہ رہے گی۔اگر ان کو اپنا قوت بازو بنانا چاہتے ہو اور اپنی زندگی تلخ کرنا نہیں چاہتے اور اولاد کو علم و ہنر سکھانا چاہتے ہو تو کمال صبر و سکون اور عفت اور پاکدامنی کے ساتھ تجرد اور آزادی میں بسر کرو۔۔“

جب کوئی اُن کی تعریف و ستایش کرتا تو اس کا جواب یا شکریہ تو لکھتے مگر بڑی خوبی سے ٹال جاتے تھے اور بعض اوقات اپنے متعلق بھی رائے دینے سے نہیں چوکتے تھے۔مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں ”میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے میری نثر کی نسبت کئے ہیں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مگر سچ یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اُس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں قائم نہیں ہو سکتیں۔بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اسٹائل میں کونسی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے۔

می گریم و از گریہ چو طفلم خبرے نیست
در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام است“

اسی شخص نے جب حیات جاوید پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت تعریف کی تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں ”حیات جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا جو کلمات بتقاضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اگرچہ میں اپنے تئیں اُن کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔یہ وہ ہی خصلت ہے جس کو اہل ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک کر

سمجھا کرتے ہیں"—

ایک عزیز کو اکسٹرا اسسٹنٹی کا عہدہ ملا تو اُنھوں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا کہ یہ اُنھیں کی سعی اور مصلحت کی بدولت ہے۔ مولانا اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں "جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمہاری سعادت مندی اور کسی قدر تمہاری نادانی کی دلیل ہے۔ اگر بفرض محال میری کوشش کو تمہاری کامیابی میں کچھ دخل ہو بھی تو اس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تعجب کی وہ باتیں ہیں جو آج کل دنیا میں لوگ کر رہے ہیں۔ غیروں کے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں۔ اپنی بساط سے زیادہ اُن کی امداد کرتے ہیں۔ تمام قوم کے لئے ویسی ہی کوششیں کرتے ہیں جیسی کہ خاندان کا سرپرست اپنے خاندان کے لئے کرتا ہے۔ اپنی جان اور مال اور وقت اور دل و دماغ کو قوم کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ قوم کی طرف سے اُن پر گالیاں پڑتی ہیں مگر وہ قوم کا خیال نہیں چھوڑتے اور رات دن اسی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن کا ہم کو اور تم کو اور تمام قوم کو دل و جان سے شکریہ ادا کرنا چاہئے اور انہی کا صدقہ ہے کہ ہماری قوم میں کسی قدر آپس کی ہمدردی کا خیال پیدا ہوگیا ہے"—

مولانا کے مزاج میں مزاح بھی تھا مگر بہت لطیف۔ چنانچہ ان خطوں میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً وہ نواب محسن الملک مرحوم کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں "ان کا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے" یا وہ اپنے ایک نیاز مند کو لکھتے ہیں کہ "آپ کا آرٹکل جو علی گڈھ کالج کی شورش کے متعلق روزانہ پیسہ اخبار میں نکلا ہے۔ میں نے کئی دفعہ پڑھا۔ اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔۔ ۔۔۔کی حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا آپ نے اس طلسم کو بالکل توڑ دیا۔ سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ ٹرسٹیوں کی غفلت اور بے پروائی کا ذکر ہے۔ ایک دانش مند کا قول ہے کہ جب کسی بدصورت آدمی پر لوگ کوئی پھبتی کہیں اور قہقہے لگائیں تو وہ بھی اُن کے قہقہوں میں شریک ہوجائے۔ چونکہ میں بھی ننگ ٹرسٹیان ہوں اس لئے میں بھی ٹرسٹیوں کی ندامت میں اُن کے ساتھ شریک ہوتا ہوں"—

چونکہ مولانا ایک مشہور اور نامور شخص تھے اس لئے اکثر عزیز اور

احباب اُنھیں سفارشوں کے لئے تنگ کرتے رہتے تھے۔ایک ایسی ہی فرمائش پر وہ لکھتے ہیں " شاید تم اور اور لوگ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ مجھے ہندوستان کے اطراف وجوانب میں ہزاروں آدمی جانتے ہیں۔اکثر معزز اور ذی اختیار لوگوں سے بھی مجھے تعارف ہے اور اکثر بزرگ میری عزت کرتے ہیں۔ پس میں جس کی جہاں کہیں سفارش کروں گا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔لیکن اے عزیز یہ خیال بالکل غلط ہے۔دنیا دار المعاوضہ اور دار المکافات ہے۔جو شخص کسی کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے کسی نہ کسی عوض اور بدلہ کی توقع پر کرتا ہے۔میں تمہاری ایک سفارش اس لئے منظور کرتا ہوں کہ مجھے تم سے دس فرمائشیں کرنے کا موقع ملے۔پس ایک ایسے شخص کی سفارش جس سے کسی طرح کا عوض متوقع نہ ہو کیونکر کارگر ہوسکتی ہے۔جب میں زمانہ کی نگاہ میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک مشہور گویا جہاں کہیں جاتا ہے امرا اُس کی خاطر کرتے ہیں۔اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت نوکری بھی اُسے ہر جگہ مل جاتی ہے۔لیکن اگر وہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سفارشیں کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف اصلا التفات نہیں کرتا۔یہی میرا حال ہے ... "

مولانا نے ایک النامہ بھی لکھا تھا جو اُن کی زندگی میں شایع نہیں ہوا کیونکہ اُس میں ہر فرقے اور گروہ پر چوٹ ہے۔چند جملے انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھے ہیں مثلاً المذھب۔اعلان جنگ۔الدین۔تقلید آبا و اجداد۔ العلم۔قسمے از جہل مرکب۔الامتحان۔آزمائش لیاقت ممتحنان۔الیونیورسٹی۔ کارخانہ کلرک سازی۔العلی گڈہ پارٹی۔شہید وفا۔العلی گڈہ کالج۔پرورش گاہ طفلاں بدست مائندراں۔الکمیشن۔وجۂ موجہ براے فیصلۂ یک طرفہ "—

ان خطوں میں کہیں کہیں ادبی نکات بھی ملتے ہیں مگر بہت کم۔یہ زیادہ تر کاتب یا پوچھنے والے پر منحصر ہے۔کسی نے اگر کوئی بات پوچھی ہے تو اس کا جواب معقول دیدیا ہے۔علاوہ اس کے یہ مجموعہ کامل نہیں ہے۔ بہت سے ایسے خط ہوں گے جو تلف ہوگئے ہیں یا قابل مرتب کے ہاتھ نہیں لگے—

ان خطوں سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ جواہرات حالی میں جو حال میں شیخ محمد اسمعیل صاحب نے پانی پت سے شایع کی ہے۔بعض نظمیں چھوٹے بچوں کے لئے مولانا کے نام سے درج ہیں۔ان میں سے اکثر نظمیں مولانا کی لکھی ہوئی نہیں۔اصل حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے خلف الرشید

خواجہ سجاد حسین صاحب سے ان کے السپکٹر تعلیمات نے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے کی فرمائش کی۔انہوں نے ہامی بھرلی اور مولانا کو لکھا۔مولانا کو طوعاً کرھاً قبول کرنا پڑا۔ لیکن اس زمانے میں مولانا علیل تھے اور علالت نے طول کھینچا تو انہوں نے یہ نظمیں مولوی محمد سعید صاحب مرحوم مدرس اول عربی و فارسی۔بورڈ ہائی اسکول دہلی سے لکھوادیں اور کہیں کہیں مناسب اصلاح کردی—

آخر زندگی میں مولانا خانگی جھگڑوں اور فکروں سے بہت عاجز آگئے تھے اور چاہتے تھے کہ کہیں فراغت اور اطمینان سے بیٹھ کر کچھ علمی کام کریں لیکن افسوس کہ یہ فراغت کبھی نصیب نہوئی۔بلکہ اسی پہ حیرت ہے کہ ان تمام حالات میں انہوں نے اتنا بڑا کام کیونکر کرلیا۔اردو ادب کے متعلق دو ایک کام اُن کی پیش نظر تھے جن کا مسودہ انہوں نے خوب غور کرکے اپنے دل میں قائم کرلیا تھا۔ان کی دلی تمنا تھی کہ اپنی زندگی میں انہیں پورا کردیں۔ لیکن اس کا موقع نہ ملا اور وہ سارے مسودے دل کے دل ھی میں رہ گئے۔ آخر آخر میں اُن کا ارادہ تھا (جیسا کہ اُن خطوں سے معلوم ہوگا) کہ اورنگ آباد میں رہ کر کچھ کام کریں لیکن علالت نے مہلت نہ دی اور اسی علالت میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔تاہم وہ اتنا کچھ اور ایسا کچھ کر گئے ہیں کہ وہ کسی ملک اور کسی قوم میں ہوتے اُن کی ہستی قابل فخر سمجھی جاتی۔اُن کی زندگی علمی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے ایسی پاک صاف۔خالص اور بے ریا ہے کہ ہمیشہ اہل وطن کی رہنمائی کرے گی اور اردو زبان پر تو اُن کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اہل زبان اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔۔

ادب میں سینکڑوں دلکشیاں ہیں۔اس کی بے شمار راہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں۔ لیکن خطوں میں جو جادو ہے (بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔نظم ہو ناول ہو ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے۔اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔بناوٹ کی باتیں جلد پرانی اور بوسیدہ ہوجاتی ہیں۔ صرف سادگی ھی ایک ایسا حسن ہے جسے کسی حال اور کسی زمانے میں زوال نہیں۔بشرطیکہ اس میں صداقت ہو۔اور ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟ یہ ہمارے خمیر میں ہے۔یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے جھوٹ بولے۔اور یہی وہ فطری تقاضا ہے کہ بعض اوقات ہم ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دلکش سی دلکش

نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول کو اُٹھا کے الگ رکھ دیتے ھیں۔ھماری ھر تصنیف و تالیف۔ ھماری ھر علمی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ھے۔غیروں کے لئے ھے۔اور یہ سمجھ کر لکھتے ھیں کہ غیروں کے ھاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گے۔اس لئے مصلحت وقت کا بھی خیال ھوتا ھے۔عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ھے۔تکلفات بھی برتنے پڑتے ھیں۔خیال کو صاف صاف لکھنے کے بجاے طرح طرح کے پیراے اختیار کرنے پڑتے ھیں۔لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھتا ھے تو وھاں کوئی غیریت باقی نہیں رھتی بلکہ بسا اوقات دوی کا پردہ بھی اُٹھ جاتا ھے۔وہ ھر مسئلہ اور ھر شے کے متعلق جیسا اُس کا خیال ھوتا ھے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ھے۔وہ اپنی راے میں آزاد ھوتا ھے۔وہ نہ دوسروں سے جھوکتا ھے اور نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ھے۔اس وقت نہ اُسے خوف لائم ھوتا ھے اور نہ نکتہ چیں کا کھٹکا۔خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ھے جو دلوں کو لبھا لیتی ھے اور یہی وجہ ھے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ھوتا ھے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ھو سکتا۔اُن خطوں میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ھے۔جو خیال جس طرح اُس کے دل میں ھوتا ھے اُسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ھے۔نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کے رکھ دیتا ھے اور اگر وہ دل ایسا ھو جو سراسر درد سے لبریز ھو۔جس میں ھمدردی نبی نوع انسان کوٹ کوٹ کے بھری ھو۔جو پریم کے رس سے سینچا گیا ھو۔تو بتاؤ کہ اُس دل کی تراوش کیسی ھوگی؟ اگر تم اس دل کی زیارت کرنی چاھتے ھو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ھوا ھے*--

تبصرۃ الفہرست

دنیاے صحافت اور عالم اشاعت میں ارباب قلم کی صدھا قسمیں اور اھل انشا کی سیکڑوں قومیں آباد ھیں یہاں ان سب کے شمار و اعداد سے بحث نہیں بلکہ اس جم غفیر میں صرف دو اصناف کا تذکرہ مقصود ھے۔ایک وہ جو اپنی ذاتی ناموری و شہرت کی بدولت اشاعت کتب میں کامیابی حاصل کرتے

---

* کتاب دو جلدوں میں چھپی ھے جو تقریباً پونے آٹھ سو صفحے پر ھے۔فاضل مرتب سے پانی پت سے یا انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے چار روپیہ کلدار میں مل سکتی ھے۔

میں موجود ہے وہ جس کو حسن اتفاق سے کتاب کے لئے ایسا موزوں و دلچسپ نام مل جاتا ہے جس کی عام دل پسندی تصنیف کے پہلے ایڈیشن کو ایک حد تک تاجران کتب اور اہل ذوق سے روشناس کر دیتی ہے۔ پہلی قسم کے اکثر مصنفین تو دو چار تصنیفوں کے بعد کچھ ایسا مرض استغنا لاحق ہو جاتا ہے کہ اگر اُن کے موجودہ کارناموں کو دس برس پہلے کی تصنیفات سے ملایا جائے تو ان دونوں نمونوں میں باہم کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی وہ کاوش تحقیق اور سعی قلم جو نام آوری کی اُمید میں ابتداء نظر آتی ہے شہرت یابی کے بعد سہل انکاری سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِلا ماشاءاللہ۔ اب رہے صنف ثانی کے حضرات اُن کے متعلق بہ سوء ظنی تو بہر حال بے محل ہے کہ وہ طالب شہرت نہیں: ع جہل گردد جہلی بر نہ گردد۔ خوشامد پسندی اور شہرت طلبی انسان کی طبیعت ثانی بن گئی ہے اور چوں کہ اب اسی رنگ کو قبول عام حاصل ہے اس لئے کسی کو کسی سے جھجھکنے کی ضرورت نہیں "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" مگر یہ واضح رہے کہ ایسی خود ساختہ طبیعت ثانی فطرت ازلی کو دبا نہیں سکتی اگر ان کی بر خود غلط خواہشات کو کامیابی حاصل نہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں موزونیت نام اور دل چسپی مضمون کی گندم نمائی سے ایک مرتبہ نقد سودا تو ہو جاتا ہے مگر تاجران کتب کی جو فروشی سے خریداروں کی نگاہ میں پھر کوئی ساکھ قائم نہیں رہتی —

اس تمہید کے بعد جس کتاب کے متعلق چند خیالات کا اظہار منظور ہے وہ مذکورۂ بالا دونوں حیثیتوں کا مجموعہ ہے یعنی مصنف بھی غیر معروف نہیں اور مضمون و نام بھی بخصوصیت عام دل کشی کا ناز پرور ہے بایں ہمہ بحسرت کہنا پڑتا ہے کہ مرض استغنا کے ساتھ عارضہ بے حسی بھی اس کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے —

پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی نے حسب بیان خود انجمن ترقی اُردو کی تجویز کے مطابق الفہرست کو مرتب کرنا شروع کیا ہے اور مسلسل بیس برس کی محنت شاقہ کے بعد (۸۱۵) صفحات کی کتاب شائقین کے دست طلب تک پہنچائی ہے۔ کتاب مذکور جیسا کہ اُس کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے مطبوعات اُردو کی فہرست ہے۔ ادبی اہل مذاق میں شاید ہی کوئی کودن ایسا ہوگا جس نے الفہرست کا نام سن کر بے تابی کے ساتھ اس کے مطالعے کی خواہش پیدا نہ کی ہو۔ ایسی مقبول النام کتاب کو کیسا ہونا چاہئے؟ اس توضیح سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کے دیباچہ کا اقتباس لکھا جائے جس سے یہ اندازہ

ہو سکے گا کہ اس کی ترتیب و تالیف میں کیا کیا وعدے کئے گئے ہیں اور اُن کا ثبوت کس کس طرح بہم پہنچایا ہے۔

اقتباس دیباچہ

"سنہ ۱۹۱۳ء میں جب انجمن ترقی اُردو قائم ہوئی تو ایک تجویز یہ بھی ہوئی تھی کہ ایک فہرست اُن تمام کتابوں کی مرتب کی جائے جو اس وقت تک تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہر فن میں کس قدر کتابیں کس کس پائے کی موجود ہیں تاکہ آئندہ اُن سے بہتر کتابیں تصنیف کرائی جائیں اور اُردو کا قدم علم کے میدان میں آگے بڑھایا جائے...... ملک میں ہر فن کے صاحب کمال موجود ہیں۔میں نے چاہا کہ اُن کی مدد سے اس کام کو پورا کروں چنانچہ بعض صاحبوں سے التجا کی کہ اپنے اپنے فن کی کتابوں کی فہرست مرتب کر دیں ......مگر مجھے یہ ظاہر کرتے افسوس آتا ہے کہ پوری ایک نے بھی نے دی اور تو اور مصنفین سے ان کی تصانیف کی فہرست پوچھی تو اکثر اصحاب نے راقم کے نیازناموں کا جواب بھی نہ دیا مجھ اکیلے سے جو کچھ ہو سکتا تھا کئے جاتا تھا آج پورے تیس برس اس دھن میں کٹ گئے والی مملکت دکن کی سرپرستی نے میری ہمت کے بازوؤں میں نئی طاقت پیدا کر دی اور میں ہمہ تن علمی مشاغل میں مصروف رہا اور جیسی مجھ سے ہو سکی فہرست مرتب کر دی......مجھ کو اعتراف ہے کہ فہرست ناقص ہے اور بہت سی باتیں اس میں اصلاح کے قابل ہیں اُردو ایک زندہ زبان ہے اور وہ بھی نوعمر۔اس میں روز بروز نئی کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں اس سبب سے یہ کوشش کہ تمام کتابوں کے نام اس میں آجائیں کبھی بارآور نہیں ہو سکتی فہرست کا نامکمل اور ناقص رہنا لازم ہے۔ممکن ہے کہ اثنائے طبع میں ایسی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئی ہوں جن کے نام اس میں نہ ہوں......جب خطوط سے کام نہ چلا تو میں نے ارادہ کیا کہ خود ہی سفر کروں اور ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں میں جا کر کتابوں کے متعلق معلومات حاصل کروں اس غرض کے لئے میں نے سرکار سے تین ماہ کی رخصت مانگی سرکار نے کتاب کی تیاری کے لئے روپیہ بے دریغ

دیا تھا جس وقت دہلی میں تامل فرمایا ناچار، مجھے بھی جو کچھ
جمع ہو گیا تھا اُسی پر قناعت کرنی پڑی" (اسی سلسلۂ عبارت
کے ساتھ وقت نہ دینے کے ثبوت میں معتمد صاحب نعلیمات کا
مراسلہ نشانی ۱۹۶۴/۱۹۶۵ نقل کیا گیا ہے جس سے مولف
کی دلت نظر اور اعتقاد صداقت پر آفرین کہنے کو جی چاہتا ہے)

یہ اقتباس دیباچہ کے ۲ صفحوں سے لیا گیا ہے۔اورکتاب کے نفس ترتیب کی بحث انہیں سطروں میں ختم کردی گئی ہے۔اس کے بعد آخر دیباچے تک اردو زبان کی ابتدائی و تمہیدی تاریخ اور بعض مصنفین کی کتابوں کا ذکر اور انجمن ترقی اُردو کی مطبوعات کا تبصرہ ہے۔غرض کہ اس التقاط سے مولف کی مجبوریوں اورہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں تک نہ پہنچنے کا حال معلوم ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس کے اُن کے انہماک وشغف اور مالی بے فکریوں کا اندازہ بھی ظاہر ہورہا ہے۔اس مسئلۂ جبر و اختیار کے سمجھنے کے بعد اگرچہ اہل ذوق کی توقعات بہت محدود رہجاتی ہیں پھر بھی (۸۱۵) صفحات کا حجم کافی امید افزائی کا ضامن ہوسکتا تھا۔یعنی اس عبارت میں اگر فہرست کے ناقص رہنے کے اعترات پر بیان ختم ہوجاتا تو یقیناً ماننا پڑتا کہ صات گو مرتب نے ایک ناقص کتاب کو بمجبوری یا بضرورت شائع کردیا ہے مگر اس کے بعد کا سلسلۂ عبارت ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ جملے نہ صرف رسمی تکلف ادبی کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں بلکہ حقیقتاً وہ اس تفصیل کا اجمال ہیں کہ دوران طبع میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ اس فہرست میں درج نہیں ورنہ اس سے پہلے کی اکثر مطبوعات مندرج کردی گئی ہیں—

۸۱۵ صفحوں کی کتاب کے ساتھ مقدمے کا جتنا تعلق ہوسکتا ہے وہ ۲ صفحوں سے ایک سطر بھی زیادہ نہیں اُس کے بعد تاریخ اُردو کے لئے ۳ صفحہ دیے گئے ہیں۔ اگرچہ اس تاریخی تحقیقات میں یہاں کسی عام تنقید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی تاہم بطور فائدہ ایک غلط فہمی کا رفع داد نا مناسب نہ ہوگا۔دیباچہ کے صفحہ ۶ پر عبارت ذیل پڑھی جائے:—

> مخاطب کو اپنا مفہوم سمجھانے کے لئے مسلمانوں نے بھاشا اور ہندوؤں نے فارسی الفاظ بولنے شروع کئے۔ہوتے ہوتے اس اختلاط نے ایک تیسری زبان ایسی پیدا کردی جس کو نہ فارسی ہی کہہ سکتے ہیں نہ بھاشا۔بلکہ ہندو مسلمانوں کی ضرورت پورا کرنے کی ایک مخلوط زبان تھی۔شاہجہاں کے زمانے میں جب دہلی

دارالخلافہ قرار پائی تو ہر ملک کے لوگ جو مختلف بھے (اس کے بعد کا لفظ پڑھا نہیں جاتا شاید " زبانیں " ہو جس کو زمانۂ کاتب نے لکھدیا ہے) رکھتے تھے دھلی میں آکر جمع ہوے اور یہ زبان باہمی تفہیم مطالب کا آلہ بن گئی-اور اُردو کہلائی"—

آب حیات اور اُس کے بعد اُس کی تائید و تقلید میں جتنی کتابیں مرتب ہوئی ہیں اُن سب نے یہ غلط خیال پھیلادیا ہے کہ اُردو کا نام (بہ حیثیت زبان) شاھجہان کے عہد سے مروج ہوا ہے۔حالانکہ اُس وقت عموماً اُردو کا مفہوم لشکر یا لشکر گاہ کے سوا کچھہ اور نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تغلقی عہد کے امیر خسرو ہوں یا علی عادل شاہی نصرتی و ھاشمی حتی کہ محمد شاھی زمانے کے ولی-حاتم-آبرو-آرزو وغیرہم سب کے سب بغیر کسی شبہے اور استثنا کے اس ممزوج زبان کو ریختہ کہتے رہے ہیں-یہاں تک کہ اب سے پون صدی قبل مرزا غالب بھی کہتے ہیں—

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

بظاھر اس غلط اشاعت و یقین کا سبب اُردوے شاھجہانی کا لقب ہے جو محض اُس لشکری بازار کو دیا گیا تھا جو صاحب قران کے حکم سے قائم کیا گیا تھا۔ اگر دکھنی اور دھلوی تاریخی منقولات ادب غلط مان لی جائیں تو ایسی نفی کا اثبات محال ہے ورنہ کون ہے جس کو " خالق باری " اور "علی نامہ" جیسی مولفات دیکھنے کے بعد یہ وھم بھی ہوسکتا ہو کہ اُردو شاھجہاں کے عہد میں پیدا یا مروج ہوئی اور بفرض محال اگر لفظ اُردو کا استعمال عصر کہن میں کسی زبان کے لئے ثابت بھی ہوجاے تو سعدی دکنی اور امیر خسرو وغیرہم کے اشعار دیکھتے ہوے اُردوے شاھجہانی کی جگہ اُردوے تغلقی یا عادل شاہی کہنا حق بجانب ہوگا اور اس طرح سلف صالحین کی محنت کا شکریۂ اعترات نہ سعادت اخلاق کا ثبوت مانا جاے گا—

اسی سلسلۂ تحقیقات تاریخی میں میر شیر علی افسوس کی کتاب باغ اُردو کا زمانۂ تالیف بھی غلط بتایا گیا ہے۔باغ اُردو تاریخی نام ہے جس سے سنہ ۱۲۱۴ ھجری بر آمد ہوتے ہیں اور اُس کی مطابقت سنہ ۱۸۰۰ ع سے ہوتی ہے یہ سنہ آغاز تالیف کا ہے اور انجام کی تاریخ " آغاز اُردوی " ہے جس سے سنہ ۱۲۲۴ ھجری حاصل ہوتے ہیں مگر مرتب الفہرست نے سنہ ۱۷۷۲ ع چھپوائے ہیں جو شاید اُن کی ولادت کا زمانہ ہوسکتا ہو—

اتنی دیباچه نویسی کے بعد صفحه (۸) کے آخر سے صفحه (۱۷) تک مطبوعات انجمن ترقی اُردو کی جو فہرست و تشریح کی گئی ہے اُس کی تصحیح و تلفظ کا بار انجمن مذکور کے روضه نشین سکریٹری صاحب کو اپنے سر مبارک پر لینا چاہئے۔کیوں که راقم عاجز کو ابھی جتنے بھاری پتھروں کو چوم کر چھوڑنا ہے اُن کے مقابل میں مطبوعات انجمن کا شمار صفر (۰) کا مترادف ہے—

دیباچے سے گزر کر سب سے پہلے جو ورق سامنے آتا ہے اُس پر مضامین مندرج کی فہرست بر محل چہرہ کشا ہوتی ہے۔غالباً مرزا صاحب نے طوالت و صرفهٔ کاغذ کے ڈر سے مضامین کے خانهٔ شمار کو " چون مد بحساب اندر " سمجھ کر تبصرہ نویس کو عقد انامل کا عادی بنانا چاہا ہے۔چناں چه اس چھوٹی ہوئی عادت کو از سرنو یاد کرنے کی زحمت گوارا کرنے کے بعد معلوم ہوا که ترتیب مضامین کا شمار (۹۴) تک پہنچتا ہے۔اگر ہر مضمون سے پہلے نمبر کا نمبر بھی ہوتا تو یقیناً اس شکوہ واجبی کی گنجائش نه رہتی۔بہر حال اس نود و چہار یعنی ہم جوار ۹۹ نود و نه کے پھیر سے نکل کر ترجمهٔ قرآن مجید کی تلاوت کا شرف حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سرسری نگاہ سے یه بھی نظر آتا ہے که دقیقه رس مرتب نے مختلف مذاہب کی کتابوں کو جدا جدا دکھایا ہے۔مثلاً۔فقه (غالباً اہل سنت) فقه اہل تشیع۔دینیات۔اہل سنت و جماعت۔دینیات اہل تشیع۔مذہب نصاریٰ۔مذہب ہنود۔اس احتیاط و تشریح کا اقتضا تھا که ترجمهٔ قرآن شریف میں بھی اہل سنت و تشیع کی تفریق کردی جاتی۔خدا جانے کوئی نا معلوم مصلحت تھی یا غفلت مجہول که اس قیاس مع الفارق کو متعمد سمجھا گیا—

قرآن شریف کے بعد تفسیر کا نمبر ہے اور اسی سے متصل تجوید کا حالانکه اصول تفسیر اور اصول فقه یه دونوں مشہور و مستقل فن مانے جاتے ہیں ان کا عدم اندراج بھی تعجب خیز ہے۔اسی سلسلے میں سب سے زیادہ حیرت اسماءالرجال کا عنوان نه پا کر ہوتی ہے۔تذکرۃالشہدا کے عنوان کے بعد تذکرۃالاولیا کا عنوان بھی ضروری تھا مگر شاید اس پہلو تہی میں فلسفهٔ عملی کے ماہر کی کوئی حکمت عملی پوشیدہ ہوگی۔فہرست مضامین کی اسی قدر تنقید اور تشریح کافی ہے۔ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہیں که ایسی کتاب کو کیسی فہرست کے ساتھ مرتب ہونا چاہئے تھا اب آئیے اصل کتاب کو کھول کر دیکھا جائے که اس عنوانی ترتیب میں کسی خاص مصروفیت و تنگی

وقت کی وجہ سے تساہل و تسامح بعید از قیاس نہیں —

رسالہ اُردو اپنے طویل الذیل حجم کی بدولت جوع المضامین کا ضرور عادی ہے مگر ڈرتا ہوں کہ نقد و نظر کی لطافت و لذت اس داستان دراز کو اتنا نہ بڑھا دے کہ موجودہ اشاعت میں دوسرے مضامین کی جگہ نہ رہے اس لئے حتی المقدور کوشش کی جائے گی کہ مختصر مگر مدلل تبصرے پر مضمون کو ختم کر دیا جائے۔فہرست مضامین کے ۵۳ عنوانات کے نمبروں کی تفصیل غیر ضروری ہے اور وہ اس لئے کہ تمام عنوان کے تحت میں ایک ربع خانہ پری بھی مکمل نہیں ایسی حالت میں ایک ایک نمبر کے لئے ایک دوسری (۸۱۶ صفحوں کی کتاب لکھنا کم از کم اس وقت میرے امکان سے باہر ہے۔قصہ کوتاہ اور اذکار سے پہلے اُس نقشے کی نقل کی جاتی ہے جس کے تحت میں تمام کتابوں کی فہرست ہے: —

نمبر	نام کتاب	نام مصنف	سنہ اشاعت	تعداد صفحات	قیمت	نام مطبع	ملنے کا پتا	کیفیت

بادی النظر میں یہ خانہ کشی معلومات بڑھانے کے لئے کافی و موزوں ہے مگر جس کاوش و خیال سے یہ عنوانی نقشہ قائم کیا گیا ہے اُسی توجہ سے خانہ پری بھی کی جاتی تو یہ فہرست اپنی نوعیت میں بے مثل کتاب ہوتی دو ایک عنوان اس نقشے میں زائد بھی ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا کیوں کہ اُن کے ہونے سے مستقبل کوئی مستقل فائدہ نہیں۔مثلاً (قیمت کتب اور ملنے کا پتا) یہ عنوان اس لئے مدفضول ہیں کہ ایک نہیں سیکڑوں کتابیں ایسی ہیں جن کے انطباع کا موقع صرف ایک بار ہاتھ آیا ہے اور اُس طباعت کو بھی اتنا عرصہ ہوچکا ہے کہ کسی مطبع یا کتب فروش کے پاس اُس کا ہونا یقنی نہیں۔ان عنوانوں کے عیوض میں اگر دو عنوان اور قائم کئے جاتے تو یہ فہرست نہ صرف کتابوں کے نام اور پتہ بتاتی بلکہ مختصر تاریخ ثابت ہوتی۔وہ عنوانات مختصراً حالات مصنف اور مجملاً مضمون تصنیف کی تنقید کے متعلق ہونے چاھئے تھے۔اس زمانے میں فہرست کتب شائع کرنے کی اصلی غایت اس سے بہتر اور کیا ہوسکتی ہے کہ ناظرین فہرست اصل کتابوں کے مطالعے سے ایک حد تک مستغنی ہو جائیں اور جس قدر ضروری باتیں ایک تصنیف میں ہوتی ہیں اُن سب کا مختصر نمونہ فہرست میں نظر آجائے۔ظاہر ہے کہ تعداد صفحات کے شمار سے بہتر یہ مفید باتیں تھیں کہ کتاب کا ماله وماعلیه اور مصنف کے خاص

خاص خاص و مشہور واقعات مثل توطن و سلین ولادت و وفات وغیرہ معلوم ہوتے رہتے۔اگرچہ دریائے معلومات کے مقابل میں یہ ایک چھینٹا ہوتا پھر بھی اس اوس سے تشنہ کامان تاریخ کی پیاس تھوڑی بہت ضرور بجھ جاتی—

اس طولانی تبصرے کو ختم کر کے تکمیل خانہ پری پر جب نظر پڑتی ہے تو مدون فہرست کی شان سادگی (عدم خانہ پری) نئی بہار دکھاتی ہے۔تراجم قرآن شریف میں ۲۰ ترجمے درج کئے گئے ہیں مگر ان میں خانہ کشی کے حساب سے بصلحت تصلیف فرو گزاشتیں موجود ہیں۔جن کی تشریح حسب ذیل ہے —

(۱) خانۂ کیفیت میں ۲۰ کیفیتوں کی جگہ صرف ۲ کیفیتیں مندرج ہیں اور وہ بھی مجہول—

(۲) ملئے کے پتوں میں صرف (۷) پتوں کا نشان ہے—۱۳ ندارد—

(۳) مطبعوں میں بھی نصف نا۔ چھپے ہوئے ہیں اور حیرت ہے کہ مرزا حیرت—مولوی نذیر احمد اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں کی جائے طباعت تک مفقود ہے—

(۴) قیمت کا شمار بھی نصف نصف ہے—

(۵) صفحات میں صرف (۲) مجلدات کے شمار کی غالباً خیالی یا تخمینی تکلیف گوارہ کی گئی ہے—

(۶) سنہ اشاعت میں حکومت تثلیث کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے—

(۷) ۔ترجمین (مصنفین) کے ناموں میں بھی پانچ نا۔ کسی خصوصیت سے دو چار معلوم ہوتے ہیں—

(۸) اب رہے کتابوں (قرآن) کے نام جن کو ترجمۂ قرآن کے سوا کسی نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔مگر اس فہرست میں تراجم قرآن کے نام یہ ہیں —

(الف) اعجاز القرآن۔معجزات قرآنی کی بحث میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔لفظاً لفظاً تو کیا جستہ جستہ بھی ترجمے کا پتہ نہیں—

(ب) اعجاز البیان فی لغات القران—

(ج) مفتاح القران—

(د) لغات القرآن—

(ہ) دلیل العیران—

(و) کلید خزائن قران—

(ز) جواهر قرانی—
(ح) معجزات القران—
(ط) جواهر الصمدیه فی احکام القرانیه—
(ی) اقتباس الانوار من کلام الغفار—
(ک) فہرست المضامین من کلام رب العالمین—

جیسا کہ ان کتابوں کے ناموں سے ظاہر ہے وہی مبحث یعنی خاص خاص مضامین قرانی یا فہرست و الفاظ فرقانی نظر آتے ہیں-ان کو مستقلاً ترجمے میں شامل کرنا مرزا صاحب ہی کا کام تھا-اگر اس قسم کے امتزاج کی اطلاع مقدمے میں لکھہ دی جاتی تو اصولی فرو گزاشت کے سوا اشترا کی غلطی کی گرفت کا موقع نہ ملتا-ایک نئی اور مفید معلومات اس فہرر میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ فتح الحمید نامی ایک ترجمۂ قران نواب محمد حسین قلی خاں نے اور ایک ترجمہ قران مولوی نصیرالدین نے بھی کیا ہے-اول الذکر کے خانۂ کیفیت میں یہ الفاظ درج ہیں (لفظی ترجمہ برائے اہل تشیع)-موخرالذکر بجز لفظ آگرہ (نام مطبع) اور ہر ایک خانہ پری سے معرا ہے-شایقین ترجمہ عموماً اور برادران شیعہ خصوصاً نواب محمد حسین قلی خاں کے لفظی ترجمے کے جس قدر مشتاق ہوسکتے ہیں-اُس کا اندازہ مجھہ سے زیادہ بعض ناظرین کو ہوگا-افسوس ہے کہ اس مفید تحقیقات کو ایسی بے پروائی سے ختم کیا گیا ہے کہ بجاے شکر مدون کا شکوہ زبانوں پر جاری ہے-علاوہ تراجم اہل سنت مولوی مقبول احمد اور مولوی فرمان علی کے شیعہ ترجمے آج کل اس قدر دائر و سائر ہیں کہ دہلی اور قریب قریب اکثر بڑے بڑے شہروں کے کتب فروش بھی اُن سے نابلد نہیں مگر مدون الفہرست لا علم ہیں-العجب !! یہ ایک عنوان فہرست کی مجملاً تفصیل کی گئی ہے اگر اسی حیثیت سے تمام عنوان کی شرح کی جاے تو صفحات اُردو کیا اوراق زمین و آسمان سے آہین ان یصملنہا کی صدا بلند ہونے لگے-جس کتاب کی باے بسم اللہ میں یہ حالت ہو اُس کی تاے تمت تک پہنچنا اگر " کوہ کندن و کاہ برآوردن نہیں " تو " صبح کرنا شام کا لانا ہے جوے شیر کا " ضرور ہے-اس لئے ہر عنوان کی خانہ پری کو اس تفصیل سے بیان کرنا غیر ضروری ہے-من شاء التفصیل فلیرجع الی الفہرست (مکر مفنت)—

اگرچہ ناظرین سے زیادہ راقم الحروف اس تبصرے کی طوالت سے گھبرا رہا ہے مگر چوں کہ ہر عنوان کے تحت میں مختلف صنعتوں کے ساتھہ ترتیب کی

نیرنگیاں نظر آتی ھیں اس لئے دیدہ و دانستہ تبصرہ نویسی کے معمولی فرائض بھی ادا نہ کرنا شایقین الفہرست کو دھوکا دینا ہے۔تمام عنوانوں سے جملہ قسم کی غلطیوں کا احصا و شمار آسان نہیں لہذا صرف اقسام اغلاط کی تعداد کا حتی الامکان لحاظ رکھا جاے کا نہ یہ کہ (۵۱۸) صفحات کے مجموعۂ اغلاط کو گنوایا جاے۔ان چند نمونوں کی سیرھی سے اہل مذاق سیر ہو جائیں کے اور سمجھہ سکیں گے کہ کس قدر دیدہ ریزی اس مدون نے مفید کام کی تدوین میں فرمائی ہے۔۔

اقسام اغلاط

(۱) مختلف فنون کی کتابوں کا تصادم یعنی تراجم سے لغات اور تاریخ سے فاول کو بھڑا دیا ہے —

(۲) ایک مضمون کی تصنیف کو دو کیفیتوں میں منقسم کر دیا ہے —

(۳) معمولی اور متداول کتابوں کی حقیقت و حالت غلط لکھی ھے یا عنوان کے خانوں کو خالی چھوڑ دیا ہے —

(۴) ایک کتاب کو ایک ھی عنوان میں مکرر دکھایا ہے —

(۵) بعض مشہور ترین تالیفات حال کو درج نہیں کیا ہے —

(۶) اُردو کتابوں کی فہرست میں فارسی و عربی کی کتابیں بغیر اطلاع ترجمہ اصل مصنفین عرب و عجم کے ناموں کے ساتھہ درج کی گئی ھیں۔

(۷) عموماً عنوانات لکھنے کے لئے ایک صفحہ مخصوص کیا گیا ہے مثلاً تراجم قرآن۔تفسیر و غیرہ۔لیکن متعدد عنوانات ایسے بھی ھیں جن کو یہ تمغاے امتیاز عطا نہیں ہوا —

(۸) ایک طرح کی کتابوں کے خواہ مخواہ دو عنوان قائم کئے گئے ھیں مثلاً سیرت نبی۔مولود شریف و سوانح عمری رسول اکرم —

(۹) خانۂ شمار کے ھندسے بعض عنوانوں میں غلط ھیں —

(۱۰) مصنفوں کے نام غلط لکھے ھیں (دیکھئے صفحہ ۸۸)

اب اس اجمال کے تفصیلی نمونے ملاحظہ ہوں:-

(۱)

(الف) تراجم قرآن کے ساتھہ جو لغات قرآن وغیرہ کی غیر متعلق کتابیں شامل کی گئی ھیں اُن کے نمونے اس سے پہلے لکھہ دئے ھیں مکرر تکلیف نظر فضول ہے —

(ب) موضح القرآن۔مصنفۂ شاہ عبدالقادر دھلوی۔یہ نام شاہ صاحب کے

ترجمۂ قرآن کا ہے جیسا مولوی نذیر احمد نے اپنے ترجمۂ قرآن میں خبر دی ہے —

(ج) عنوان تفسیر کے اکیسویں نمبر میں مقدمۂ تفسیرالقرآن مصنفہ مرزا حیرت دہلوی بہ تعداد صفحات (۷۱۸) بغیر اظہار قیمت درج ہے اور اس کے بعد نمبر ۲۲ میں تفسیرالقرآن اسی پر حیرت مصنف کے نام سے بہ تعداد صفحات (۷۲۰) بہ قیمت چھ روپیہ سنہ ۱۲۲۲ کی مطبوعہ موجود ہے۔ اس اندراج کے متعلق کئی باتیں تنقیح طلب ہیں۔ اول یہ کہ سنہ ۱۲۲۲ ہجری ہیں یا عیسوی ہیں۔ اگر ہجری ہیں تو مرزا حیرت کی زندگی قابل رشک ہے اور اگر عیسوی ہیں تو غالباً اب حضرت عیسیٰ کی دوبارہ تکلیف فرمائی تحصیل حاصل ہے : ع : عیسیٰ کی ہیں اس نے آنکھیں دیکھیں۔ بہر حال اس لطیفۂ سخن میں یقیناً ایک شوشے کا فرق کاتب کے سر تھوپا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۳ کو ۱۲ لکھ گیا ہو گا۔ مگر اس تعجب کا کیا علاج کیا جائے کہ جس تفسیر کا حجم ۷۲۰ ہو اُس کے مقدمے کی ضخامت صرف دو صفحے کم ۷۱۸ دکھائی گئی ہے۔ اکثر مدعیان وقوت اب تک مولوی عبدالحق صاحب کو الفضل للمتقدم کا دعویدار و مستحق سمجھے ہوئے تھے مگر ایسی مقدمہ بازی کے سامنے : ع : غلط است آنچہ مدعی گوید —

(د) تفسیرالقرآن مصنفہ سرسید احمد خاں مطبوعہ نول کشور لکھنؤ (۱۳۱۵) قیمتی چالیس روپیہ ضرور قابل دید تفسیر ہو گی (یعنی مطبوعہ نول کشور) چوں کہ تعداد صفحات لکھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی اور مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی پتہ نہیں چلا ناظرین کرام میں کوئی مبصر توجہ فرما کر تکلیف اطلاع گوارا کرے تو راقم حروف بے حد ممنون ہو گا —

(ہ) تراجم قرآن کے نمبر ۹ میں اعجازالقرآن مصنفہ مولوی ابوالحسن صدیقی مندرج ہے یہی نام اسی مصنف کے نام سے تفسیر میں درج ہے صرف فرق اتنا ہے کہ پہلی نظامی بک ایجنسی سے ۲ آنہ میں ملتی ہے اور دوسری ۲ آنہ میں مقلن دکن حیدرآباد میں چھپی ہے۔ اب اس صغریٰ و کبریٰ سے ناظرین جو چاہیں نتیجہ نکال لیں —

(و) فن تجوید میں نجوم القرآن۔ جرزالاصول الفروع۔ رموز القرآن۔

وجوہ المعانی۔آداب قرآن کے نام بھی موجود ہیں جن کو فن قراءت سے کوئی واسطہ نہیں —

(ز) علم اخلاق کی بعض کتابوں کے نمونے یاد رکھنے کے لایق ہیں — ٹھیٹھ کی پری۔جو سالگو۔اخلاق کاشی۔آئینہ ہند۔باغ بہاری۔جی گھام۔کچکول بھوا۔لال چندریکا۔پریس باغ۔ان کتابوں کے ساتھ چند خاص کتابیں اور ہیں جن کا نمونہ نمبر ۲ میں دیکھا جائے اور پھر اس سنگم کے جوڑ کی خوش ربطی کو سراہا جائے —

(ح) تاریخ انگلستان کے عنوان میں تاریخ روم بھی شامل ہے اور ایران کی سیاسی تاریخوں کے ساتھ شعرالعجم میں جو عذوبت ہے اس کی داد دینے سے لب چپکتے ہیں —

(ط) تصوف ہنود پوتھی گیان پرشاد سے شروع ہوتا ہے اور ارتقائی معراج معرفت پاتا ہوا فصوص الحکم اور دریاے حقیقت سے عبور گزرتا ہے پھر رسالۂ شرافت پر ختم ہوجاتا ہے۔اس عنوان میں جس صنعت تعطیل سے کام لیا گیا ہے اس کا تذکرہ نمبر (۷) میں ہوگا —

(ی) اور فنون کے مقابل میں نسبتاً تاریخ کے مختلف شعبے دکھاے ہیں اور کوشش کرنی چاہی ہے کہ ہر طبقے کی تاریخ جدا جدا دکھائی جاے مگر اس میں جو کمال کیا گیا ہے وہ بغیر اصل کتاب کے دیکھے ہوے سمجھ میں نہیں آسکتا۔المختصر بہت سے شعبے لکھتے لکھتے جب تھک گئے ہیں تو ایک عنوان " تواریخ کی مختلف کتابوں " کا قائم کیا ہے۔اس ذیل میں جو غیر معروف و غیر متحقق یعنی متفرق کتابیں درج کی گئی ہیں اُن میں چند کے نام یہ ہیں:- تاریخ عالم-تاریخ انکملا-تاریخ چترال-تاریخ چین-سلسلة الملوک (سرسید) تاریخ امریکہ کامل —

(۲)

اس مد میں ناظرین نے مرزا حیرت کی تفسیر القرآن اور مقدمہ تفسیر القرآن کا حال پڑھ لیا ہے۔اس سے زیادہ معلومات بڑھانی ہے تو خطبات احمدیہ۔اور تفسیر قرآن مولفہ سرسید احمد خاں دیکھ لیجیئے۔اس سے زیادہ ورق گردانی کو جی نہیں چاہتا —

(۳)

(الف) سیرۃ النبی (مولانا شبلی) جس کے دو حصے الفہرست کے شائع

ہونے سے پہلے چھپ چکے تھے اُن میں سے صرف حصۂ اول لکھا ہے اور اُس کی قیمت مبلغ ۱۵ روپیہ لکھی ہے۔حالانکہ ہر حصے کی ۲ روپیہ عام قیمت ہے —

(ب) مولود شریف شہید میں باوجود یکہ مؤلف کا تخلص موجود ہے مگر خانۂ مصنف و اشاعت وغیرہ کو خالی چھوڑا گیا ہے —

(۴)

اس مد کی موجیں بے پناہ ہیں۔ایک سلسلۂ تاریخ ہی میں متعدد مثالیں موجود ہیں —

(الف) سیرۃ النبی کے عنوان میں منہاج النبوت دو جگہ۔سوانح عمری آنحضرت بغیر نام مؤلف ۲ سے زیادہ جگہ —

(ب) صفحہ (۸۰۴) میں بذیل انشا درد محبت اور اردوے معلی مکرر —

(ج) تعلیم نسواں میں لاثانی اُستانی اور وکیل نسواں مکرر —

(د) آثار الصنادید مکرر —

(ہ) سوانح مولانا روم مکرر —

(و) البرامکہ مکرر —

(۵)

کیا ناظرین متحیر نہ ہوں گے کہ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیفات میں " الفاروق۔موازنہ انیس و دبیر۔سیرۃ النعمان۔اور مولانا حالی کا دیوان اور غالباً حیات سعدی اور یادگار غالب بھی اس فہرست میں نہیں ملتی۔اس سے زیادہ چراغ تلے اندھیرا کیا ہوسکتا ہے کہ خود مرزا صاحب نے بعض اپنی تالیفات کو نہیں درج کیا۔مثلاً الاستدلال۔تمنائے دید وغیرہ شاید ازراہ انکسار ایسا کیا ہو۔حالانکہ الفہرست کے آخری پنّے پر تمام تصانیف کا اشتہار مع قیمت موجود ہے —

(۶)

غنیۃ الطالبین مولفۂ شیخ عبدالقادر جیلانی۔فصوص الحکم۔عوارف المعارف۔شیخ شہاب الدین۔مآثر الکرام حضرت آزاد بلگرامی۔وغیرہ اکثر کتابیں اصل مصنفین کے نام سے بغیر اطلاع ترجمہ موجود ہیں —

(۷)

صفحہ (۱۰۷) سے جو کتابیں شروع ہوئی ہیں اُن میں پوتھی جالکا بھوں اگم سندیش۔کبیر جوگ یادگار رام۔امر گرنتھہ۔مقالات الاحسان فی مقامات العرفان۔

لیہات موفیہ فرہنگہ سو سوا سو کتابیں صفحہ (۱۲۰) تک لکھی گئی ہیں مگر ان
نہ کوئی عنوان ہے نہ کہیں شمار کا نمبر —

(۸)

تاریخ کے عنوان میں پہلا شعبہ (سیرۃ النبی) ہے اس میں بھی
مولود سعدی و مولود شہید وغیرہ موجود ہیں اور پھر اسی سے متصل
جامع عمری جناب رسول اکرم کا علوان ہے وہاں بھی اسی قسم کی کتابیں
دکھائی گئی ہیں اور ان دونوں سلسلوں کے بعد مولود شریف کا مستقل
عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں پھر وہی مولودوں کی گردان۔
(ملو یا قوم بل صلوا علی الصدر الامیں) —

(۹)

صفحہ (۱٦۰) کے عنوانی نمبر پر دس کے ہندسۂ شمار نظر آتے کا
مگر صفحہ (۱٦۱) پر بلا فصل ٦۱ تا (۱۰۱) شمار کے نمبر ہیں - حالانکہ صفحات
(۱٦۰) و ۲٦۱ میں غلطی نہیں —

(۱۰)

یہ حاتمے کا بند تو قیامت ہی کا مقطع ہے - علم اخلاق کے باتیسویں نمبر میں
(تہذیب الاخلاق کی جلدیں) کتاب کا نام ہے - اس کے بعد مصنفین میں جلد اول
محسن الملک - جلد دوم سر سید احمد خاں جلد سوم اعظم یار جنگ چراغ علی -
جلد چہارم حالی ذکاءاللہ کے نام سے منسوب ہیں —

جناب ایڈیٹر صاحب اُردو اگر اس معمے کو آپ حل کردیں تو اس کے
معاوضے میں ایک سال کے لئے رسالہ اُردو کو کسی شوقین ادب طالب علم کے
نام مفت جاری کرنے کے لئے چندہ حاضر کروں گا! —

ان سطور تک الفہرست کے جن حقائق و حصائص پر روشنی ڈالی گئی
ہے - اُن سے یہ نہ سمجھہ لینا چاہئیے کہ اس مجموعۂ خوبی ہائے بے کراں کے
کارناموں کی وضاحت انھیں نمبروں میں محدود ہے - یہ تو چند اور سرسری
نمونے ہیں جو مبصرین حقیقت کے سامنے بطور مثال پیش کئے گئے ہیں - ورنہ
یہ سلسلۂ نامتناہی کرۃ بعد اولی و مرۃ بعد اخری برابر چلا گیا ہے - جس
علوان پر نظر ڈالئیے ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست - ان بدیہیات
کے بعد جن باتوں کا پیش کرنا مقصود ہے وہ اگرچہ قیاسات پر مبنی ہوں گی مگر
ایک وسیع النظر ماہر سمجھہ سکے گا کہ یہ قیاسات مع الفارق نہ ہوں گے - جن کو
حسب ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جاتا ہے —

(۱) الفہرست کس طرح مرتب کی گئی ہے اور اس میں ایسی بے ترتیب لغزشیں کیوں رہ گئیں —

(۲) جس قدر تعداد کتب اس فہرست میں دکھائی گئی ہے - معمولی اخبار بین باخبر علم الاعداد سے یہ ثابت کرسکتا ہے کہ اس تعداد سے بہت زیادہ کتابیں بآسانی مل سکتی تھیں —

(۳) ایک دو نہیں درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں اور مبالغہ نہ سمجھا جائے تو ہزاروں مطبوعہ (اُردو) کتابیں اس فہرست میں مندرج نہیں جن کی طباعت اس کی اشاعت سے بہت پہلے عالم وجود میں شہرت پزیر ہوچکی ہے —

(۱)

ترتیب کی بے ربطی اور عنوانوں کی عدم خانہ پری بتارہی ہے کہ عموماً کسی بک ایجنسی کی فہرست سے کتابوں کے نام لکھے گئے ہیں - یہ قیاس اس لیے علم الیقین بلکہ حق الیقین کا مرتبہ پا سکتا ہے کہ ایک مرتب فہرست جو کافی قابلیت تدوین رکھتا ہو اصل کتاب کو پاکر ممکن نہیں کہ اس کے مصنف کا نام اور صفحات کی تعداد معلوم نہ کرسکے - ظاہر ہے کہ دکان داروں کی فہرستیں بکثرت صرف کتابوں کے ناموں اور قیمت کو بتاتی ہیں نہ کہ عموماً مصنفین کو اس دعوے کی دلیل میں صفحہ ۲۵۳ کے عنوان سوانح عمری کو دیکھا جائے - جس میں (۵۱۷) کتابیں مندرج ہیں - مگر (۳۰۰) کتابیں ایسی ہیں جن کے مؤلف نا معلوم اور قیمت معلوم - یہی صورت ناول کی فہرست میں ہے کہ (۹۰۰) سے زیادہ کتابوں کے اسما درج ہیں - لیکن مجموعتاً (۱۹) صفحے ایسے ہیں جن میں بجز قیمت اور پتے کے کوئی نشان نہیں - اب رہیں وہ کتابیں جن کے مصنفین کے نام موجود ہیں تو ان میں بعض ایسی ہیں جن کے مصنف شہرت یافتہ ہیں اور اشتہاری کتب فروش فروغ تجارت کے لیے ان کے نام بھی لکھہ دیتے ہیں اسی کی نقل کافی سمجھی گئی - اور بفرض اگر کسی چھوٹے سے مقامی کتاب خانے سے چند کتابیں لی گئی ہیں تو ان کے اندراج کی یہ شان نہیں ہو سکتی - ایسی فہرست کے مدون کا معمولی فرض تھا کہ واقفیت عامہ کے لیے خانۂ کیفیت میں اس کتب خانے کا حوالہ دیا جاتا - ان کھلی ہوئی چشم پوشیوں کو دیکھہ کر ایسی لغزشوں کا سبب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ جس کتب خانے سے فہرست کتب لی گئی ہے اس کو کسی ایسے کم علم اور مجہول الحافظہ سے لکھوایا گیا ہے جسے اپنی قابلیت و یادداشت پر اعتماد نہ تھا - بکثرت دیکھا جاتا ہے کہ کتب خانوں میں بعض مجلدات متعدد جمع ہوجاتی ہیں - ناقل نا عاقل نے فہرست لکھتے وقت

اس کا خیال بھلا دیا کہ یہ نقل مالک کے سامنے پیش ہونے والی ہے۔ الماریوں میں جتنی کتابیں ملیں بلا استثناء مکررات ان کو لکھ لیا اور پھر وہی مسودہ مکھی پر مکھی مارنے کے لئے کاتبان مطبع کے حوالے کر دیا گیا۔ اگر کتابوں کا دیکھنے والا علمی ذوق سے نابلد نہیں اور وہ کتابوں کو محض اس لئے دیکھ رہا ہے کہ ان کی ایک مکمل فہرست اہل عام کے ہاتوں تک پہنچانی ہے تو کیا کوئی غبی الذہن بھی اصل کتابوں کو پاکر تعداد صفحات اور اسماء مصنفین کو چھوڑ سکتا ہے۔ غرض کہ اکثر عنوانوں میں کتابوں کا مکرر درج ہو جانا اور اُردو و فارسی کا امتیاز نہ کرنا اور مصنفوں کے ناموں کا نہ لکھنا ان قیاسات کو یقینیات بنانے کے لئے کافی ضمانت کر رہا ہے —

(۲)

اس بات کے ثابت کرنے سے پہلے کہ الفہرست میں مطبوعہ کتابوں کی تعداد بہت کم بتائی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ جس قدر مطبوعات اُس میں مندرج ہیں اُن کا شمار کیا جاے۔ اس مصیبت کے جھیلنے میں پھر لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔ یعنی مدون کی سہل نگاری اور بے پروائی سے ۸۱۵ صفحوں کی کتابوں کو گلنا ہوگا۔ جب کہیں یہ عقدہ حل ہوسکے گا۔ بہر حال سنگ آمد و سخت آمد جمع و تفریق ضرب و تقسیم کے بعد جس عطر مجموعے کو تحصیل حاصل سمجھہ سکا وہ (۶۷۴۵) کے اعداد ہیں —

اُردو زبان کی ابتدائی اور تصنیف و تالیف کی تاریخ سے قطع نظر کرتے ہوئے عام اہل خبر جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط سلطنت سے اُردو زبان کی ترویج و اشاعت شروع ہوئی ہے اور فورٹ ولیم (کلکتہ) اور دہلی کی سوسائٹی (سنہ ۱۸۲۰ ع) کے وجود کے ساتھہ طباعت کتب کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ اس سو سوا سو برس کی مدت طویل میں رفتار مذاق دیکھتے ہوئے بالاوسط کس قدر کتابیں چھپنی چاہئیں ؟ اِس کا سرسری اندازہ اُس یادداشت سے کرنا چاہئے جس کو جنوری سنہ ۱۹۲۱ ع کے رسالۂ زمانہ (کانپور) نے اُردو کی قلت اشاعت پر افسوس کے ساتھہ ثبت کیا ہے وہ فقرہ یہ ہے — " ستمبر سنہ ۱۹۲۰ ع کی سہ ماہی میں ۷۲ کتابیں اُردو میں چھپی ہیں۔۔۔ اگر اسی سرمایۂ اشاعت پر کفایت و قناعت کی جائے تو سوا سو برس میں ۳۰ یا ۴۰ ہزار کتابیں شایع ہونی چاہئیں۔ لیکن مدون الفہرست نے اس قلیل تعداد اوسط کو بھی اتنا گھٹایا ہے کہ اگر مذکورۂ بالا شمار کو صفر (۰) کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا —

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

راقم حروف کا یہ قیاس و گمان بھی علم الیقین اور حق الیقین سے کم نہیں جس کے لئے قطعی ثبوت و دلیل سنہ ۱۹۰۵ ع کی مردم شماری کی وہ رپورٹ ہے جس کا خلاصہ اگست سنہ ۱۹۰۵ ع کے زمانے میں بایں الفاظ شایع ہوا ہے:—

" مردم شماری ہند کی رپورٹ میں ہندوستانی زبانوں کے متعلق جو یاد داشت لکھی گئی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ ع تک اُردو ادب میں (۱۶۳۹۵) کتابیں شایع ہوئی میں اور مخصوص بخط اُردو (۱۰۸۷۹) چھپی ہیں۔اتنی اشاعت کسی دوسری زبان میں نہیں "

سب جانتے ہیں کہ ایک مردم شماری سے دوسری مردم شماری تک دس برس کا زمانہ ہوتا ہے۔الفہرست سنہ ۱۹۰۳ و۱۹۰۴ کی مردم شماری کے بعد دوسری مردم شماری کے لگ بھگ حسب بیان مؤلف دامن ترتیب میں گل اندازی شروع کر چکی تھی اور تیسری مردم شماری (سنہ ۱۹۲۱ ع) تک اپنی پر دامنی سے اس گلزار کو سدا بہار بنا چکی تھی مگر افسوس ہے کہ با وجود ذرائع معلومات مردم شماری کی رپورٹ دیکھنے کو بھی کسی بڑے کتب خانے کی سیر کا مترادف سمجھا گیا—

(۳)

اس نمبر میں لفظی تمہید و تشریح زیادہ نہو گی بلکہ صرف یہ بتا کر کہ الفہرست کی ترتیب سنہ ۱۹۲۳ ع میں ختم کی گئی ہے۔اس سے پہلے یعنی سنہ ۱۹۲۲ ع تک جتنی کتابیں اُردو میں شایع ہوچکی ہیں ان میں سے چند نام ایسے پیش کئے جائیں گے جن کا پتا نشان الفہرست میں نہیں اور اسی کے ساتھہ یہ بتا دینا بھی ترفع بے محل نہ ہوگا کہ یہ کتابیں راقم الحروف کے حقیر کتب خانہ میں موجود ہیں۔اگر جناب مرزا صاحب کو حیدرآباد سے باہر جانے کی اجازت حاصل نہیں ہوئی تو بھی ممکن اور بہت ممکن تھا کہ اگر خاص بلدۂ فرخندہ بنیاد میں کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سر سالار جنگ بہادر اور دیگر اہل مذاق کے کتاب خانوں امعان نظر سے دیکھتے تو اُن کتابوں سے چوگنا مجموعہ جمع ہوجاتا۔میرا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہے کہ اِس گئے گزرے زمانے میں بھی حیدرآباد میں کتابی سرمایہ کافی تعداد میں موجود ہے بشرطیکہ کوئی ڈھونڈھنے والا نیاریا بن کر چھان بین کرے۔جس صورت میں یہ فہرست

پیش کی گئی ہے افسوس کہ اُس کی کوئی حیثیت نظر میں نہیں جچتی۔عنوان۔ خانہ پری۔کاغذ۔طباعت وغیرہ وغیرہ جس چیز کو دیکھا جاتا ہے نقص سے خالی نہیں۔کاش بانکی پور لائبریری کی مطبوعہ فہرست ہی سے مدد لی گئی ہوتی تو غالباً کتابوں کی تعداد میں اتنی کمی اور خانہ پری میں اس قدر سادگی نظر نہ آتی۔راقم حروف اگرچہ اس وقت تک مرزا صاحب کے تعارف ظاہری سے فیض یاب نہیں مگر اُردو کے سلسلۂ خدمت کی بدولت بکثرت نہ سہی تو بقلت ان کی قابلیت سے آگاہ ہے۔جس مفید ضروری اور مہتم بالشان کام کو انہوں نے اپنے ذمے لیا تھا وہ ہر طرح اُن کے لئے شایان شان تھا مگر حیرت ہے کہ ایسے کار نامے کو جس چار جامے کے ساتھ حلیۂ انطباع بخشا گیا ہے اُس کی کسی ادا میں کوئی حسن نہیں پایا جاتا —

اب میں اپنے مجوزہ عنوانی نقشہ کے ساتھ بغیر ترتیب فن چند کتابیں پیش کر کے رخصت ہوتا ہوں: —

(نقشہ صفحہ آیندہ پر ملاحظہ ہو)

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۱	ریاض الانوار حصہ اول	تذکرۂ اولیا	حافظ محمد عمر دہلوی	۱۳۰۰ھ	۳۰۸	نصرت المطابع دہلی	۱۳۰۲ھ	
۲	ایضاً جلد دوم	تذکرۂ اولیا	حافظ محمد عمر دہلوی	۱۳۰۰ھ	۱۰۸	حدیقۃ العلوم میرٹھ	۱۳۰۵ھ	
۳	تاریخ بلگرام ۲ حصہ	تاریخ	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۳۰۱ھ	۱۷۲	نور الانوار آرا	۱۳۰۱ھ	
۴	عقد ثریا	عملیات	سید عابد حسین لکھنوی	۱۳۰۳ ۱۸۸۲ء	۵۵	نولکشور لکھنؤ	۱۳۰۳ ۱۸۸۲ء	
۵	سخن بے مثال دیوان شاد لکھنوی	دیوان	شیخ محمد جان شاد	۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ء	۱۷۳	تصویر عالم پریس لکھنؤ	۱۳۱۸ھ	
۶	گوہر آبدار	دیوان	منور خاں گوہر مدراسی	۱۳۲۳ھ	۷۲	مطبع سلطانی مدراس	۱۳۲۳ھ	
۷	اُردو کا گلدستہ	نظم	سید امجد علی اشہری	۱۹۰۵ء	۷۲	مطبع آگرہ اخبار	۱۹۰۵ء	
۸	جلوۂ کائنات	اخلاق	مولوی عبدالرحمن کلیانی		۲۰	کریم المطابع بجنور	*	* سنہ اشاعت اصل کتاب میں نہیں ہے مگر یہ مصنف اسی زمانے کے ہیں
۹	نہال روضۂ اکبر (رحمت پیغمبر)	دیوان نعت	محمد اکبر خاں اکبر میرٹھی	۱۳۲۰ ۱۹۰۲ء	۸۰	نامی پریس میرٹھ	۱۳۲۰ھ	
۱۰	دیوان افسر	دیوان	بشیر الدین افسر اورنگ آبادی	۱۳۱۱ھ	۷۳	مطبع خبیر اورنگ آباد دکن	۱۳۱۲ھ	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ الطباعۃ	ملاحظہ
۱۱	مناصرہ	نظم منقبت	حافظ منیرالدین ضیا	۱۳۲۳ھ	۲۲	مفیدالاسلام حیدرآباد دکن	۱۳۲۳ھ	
۱۲	تضمین بے بہا	نظم	پتمبر پرشاد اختر اجمیری	۱۹۰۳ء	۳۸	مطبع رضوی دھلی	۱۹۰۳ء	
۱۳	گلزار سخن	ادب شاعری	جگناتھ پرشاد فیض کھلتوا	۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء	۲۲۸	نولکشور لکھنؤ	۱۳۲۶ھ	
۱۴	تاریخ بدیع	مثنوی	امیراللہ تسلیم	۱۲۹۸ھ ۱۸۸۱ء	۳۵۴	مطبع حسنی رامپور	۱۲۹۸ھ	
۱۵	کان تاریخ	صنایع تاریخ	رامپرشاد شاہجہان آبادی	۱۲۹۳ھ	۱۹۰	مطبع انوری آگرہ	۱۲۹۳ھ	
۱۶	کلام مہر	نظم	سورج نرائن مہر	۱۹۰۸ء	۳۳۲	مفیدعام لاھور	۱۹۰۸ء	
۱۷	صفیر بلبل	دیوان	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۲۷۳ھ		عظیم المطابع پٹنہ	۱۲۸۰ھ	
۱۸	ارمغان عزیز	دیوان	نواب عزیزیار جنگ	۱۳۳۶ھ	۲۲۵	شوکۃ المطابع حیدرآباد دکن	۱۳۳۶ھ	
۱۹	آثارالشعرا	تذکرہ شعرا	سید ممتاز علی بھوپالی	۱۳۰۳ھ	۲۹۹	مطبع شاھجہانی بھوپال	۱۳۰۷ھ	
۲۰	کلیات شیفتہ و حسرتی *	دیوان	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۸۶۹ء	۱۲۳	نظامی پریس بدایوں	۱۹۱۹ء	
۲۱	تذکرۃالصلحا (تاریخ احسن)	تاریخ	مولوی عبدالحی بدایونی	۱۳۳۰ھ	۶۶	ایضا	۱۳۳۰ھ	

* یہ کلیات الحیدرسٹ میں نہیں ملتا ہے *
چھپا ہوا تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے —

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۲۲	کیفیت تشریف آوری امیر کابل	تاریخ	مسلمانان مدرسة العلوم علی گڈہ	۱۹۰۷ع ۱۳۲۴ھ	۳۵	انستیٹیوٹ پریس علیگڈہ	۱۹۰۷ع	
۲۳	سالانہ رپورٹ جائداد مدرسة العلوم علی گڈہ	تاریخ	کارکنان مدرسة العلوم علی گڈہ	۱۹۱۲ع	۴۳	ایضاً	۱۹۱۲ع	
۲۴	خطبات الاسلام للجمعة والایام العظام	فقہ	مولوی یونس خاں دتاولی علی گڈہ	۱۳۳۰ھ	۳۲	مطبع احمدی علیگڈہ	۱۳۳۰ھ	
۲۵	چراغ سخن (رسالہ عروض)	عروض	مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی	۱۹۱۵ع	۹۶	گلشن ابراہیمی لکھنو	۱۹۱۵ع	
۲۶	رسالہ کانفرنس نمبر ۷	لکچر	صاحبزادہ آفتاب احمد خاں	۱۹۱۱ع	۷۶	ریاض ھند علیگڈہ	۱۹۱۱ع	
۲۷	محاربات ترک با اطالیہ	مسدس (نظم)	غلام حضرت خاں حاذق	۱۹۱۳ع	۴۸	نولکشور لکھنو	۱۹۱۳ع	
۲۸	تاریخ جدید صوبہ اڑیسہ	تاریخ	سید اولاد حیدر فوق بلگرامی	۱۹۱۵ع	۳۱۶	مطبع اکبری پٹنہ	۱۹۱۵ع	
۲۹	سر السکلون ترجمہ سر العالمین	اخلاق	سید یسین علی حسن نظامی	۱۳۲۹ھ	۲۰۳	رفاہ عام استیم پریس لاہور	۱۳۲۹	
۳۰	قانون تصوف حصہ اول	تصوف	منیجر انجمن خدام الصوفیہ لاہور	۱۳۲۲ھ	۴۰	فیض عام لاہور	۱۳۲۲ ۱۹۰۴ع	
۳۱	کنز التاریخ	تاریخ	مولوی رضی الدین بدایونی	۱۳۱۹ھ	۳۱۲	نظامی پریس بدایوں	۱۹۰۷ ۱۳۱۹	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۳۲	تاریخ فرخ آباد ۲ حصہ	تاریخ	ولیم آروین سی ایس فتح گڈہ		۳۶۱	*		* اصل کتاب پر مطبع وغیرہ کا نام نہیں ہے —
۳۳	تذکرۃ الانساب	تذکرہ اولیا	مولوی سید امام الدین گلشن آبادی	۱۳۲۲ھ	۱۶۰	افضل المطابع دہلی	۱۳۲۲ھ	
۳۴	دیوان اول یاس	دیوان	میر ذاکر حسین یاس لکھنوی	۱۲۹۲ھ	۲۳۰	قومی پریس لکھنو	۱۳۰۶ھ	† الفہرست میں صرف مرتبہ آزاد درج ہے —
۳۵	قواعد منتخب	قواعد اردو	سید ضامن علی جلال لکھنوی	۱۳۰۴ھ	۳۲	مطبع قومی لکھنو	۱۳۱۰ھ	
۳۶	گلدستہ معرفت	مثنوی	نواب صفدر علی خاں رامپوری	۱۳۰۹ھ		منید عام آگرہ	۱۳۱۰ھ	
۳۷	دیوان ذوق †	دیوان	شیخ محمد ابراهیم ذوق	۱۲۶۰ھ	۹۶	مطبع نامی لکھنو	۱۸۹۲ع	‡ الفہرست میں صرف مرتبہ نظامی و حسرت درج ہے حالانکہ مرزا غالب کے دیوان بکرات و مرات چلد بار شایع ہو چکے ہیں —
۳۸	دیوان غالب ‡	ایضاً	اسداللہ خاں غالب	۱۲۸۱ھ	۷۲	ایضاً	۱۳۰۸ھ	
۳۹	مظہر عشق	ایضاً	ارشد علی خاں قلق	۱۲۸۹ھ	۲۰۲	نولکشور کانپور	۱۳۲۹ھ	
۴۰	نظم دلفریب	ایضاً	شاہ نذرالرحمن حفیظ عظیم آبادی	۱۳۱۶ھ	۴۰۷	احسن المطابع پٹنہ	۱۳۱۷ھ	
۴۱	چمنستان صفیر	نظم	حکیم علی حسین صفیر لکھنوی	۱۹۱۰ع	۴۸	منید عام پریس لکھنو	۱۹۱۰ع	
۴۲	باغ خیال اکبر (دیوان اکبر)	دیوان	اکبر علی خاں افسوں و اکبر آگرہ §		۹۶	ابوالعلائی آگرہ		§ حال کے شاعر ہیں —

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۴۳	ریاض نواس (کلام اطہر)	دیوان	غلام مصطفیٰ خاں اطہر جل گانوں	۱۳۲۷ھ	۱۳۲	مطبع حقانی دہلی	۱۳۲۷ھ	
۴۴	نشتر سخن	تذکرہ شعرا	احسان اللہ عباسی	۱۹۱۱ع	۳۷۲	مطبع حکیم برہم وغیرہ	۱۹۱۱ع	
۴۵	آیات الاحکام	فقہ	مولوی عبدالعلی نگرامی	۱۲۹۲ھ	۲۱۸	مطبع علوی محلہ بلہرہ	۱۲۹۲ھ	
۴۶	الکلمۃ العلیا لاعلاء علم المصطفا	کلام	مولوی نعیم الدین مرادآبادی	۱۳۲۷ھ	۱۳۸	شمس المطابع مرادآباد	۱۳۲۷ھ	
۴۷	قصص العرب	تاریخ	ہادی حسین ہادی بنارسی	۱۹۱۰ع	۵۸	سلیمانی پریس بنارس	۱۹۱۰ع	
۴۸	انشاے جدید	انشا	عبدالسلام وفیقی	۱۹۰۸ع	۹۳	نظامی پریس بدایوں	۱۹۰۸ع	
۴۹	سفینۂ نوح	دیوان	محمد نوح نوح ناروی	۱۳۲۹ھ	۲۲۵	اسٹنڈرڈ پریس الہ آباد	۱۳۲۹ھ	
۵۰	میلاد معصومین	مراثی و منقبت	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۹۱۳ع	۳۱۵	عزیزی پریس آگرہ	۱۹۱۳ع	
۵۱	دیوان حاذق	دیوان	منشی فخرالدین حاذق برہانپوری	۱۳۲۲ھ	۸۰	ابوالعلائی پریس آگرہ	۱۹۰۶ع	
۵۲	دیوان فروغ	دیوان	سید امیر حسین وکیل حیدرآباد دکن	۱۳۲۵ھ	۲۵۳	گلشن فیض لکھنؤ	۱۹۰۷ع	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۵۳	گلگشت فرنگ (روزنامچہ نواب مہدی حسن خاں)	سفرنامہ	مترجمہ مولوی عزیز مرزا	۱۸۸۹ء	۲۳۶	مفید عام آگرہ	۱۸۸۹ء	* یہ کتاب دینیات کے نصاب میں شامل ہے اس کے آخری اوراق نہیں ہیں اس لئے سنہ طباعت و مطبع معلوم نہیں ہو سکا
۵۴	ظہور المومنین (مجموعہ احمدی)	فقہ شیعہ	سید آل احمد بلگرامی	۱۲۹۱ھ	۳۳۴	مطبع اعجاز محمدی آگرہ	۱۳۱۱ھ	
۵۵	کشف الحاجۃ ترجمہ مالابدمنہ	فقہ اہل سنت	مولوی نورالدین	۱۲۹۲ھ	۹۶	سلطان المطابع لکھنؤ	۱۲۹۹ھ	
۵۶	تزک مرتضوی	حالات اولیاء اللہ	مولوی حسن رضا خاں بریلوی	۱۳۰۰ھ	۲۴	مطبع جماعت تجارت بریلی	۱۸۸۳ء	
۵۷	سلسلہ دینیات ۷ حصہ	فقہ	کمیٹی دینیات اہل سنت مدرسۃ العلوم علیگڈھ	۱۹۰۳ء	مجموعہ ۱۷۵	مطبع احمدی علی گڈھ	۱۹۰۳ء	
۵۸	ریاض نسیم	دیوان	سید شبیر حسین نسیم بھرتھوری	۱۹۰۹ء	۲۳۲	ابوالعلائی پریس آگرہ	۱۳۲۷ھ	
۵۹	گنجینۂ اسرار الٰہی ملفوظات بلدیشری	تصوف و اخلاق	بلدیشری پرشاد (خزانچی)	۱۸۹۴ء	۲۲۰	مطبع الٰہی آگرہ	۱۸۹۴ء	
۶۰	ازالۃ الوسواس عن صدور الناس	کلام	سید محمد احسن امروہوی ۳ حصہ	۱۹۰۳ء	۹۲	مطبع میرٹھ	۱۹۰۳ء	
۶۱	الطاعون	طب	حاذق الملک حکیم اجمل خان	۱۳۱۵ھ		*	۱۳۱۵ھ	
۶۲	مانع البدعات	فقہ دینیات	مولوی عالم علی	۱۲۹۴ھ	۵۲	مطبع قیصری پٹنہ	۱۳۰۰ھ	
۶۳	مولود شریف نبی کریم	مولود شریف	صاحب علی خان	۱۲۹۸ھ	۳۲	مطبع جلالی الہ آباد	۱۲۹۸ھ	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۶۴	برهان لائح فی تحقیق امرالذمائح	فقہ	مولوی سید قمرالدین احمد	۱۲۹۲ھ	۱۵۴	مطبع نظامی کان پور	۱۲۹۲ھ	*بہارستان سخن کے نام سے ایک کتاب مطبوعہ نول کشور الفہرست میں درج ہے مگر وہ یہ کتاب نہیں ہے —
۶۵	بہارستان سخن *	دیوان	ناسخ و آتش و آباد لکھنوی	۱۲۹۳ھ	۲۵۹	مطبع محمدی لکھنؤ	۱۲۹۳ھ	
۶۶	حیات وارث	سوانح عمری	مرزا محمد منعم بیگ	۱۹۱۶ع ۱۳۳۴ھ	۷۲	مطبع حکیم برہم گورکھپور	۱۹۱۶ع	
۶۷	طلب صادق	ناول	حاجی محمد خاں خورجوی	۱۸۹۹ع	۱۰۴	خادم الاسلام پریس دهلی	۱۸۹۹ع	
۶۸	تہدید العدوہ	مباحثہ	سید شاہ محمد حسین پھلوی	۱۳۱۵ھ	۵۰	مطبع حنفیہ پٹنہ	۱۳۱۵ھ	
۶۹	تواریخ مہین	قطعات تاریخ نظم	سید محمد مہدی کمال لکھنوی	۱۳۲۲ھ	۵۴	مطبع تصویر عالم لکھنؤ	۱۳۲۲ھ	
۷۰	حدیقۂ شہدا +	حالات بزرگاں	مرزا جان لکھنوی	۱۲۷۲ھ	۷۰	مطبع قدیم لکھنؤ	۱۲۷۲ھ	+ذکر جہاد مولوی امیرالدین علی
۷۱	سیف الاسلام	مباحثہ نصاریٰ	سید فتح علی بخاری	۱۲۸۷ھ	۳۰	لائٹ پریس بنارس	۱۲۸۷ھ	
۷۲	تصدیق الاسلام	مباحثہ نصاریٰ	سید فتح علی بخاری	۱۲۸۷ھ	۳۸	لائٹ پریس بنارس	۱۲۸۷ھ	
۷۳	هشت کونسل (دیبہا)	مباحثہ نصاریٰ مناظرہ	حکیم محمد حسن امروهوی	۱۲۹۱ھ	۳۲	مطبع مجتبائی دهلی	۱۲۹۱ھ	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
٧٦	ہفت جلسہ	مناظرہ	نعمان خاں وکیل	١٢٩٣ھ	٢٢	انوار محمدی رائے بریلی	١٢٩٣ھ	
٧٧	معلم الحساب معروف بہ مکتب نامہ	حساب	مولوی مسیح الزمان		١٨٨	مطبع مسیحائی لکھنؤ •		• تعمیم چھاپہ خانہ سے پہلے کا ہے اس نام کی جو کتاب الفہرست میں درج ہے وہ کوئی اور ہے—
٧٨	رشحات صفیر	قواعد	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	١٢٩٣ھ	٢٩٢	مطبع نور الانوار آرہ	١٢٩٣ھ	
٧٩	گلشن ملن	دیوان	مرزا فدا علی ملن لکھنوی	١٣٢٧ھ	٣٢	مطبع فیض احمدی لکھنؤ	١٣٢٧ھ	
٨٠	عدد التاریخ	تاریخ گوئی	منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی	١٣٢٠ھ	٣٣٦	مطبع نیر اعظم مراد آباد	١٣٢٠ھ	
٨١	الفاروق	سوانح عمری	شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی	١٨٩٩ء	٣١٢	نامی پریس کان پور	١٨٩٩ء	
٨٢	عجائبات امریکہ	سفرنامہ	منشی الٰہ دت سیالکوٹ	١٨٩٥ء	٢٠٨	پنجاب پریس سیالکوٹ	١٨٩٥ء	
٨٣	فاطمی دعوت اسلام	تاریخ	مولوی حسن نظامی	١٣٣٨ھ	٢٣٠	مطبع دہلی •	١٩٢٠ء	• مطبع کا نام اصل کتاب میں پڑھا نہیں گیا—
٨٤	واقعات انیس	سوانح	حکیم مہدی حسن احسن لکھنوی	١٩٠٨ء	٢٣٣	اصح المطابع لکھنؤ	١٩٠٨ء	
٨٥	مہلائے سخن	واسوخت	منشی امیر احمد امیر مینائی	١٣١٠ھ	١٧٥	دائرۂ ادبیہ لکھنؤ	١٩٢١ء	
٨٦	جامع القواعد	صرف ونحو	موتی رام ٹھاکر	١٩٢١ء	٢٩٧	مفید عام پریس لاہور	١٩٢١ء	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۸۷	معین الشعرا	قواعد شاعری	مہر محمد علی خان ناظم	۱۳۲۳ھ	۱۱۲	مطبع صاحب دکن حیدر آباد	۱۳۲۳ھ	
۸۸	تاج سخن	دیوان	حافظ جلیل حسن جلیل	۱۹۱۰ع	۳۶۳	مطبع اختر دکن حیدر آباد	۱۹۱۰ع	
۸۹	جان سخن	دیوان	حافظ جلیل حسن جلیل	۱۳۳۳ھ	۲۶۶	امیر المطابع حیدر آباد- دکن	۱۹۱۶ع	
۹۰	دیوان وحشت	دیوان	رضاعلی وحشت کلکتہ	۱۳۲۷ھ	۱۳۷	مطبع ستارۂ ہند کلکتہ	۱۳۲۸ھ	
۹۱	رسالہ عقیقہ	فقہ	محمد نظام	۱۲۷۸ھ	۲۴	مطبع نظامی کانپور	۱۲۷۸ھ	
۹۲	تنبیہ الجہال بالہام الباسط المتعال	مناظرہ	مولوی حافظ بخش	۱۲۹۱ھ	۱۰۴	مطبع بہارستان کشمیر لکھنؤ	۱۲۹۲ھ	
۹۳	دیوان مجروح	دیوان	میر مہدی حسن مجروح دہلوی	۱۸۹۹ع ۱۳۱۶ھ	۲۴۸	سرفراز پریس دہلی	۱۸۹۹ع	
۹۴	دیوان عزیز	دیوان	مولوی حافظ عبدالعزیز خاں بریلوی	۱۸۹۳ع ۱۳۱۱ھ	۲۶۴	مطبع شوکت الاسلام لکھنؤ	۱۸۹۳ع	
۹۵	کاشف الحقائق جلد دوم*	ادب شاعری	نواب امداد امام اثر		۵۳۹	کارونیشن پریس لکھنؤ		*اس کی پہلی جلد بھی چھپ چکی ہے—
۹۶	میخانۂ بیخود	دیوان	عبدالحی بیخود بدایونی	۱۳۱۳ھ	۳۰۰	مستلصر پریس دہلی	۱۹۱۰ع	

نمبر شمار	نام کتاب	فن	مصنف	زمانہ مصنف	تعداد صفحہ	مطبع	سنہ اشاعت	کیفیت
۹۷	روضۃ الکرام شجرۂ سادات بلگرام	انساب	سید وصی الحسن بلگرامی	۱۹۲۰ء	۲۳۶	مطبع حکیم برہم گورکھپور	۱۹۲۰ء	
۹۸	حل غوامض	لغت	مولوی سید محمد عبداللہ بلگرامی	۱۸۸۹ء	۲۵۴	مطبع احمدی کان پور	۱۸۸۹ء	
۹۹	موازنہ انیس و دبیر*	تذکرہ	مولوی شبلی نعمانی	۱۹۱۰ء	۲۸۳	انوارالمطابع لکھنؤ	۱۹۲۱ء	* یہ تیسرا ایڈیشن ہے —
۱۰۰	المیزان	تذکرہ	سید نظیر الحسن رضوی	۱۹۱۲ء	۲۱۰	فیض عام علیگڑھ	۱۹۱۲ء	
۱۰۱	دیوان غالب جدید نسخۂ حمیدیہ	دیوان	مولف مفتی انوارالحق	۱۹۲۱ء	۳۴۲	مفید عام آگرہ	۱۹۲۱ء	
۱۰۲	جلوۂ خضر حصۂ اول	تذکرہ	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۳۰۲ھ	۳۰۸	نورالانوار آرہ	۱۸۸۵ء	
۱۰۳	ایضاً حصۂ دوم	تذکرہ	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۱۹۰۲ء	۲۸۳	نورالانوار	۱۸۸۵ء	
۱۰۴	شرح دیوان غالب	دیوان	مولوی سید علی حیدر طباطبائی	۱۹۰۸ء	۳۴۸	مفید الاسلام حیدرآباد۔دکن	۱۹۰۸ء	

جہاں تک امکان کی معمولی حد تھی الفہرست کے اوراق ایک ایک کتاب کے مقابلے کی غرض سے اُلٹے پلٹے گئے ہیں-اتنی ورق گردانی کے بعد بھی اگر کوئی کتاب اس نمونے میں ایسی درج ہوگئی ہو جس کا وجود الفہرست میں موجود ہے تو راقم حروف کو انسان سمجھا جاے نہ فرشتۂ آسماں—

یہ چند کتابیں محض نمونے کے لئے پیش کی گئی ہیں جن میں ہر قسم اور ہر فن کی چھوٹی بڑی کتابیں موجود ہیں اگر خاکسار صرف اپنے چھوٹے سے کتب خانے ہی کی فہرست پیش کرے تو بلا مبالغہ الفہرست کی ایک چہارم ضخامت درکار ہوگی جس کے لئے نہ اب وقت ہے نہ اس نمونے کے صحیح سان لینے پر آئندہ ضرورت-بالاخر اس شعر پر خاتمہ ہے—

داماں نگہ تنگ و گُل حسن تو بسیار
گُلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

احسن مارہروی
اُردو لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج
مسلم یونیورسٹی-علی گڈھ

گوھرین نامہ

مولوی احسن‌اللہ خاں ثاقب پروفیسر عربی و فارسی وکٹوریہ کالج گوالیار ادبی دنیا میں دیرینہ روشناس ہیں اور یہ گوھرین نامہ عربی فارسی-اُردو میں آپ کے خیالات و مقالات-مکتوبات اور کلام نظم کا مجموعہ ہے اکثر اصناف سخن پر حاوی اور تنوع مضامین کے لحاظ سے دل چسپ-نیز بعض ادبی و علمی معلومات کے لحاظ سے مفید و پر لطف ہے-ثاقب صاحب کی عمر اس وقت ۶۲ سال کی ہے-آپ کو ہمیشہ ادبی ذوق اور ادبیات سے دل چسپی رہی-ہندوستان و ایران کے اکثر نامور ہم عصر شعراء و ادباء سے دل چسپ و پر لطف صحبتیں رہیں اور اکثر و بیشتر نے اعتراف قابلیت کیا ہے-آپ کی زندگی کے قابل ذکر کارناموں میں رسالہ قند پارسی ہے جو ماہانہ علی گڈھ سے

نکلتا رہا۔ اُردو میں مکتوبات امیر مینائی مشہور تالیف ہے۔ دیوان فارسی ہنوز طبع نہیں ہوا۔ حاشیۂ اصطرلاب دیوبند کے مشہور مدرسۂ عربیہ میں داخل نصاب ہے۔ دیباچۂ انتخاب دیوان فیضی فیاضی۔ شرح حسن و عشق عالی شیرازی بھی قابل تذکرہ ہیں —

گوہرین نامہ میں صفحہ ۱۴ سے ۳۴ تک مکتوبات فارسی ہیں جو مولف نے سنہ ۱۸۹۳ء سے سنہ ۱۹۱۶ء تک مختلف احباب کو لکھے۔ ان میں قدیم فارسی انشاپردازی کی شان پوری طور پر نمایاں ہے۔ پھر ۱۲۳ صفحہ تک مختلف تقریظیں۔ خطبات۔ دو تین مضامین اور کچھ رہ خیالات و واردات ہیں جو وقتاً فوقتاً بعض کتابوں کے دیکھنے یا کسی اور محرک کے وجہ سے پیدا ہوئے اور بیاض میں ٹانک لئے گئے تھے۔ یہ حصہ بہت دل چسپ اور جدت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اس سے مولف کے صحیح خیالات و جذبات۔ بعض کتب اور اشخاص کی نسبت رائے۔ معاصرین و احباب سے مراسم و تعلقات وغیرہ کا پتہ چلتا ہے اور یہ کہ مولف صاحب کی ملاقات ہندوستان کے کن کن بزرگوں سے کن کن مقامات میں ہوئی ہے —

صفحہ ۱۱۴ سے ۱۴۷ تک حصۂ نظم فارسی ہے۔ اس میں قصائد۔ قطعات۔ غزلیات وغیرہ ہیں اور کلام کی پختگی۔ سلاست ذوق اور متانت بیان ہر جگہ نمایاں ہے پھر چند عربی مکتوبات ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قدیم طرز کے اچھے خاصے ادیب ہیں۔ ان سب کے بعد کچھ اُردو مکتوبات۔ دو ایک مضامین پھر چند دیباچے ہیں جو مولف صاحب نے بعض کتب پر لکھے ہیں۔ اس کے بعد اُردو کلام ہے جس میں غزلیں زیادہ ہیں۔ اگرچہ ثاقب صاحب کا اصل ذوق فارسی ہے۔ اُردو میں بہت کم لکھا اور کہا ہے۔ مگر جو کچھ کہا اور لکھا ہے اس میں بھی پختگی بیان۔ صحت زبان۔ سلاست ذوق۔ متانت و سنجیدگی کا عنصر نکھرا ہے۔ بہر حال یہ مجموعہ دیکھنے کے قابل ہے۔ اس سے مولف کی تینوں زبانوں میں قابلیت۔ مولف کے رجحان طبیعت۔ ذوق ادب اور سوانح زندگی۔ جذبات و خیالات سب کچھ معلوم ہوتے ہیں۔ آخر کتاب میں مولف کے نام ہندوستان و ایران کے مشاہیر کے چند مکتوبات تینوں زبانوں میں ہیں۔ جن سے ان بزرگوں سے ثاقب صاحب کے مراسم صحبت اور ثاقب صاحب کی نسبت ان کی رائیں اور اعترات قابلیت کا اظہار ہوتا ہے اور یہی شاید ان کو شامل کرنے کا منشاء بھی ہے۔ ان بزرگوں میں مولانا حالی۔ شبلی۔ وقارالملک مرحوم۔ حکیم اجمل خاں۔ مولانا عمادی۔ اڈیٹر چہرہ نما مصر۔ ایران۔ اصفہان اور شیراز کے بعض اڈیٹروں کے

خطوط هیں- گو یہ سب ذاتی (پرائیوٹ) هیں اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شایع هوں گے تاهم ان سب میں کچھہ نہ کچھہ دل و دماغ کے لئے سامان تفریح و دل چسپی موجود هے—

گوهرین نامہ کی لکھائی چھپائی کاغذ بہت معمولی هے- حجم ۲۱۴ صفحے قیمت صرف ۱ روپیہ ۴ آنہ غالباً مولف صاحب یا محمد حسن صاحب علوی مالک انوارالمطابع لکھنؤ سے ملے گا—

(م)

—:o:—

مثنوی اسرار هستی

(اس کے مصنف سید ضامن حسین صاحب گویا جہان آبادی

تلمیذ جناب حافظ پہلی بھیتی هیں)

یہ مثنوی مضامین حقیقت و معرفت پر مشتمل هے اور بصائر کے عنوان سے یوں شروع هوتی هے:—

چمن میں هے کیا بہار دیکھو — چمن هے کیا لالہ زار دیکھو
نکلتی هے دل سے خود بخود واہ — زبان کہتی هے اللہ اللہ
وہ خوشنوا هیں طیور گویا — وہ پیارا پیارا هے اُن کا نغما
کہ محو هو جائے سننے والا — رهے نہ کچھہ هوش تن بدن کا
یہ پھول پتے مہکنے والے — یہ بیل بوتے طرح طرح کے
کھلائے کس نے اگائے کس نے — دکھائے کس نے سنگھائے کس نے
یہ چھوٹی چڑیاں چہکنے والی — یہ ننھی کلیاں مہکنے والی
چہک رهی هیں مہک رهی هیں — پھدک رهی هیں چٹک رهی هیں

آگے چل کر مسائل وحدانیت- وحدت وجود- سوفسطائیت- مادیت- ثنویت (بت پرستی) اور تثلیث پر اپنے خیالات ظاهر کئے هیں- پھر ان پر تبصرہ هے- وجدانی باتیں اور حقیقت خدا شناسی وغیرہ پر عمیق مضامین هیں- آخر میں عروس وحدت اور تبسم کے عنوان سے دو نظمیں هیں—

جناب گویا کا کلام بے عیب- زبان عمدہ- بیان دل کش هے- ضخامت ۴۸ صفحے تقطیع چھوٹی ۲۰ × ۱۶/۳۰ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ نفیس قیمت کہیں درج نہیں- مولوی سید ضامن حسین صاحب گویا محلہ احمدزئی پیلی بھیت سے مل سکتی هے—

(م)

شراب عیش

یہ ناول قاری سرفراز حسین صاحب دہلوی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ قاری صاحب ایک عرصہ سے ان معاشرتی پیچیدگیوں کا مطالعہ کر رہے ہیں جو طبقۂ طوائف کے بدولت آئے دن ہماری سماج میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ خالص اسی موضوع پر وہ پانچ افسانے سعید۔ سعادت۔ شاہد رعنا۔ سزائے عیش اور انجام عیش لکھ چکے ہیں اور زیر تبصرہ افسانہ اسی "سلسلۃ الطوائف" کی چھٹی کڑی ہے—

طوائف اور ان کے حالات زندگی کو بطور موضوع تحریر یا تقریر میں پیش کرنا شرفاء کے طبقہ میں جیسا کچھ معیوب سمجھا جاتا ہے محتاج بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بدنصیب گروہ کی زندگی۔ اس کی تنظیمات اور روایات پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے اور ان چیزوں کی واقفیت کے بغیر نوجوانوں کی حالت درست کرنا اور اس قابل رحم طبقۂ کی اصلاح کرنا دشوار ہے۔ مبتذل اور عامیانہ مباحث سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو ان لوگوں کی زندگی کے ایسے مسائل سامنے آتے ہیں جن پر سنجیدگی کے ساتھ خالص معاشرتی نقطۂ نگاہ سے بحث ہو سکتی ہے اور اصلاحی تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلہ کی دوسری کتابوں کی طرح موجودہ کتاب بھی اسی مقصد کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے—

افسانے کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو بھی کتاب کافی دلچسپ ہے۔ شریف خواتین اور طوائف دونوں کی صاف اور سچی تصویریں ہیں۔ جو کچھ بھی لکھا ہے قرین قیاس بنا کر لکھا ہے۔ پلاٹ اگر زیادہ گہرا نہیں ہے تو بعید از حقیقت بھی نہیں ہے۔ طوائف کی گفتگو۔ ان کے طور طریقے اور چالوں کا بیان جس انداز سے کیا گیا ہے وہ جناب مصنف کے گہرے مشاہدہ کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک چیز جس سے ہمیں اصولاً اختلاف ہے یہ ہے کہ کہیں کہیں نفس قصہ کو چھوڑ کر کئی کئی صفحات نصائح اور تجاویز کی نظر کئے گئے ہیں۔ جب مصنف اس طرح قصہ سے الگ ہٹکر نصیحت پر اُتر آتا ہے تو لطف باقی نہیں رہتا۔ مصنف کا فرض ہے کہ اپنی شخصیت کو ہمیشہ پس پردہ رکھے اور قصہ کو خود اپنے اخلاقی نتائج پیدا کرنے دے۔ زبان پر کوئی اعتراض نہیں۔ دلی کی صاف ستھری بول چال ہے البتہ کہیں کہیں انگریزی ساخت کے جملے نظر آتے ہیں جیسے:—

صفحہ ۴ (۱) " میں نے آپ کی اس زیادتی کو بھلا دیا کہ باوجود دوسرے شخص کو چاہنے کے آپ نے مجھ سے بھی اظہار تعشق کیا جس کو میں اپنی غلطی سے سچ سمجھا " —

صفحہ ۳۲ (۲) " عشرت کو اپنے پیشہ کی جملہ روایات میں بہت تندہی کے ساتھ پرورش کیا " ایک مقام پر لکھا ہے " بڑی طوائفوں سے رسائی ہے " ہماری رائے میں " سے " کی بجائے " تک " زیادہ مناسب ہوتا —

سرورق رنگین - کاغذ لکھائی چھپائی غنیمت ہے - دفتر تمدن مٹیا محل دھلی سے دس آنہ میں مل سکتی ہے —

(و

---:o:---

بہرام کی رہائی

ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ظفر عمر صاحب نے ایک قصہ نیلی چھتری اور دوسرا بہرام کی گرفتاری کے نام سے لکھا تھا - ان دونوں قصوں کی خاصی شہرت ہو چکی ہے - یہ اس قصے کا بقیہ حصہ ہے جسے مرزا باقر حسن صاحب موزوں نے مکمل کیا ہے - مرزا صاحب نے کمال کیا ہے کہ اُسی رنگ میں اس قصے کا خاتمہ کیا ہے دل بہلانے کے لئے اچھی چیز ہے اور جو لوگ سراغ رسانی اور مجرم اور پولیس کے داو گھاتوں کو شوق سے پڑھتے ہیں اُن کی دل چسپی کے لئے یہ خوب کتاب ہے —

جنٹلمین بک ڈپو امین آباد لکھنؤ سے ایک روپیہ چار آنے میں مل سکتی ہے —

---:o:---

فطرت نسوانی

یہ کتاب مطبوعات صوفی کی ۶۹ ویں کڑی ہے - یہ اصل میں ایک فرانسیسی پروفیسر اخلاقیات ھنری مارین کی تصنیف ہے - عربی میں اس کا ترجمہ امیل زیدان صاحب اڈیٹر الہلال نے کیا تھا اور اب ملک کے مشہور اہل قلم مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے مذکورۂ بالا نام سے اُردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے —

کتاب میں نسوانی مسائل پر بہت خوبی سے بحث کی گئی ہے۔گزشتہ زمانہ میں عورت کا سماجی رتبہ اس کی جسمانی حالت۔اس کی نفسیاتی خصوصیات اور پھر زمانہ جدید میں اس کی آزادی کی تاریخ۔یہ سب باتیں بہت کچھ تفصیل کے ساتھ درج کی گئی ہیں اور ان لوگوں کے لئے سبق آموز ہوں گی جو عورت کی زندگی اور اس کے مقصد پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں—

ہمارے ملک میں عورتوں کی سماجی حیثیت کے متعلق مختلف اور متضاد رائے رکھنے والے دو گروہ ہیں ایک گروہ وہ ہے جو صحیح معنوں میں "مغرب زدہ" ہے اور عورت کو ہر اعتبار سے مردوں کے برابر اور انہیں کی ذہنی اور اخلاقی صفات سے متصف خیال کرتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں انہیں صنف قوی کے دوش بدوش دیکھنا چاہتا ہے۔دوسرا گروہ وہ ہے جو ہندوستان کے مخصوص سماجی ماحول سے اس حد تک متاثر ہوگیا ہے کہ تعلیم نسواں کا ذکر تک سننا گوارا نہیں کرتا۔فاضل مصنف نے اس افراط و تفریط سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔وہ موخرالذکر گروہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں اور بہت صحیح کہتے ہیں —

> "عورتوں پر دور ماضی کا بہت بڑا اثر پڑا ہے اور اس نے عورت کو اپنے مناسب حال اخلاق اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے۔اب نسلاً بعد نسل یہ مصنوعی اخلاق اس کے اندر راسخ ہوگئے ہیں "تربیت" اور "انتخاب جنسی" نے ان کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔تربیت کے ذریعہ سے لڑکی کو ان اوصاف کا خوگر کیا جاتا ہے جو اس کے لئے پسندیدہ خیال کئے جاتے ہیں............اور "انتخاب جنسی" کے ذریعہ سے ان اوصاف کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے جو مرد کو خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔چونکہ مرد صرف اس لڑکی سے شادی کرتا ہے جس میں یہ اوصاف پائے جائیں۔اس لئے نسلاً بعد نسل یہ خواص موروثی بنتے چلے جاتے ہیں"—

....

> "عورت کے اندر اس قسم کی مخفی قوتیں موجود ہیں جو اس کی حالت کو بہتر بنا سکتی ہیں اس پر

ایک طویل مدت تک مظالم کئے گئے ہیں ....
مقتضاے انصاف نہیں ہے کہ اب بھی ہم اس پر
جابرانہ حکومت کریں۔

———:o:———

اول الذکر گروہ سے فاضل مصنف کا خطاب یہ ہے۔—
" تربیت سے زیادہ خود نسوانیت عورت کی ذات
پر اثر ڈالنے والی چیز ہے......
" اور یہی نسوانیت حقیقی اور اساسی موثر ہے "

....

" ایک محدود حد تک عورت کو لازمی طور پر
مرد کی اطاعت کو قبول کرنا پڑے گا اور اگر اس
نے اس اطاعت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو نظام
بشری کلیتاً اُلٹ پلٹ جائے گا۔ بلکہ اگر کوئی انسان
اس کی کوشش کرے تو خود عورت کی فطرت۔اس
کے اعضا کی ساخت۔اس کا اخلاق اور اس کا مزاج
اس مقصد کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرے گا "—

———:o:———

مذکورۂ بالا اقتباسات سے عورتوں کے متعلق فاضل مصنف کا نقطۂ خیال پورے طور پر معلوم ہو جاتا ہے اور اس میں اضافہ یا کمی کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔اگر ہمارے پر جوش جدید تعلیم یافتہ نوجوان یہ سمجھ لیں کہ با وصف مساوات ذہنیت عورت اپنا ایک مخصوص نظام ترکیبی بھی رکھتی ہے یعنی "نسائیت" تو وہ یورپ اور امریکہ کی کورانہ تقلید چھوڑ دیں۔ دوسری طرف اگر ہمارے ملک کے قدامت پسند حضرات اس حقیقت پر غور کریں کہ عورت کی موجودہ حالت۔اس کی کمزوریاں۔اس کی مکتسب عادتیں یہ سب کے سب اس میں ماحول کے اثرات یا بقول فاضل پروفیسر "انتخاب جنسی" (Sexual Selection) کی بدولت پیدا ہوئے ہیں اور انہیں بدلنا ممکن ہے تو وہ عورت کو حقیر خیال کرنا چھوڑ دیں۔اس کی قابلیت کا صحیح اندازہ کریں اور اسے اس کے مناسب حال رتبہ پر ضرور سرفراز کریں—

———:o:———

کتاب میں عورت کی نفسیاتی خصوصیات مثلاً غیرت۔کثیرالکلامی۔

جذبہ واسطہ بازی-تنگ خیالی-تلون مزاجی وغیرہ پر بھی مفصل بحث کی گئی ہے-جو بجائے زمانہ حال کی تحقیق کے زیادہ تر متقدمین کے خیالات سے ماخوذ ہے-مثلاً عورت کی ذہانت اور حافظہ کے جو نقائص فاضل مصنف نے بتائے ہیں ان کی تصدیق تازہ ترین نفسیاتی اختیارات سے نہیں ہوتی —

کتاب کا طرز فلسفیانہ ہے-ترجمہ میں بھی یہی اثر پیدا ہوگیا ہے-مناسب ہوتا کہ زیادہ سلجھا ہوا ترجمہ ہوتا-موجودہ ترجمہ بھی بہت بلند پایہ ہے —

نسوانی مسائل پر غور کرنے والے حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضرور مفید ہوگا —

کاغذ معمولی لکھائی چھپائی اچھی ایک روپیہ ۸ آنہ میں صوفی پرنٹنگ کمپنی پنڈی بہاءالدین سے مل سکتی ہے —

(و)

شالامار باغ

یہ سو صفحات کی کتاب مولوی محمدالدین صاحب فوق لاہوری کی تالیف ہے-جس میں موصوف نے نہایت تلاش و جستجو سے ہندوستان کے اُس مشہور آفاق تاریخی باغ کے حالات تاریخی لکھے ہیں جو لاہور میں شالامار کے نام سے معروف-مرحوم شاہجہاں بادشاہ کے شوق تعمیر کی دلفریب یادگار اور آج بھی باوجود اپنی بربادیوں کے نادرۂ روزگار ہے-جناب فوق بہت سی تاریخی کتابوں کے مولف ہیں اور آپ کے تالیفات کو ملک میں پوری مقبولیت حاصل ہو چکی ہے-چنانچہ یہ رسالہ بھی بارہا ارباب ذوق کے ہاتھوں تک پہنچ چکا ہے-مگر اس جدید اشاعت میں مولف صاحب نے بہت کچھ مزید تاریخی معلومات کا اضافہ کیا ہے اور اب یہ باغ شالامار کی ایک عمدہ اور مکمل تاریخ ہو گیا ہے-مزید دل چسپی کے لئے لایق مولف صاحب نے یہ کیا ہے کہ کشمیر-پنجاب-ہندوستان میں اور جتنے باغ اس نام کے ہیں ان کے حالات بھی بہم پہونچا کر شامل کر دئے ہیں —

چھوٹے سائز پر معمولی چھپی ہے اور آٹھ آنہ میں ظفر برادرس تاجران کتب لاہور سے ملتی ہے —

(م)

تاریخ و سیرت

ترجمہ تزک بابری اُردو معروفہ بابرنامہ

یہ کتاب بابر بادشاہ کے خود لکھے ہوئے سوانح زندگی کا اُردو ترجمہ ہے جو شاہزادہ مرزا نصیرالدین حیدر گورگانی المتخلص بہ فانی مرحوم و مغفور نے فارسی ترجمہ سے سلیس اُردو زبان میں کیا ہے۔مترجم نے اسے ۱۸ جمادی الاول سنہ ۱۳۱۶ ہجری کو قیام حیدرآباد کے زمانہ میں ختم کیا لیکن طبع ہونے کی نوبت اُن کی وفات کے بعد سنہ ۱۳۴۳ ہجری میں آئی حضرت مترجم انارالله برهانه کی محنت شاقه اور اُن کی صاحبزادی خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ سلمہا الرحمن کی توجہ کاملہ کا یہ نتیجہ ہے جو یہ بے نظیر کتاب نہایت شیریں با محاورہ اردو زبان میں زیور طبع سے آراستہ نظر آتی ہے۔اس کتاب کا ترجمہ تقریباً یورپ کے ہر زبان میں ہو گیا ہے اور یہ بڑی صدمہ کی بات تھی اور بڑی کمی تھی کہ اُردو زبان اس دولت سے محروم تھی۔اس لئے صاحبزادی صاحبہ کا جہاں تک شکریہ ادا کیا جائے کم ہے کہ انہوں نے اپنے والد ماجد مرحوم مغفور کے یادگار ہی کو زندہ نہیں کیا بلکہ اُردو داں پبلک پر بڑا احسان کیا—

جناب شہزادہ مرزا نصیرالدین حیدر مرحوم جیسا کہ مقدمۂ کتاب سے معلوم ہوتا ہے ترکی زبان سے واقف تھے اور ایک ترکستانی عالم سید محمود آفندی سے حاصل کی تھی۔یہ اُردو ترجمہ گو عبدالرحیم خاں خانخانان کے فارسی ترجمہ سے کیا گیا ہے مگر اُس فارسی ترجمہ میں اس قدر ترکی الفاظ ہیں کہ جب تک قدیم ترکی زبان سے واقفیت نہ ہو فارسی سے بھی ترجمہ کرنا دشوار ہے چنانچہ جن لوگوں نے یورپ کی زبانوں میں فارسی سے ترجمہ کیا ہے وہ بھی ایک گونہ ترکی زبان سے واقفیت رکھتے تھے۔اُردو میں ترجمہ ہونے کے بعد اس کا مقابلہ جان لیڈن صاحب کے ترجمہ سے بھی کیا گیا ہے۔جان لیڈن صاحب کے ترجمہ کے متعلق ذیل کے سطور میں کچھ ذکر کیا جائے گا۔خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ اپنی مقدمہ کتاب میں تحریر فرماتی ہیں کہ "ابتداء تو اس کام میں حضرت کے ایک انگریزی خواں دوست نے اپنا وقت عزیز صرف کیا اور جب وہ نبھا

نہ سکے تو میرے برادر مرحوم مرزا قمرالدین حیدر جو اُس وقت زندہ تھے اور راقمہ نے باوجود اپنی کم لیاقتی کے اپنی خدمات نذر کیں پھر برادر مرحوم کو بھی خدمات مفوضہ سرکاری کے سبب سے فرصت نہ ملی لیکن راقمہ نے یہ مبارک خدمت بفضل الہی آخر تک انجام دی" واقعی اس ترجمہ میں صاحبزادی صاحبہ (سلمہا اللہ تعالیٰ) نے جو کد و کاوش فرمائی ہے اور حسن اسلوب کے ساتھ جو انتظام طبع فرمایا ہے وہ ہم سب کے شکریہ کا مستحق ہے۔ جو کام اس وقت تک بڑے بڑے مردوں سے نہ ہو سکا وہ ان لایق بی بی نے انجام دیا۔ کاتب حروف کے پاس سوائے تعریف و عقیدت مندی کے ان کے لئے کوئی الفاظ نہیں خدائے بزرگ و برتر انہیں بہت دنوں سلامت رکھے! اور ایسے بہت سے کام اُن کے ہاتھ سے کرائے! یہ بی بی مردوں سے گوے سبقت لے گئیں اور قوم کے لئے باعث فخر ہیں—

بابر نامہ کے اس وقت تک آٹھ قسم کے نسخے دنیا کی نظر سے گذرے ہیں جنکی تفصیل مسز بیورج نے اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں حسب ذیل دی ہے۔—

۱- بابر کا اپنا قلمی نسخہ سنہ ۱۵۳۰ع میں لکھا گیا اس میں کچھہ اوپر ۳۸۲ صفحے تھے سنہ ۱۶۲۸ع سے ۱۶۳۸ع تک شاہی کتب خانہ میں اس کا پتہ چلتا ہے اس کے بعد غائب ہو گیا—

۲- خواجہ کلاں احراری کا نسخہ-یہ سنہ ۱۵۲۹ع میں لکھا گیا تقریباً ۳۶۴ صفحے تھے-جس سال مکمل ہوا اسی سال سمرقند بھیجا گیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس کا لکھا ہوا ہے-کہا جاتا ہے کہ خواجہ کلاں کے خاندان میں اب تک محفوظ ہے—

۳- ہمایوں کا نسخہ جس پر اس کے حکم سے حاشیہ چڑھایا گیا تھا-غالباً اس کی تکمیل سنہ ۱۵۳۱ع میں ہوئی اس کا لکھنے والا شاید علی الکاتب تھا سنہ ۱۵۵۶ع سنہ سے ۱۵۶۷ع تک شاہی کتب خانہ میں اس کا پتہ چلتا ہے—

۴- محمد حیدر و غلات کا نسخہ-یہ سنہ ۱۵۳۶ع و سنہ ۱۵۴۰ع کے درمیان لکھا گیا ہے ممکن ہے کہ خود محمد حیدر مولف تاریخ رشیدی کے ہاتھہ کا لکھا ہوا ہو-سنہ ۱۵۴۰ع و سنہ ۱۵۴۷ع میں کشمیر میں اس کا پتہ چلا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ اب کاشغر میں ہے—

۵- الفنسٹن صاحب کا نسخہ-اس کی تاریخ کتابت مابین سنہ ۱۵۵۶ع و سنہ ۱۵۷۶ ع ہے اس میں تقریباً (۲۸۶) صفحے تھے-کتب خانہ اڈووکیٹ (Advocates' library) میں سنہ ۱۸۱۶ع سے سنہ ۱۹۲۱ع تک پتہ تھا-سنہ ۱۸۱۰ و

میں بمقام پشاور یہ خریدا گیا تھا —

۶- برٹش میوزیم کا نسخہ- سنہ ۱۹۲۹ ع میں تحریر ہوا ہے- اس میں صرف (۹۷) ورق ہیں- سب پرزے پرزے ہیں- علی الکشمیری اس کا کاتب تھا —

۷- نسخہ للندیسیانا- نور محمد خواهر زادہ ابوالفضل نے اسے سنہ ۱۹۲۵ ع میں لکھا تھا- اس کے صرف (۷۱) ورق دستیاب ہوے ہیں جو اب جان ریلنڈ (Jhon Ryland) کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں —

۸- حیدرآبادی نسخہ- غالباً سنہ ۱۷۰۰ ع کا قلمی ہے اس میں ۳۸۲ صفحے ہیں- مسز- اے بیورج Mrs.A.S.Beveridge نے اسے ایڈٹ کیا اور سنہ ۱۹۰۵ ع میں مسٹر گب ٹرسٹ (Gibb Trust) نے فوٹو لے کر شایع کیا- یہ نسخہ سب سے زیادہ صحیح ہے- مسز بیورج کی نظر سے بمقام حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۰۰ ع میں گزرا تھا اور سید علی بلگرامی مرحوم کی کوششوں سے مسز بیورج کو دستیاب ہوا جنھوں نے (۱۸) سال کی محنت میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مفصل حاشیے چڑھا کر شایع کیا —

فارسی میں بابر نامہ کا پہلا ترجمہ سنہ ۱۵۸۳ ع میں پائندہ حسین مغول غزنوی اور محمد قلی مغول حصاری نے کیا تھا- دوسرا فارسی ترجمہ سنہ ۱۵۸۹ ع میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے محمد عبدالرحیم خاں خانخاناں ترکمان نے کیا- ان دونوں نے اپنے ترجموں کا نام واقعات بابری رکھا- مسٹر لیڈن اور مسٹر ارسکن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا مگر فارسی ترجمہ سے کیا- اصل ترکی سے نہیں کیا اصل ترکی سے بابر نامہ کا ترجمہ صرف مسز اینٹ- ایس بیورج Mrs. Annette S. Beveridge نے کیا ہے جو اس زمانہ میں سب سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے- ان تینوں ترجموں میں باہم بہت اختلاف ہے جن پر تفصیلی بحث کرنا یہاں مقصود نہیں صرف معمولی سا ذکر کیا جاے گا- یہ اُردو ترجمہ بابر نامہ جو اس وقت زیر تنقید ہے عبدالرحیم خاں خانخاناں کے فارسی ترجمہ کا ترجمہ ہے اور لیڈن صاحب کے ترجمہ سے مقابلہ کرکے درست کیا گیا ہے- یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ فارسی ترجمہ شہزادہ مرزا نصیرالدین حیدر مرحوم کے پاس کہاں سے آیا- کاتب حروف کے پاس جو نسخہ ہے وہ مرزا محمد شیرازی ملک الکتاب بمبئی کا طبع کردہ ہے جس کے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ " کتاب مذکور از کتب خانۂ عالی جاہ راجہ مہاسوپادیایا سانول داس جی ممبر کونسل راج اودےپور بدست آمد لہذا بہ ترسیم آں رغبت گماشتہ

و حتی الامکان به تصحیح آں کوشید. اماچوں تصحیح ایں قبیل کتاب که منحصر به نسخه واحد و اکثر الفاظ ترکی داره چنانچه باید بفعل نمی آید "- یه صحیح هے واقعی اس نسخه میں بکثرت غلطیاں موجود هیں- میرزا نصیرالدین حیدر مرحوم کے اُرده ترجمه کا اس فارسی ترجمه سے سرسری مقابله کرنے پر معلوم هوا که یه اُرده ترجمه لفظی ترجمه نهیں هے بلکه رواں هے مثلاً—

صفحه ۱ سطر ۱۳ میں هے "ازبکوں کے حملے سے اس زمانه میں ایسی ویرانی هے" (اُرده ترجمه)- فارسی ترجمه یه هے "از جهت عبور اوزبک درایں تاریخ ویراں شده "- ترکی الفاظ یه هیں "مغل و اوزبک جهت دین" یعنی مغلوں اور اوزبکوں کی وجه سے مسز بیورج لکھتی هیں که الفاظ "از جهت عبور اوزبک" خانخاناں کے بڑھاے هوے هیں جن سے صرف صراحت مقصود تھی اس لئے که المالیغ و الماتو اور یانگی یه تینوں شهر مشرق و مغرب کے راسته پر جهاں سے خانه بدوش اقوام آیا کرتی تھیں واقع تھے- ترجمه میں اس کی طرف اشاره کرنا مقصود تھا جو "عبور" کا لفظ بڑھایا گیا- ارسکن اور لیڈن نے اس کا ترجمه "از جهت حمله هاے اوزبک" کیا هے جو نه ترکی کا صحیح ترجمه هے اور نه اس میں وه رعایت هے جو وضاحت کے خیال سے خانخاناں نے رکھی تھی- اسی انگریزی ترجمه لیڈن صاحب کا ترجمه شهزاده صاحب کا اُرده ترجمه هے—

صفحه ۵ سطر ۱ "اس کو تاریخ کی کتابوں میں اخشیکت کے نام سے لکھا هے" فارسی ترجمه میں هے "در کتب اخشیکت می نویسند" اصل ترکی میں هے "کتابوں میں اسے اخشیکیت لکھتے هیں"

صفحه ۵ سطر ۴-۶ " دریاے سیحوں قلعه کے فصیل کے نیچے هی بهتا هے- اس کا قلعه ایک اونچے کھڈ پر بنا هوا هے جو دریا کے کڑاڑے پر هے- کھڈ کی گهرائی گویا قلعه کی خندق هے- عمر شیخ مرزا نے جب اس کو دارالسلطنت بنایا تو دو ایک مرتبے باهر کی جانب اور پشتے تعمیر کئے" یه ترجمه اِس فارسی کا هے "دریاے سیحون از پایه قلعه ومیریزد- وقلعه او برجر بالمدی واقع شده- بجاے خندق جرهاے عمیق افتاده عمر شیخ مرزا که آں را پاے تخت ساخت یکدومرتبه از بیروں هم باز جرها انداخت" مسز بیورج نے جو ترجمه کیاهے اس کی اُرده یه هے- "فصیل سے گھرے هوے شهر کے نیچے دریاے سیحوں بهتا هے- یه قرغاں (یعنی محصورة بستی اور قلعه سب) ایک بڑے کھڈ (دره) پر واقع هے اور خندق کے جگه اس میں گهرے گهرے درے هیں- عمر شیخ مرزا نے جب اسے اپنا پاے

تعمت بنایا تو دو ایک سرتبه بیرونی دروں میں سے (جلد) اور درے کاٹے۔ اسپر مسز بیورج نے ایک بڑا نوٹ دیا ہے جو بہت دلچسپ ہے مگر طوالت کے خیال سے یہاں نہیں درج کیا جاتا۔ انکا مقصود یہ ہے کہ عمر شیخ مرزا نے پانی کے لئے نہریں کاٹ کر نکالی تہیں جلہیں اسی شہر اخشی کے مشرق و مغرب میں باہم لاکر ملا دیا تھا تا کہ شہر کی حفاظت کا کام بھی اُن سے لیا جاسکے اور شہر میں زیادہ پانی بھی پہونچایا جاسکے۔ بابر دو لفظ الگ الگ استعمال کرتا ہے قرغان اور ارک۔ قرغان سے مراد ہے وہ شہر جس کے گرد فصیل ہو معہ اندرونی قلعہ کے جسے ارک کہتے ہیں۔ خافخاناں نے اور انکے اتباع میں مرزا نصیرالدین حیدر مرحوم نے قرغان اور ارک دونوں کا ترجمہ قلعہ ہی کیا ہے اور جو فرق انکے معنوں میں ہے اسے نظر میں نہیں رکھا —

صفحہ ۵ سطر ۱۲ " بارہ سنگھا " ترجمہ کیا گیا ہے بوغو مرال کا جس کے اصلی معنی گوزن کے ہیں۔ حیدرآبادی ترکی نسخہ میں اس لفظ کے نیچے معنی کے طور پر گوزن کا لفظ لکھا ہوا ہے اور واقعات بابری میں بھی اس کا ترجمہ گوزن کیا گیا ہے۔ لیکن خانخاناں کا جو فارسی ترجمہ ہمارے سامنے ہے اس میں صرف بوغو مرال ہی لکھا ہوا ہے —

صفحہ ۸ سطر ۴ و ۵ " معجون بہت کھانے لگے تھے۔ معجون کھانے کے بعد مزاج چڑچڑا ہوجاتا تھا۔ رحمدل بہت تھے۔ بغل اور داغ بہت رکھتے تھے " یہ ترجمہ بالکل غلط کیا گیا ہے مترجم نے نوٹ میں بعض الفاظ کے نہ سمجھنے کا اعتراف کیا ہے۔ فارسی ترجمہ کی اصل عبارت یہ ہے " در آخر معجون بسیار اختیار میکرد و در معجون گری کلہ خشک می شد۔ متیم شعار بود ونعل داغ بسیار داشت " مسز بیورج کے ترجمہ کی اُردو یہ ہے " آخر زمانہ میں معجون کو ترجیح دیتے تھے اور اس کے ترنگ میں بیخود رہا کرتے تھے۔ عاشق مزاج تھے اور محبت کے داغ (دل پر) بہت رکھتے تھے " اس معنی کے سند میں مسز بیورج نے نظامی کا یہ مصرعہ پیش کیا ہے —

هلوز ازعشق بازی گرم داغ هست

صفحہ ۱۲ سطر ۱۱ " جنگ یاسی کجیت میں گھمسان کی لڑائی لڑا تھا بھاگڑ اور مصیبت کے موقعہ پر جب میں نے کوہستان سیحا سے سلطان محمود خان پاس جانے کا ارادہ کیا " فارسی ترجمہ ہے " واز جنگ یاسی کجیت هم خوب چاپقولاش کردہ بود۔ در قزاقیها وقتیکہ در کوهستان سیحا عزیمت رفتن پیش سلطان محمود خان کردم " چاپقولاش سے مراد باہم شمشیر زنی کرنا ہے۔ قزاقی

کا لفظ اُن نوالوں کے لئے آیا ہے جو لقمہ چبا جانے کے بعد کمیلاؤں میں بیٹھ کر باہر لے لڑی تھیں۔ انہیں انگریزی میں "گوریلا وارفیر" کہتے ہیں۔ اُردو ترجمہ سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا جہاں اس لفظ کا ترجمہ ہمیشہ "مصیبت کے موقعے" کیا گیا ہے—

صفحہ ۱۱ سطر ۲۰۔ فارسی کا ایک شعر ہے جس کا آخری لفظ ارزین ہے۔ فارسی نسخہ میں بھی یہی ہے جسے کتابت کی غلطی کہنا چاہئے مگر مسز بیورج ارزین لکھتی ہیں جو صحیح ہے۔ دیباچہ انوار سہیلی میں یہ شعر موجود ہے—

صفحہ ۱۴ سطر ۱۲-۱۳ "سنہ ۹۰۸ ہجری میں جب میں نے خسرو شاہ کے آدمیوں کو توڑ لیا اور کابل میں مقیم کو جا گھیرا" فارسی ترجمہ ہے "در تاریخ نہصد و دہ که خسرو شاہ را همراه گرفته در کابل مقیم را قبل کرده بودم" سنہ کی غلطی ہے فارسی ترجمہ میں سنہ صحیح ہے نام مقیم نہیں ہے بلکہ مقیم ہے "خسرو شاہ را همراه گرفته" اس فارسی اور اس کے اُردو ترجمہ "خسرو شاہ کے آدمیوں کو توڑ لیا" ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ حیدرآبادی ترکی نسخہ فارسی ترجمہ کی تائید کرتا ہے اس کا اُردو ترجمہ یہ ہے "سنہ نوسو دس ہجری میں جب کہ خسرو شاہ کے همراه میں نے کابل میں مقیم کو محصور کیا"—

صفحہ ۱۵ سطر ۵ و ۶ "اس کا دعویٰ تھا کہ میں جادوگر ہوں" فارسی ترجمہ ہے "دعوی یدہ چی گری میکرد" یدہ چی گری کے معنے جادوگری کے نہیں ہیں۔ مسز بیورج نے اس کا ترجمہ Jad-stone سے پانی برسانا کیا ہے۔ اُردو ترجمہ سے یدہ چی گری کی یہ خصوصیت نہیں ظاہر ہوتی اور جادو کا عام مفہوم سمجھ میں آتا ہے جو صحیح نہیں ہے—

صفحہ ۱۶ اُردو ترجمہ میں "سنہ ۸۹۹ ہجری کے واقعات" یہ الفاظ بطور عنوان درج ہیں۔ فارسی ترجمہ میں ہے "وقائع سال اول جلوس مطابق سنہ ۸۹۹ ہجری"۔ مسز بیورج نے کوئی ایسا عنوان نہیں قایم کیا۔ ترکی نسخہ میں صرف تسلسل واقعات ہے سال جلوس اول کی صراحت کر کے واقعات درج نہیں کئے ہیں مگر اس میں کوئی ہرج نہیں۔ فارسی ترجمہ اور اُردو ترجمہ کے یہ اختلافات کتاب زیر ریویو کے صرف سولہویں صفحہ تک سرسری طور پر نظر آئے ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ہر جزو میں کم و بیش اسی قدر ملیں گے۔ مثال کے طور پر بس انہیں کافی سمجھا جائے۔ عیسوی تاریخیں آسانی کے لحاظ سے ہجری سنین کے مطابق اکثر صحیح لکھی گئی ہیں مگر بعض بعض جگہ غالباً سہواً

غلطی ہو گئی ہے مثلاً صفحہ ۳۷ کے چوتھے نوٹ میں بجائے سنہ ۱۳۹۷ ع کے سنہ ۱۴۵۷ ع درج ہو گیا ہے۔ یہ یقیناً کاتب کی غلطی ہے مگر ایسی غلطیاں نہ ہونی چاہئیں۔ اصل ترکی نسخہ میں دستبرد زمانہ سے سنہ ۱۹۱۴ ھ کے واقعات کا صرف ایک ورق باقی رہ گیا ہے۔ اس کے بعد سے سنہ ۹۲۵ ہجری تک کے اوراق ضائع ہو گئے اور کتاب میں نہیں ہیں۔ سنہ ۹۲۵ ہجری سے واقعات کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے لیکن سنہ ۹۲۶ ہجری کے چلند ورق کے بعد بہت سے اور ورق غائب ہیں اور سنہ ۹۳۲ ہجری سے پھر سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ تمام واقعات اُردو ترجمہ میں (باتباع مطبوعہ ترجمہ فارسی) سنہ ۹۱۵ ہجری اور سنہ ۹۲۷ ہجری کے نیچے درج کئے گئے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ اسے تحقیق کر کے لکھنا چاہئے تھا۔

مقامات کے نام نیز اشخاص کے نام کہیں کہیں غلط اور بلا تحقیق و تصیح لکھ دئے گئے ہیں۔ یہ چیز نہایت اہم اور سخت محنت و جانفشانی کی محتاج ہے۔ صرف دو ایک مقام کی مثال یہاں دی جاتی ہے ورنہ پوری کتاب سے انتخاب کرنا ایک غلط نامہ تیار کرنے کے برابر ہے۔

صفحہ ؛ أطرار غلط ہے۔ اس کے جگہ طراز ہونا چاہئے۔ أطرار مغربی ترکستان میں ہے اور طراز مشرقی ترکستان میں۔ متن میں مشرقی ترکستان کا ذکر ہے اس لئے اس میں أطرار صحیح نہیں ہو سکتا۔

ایغاچ ایک لفظ ہے جو بارہا اس کتاب میں آیا ہے۔ اس کا ترجمہ فارسی میں فرسنگ کیا گیا ہے مگر یہ غلط ہے۔ ایغاچ ایک۔قررہ فاصلہ کے لئے نہیں آتا اور کم و بیش ہوتا رہتا ہے کہیں فرسنگ کا مرادف ہوتا ہے اور کہیں نہیں۔ اسلئے فرسنگ کی جگہ اس لفظ کو ہمیشہ داخل کرنا بے احتیاطی بلکہ غلطی ہے۔ صفحہ ۲۰ پر سلطان احمد مرزا کی ایک بیوی کا نام قبلق بیگم لکھا ہے جو غلط ہے۔ صحیح لفظ قتاق یا قاتاق ہے۔ حاشیہ میں مترجم نے اشارہ کر دیا ہے مگر متن میں صحت نہیں کی۔ صفحہ ۲۲ سطر ۲۱ میں ترقد بیگ غلط نام ہے۔ صحیح نام توقا بیگ ہے اسی طرح محمد دوست اور علی دوست دو الگ الگ شخصوں کا مذکور نہیں ہے بلکہ صرف محمد دوست کا ذکر ہے جو علی دوست کا لڑکا ہے۔ صفحہ ۴۴ سطر ۱۸ و ۱۹ میں پل محمد حبیب غلط نام ہے۔ صحیح نام ہے پل محمد چپ۔ غرض کہ اسی طرح کے ناموں میں بکثرت غلطیاں ہیں جو نظر ثانی کی سخت محتاج ہیں۔

بابر نے بعض مقامات پر مثلاً خواجہ مولانائے قاضی ابراھیم سارہ گوک سدائے وغیرہ کے حالات بطور جملہ معترضہ سلسلۂ واقعات سے الگ کر کے لکھے ہیں۔ فارسی ترجمہ کی کتابت میں ایک سلسلہ میں انہیں درج کر دیا گیا ہے

اور اردو ترجمہ میں بھی یہی لیا گیا ہے۔مناسب ہوتا کہ انہیں اس طرح لکھا جاتا کہ سلسلہ یہاں منقطع نہ معلوم ہوتا اور یہ یوں اپنی جگہ رہتے۔ترکی اصل کتاب سے اگر مقابلہ کیا جائے تو بعض مقامات پر بہت تقدم و تاخر معلوم ہوگا مثلاً اردو ترجمہ میں (باتباع فارسی مطبوعہ ترجمہ) صفحہ ۳۳ پر سنہ ۹۰۳ کے واقعات میں سلطان حسین مرزا اور بدیع الزماں مرزا کی لڑائی۔ بدیع الزماں کے ذوالنون کے پاس جانے تک کا حال درج ہے جو حیدرآبادی ترکی نسخہ میں موخر رکھا گیا ہے اور سنہ ۹۰۲ ہجری کے واقعات میں درج کیا گیا ہے۔اس طرح اور دو ایک مقام پر یہی حال ہے اور الفاظ میں تو اکثر اختلاف ہے جس کی صراحت طوالت سے خالی نہیں۔اگر یہ امر تحقیق کر لیا جاتا کہ کس سنہ کے یہ واقعات ہیں اور اُسی سنہ کے تحت میں درج کئے جاتے تو مناسب ہوتا—

اس اردو ترجمہ کا جان لیڈن صاحب کے ترجمہ سے مقابلہ بھی ہوا ہے۔ لیڈن صاحب کا ترجمہ خود بالکل ناقص اور تصحیح طلب ہے۔مسٹر ارسکن کو جب یہ ترجمہ ملا تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔وہ لیڈن صاحب کو بڑی منزلت دیتے ہیں مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "اس ترجمہ کے ملنے نے مجھے عجیب گومگو کی حالت میں ڈال دیا۔دونوں ترجمے (یعنی خود ان کا اور لیڈن صاحب کا) بہت سے اہم جزئیات میں اختلاف رکھتے ہیں لیکن چوں کہ ڈاکٹر لیڈن کو اصل نسخہ سے ترجمہ کرنے کا موقعہ ملا تھا میں نے خیال کیا کہ جہاں تک ہوسکے انہیں کے ترجمہ کو اختیار کروں اور صرف ایسے مقامات تبدیل کرتا جاوں جو متن سے یا تزک کے دیگر حصص سے صاف طریقہ پر غیر مطابق نظر آئیں یا جو بالکل سہو نظری سے تحریف ہوئے ہوں جو ایک نامکمل کام میں لازمی طور پر واقع ہوا کرتی ہیں"۔ارسکن کے مقدمہ میں بہت سے ایسے صاف صاف اشارے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر لیڈن کے ترجمہ کو سمجھتے ہیں کہ محض مشق کے طور پر کیا گیا تھا اور اس میں بہت کچھ تصحیح و ترمیم کی ضرورت باقی تھی۔کاش اس اردو ترجمہ کا مقابلہ بجائے لیڈن صاحب کے مسز بیورج کے ترجمہ سے کیا جاتا اور جو نوٹ کہ لیڈی صاحبہ نے لکھے ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جاتا۔مجھے یقین ہے کہ اگر خجستہ سلطانہ بیگم صاحبہ کو اس کا علم ہوتا تو وہ ضرور ایسا کرتیں—

مسز بیورج نے اپنا ترجمہ چار حصہ کرکے جون سنہ ۱۹۱۲ ع مئی سنہ ۱۹۱۴ ع اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ ع اور ستمبر سنہ ~~[illegible]~~ ۱۹۲۱ ع میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے شایع کیا

ہے۔انہیں مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کی مدد سے ایک ترکی قلمی نسخہ مل گیا تھا۔جو ان کی تحقیقات میں بابر کے اپنے قلمی نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔بابر کے اس نسخہ کو عبدالحمید (مولف پادشاہ نامہ) نے سنہ ۱۶۲۸ ع و سنہ ۱۶۳۸ ع کے مابین شاہ جہاں کے ذاتی کتب خانہ میں دیکھا ہے۔یہ اب نادر شاہ کے دستبرد اور سنہ ۱۸۵۷ ع کی بغاوت کی بربادی سے خدا معلوم کہاں ضائع ہو گیا ہے۔ حیدرآبادی ترکی نسخہ جو اس کی نقل ہے اورنگ زیب کے زمانہ (سنہ ۱۶۵۵ ع۔ سنہ ۱۷۰۷ ع) کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔مسز بیورج نے پروفیسر براؤن کو یہ نسخہ دکھایا تھا اور ان کے مشورے کے بعد چھاپا گیا۔مگر اس میں بھی بہت سے ورق غائب ہیں اور تسلسل بیان میں وقفہ پڑ جاتا ہے۔

محمد حیدر مرزا وغلات کے پاس بھی ایک اصلی نسخہ تھا جس سے وہ تاریخ رشیدی میں بکثرت انتخابات درج کرتا جاتا ہے۔ان ایام کے حالات معلوم کرنے میں جن کے ورق گم ہو گئے ہیں اس نسخہ سے بہت مدد مل سکتی ہے۔اصل ترکی بابر کی اپنی زبان ہے۔مسز بیورج نے باوجود ارسکن اور لیڈن کے ترجموں کے حیدرآبادی ترکی نسخہ سے ترجمہ کرنے کا ارادہ صرف اس لئے کیا کہ وہ لیڈن کے نسخہ کی طرح نامکمل اور خراب نہ تھا اور ارسکن کے ترجمہ کے مقابلہ میں جو فارسی ترجمہ کی مدد سے کیا گیا ہے اصل ترکی سے ترجمہ کرنا اصلیت کو زیادہ قائم رکھنا تھا۔بابر کے اپنے رنگ اور خصوصیات کا جو اندازہ خود اس کے الفاظ سے ہو سکتا ہے وہ اس کے کلمات کے اون ترجموں سے نہیں ہو سکتا جو فارسی میں ترجمہ کئے گئے تھے۔ارسکن کے ترجمہ میں یہ بات مفقود ہے اور لیڈن کے ترجمہ میں جو بالکل نامکمل اور ناقص ہے بدرجۂ اولی مفقود ہے۔پھر اُس ترجمہ میں یہ کیسے نظر آسکتی ہے جو با محاورہ رواں اُردو زبان میں فارسی ترجمہ سے کیا جائے اور ایک ناقص ترجمہ سے مقابلہ کر کے صحیح کیا جائے۔ یہ ضروری بات ہے کہ بابر بابر نظر آئے نہ کہ اکبر شاہ ثانی یا بہادر شاہ۔

اس اُردو ترجمہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان نہایت شستہ اور طرز ادا دلچسپ اور مسلسل ہے کہیں اُلجھن نہیں ہوتی اور گو خانخاناں کے ترجمہ کی طرح اصل ترکی زبان کے انداز و ترکیب عبارت کے مطابق نہیں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ ایک بہت مشکل چیز کو حتی المقدور واضح اور سلیس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مترجم علیہ الرحمہ کو اس میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔

مسز بیورج اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں لکھتی ہیں کہ خود ان کے ترجمہ

ارسکن کے ترجمہ اور ڈی کورٹیل کے الفاظ و انداز میں بابر کی شخصیت تین مختلف طرح کی معلوم ہوتی ہے۔اس اختلاف کی وجہ ایک حد تک یہ ہے کہ ہر ایک نے مختلف نسخوں سے ترجمہ کیا ہے لیکن بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ نواہ اہل قلم نے اپنی بے تکلف رواں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کا خوب استعمال کیا ہے۔ان کی تصویر بلا شک زیادہ صحیح ہوتی اگر ان میں سے ہر ایک اپنی مادری زبان کے استعمال کو صرف ان اجزا تک محدود رکھتا جو ترکیب السنہ کے لحاظ سے پرانی ترکی کے لگ بھگ ہوتی —

یہی حال اردو ترجمہ کا ہے جو بابر ترکی زبان میں نظر آتا ہے۔وہ اردو زبان میں نہیں ہے۔وہ " ہم " کا لفظ اکثر صرف اسوقت استعمال کرتا ہے جبکہ خود اس کی ذات کے ساتھ اس کے امراے دولت وملازمین سے بھی مراد لینا مقصود ہو ورنہ شرماتا ہے۔کہیں افعال مجہول استعمال کرکے اپنا صریحی ذکر بچا جاتا ہے اور کہیں جمع متکلم استعمال کرکے دوسرے لوگوں کی آڑ میں خود حجاب کے مارے پوشیدہ رہتا ہے۔اس کے بچپن کی اُمنگ۔شوخ و شنگ طبیعت۔پھر درازی عمر کے ساتھ پختگی کا آنا اور باوجود بےتکلفی کے متانت یہ سب باتیں اس کی اپنی زبان کے مختلف موقعوں کی عبارتوں ہی سے ظاہر ہوسکتی ہیں۔بے تکلف اردو محاوروں کا آزادانہ استعمال اسے کہیں سے کہیں پہونچا دیتا ہے اور بعض دفعہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو اصل ترکی کتاب میں ہے۔میرے خیال میں اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ بہت کچھ لفظی کیا جاے اور حتی المقدور ترکی زبان کے خصوصیات یا کم سےکم جو قیود کہ بعض ترجموں میں ان خصوصیات کو محفوظ رکھنے کیلئے رکھے گئے ہیں انکی پابندی ملحوظ رہے خواہ زبان کسی قدر اوپری ہی کیوں نہ معلوم ہو۔اس سے آدمی کی صحیح طبیعت کا کسی قدر اندازہ ہوسکے گا لیکن اگر دوسری زبان کے محاورات کو بلا تکلف برتا جاے گا تو اس بات کا اندازہ ہونا مشکل ہے۔بابر نامہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف کی تصویر کی ٹھیک جھلک نظر آے اور معلوم ہو کہ جو شخص بات چیت کررہا ہے وہ کون ہے اور کیسا ہے۔اگر یہ بات ترجمہ میں نہ رہی تو یہ کہا جاے گا کہ اس نے تصویر کے خط وخال کو بدل دیا ہے اور بابر کی ترکی اور ہندی تصویر میں بڑا فرق پڑجاے گا۔عبدالرحیم خان نے فارسی زبان میں اس خصوصیت کو بہت حد تک باقی رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر ترکی الفاظ استعمال کرتا ہے کہ کچھ تو صحیح تصویر کا رنگ و روغن باقی رہے۔مثلاً صفحہ ۹۴ سطر ۲۲ و ۲۳ اردو ترجمہ کی یہ عبارت ہے " جونہی

میں نے یہ سنا کہ اندجان والے میرے طرفدار ہیں وونہی میں نے کچھہ تامل نہ کیا۔ سورج نکلتے ہی میں مرغنیان سے چل نکلا اور دن ڈھلے اندجان میں آگیا" اس ترجمہ کی اصل فارسی عبارت یہ ہے " خبر مضبوط ساختن اندجان بمی آمد هیچ توقف نہ کردہ در وقت آفتاب برآمد از مرغنیان سوار شدہ روز برگشتہ بود کہ باندجان آمدم" مسز بیوج کے انگریزی ترجمہ کی اردو یہ ہے "جونہی میں نے یہ سنا کہ اندجان کو ان لوگوں کی مدافعت میں مضبوط کرلیاگیاہے سورج نکلتے ہی میں مرغنیان سے گھوڑے پر سوار ہوا اور دوپہر کے قریب اندجان جا پہونچا—

ایک اور مثال لیجئے۔اردو ترجمہ کے صفحہ ۹۵ سطر ۱۲ و ۱۳ پر ہے "یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے ہمارے اور خواجہ قاضی کے متعلقین کو لوٹا اور تباہ کیا تھا" خانخاناں کی فارسی یہ ہے "درین فترات‌ها فلان و تاراج کنندہ مردمے کہ باما تعلق داشتند و متعلقان خواجہ قاضی همیں‌ها بودند" مسز بیورج کے انگریزی ترجمہ کی اردو یہ ہے "یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے زمانہ‌ہاے فترت میں خود میرے اور خواجہ کے متعدد مسلمان متعلقین کو لوٹا اور قید کیا تھا" فترت کے زمانہ سے وہ زمانہ مرادہے جس میں بابر بےتاج و تخت تھا اور مسلمان کا لفظ جرم کی اہمیت ظاہر کرنے کو لکھتا ہے—

ان ترجموں کا باہمی فرق ظاہر ہے۔میرے خیال میں مترجم کا یہ بڑا فرض ہے کہ تصویر کے اصل خط وخال جسقدر ہوسکے باقی رکھنے کی کوشش کرے گویہ بہت مشکل ہے مگر کچھہ نہ کچھہ کامیابی ضرور ہوسکتی ہے—

بابر نامہ کے جس قدر نسخے دستیاب ہوے ہیں سب افسوس ہے کہ نامکمل ہیں یعنے بیچ بیچ میں سے اوراق غائب ہیں جن سے سلسلۂ بیان میں بار بار وقفے پڑ گئے ہیں۔اُردو ترجمہ میں اس کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ واقعات کی لڑی کو جو ٹوٹ ٹوٹ گئی ہے جوڑ دیا جاے۔فارسی ترجموں میں بھی یہ کمی موجود ہے۔جب تک ہم عصر مورخین کی تصنیفات کو اُلٹ پلٹ نہ کیا جاے واقعات کا علم ہونا اور چھوٹے ہوئے مقامات پر ربط قائم کرنا بہت مشکل امر ہے اصل کتاب کے ورقوں کے ضائع ہونے کے بہت سے وجوہ بیان کئے جاتے ہیں۔ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سنہ ۱۵۱۲ع میں حصار کے قریب شاہی کیمپ برباد ہوگیا اُس میں بھی کچھہ ورق ضائع ہوے کچھہ سنہ ۱۵۲۹ع میں ضائع ہوے۔اس موقعہ پر کتابوں کو نقصان پہونچنے کا ذکر خود بابر کرتا ہے۔تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمایوں کو سنہ ۱۵۴۱ع سے سنہ ۱۵۵۰ع تک جلا وطن رہنا پڑا۔اس زمانہ میں

اس کے کتب خانہ پر کیا کیا آفتیں گذری ہوں گی۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ بابر نے اپنے بعد مکمل کتاب چھوڑی اور با وجود نقصانات کے پھر بھی اس کی تکمیل کر دی تھی۔ یہ پوری کتاب اس کے بعد تک موجود تھی مگر ہمایوں کی جلا وطنی نے ہر چیز کو تہ و بالا کر دیا اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اس کتاب کو بہت نقصان پہونچا۔ عبدالرحیم خان خانخاناں کو بھی مکمل کتاب نہیں ملی اس لئے ان کے ترجمہ میں بھی ضائع شدہ اوراق کی جگہ خالی رہ گئی ہے۔ انہوں نے تکمیل کی کوشش اس لئے نہیں کی کہ اُن کا جو مقصود تھا یعنی آئین اکبری کے لئے ابوالفضل کو مواد بہم پہونچانا وہ پورا ہو گیا تھا۔

مسز بیورج نے اس طرف خاص توجہ کر کے تمام واقعات کا سلسلہ ملا دیا ہے کیا اچھا ہوتا اگر مرزا نصیرالدین حیدر صاحب مرحوم یا ان کی صاحبزادی صاحبہ بھی اس کمی کو پورا کر دیتیں۔ میرے خیال میں اس کمی کے پورا کرنے کی بہت ضرورت ہے تا کہ تاریخ کی یہ کتاب مکمل ہو جائے۔ نیز اس کی ضرورت ہے کہ مقامات کے نام اور لوگوں کے نام کی صحت کافی طور پر کی جائے اور اُن کے تھوڑے تھوڑے حالات بھی لکھ دئے جائیں۔ تاہم جو کچھ ہو گیا ہے وہ بھی بہت غنیمت ہے اور ہمارے توقع سے بہت زیادہ ہے۔

(عبداللہ)

تاریخ بنی ہاشم

تاریخ اسلام میں بنو امیہ اور بنو ہاشم کی باہمی نزاعت ایک طویل کشمکش ہے جو مملکت اسلام کے لئے سخت مضرت رساں ثابت ہوئی۔ اس قبائلی مخاصمت و جد و جہد کے متعلق مختلف العقائد فرقوں کی مختلف رائیں ہیں اور اس کے متعلق بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں چنانچہ یہ کتاب بھی ان میں سے ایک ہے۔ دوسری تاریخوں کے مقابلے میں ایک چیز جو اس میں بہتر پائی جاتی ہے وہ مولف کی ذاتی رائے ہے۔ فاضل مولف نے جس واقعہ کو لیا ہے بہ حد امکان اس پر استدلال کیا ہے اور جو کچھ کہا ہے صاف صاف کہا ہے لیکن کتاب پر ایک گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فی الحقیقت حضرت علی کی سوانح عمری ہے۔

تاریخ بنو ہاشم میں سب سے زیادہ اہمیت آنحضرت صلعم کو حاصل ہے جنہوں نے دنیا میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا۔ پیغمبر اسلام کی تعلیم۔ کامیابی

اور دیگر سوانح کو صرف اکتالیس صفحوں پر بیان کیا ہے اور حضرت علی کا بیان ایک سو پینتالیس صفحوں پر مشتمل ہے—

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مولف کے لئے ایک رائے کا رکھنا ضروری ہے لیکن اس رائے کے اظہار میں غم و غصہ مولف کے شایان شان نہیں۔اس کتاب کی تاریخی حیثیت قائم نہیں رہتی جس کے واقعات کا اظہار نہایت درشت پیرائے میں کیا جائے۔ہم بہ خیال اختصار صرف چند اقتباسات درج کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو—

صفحہ ۲۳ "ابولہب کی زوجہ ایک بد عقل و کمینہ عورت تھی۔ہمارا خیال ہے کہ اس بیوی اور اسی سالے کی وجہ سے ابولہب فی النار ہوا"—

صفحہ ۳۵ "ابودجانہ نے چاہا ہے کہ اس ذاتی کاتب کا سر اڑا دیں"—

صفحہ ۱۰۱ "دیدہ حاسد کور باد اس پر کمینہ خو جہلاے قریش"

صفحہ ۱۹۳ "افسوس کہ یہ روش مذموم علامہ ممدوح (مولوی شبلی نعمانی) سے مختص نہیں ہے بلکہ ہم ایک گروہ کو اسی خبط میں مبتلا دیکھتے ہیں"—

ذرا مقابلہ کیجئے—

صفحہ ۱۳۶ "عدی نے اس لاش (طرفہ) کو کاٹا"—

صفحہ ۱۳۹ "اس جنگ میں اصحاب امیرالمومنین کی طرف سے صرف سات مجاہد شہید ہوئے"—

اس کے علاوہ مختلف مقامات پر بدکار-ناهنجار-ظالم-سفاک-بد خصلت اور دوسرے ایسے بہت سے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جس سے مولف کا رجحان ظاہر ہوتا ہے—

مولف نے جو واقعات درج کئے ہیں ان میں کہیں کہیں تضاد بھی پایا جاتا ہے—

صفحہ ۹۵ "اور فرمایا کہ کل ہم یہاں سے روانہ ہونگے۔ہمارے ساتھ کوئی وہ شخص نہ چلے جس نے عہد عثمان میں اہل شورش کی حمایت کی ہو"—

صفحہ ۱۴۰ حضرت علی محمد ابن ابوبکر کے متعلق فرماتے ہیں "بخدا میرے علم میں محمد ان لوگوں میں سے تھا جو قضائے الہی کے منتظر رہتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں حصول اجر کے لئے کرتے ہیں اور مومن

سے مانوس اور فاجروں سے بیزار رہتے ہیں "—

سب سے قابل اعتراض وہ دعویٰ ہے جو فاضل مولف نے قریہ فدک کے متعلق کیا ہے اور اس پر زیادہ تکلیف دہ وہ حق جو زید ابن علی کے متعلق دیا گیا ہے—

صفحہ ۱۹۴ " آنحضرت کے مملوکات و مقبوضات خاص تھے جو مالک الملک حقیقی نے بلا مداخلت و کوشش مجاہدین کے آنحضرت کو عطا فرمائے تھے "—

صفحہ ۲۳۷ " ہم ' سلطنت رسول خدا ' کے لئے سب سے زیادہ حقدار تھے "—

کسی بانی مذہب کا اپنے لئے مقبوضات و مملوکات رکھنا بے معنی ہے اور اس سے زیادہ نا قابل قبول وہ خیال ہے جو " سلطنت رسول خدا " کے متعلق ہے۔ ایک سیاسی فلسفی کے زاویہ نگاہ سے یہ دونوں دعوے بے معنی ہیں—

مولف نے کئی جگہہ بغیر دلیل کے علل قائم کئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں—

صفحہ ۹۲ —" لیکن حضرت عمر کے آخری دور سلطنت میں آثار زوال نمودار ہو گئے "—

مبالغہ دیکھئے —

صفحہ ۱۳۶ — جنگ صفین " ان میں سے صرف آخری روز کی جنگ میں پانچ سو تیئس شامی امیرالمومنین کے ہاتھ سے قتل ہوئے "—

صفحہ ۱۸۸ " زیاد جب تک امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف سے حاکم ایران رہا نوشیرواں بنا رہا اور جب معاویہ سے سازش کر کے ان کے عہد میں حکمران ہوا تو چنگیز خاں سے بھی خونریزی میں بڑھ گیا "—

ان کے علاوہ اور متعدد واقعات ہیں جو صرف اختصار کے خیال سے درج نہیں کئے جاتے—

ایک مورخ کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ سلیس زبان لکھے۔ کیوں کہ غیر معروف ترکیبوں کے استعمال کرنے سے بہت سی انجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں— مثلاً

صفحہ ۱۹۸ " روز بازپرس کو دھیان رکھے ہوئے وہ کام کئے جو اس وقت کام آئیں "—

ان تمام خامیوں کے باوجود مولف کی یہ محنت مستحق تعریف ہے اور اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ الجھا ہوا زمانہ معرض بحث میں آئے گا۔ تاریخ میں اگر تحقیق سے کام نہ لیا جائے تو تاریخ کی حیثیت افسانے کی رہ جاتی ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

فاضل مولف میرے خیال میں پہلے اُردو تاریخ نویس ھیں جنھوں نے کھلم کھلا واقعات پر استدلال کیا ھے—

(۱)

سیرت عمر و ابن العاص

اس کتاب میں حضرت عمرو ابن‌العاص کے سوانح زندگی بیان کئے گئے ھیں ابتدا میں آنحضرت سے مخالفت-نجاشی کے پاس وفد لے کر جانا اور آخر میں خالد ابن ولید کے ساتھ مل کر مشرت بہ اسلام ھونا یہ سب واقعات وضاحت سے درج ھیں-مولف نے ان کے اوصاف بالخصوص شجاعت و تدبر کو بہت اھمیت دی ھے-شجاعت میں اُنھیں خالد ابن واید کے ھم پلہ کیا ھے اور تدبر و فراست کے نقطۂ نگاہ سے انھیں خالد پر ترجیح دی ھے-ھم ان کی شجاعت کو تسلیم کرتے ھیں لیکن کوئی حربیات کا ماھر ان کی فتوحات کو خالد کی ھفرمندیوں کے مقابلہ میں نہیں رکھہ سکتا-خالد ابن ولید کی اکثر کامیابیاں عربوں کے خلاف ھیں جن میں طرفین مساوی ھیں-جنگ احد میں قریش کی کامیابی-خلیفہ اول کے زمانے میں مرتد عربی قبائل کو مطیع بنانا-ایرانیوں کے خلاف سلاسل اور ولاجہ شام میں فتح یرموک سب خالد کی سپہ سالاری کا نتیجہ تھیں عمر و ابن‌العاص کی فتوحات اُس وقت کی ھیں جب عربوں کے پاس آلات جنگ و دیگر ذرائع اور جنگی تجربہ پہلے سے کہیں بہتر تھا-اس کے ما سوا ھم یہ بھی دیکھتے ھیں کہ معزولی کے بعد خالد ابن ولید کو کوئی موقع نہ ملا ورنہ فاتح مصر غالباً خالد ھی ھوتے-جنگ صفین میں تو عمر و ابن العاص کی جرنیلی کا بھرم کھل گیا-عمر و ابن‌العاص دوسرے درجے کے سپہ‌سالاروں میں ھیں اور ان کا مرتبہ سعد اور قعقاع کے برابر ھے—

مولف نے حزم و تدبیر میں ان دو حضرت عمر اور امیر معاویہ کے دوش بدوش رکھا ھے اس سے ھمیں اتفاق نہیں ھے-حضرت عمر کا مطمح نظر جداگانہ ھے یعنی مملکت اسلام کا استحکام اور حکومت میں عمومیہ کی حیثیت قائم رکھنا-عمر و ابن‌العاص اور امیر معاویہ کا مطمح نظر ذاتی اور جماعتی مفاد ھے-حضرت عمر کے ذرائع کہیں بھی ناجائز نہیں ھیں لیکن عمر و ابن‌العاص اور امیر معاویہ دونوں ذرائع اختیار کرنے میں اسلام کے دستور کے خلاف کام

کر جاتے ہیں۔ یہ اختلاف ان خطوط سے ظاہر ہو جاتا ہے جو حضرت عمر نے بحیثیت خلیفہ اور عمرو ابن العاص نے بہ حیثیت امیر مصر ایک دوسرے کو لکھے—

(صفحہ ۹۳—۹۴—۹۵) حضرت عمر نے یہ تحریر کیا "کہ سمجھ لو کہ میں کوئی نا قابل سماعت عذر قبول نہ کروں گا۔اگر تم نے ٹھیک کام کیا ہے تو برأت حاصل کرلے میں کیا قباحت ہے" عمرو ابن العاص نے جواب میں یہ لکھا "آپ نے اس مکتوب میں ذرا بھی میرا پاس اور آبرو کا لحاظ نہ رکھا۔یثرب کا کوئی یہودی بھی ہوتا تو اس سے زیادہ آپ اُسے کیا لکھتے"۔

تصفیہ دومۃ الجندل میں مولف نے مسعودی کا ساتھ دیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ کوئی زبانی فیصلہ نہ سنایا گیا مگر اس تحریر میں جو مولف نے کتاب میں درج کی ہے فیصلے کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔تحریر میں عمرو ابن العاص کے متعلق خیر میں یہ لکھا گیا ہے نہ وہ دونوں کے عزل پر راضی ہوگئے لیکن عبداللہ کی خلافت پر راضی نہ ہوئے۔اس وجہ سے بلا اس فیصلے کے نہ کوئی خلیفہ ہو صحیفہ ختم کر دیا گیا۔اگر اس تحریری فیصلے پر اکتفا کیا جاتا تو عمرو ابن العاص اس فیصلے کو لے کر امیر معاویہ کے پاس کیونکر جاتے اور امیر ان کو چھ ہزار سپاہ دے کر مصر کی امارت کیوں تفویض کرتے اور اس فیصلے کے بعد امیر معاویہ امیرالمومنین کا لقب کیوں اختیار کرتے—

مولف نے عمرو ابن العاص کی خانگی زندگی پر نہایت سرسری نظر ڈالی ہے حالانکہ یہ زندگی۔سیرت کا ایک بہت بڑا جزو ہے بالخصوص قرون اولیٰ میں خانگی زندگی سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔مولف نے عمرو ابن العاص کے خطوط درج کئے ہیں مگر ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔البتہ اس خط کے متعلق گبن و بٹلر کی رائے ظاہر کی ہے جو مصر کی شادابی کے متعلق لکھا گیا ہے فاضل مولف نے خود صرف ترجمہ کر دیا ہے اور بلاغت کے متعلق اتنا بھی تو نہیں لکھا جتنا گبن یا بٹلر نے لکھا ہے—

مجموعی حیثیت سے مولف کی یہ ترتیب قابل تعریف ہے۔زبان شستہ اور تاریخی مضمون کے مناسب ہے۔بڑی خوبی یہ ہے کہ تاریخی اُلجھنوں سے بالکل پاک ہے۔اس زمانہ میں ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے—

(۱)

کشمیر کی رانیاں

یہ کشمیر کی بیس رانیوں کا چھوٹا سا تذکرہ ہے جو مولوی محمدالدین صاحب فوق کے اصرار و فرمایش دوستانہ پر محمد اسمعیل صاحب ہاتف بھوپالی نے کشمیر کی تاریخوں سے انتخاب کر کے تالیف کیا اور ظفر برادرس لاہور نے شایع کیا ہے۔کشمیر کی طویل تاریخ میں جس کی مدت تقریباً پانچ ہزار سال ہے صرف بیس رانیوں کے حالات زندگی ضمناً ملتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف صاحب کو کتنی ورق گردانی کرنی پڑی ہوگی کہ یہ چالیس صفحہ کا تذکرہ احاطۂ تحریر میں آیا۔جناب ہاتف نے اس کی ترتیب میں بڑے سلیقہ سے کام لے کر حشو و زوائد اور خلاف عقل واقعات کو قلم انداز کر دیا ہے اور تاریخی نقطۂ نظر کو پیش رکھہ کر یہ رسالہ تیار کیا ہے اس لحاظ سے جناب مولف کی محنت لائق داد ہے—

کتاب چھوٹے ۲۰×۳۰ ۱۶ سائز پر چھپی ہے لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت چار آنہ۔ملنے کا پتہ—ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور—

(م)

سیرت علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی

ہندوستان کے علماء اور عربی داں طبقہ میں شاید کوئی ایسا نہ ہوگا جو علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے نام اور ان کی گرانمایہ تصانیف سے آشنا نہ ہو۔ منطق فلسفہ۔نحو۔تسفیر۔عقائد وغیرہ کی معرکہ آرا کتب پر مولانا کے شروح و حواشی اور بعض مستقل تالیفات نہایت بے بہا ہیں۔درس نظامیہ کے طلبا کو اب تک ان سے کچھہ نہ کچھہ کام پڑتا رہتا ہے۔مولانا علوم قدیمہ عربیہ میں مسلم اور فاضل سیالکوٹی۔فاضل لاہوری کے نام سے مشہور تھے۔عہد اکبری سے لے کر دور شاہجہانی تک کے مشاہیر علماء و فضلاء میں شمار رہا۔ان کی فلسفی نکتہ آفرینیاں اور مذہبی مباحث وسط ایشیا و ایران تک کے حکماء کو محو حیرت کیا کرتی تھیں۔اُن کے دم سے سیالکوٹ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری اور علم و فضل کا دریا رواں تھا اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہجہاں کا نامور وزیر با تدبیر سعداللہ خاں ان کے ہم سبق رہے ہیں

باوجود ان تمام صفات و شہرت ہمہ دانی کے مولانا کے حالات و سوانح ہنوز پردۂ خفا میں تھے۔مولوی محمدالدین صاحب فوق نے جذبۂ وطنی سے کام لے کر یہ زیر نظر حالات کی سوانح عمری تیار کی۔جس میں تفصیل سے حالات و واقعات بہم پہنچانے کی کوشش کی اور مولانا محمود علی خان ایم اے پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ نے مولانا کی بعض مشہور تصانیف پر حق تنقید و تبصرہ ادا کیا ہے۔شروع میں حضرت اقبال نے جو مولانا کے نامور ہم وطن ہیں مختصر دیباچہ زیب قلم کیا ہے۔آخر میں مشاہیر سیالکوٹ کے تذکرے اور سیالکوٹ کی مختصر تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان مغلیہ کے زمانہ میں یہ شہر علم و فضل اور صنعت و حرفت کا مشہور گہوارہ تھا۔یہ کتاب مجموعی حیثیت سے دلچسپ اور تاریخی حالات و واقعات کی حامل ہے اور سوا سو صفحوں پر ختم ہوتی ہے۔البتہ بعض واقعات مکرر سہ کرر آگئے ہیں اور زبان میں کہیں کہیں "پنجابیت" نمایاں ہے نام بھی نہایت طولانی اور بے ڈھنگا ہے۔ یعنی (سوانحات عمر ملک العلماء علامۂ عبدالحکیم سیالکوٹی) اُمید ہے کہ مولف صاحب آئندہ طباعت میں ان دونوں عیوب کو نکال دیں گے —

لکھائی چھپائی صاف اور کاغذ معمولی ہے سائز ۱۸ × ۲۲ ۸ قیمت دس آنہ ظفر برادرس تاجران کتب لاہور سے ملتی ہے —

(ـ)

اخلاق و تعلیم

درس حیات

یہ کتاب محمد اکبر صاحب مراد پوری (ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول دسرھہ ضلع لایل پور) کی تالیف ہے کتاب مختلف اخلاقی مضامین کا مجموعہ ہے اور بقول جناب مولف کے اس کا منشاء یہ ہے کہ اخلاقی مضامین اور "مشاہیر کی سوانح عمریوں سے نوجوانوں کے جذبات و حسیات ابھارنے کی کوشش" کی جائے۔اس مقصد کو مدنظر رکھ کر ۱۸ مضامین "کیرکٹر" "مصائب کے فوائد" "مشکلات کا مقابلہ" "فراست" "خود ضبطی" وغیرہ پر لکھے گئے ہیں۔انگریزی اخلاقی کتب سے حسب ضرورت مدد لی گئی ہے اور ان کے اقتباسات درج کئے گئے ہیں —

دیباچہ میں فاضل مولف موجودہ کتب اخلاقیات کی شکایت کرتے ہیں کہ " وہ صرف نظریات پر اکتفا کرتے ہیں " ہمیں افسوس ہے کہ باوجود مثالوں کی فراوانی کے یہ کتاب بھی نظری (Theoretical) ہی ہے-اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے-اخلاقیات کی ہر کتاب جو بالواسطہ اخلاقی نصائح کے عوض "یہ کرو" اور "یہ نہ کرو" کا دفتر ہوگی ضرور نظری ہوگی-اخلاقی تعلیم کے فواید سے انکار نہیں کیا جاسکتا-لیکن اس تعلیم کا جو طریقہ پرانے زمانہ میں رائج تھا وہ ضرور قابل اعتراض ہے-تجریدی مباحث اُس وقت تک نوجوانوں کی توجہ حاصل نہیں کرسکتے جب تک کہ وہ اخلاقی قصص اور افسانوں کی شکل اختیار نہ کریں —

کتاب انگریزی اخلاقی تصانیف- Archeticts of fate, Uses of Life وغیرہ سے ماخوذ ہے-اردو کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے-زبان پر کسی قدر پنجابی اثر غالب ہے-پھر بھی سادہ اور صاف ہے-اسلوب تحریر ناصحانہ ہے-اچھی اچھی باتیں لکھی گئی ہیں اور جو نوجوان اسے سمجھکر پڑہ سکے اس کے لئے ضرور مفید ثابت ہوگی —

تقطیع چھوٹی-خط جلی اور واضح-اچھی چھپی ہے اور جناب مولف سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے —

(و)

—:o:—

تربیت-حصۂ اول و دوم

مالیگاوں ضلع ناسک میں ایک چھوٹا سا مقام ہے ریلوے اسٹیشن بھی نہیں لیکن اس دورافتادہ مقام میں اردو زبان کا جو چرچا ہے وہ بہت غنیمت ہے کثرت سے غزل گو شاعر موجود ہیں جن میں سے کئی ایک صاحب تلامذہ بھی ہیں مشاعرے بھی ہوتے ہیں گلدستے بھی نکلتے ہیں-اس کی بعض ادبی انجمنیں بھی ہیں-ان میں ایک دائرہ ادبیہ بھی ہے-جس کے ناظم مولوی عبدالصمد صاحب نعمانی صاحب ذوق شخص معلوم ہوتے ہیں-انھوں نے حال میں اس دایرہ سے تربیت حصہ اول اور تربیت حصہ دوم دو مختصر رسالے شایع کئے ہیں پہلا حصہ مصر کی نامور اور مشہورۂ آفاق ادبیہ آنسہ زیلب می کے ایک مختصر رسالہ کا ترجمہ ہے-جو موصوفہ نے مصر کے سرکاری مدارس میں لڑکیوں کی ابتدائی

تعلیم کیلئے تصنیف کیا تھا۔اُس میں آنسہ سی نے مصری معاشرت کو مد نظر رکھتے ہوئے بچوں کو بہت ہی آسان طریقے سے مذہبی واخلاقی تعلیم دی ہے۔ لیکن چونکہ مصری اور ہندستانی معاشرت متحد نہیں ہے اس لئے مترجم صاحب نے ترجمہ میں اپنے ملک کی ضروریات وداعیات کے لحاظ سے جابجا کمی بیشی بھی کی ہے اب یہ رسالہ اس قابل ہوگیا ہے کہ ہندوستانی بچوں کو پڑھایا جائے دوسرا حصہ اگرچہ ترجمہ نہیں بلکہ خود مولوی عبدالحمید صاحب کی تالیف ہے۔ مگر اُسے بھی پہلے حصے کی طرز پر لکھا ہے—

چھوٹی تقطیع پر پہلا رسالہ ۳۱ اور دوسرا ۳۱ صفحہ پر ہے قیمت دو دو آنے—

(م)

ساربان—امانت—نور ہدایت

یہ تینوں قصے بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔پہلا قصہ جس کا نام ساربان ہے حضرت عمر کے عہد کا ہے۔یہ ایک شخص کی سچائی کا حیرت انگیز امتحان ہے۔دوسرا قصہ جس کا عنوان امانت ہے خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ کا ہے۔اس میں ایک سوداگر نے امانت میں خیانت کی ہے اور خلیفہ کے دربار میں عجیب طرح سے اس کا فیصلہ ہوتا ہے۔نور ہدایت میں ایک صحابی کی شہادت کا موقعہ مذکور ہے۔یہ تینوں اخلاقی قصے ہیں اور اچھی اور صاف ستھری عبارت میں لکھے گئے ہیں۔لڑکوں لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل ہیں۔چکنے کاغذ پر بہت اچھے چھپے ہیں۔جہاں گیر کلب۔چابک سواران لاہور سے مل سکتے ہیں۔ پہلے کی قیمت چار آنے دوسرے کی اڑھائی آنے اور تیسرے کی تین آنے ہے—

—:o:—

مذہب

تذکریٰ

یہ ۳۸ صفحوں کا رسالہ مولانا ابوالکلام آزاد کے دو مضمونوں۔تذکار مقدس (ماہ ربیع الاول) اور افسانہ ہجر و وصال کا مجموعہ ہے۔جسے شرکت

ادبیہ علی گڈھ نے نہایت اہتمام سے اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر نفیس اور حسین و جمیل کتابت و طباعت کے ساتھہ خوبصورت سائز میں مجلد شایع کیا ہے اور اور یہ شرکت کے سلسلۂ معارف اسلام کا دوسرا نمبر ہے--

مولانا کا خطیبانہ پر زور طرز بیان اور خاص دل آویز انداز تحریر کسی معرفی کے محتاج نہیں ھیں اور جس قدر بیان و زبان اور قلم و تحریر میں زور و طنطنہ ہے اُسی قدر اہم مسائل دینی میں ژرف نگاھی بھی حاصل ہے-یہ دونوں خوبیاں مل کر مضامین و رسائل میں جو آپ کے قلم سے نکلتے ھیں ایک خاص بات پیدا کر دیتی ھیں جو مولانا ھی کے ساتھہ مخصوص ہے-چنانچہ یہ مجموعہ بھی ان محاسن کا حامل ہے--

پہلے مضمون میں ولادت با سعادت کی ضرورت و مقصد کو بیان کیا ہے- قرآن شریف کی آیات کو جا بجا اپنے مضامین میں جس طرح مولانا سمو لیتے ھیں وہ آپ ھی کا حصہ ہو گیا ہے-دنیا کی فلاح و اصلاح کے لئے خدائے پاک کا طریقۂ جاریہ (سنۃ اللہ) روحانی تربیت-تکمیل حدایت-عالم گیر پیام ظہور و مقصد ظہور-یادگار حریت وغیرہ عنوانوں کے ذیل میں بعثت و ضرورت بعثت نبوی کو دل نشین و پر اثر پیرایہ میں ثابت و واضح کیا ہے اور دیگر اولوالعزم رسل سے موازنہ و مقابلہ بھی ہو گیا ہے —

دوسرا مضمون افسانۂ ھجر و وصال ہے جس میں ھماری انتہائی غفلت و سرشاری-اسباب ھلاکت-حوادث حاضرہ-راہ نجات-خدا سے سرکشی کا نتیجہ وغیرہ عنوانات کے ذیل میں ملت اسلامیہ کے عروج و زوال-تباھی و بربادی کا نقشہ کھینچ کر ھوشیاری و بیداری تعلیم نہایت موثر پیرایہ میں دی ہے- قیمت کہیں درج نہیں-شرکت ادبیہ علی گڈھ کے علاوہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے بھی یہ رسالہ ملتا ہے—

(م)

بشریٰ

یہ ۴۸ صفحوں کا چھوٹا سا رسالہ مولانا سید سلیمان ندوی کی قیمتی تالیف اور زور قلم کا نتیجہ ہے جس میں اسلام کے بعض حقائق اور خصوصیات نیز اُن صفات باری تعالی پر روشنی ڈالی ہے جو اسلام نے اپنے پیرووں کے

آگے کئے اور پیش کئے ہیں-یہ در اصل عیسائیوں کے ایک مشہور اعتراض کا زبردست و مدلل جواب ہے کہ—

اسلام نے خدا کا جو تخیل اپنے پیرووں کے سامنے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ (خدا) ایک جبار-قہار-پر غضب-صاحب جلال و جبروت شاہنشاہ ہے-جس سے بندوں کو ڈرتے کانپتے رہنا چاہئے-مولانا نے نہایت عمدگی سے اس کا رد کیا ہے اور قرآن حکیم و احادیث صحیحہ سے ثبوت دیا ہے کہ اسلام اُمید و بیم خوف و رجا کے بین بین ہے—

شرکت ادبیہ علی گڈھ نے بسلسلۂ معارف اسلام شایع کیا ہے-لکھائی چھپائی نہایت نفیس و پاکیزہ اور کاغذ عمدہ ہے-قیمت چھ آنہ ملنے کا پتہ شرکت ادبیہ علی گڈھ یا انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن—

(-)

متفرق

خیابان عرفاں

اس کتاب کو دیکھتے ہی آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں-اور مطالعہ کے بعد اس سے زیادہ دل و دماغ میں روشنی پیداہوتی ہے-یہ مستند فارسی شعرا کی رباعیات کا انتخاب ہے-جس میں کم و بیش اساتذہ کی پندرہ سو رباعیاں ہیں-انتخاب مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی صدرمحاسب سرکارعالی کا ہے-جن کا ذوق ظاہری اور باطنی دونوں قابل داد ہیں-ذوق ظاہری کتاب کی نفیس جلد-عمدہ لکھائی چھپائی اور کاغذ سے ظاہر ہے-اور ذوق باطنی اس انتخاب سے جو انھوں نے بڑی کاوش اور کوشش سے کیا ہے-سید صاحب موصوف متعدد کتابوں کے مترجم اور مولف ہیں اور اپنی ہرکتاب میں انھوں نے نفاست مذاق کا ثبوت دیاہے-یہ رباعیاں خاص خاص عنوانوں کے تحت میں جمع کی گئی ہیں-جو معرفت و اخلاق پر مشتمل ہیں-ہر صفحہ پر خوشنما بیل ہے-لوح بہت خوبصورت ہے-جلد پر ایک خوشنما منظر کی تصویر ہے-اور کتاب کے اندر ایسے ایسے جواہرات بکھرے ہوے ہیں جس کی داد صرف اہل بصیرت

دے سکتے ھیں-اصحاب ذوق کے لئے یہ بے بہاتحفہ ھے اور ھمیں امید ھے کہ اس کی پوری پوری قدر کی جاے گی—

ھماری راے میں یہ مناسب ھوتا کہ اگر شعرا کے نام کے ساتھہ اُن کا مختصر سا حال چند سطروں میں اور سنہ وفات وغیرہ بھی دے دیا جاتا-سہواً چند قطعات بھی درج ھوگئے ھیں-امید ھے کہ دوسرے اڈیشن میں نہ صرف اصلاح ھوگی بلکہ اور اضافہ بھی ھوگا-یہ بھی کم خوشی کی بات نہیں ھے کہ کتاب نواب عمادالملک بہادر جیسے صاحب فضل و ذوق کے نام معنون کی گئی ھے—

تعداد صفحات پانسوسے اوپر ھے قیمت چھہ روپیہ کلدار ھے اور فاضل مرتب سے مل سکتی ھے—

—:o—

مصرف جنگلات و تربیت جنگلات

یہ دو کتابیں مولوی ابویوسف احمد محی الدین حسین صاحب فاروقی مددگار ناظم جنگلات ریاست حیدرآباد نے انگریزی سے ترجمہ کی ھیں-اُردو زبان میں اس فن کی غالباً یہ پہلی کتابیں ھیں جو شایع ھوئی ھیں-قابل مترجم نے اس کام کو بڑی محنت اور صرف کثیر کے بعد انجام دیا ھے-کیوں کہ دونوں کتابیں بہت ضخیم ھیں-اس قسم کے فنون کا ترجمہ آسان کام نہیں-ان میں سینکڑوں اصطلاحات استعمال کی گئی ھیں جن کے مرادف الفاظ کا تلاش کرنا بہت دقت طلب ھے-ترجمہ سلیس زبان میں کیا گیا ھے اور اصطلاحات میں بھی اس بات کا خیال رکھا گیا ھے کہ جہاں تک ممکن ھو سہل الفاظ استعمال کئے جائیں-مگر بعض بعض مقامات پر ترجمہ بالکل لفظی ھوگیا ھے جس کے سمجھنے میں ذرا دقت ھوتی ھے یا بعض جگہ ایسے لفظ استعمال کئے گئے ھیں جو کسی قدر ثقیل ھیں اور اُن کی جگہہ آسان الفاظ آسکتے تھے-لیکن یہ خامیاں ایسی نہیں کہ اس سے مترجم کی محنت یا کتاب کی خوبی پر حرف آسکے-یہ کتابیں خاص طور پر ملازمین سررشتۂ جنگلات سرکار عالی کے فائدے کے لئے لکھی گئی ھیں اس لئے اس میں ایسے الفاظ بھی نظر آئیں گے جو حیدرآباد میں رائج ھیں اور دوسرے صوبوں میں جہاں اُردو بولی جاتی ھے آسانی سے سمجھہ میں نہ آئیں گے-مثلاً تات-مندا وغیرہ—

دونوں کتابوں کے آخر میں درختوں کے مقامی اور انگریزی اور

لاطینی نام اور اُن کے مقابل ہندوستان کی مختلف زبانوں کے نام درج ہیں—

قابل مترجم کی محنت اور شوق قابل تعریف ہے اور ہمیں امید ہے کہ جن صاحبوں کے لئے یہ کتابیں ترجمہ کی گئی ہیں وہ اس کی قدر کریں گے اور خاطر خواہ مستفید ہوں گے—

سالانہ رپوٹ-دارالمعلومات مودی کامٹی—

یہ دارالمعلومات جو انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) کی شاخ ہے بہت مفید کام کررہا ہے-اس کے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں اُردو زبان کی عمدہ اور منتخب کتابیں جمع کی گئی ہیں-لوگوں میں مطالعہ کا ذوق اور خیالات میں روشنی پیدا کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ کتاب خانوں کا قیام ہے-اس رپوٹ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قابل ناظم محمد طالب الدین صاحب اور ان کے احباب دارالمعلومات کی ترقی دینے میں ہر قسم کی کوشش کر رہے ہیں-کتاب خانے کے ساتھہ اخبارات و رسائل کا بھی انتظام کیا گیا ہے-ایسی مجلسوں کے انعقاد کا بھی انتظام کیا جاتا ہے جن میں مفید مباحث پر تقریریں ہوتی ہیں-ایک رسالہ جاری کرنے کی بھی تجویز ہو رہی ہے اور سب سے بڑی تجویز یہ ہے کہ دارالمعلومات کے لئے مستقل عمارت تعمیر کی جاے-حسابات کی باقاعدہ تنقیح ہوتی ہے-ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ ترقی کرے اور اپنے فیض سے اهل کامٹی کو مستفید کرے—

روئداد جلسۂ سالانہ منبع الطب لکھنؤ

منبع الطب کا یہ جاسہ آنریبل راجہ راجیشر بلی صاحب بی-اے-او-بی-ایم ایل-سی وزیر صیغہ تعلیم کی صدارت میں ہوا-اس روئداد کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم محمد هادی رضا خاں صاحب ماهر لکھنوی کی سعی اور مستعدی سے یہ مدرسہ ترقی کر رہا ہے اور طلبہ حکیم صاحب کی تعلیم سے مستفید ہو کر کامیاب ہو رہے ہیں-مدرسہ کی روح رواں خود حکیم صاحب ہیں اور حکیم صاحب کے علم و فضل اور سعی و کوشش سے جو رونق اس مدرسہ

کو حاصل ہے وہ لکھنؤ میں اس وقت کسی مدرسہ کو نہیں-اُمید ہے کہ جو صاحب طب یونانی کے قدرداں ہیں اس کی ضرور مدد کریں گے —

—:o:—

اُردو کے جدید رسالے

شمع

یہ رسالہ اسی سال جنوری سے نکلنا شروع ہوا ہے اور جنوری اور فروری کے دو پرچے شایع ہو چکے ہیں-اس کے اڈیٹر جناب محمد حبیب (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا-ایم-آر-اے-ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور جناب حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا آگرہ ہیں-دونوں صاحب فضیلت-صاحب ذوق اور پر جوش نوجوان ہیں-یہ قران السعدین شاید ہی اُردو کے کسی دوسرے رسالے کو نصیب ہو-قابل اڈیٹروں کی طرح رسالہ بھی ہونہار معلوم ہوتا ہے اور مضامین کی ترتیب اور نوعیت بتا رہی ہے کہ آگے چل کر نام پیدا کرے گا اور اُردو زبان کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا-اس سے ایک گونہ خوشی ہوئی کہ اس رسالہ میں سیاسی مضامین کا بھی خیال رکھا گیا ہے-قطع نظر اُن سیاسی مسائل کے جو آے دن کانفرنسوں-کانگرسوں اور کونسلوں میں معرض بحث میں آتے رہتے ہیں اُردو داں طبقہ کو زیادہ تر علمی حیثیت سے سیاسیات کے جاننے کی ضرورت ہے-جہاں تک ہمارا خیال ہے سواے "زمانہ" کے اُردو کے دوسرے رسالوں میں بہت کم اس قسم کے مضامین شایع ہوتے ہیں-پروفیسر حبیب جن کے انگریزی مقالہ کا اُردو ترجمہ مبادی سیاسیات کے عنوان سے شمع کے فروری نمبر میں شایع ہوا ہے اس کام کے خاص طور پر اہل معلوم ہوتے ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے-آج کل ہمارے ملک میں ہر کہ ومہ سیاست کے کوچہ میں گام فرسا ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس کے تاریخی اور علمی پہلو سے واقف ہیں-رسالے اور اخبار زیادہ تر وقتی تحریریں ہوتی ہیں اور سب سے پہلے انہیں ملک کی وقتی ضروریات پر نظر رکھنی چاہئیے-اگر یہ قابل نوجوان اڈیٹر اپنے رسالے کی یہ خصوصیت قرار دے لیں کہ اس میں ہر مہینے کم سے کم ایک دو مضمون سیاسیات پر اعلی پایہ کے شایع ہوا کریں گے تو وہ بہت بڑا کام کریں گے اور اُن کا یہ رسالہ

درحقیقت شمع ہدایت کا کام دے گا۔ باقی غزل سرائی کے لئے بہت سے رسالے موجود ہیں اس لئے جعفری صاحب کو زیادہ پریشان خاطر ہونے کی ضرورت نہیں۔ رسالوں کو اپنی فرصت کا مشغلہ یا شوق پورا کرنے کا آلہ نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اگر ضرورت ہو تو اپنے ذاتی شوق کو تج کر ملک کی ضرورت کو پورا کرنا چاہئے یہ وقت ہائے و ہو مچانے اور ہلڑ کے ساتھ ہو جانے کا نہیں ہے۔ یہ بہت نازک زمانہ ہے اس میں مزدوروں۔ محنتیوں اور جفا کشوں کی ضرورت ہے۔ ان الفاظ کے لکھنے کی ہمیں اس لئے جرأت ہوتی ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان دونوں نوجوانوں میں اس کی صلاحیت اور قابلیت موجود ہے۔

مطبع کی غفلت اور کافی نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے پہلا پرچہ اچھا نہیں چھپا تھا اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ لیکن دوسرا پرچہ اس سے کسی قدر بہتر ہے لیکن اس پرچہ میں ہمیں "قلابازیاں" "نقاحت" "مبہوط" کے الفاظ دیکھ کر تعجب ہوا۔ ہم تو یہ توقع رکھتے تھے کہ ہمارے نوجوان دوست اُردو املا میں آسانیاں پیدا کریں گے نہ یہ کہ وہ اُسے اور دشوار بنادیں گے۔ اُمید ہے کہ مضامین اور کاپیوں کے دیکھنے میں صحت کا زیادہ خیال رکھا جائے گا۔

ہمیں اس زمانہ میں جب کہ رنگ برنگ کے رسالے جاری ہو رہے ہیں شمع کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ صحیح مقاصد ہی کے ساتھ نہیں مگر صحیح عمل کے ساتھ میدان میں آیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

میانہ تقطیع پر ۹۶ صفحہ کا حجم ہے قیمت سالانہ چھ روپیہ۔ کاغذ بہت اچھا لگایا گیا ہے۔ منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ سے مل سکتا ہے۔

عندلیب

آج کل کوئی مہینا ایسا خالی جاتا ہوگا کہ نیا رسالہ نہ نکلتا ہو۔ لیکن جب کوئی اچھا رسالہ نظر آتا ہے تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ اردو کا علمی اور ادبی رسالہ خورجہ سے شایع ہوا ہے مگر دلی میں چھپا ہے۔ اڈیٹر ہلال احمد زبیری مارہروی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگرچہ بعض رسائل کے وجود سے اُردو زبان کو بہت کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے "مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب مل کر بھی ملک میں صحیح ادبی روح پیدا نہیں کر سکتے۔" لہذا اس رسالے کے

جاری کرنے کی ضرورت ہوئی اور ہمیں توقع بلکہ یقین ہے کہ فاضل ا
ضرور " اس نوزائیدہ لہر کی رو بدل دینے میں " کامیاب ہوں گے۔ یہ پہلا
ہے۔دعوی بہت بڑا اور ارادہ بہت بلند ہے۔خدا راس لائے اور کامیابی عطا فر
لیکن جو کوشش انہوں نے اس نمبر کے مرتب کرنے میں کی ہے وہ ہر طرح
تعریف ہے۔شروع میں ایک تصویر بھی ہے جس میں برکھا رت کا سماں د
ہے۔مضامین بھی دلچسپ ہیں۔نظموں کی تعداد بھی اچھی خاصی
اور تقریباً سب نظمیں عمدہ اور پڑھنے کے لائق ہیں۔پہلا مضمون " تم
اتحاد نورانی " پر مولانا ظفر علیخاں صاحب کا ہے اور " مخزن الاثا
کے عنوان سے مولوی سعید احمد صاحب مارہروی کا مضمون اسلامی تعمیر
تاریخ کے متعلق ہے۔پروفیسر سید علی احسن صاحب احسن کا مضمون او
اردو بہت پر لطف ہے۔ایک فسانہ بھی شروع کیا گیا ہے۔رسالہ بحیث
مجموعی بہت اچھا ہے اور ترقی کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔چھپائی لکھ
کا بھی خاص اہتمام کیا ہے۔بڑی تقطیع کے ۶۰ صفحہ پر ہے۔سالانہ قی
چار روپیہ آٹھ آنہ—

کوکب

یہ رسالہ حال ہی میں اترولہ ضلع گونڈہ سے جاری ہوا ہے۔ایسے
سے ایک اخلاقی اور ادبی رسالہ کا جاری ہونا بہت غنیمت ہے۔مختلف قسم
مضامین اور نظمیں درج ہیں۔آخر میں کچھ معلومات اور خبریں بھی
کردی ہیں۔قابل اڈیٹر غلام حیدر خاں صاحب کی محنت اور سعی قابل داد
کہ انہوں نے ایسے مقام سے ایسے رسالہ کی اشاعت کی ہمت کی ہے۔اُمید ہے
اس علاقے کے اصحاب اس کی قدر کریں گے—

سالانہ قیمت مختلف طبقوں کے لوگوں سے مختلف ہے۔عام پبلک اور ہ
سے دو روپیہ آٹھ آنہ سالانہ ہے—

شادماں

یہ بھی بالکل تازہ رسالہ ہے۔اسی سال سے شایع ہونا شروع ہوا ا
ریاست جے پور سے نکلتا ہے۔اڈیٹر حکیم نورالحسین صدیقی صاحب ہیں

مختلف قسم کے مضامین درج ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر ادبی اور اخلاقی ہیں۔ دو ایک غزلیں بھی ہیں۔ادبی تفریح اور دل چسپی کے لئے یہ اچھا رسالہ ہے۔ قابل اڈیٹر مستحق شکریہ ہیں کہ انہوں نے جے پور سے اردو کے ادبی رسالہ کے شایع کرنے کی کوشش کی ہے۔اُمید ہے کہ اس سے ریاست جے پور میں اُردو ادب اور زبان کے صحیح ذوق پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔صفحات پر علاوہ سلسلہ کے اعداد کے ہر مضمون کے اعداد الگ الگ لکھے ہیں۔یہ اچھی بات ہے لیکن اس سے کیا فائدہ جب کہ مضامین کی طبع میں اس امر کا خیال نہیں رکھا کہ ہر مضمون رسالہ سے الگ نکل سکے۔ایک ہی صفحہ پر ایک مضمون ختم ہوتا اور دوسرا شروع ہوجاتا ہے—

رسالہ جے پور کے نابالغ مہاراجہ مان سنگھ کے نام سے منسوب ہے—

خاصی بڑی تقطیع پر ۶۴ صفحے ہیں۔کاغذ اچھا لگایا گیا ہے۔سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہے—

—:0:—

اُردوے معلیٰ

مولانا حسرت موہانی نے فی الحال سیاسیات سے قطع تعلق کرکے پھر اُردوے معلیٰ شایع کیا ہے اور جنوری اور فروری کے نمبر ایک ساتھ نکالے ہیں۔اُردوے معلیٰ اُردو کا پرانا خادم ہے اور اس نے ادبی ذوق پیدا کرنے اور اُردو کی اشاعت میں قابل تعریف خدمت کی ہے۔یہ رسالہ اول سنہ ۱۹۰۳ع سے سنہ ۱۹۱۳ع تک برابر جاری رہا لیکن حکومت کے حکم سے بند کردیا گیا تھا۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اب وہ پھر جاری ہوا ہے اور اس کی ادبی دلاویزیاں وہی ہیں جو پہلے تھیں۔بجاے سیاسیات کے اب بزرگان دین کے شجرے شروع میں درج کئے گئے ہیں۔یہ نئی بات ہے جو پہلے اُردوے معلیٰ میں نہیں تھی۔اس کے بعد مولانا نے اپنی ایک تصنیف نکات سخن کے نام سے شایع کرنی شروع کی ہے۔اس کتاب میں متروکات سخن۔معائب سخن۔محاسن سخن۔ نوادرات سخن اور اصلاح سخن سے بحث ہوگی۔چنانچہ اس وقت پہلی فصل جو متروکات سخن کے متعلق ہی شایع ہو رہی ہے۔یہ مولانا کے مطالعہ اور ادبی ذوق اور تجربہ کا نچوڑ ہے۔یہ تصنیف بڑے پایہ کی ہوگی اور ادیبوں۔ شاعروں۔طالب علموں کے لئے بے حد کار آمد اور مفید ثابت ہوگی۔اس لئے ہم

اُن صاحبوں کی خدمت میں جو اردو زبان اور ادب کا ذوق رکھتے ہیں در
یہ سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرورا سے مطالعہ کریں۔یہ کتاب اُن کے حق میں ی
نعمت ہوگی۔مولانا نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا تھا کہ اُن اساتذہ کے کلام کا جو اب
طبع نہیں ہوا تھا یا جو ایک بار طبع ہوکر گمنام ہوگیا تھا انتخاب شایع کیا تھا۔ام
بہت سے اساتذہ باقی تھے۔ان کا کلام بھی اُردوے معلیٰ میں مسلسل چھپنا شروع ہو
ہے۔امید ہے کہ صاحبان ذوق اور اُردو زبان کے بہی خواہ اس رسالہ کی قدر کریں گے
سالانہ چندہ صرف دو روپیہ چار آنے ہے۔مولانا سے کانپور کے پتہ
مل سکتا ہے—

---:0:---

ککے زئی

یہ قوم ککے زئی کا سہ ماہی رسالہ ہے۔اس قوم کے لوگ زیادہ تر پنجا
میں آباد ہیں اور اس کے اکثر ارکان تجارت پیشہ ہیں۔ان کی ایک مجل
ککے زئی سنٹرل ایسوسی ایشن کے نام سے لاہور میں قائم ہے۔رسالہ کا مقد
قوم ککے زئی میں تعلیمی و معاشرتی اصلاح کرنے کا ہے۔یہ بہت مبارک مقصد
بشرطیکہ یہ حضرات اپنے فرقے کی دھن میں ملک اور قوم کو نہ بھول جائیں
فرقہ واری کوششوں میں اکثر یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ بڑے مقصد
بھول جاتے ہیں اور اُن میں ایک قسم کی تنگ دلی اور تنگ نظری پیدا ہو جات
ہے ہمیں اُمید ہے کہ ککے زئی اپنے فرقے کی اصلاح کے جوش میں ملک کے فرائض
فراموش نہیں کرے گا اور سلامت روی اور بیش بینی سے اپنے فرض کو انجا
دے گا۔جس طرح کوئی شخص تنہا دوسروں سے الگ رہ کر دنیا میں بس
نہیں کرسکتا اور نہ ترقی کرسکتا ہے اسی طرح کوئی فرقہ یا قوم ملک کی
دوسری اقوام سے الگ رہ کر عروج حاصل نہیں کرسکتی۔ککے زئی سے یہ توق
ہے کہ وہ اس خیال کو پیش نظر رکھے گا اور ایسی صورت میں وہ یقیناً اپنے فرق
کے لئے بہت زیادہ مفید ہوگا—

---:0:---

جام جہاں نما

یہ نیا رسالہ پانی پت سے مولوی محمد اسمعیل صاحب کی اڈیٹری میں
ماہ مارچ سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔رسالہ بڑے دعوے اور دم خم کے ساتھ

میدان ادب میں آیا ہے۔ وہ بعض موجودہ رسالوں پر فقرے کسنے کے بعد اردو کے چلتہ نامور رسالوں کا نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ "بھلا ہماری پہنچ ان فلک نشینوں تک کہاں ہو سکتی ہے۔ پر لگا کر بھی اڑیں تو وہاں تک نہیں پہنچ سکتے" لیکن اس انکسار اور عجز سے اسے فوراً ندامت ہوتی ہے اور دوسرے ہی فقرے میں کہہ اٹھتا ہے "مگر نہیں ہمیں پہنچنا وہیں ہے۔ مانا کہ اس وقت نہیں پہنچ سکتے۔ دو چار چھ برس میں سہی مگر ہمیں پہنچنا وہیں ہے۔ تکلیفیں اٹھاکر۔ دقتیں سہہ کر۔ بار بار ناکام رہ کر۔ مگر ہمیں پہنچنا وہیں ہے" آفرین ہے اس ہمت پر۔ اگر انہیں اپنے نفس پر ایسا ہی اعتماد ہے تو وہ ضرور وہاں تک پہنچ کر رہیں گے۔ اور ہماری آرزو ہے کہ جس مدت کا اندازہ انہوں نے کیا ہے اس سے بھی جلد پہنچیں۔ مولانا حالی مرحوم اور مولانا وحیدالدین صاحب سلیم کے ہم وطن کے لئے یہ کوئی دشوار بات نہیں ہے۔ رسالہ دلچسپ ہے اور ہر قسم کے مفید معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی ادبیات۔ اخلاقیات۔ اسلامیات۔ تذکرات۔ ایجادات۔ معلومات۔ اکتشافات۔ منظومات۔ فکاہات۔ تفریحات۔ عقلیات۔ نسائیات۔ صناعات۔ مجربات۔ استفسارات۔ تعارفات۔ تنقیدات یہاں تک کہ "مفیدات" اور فسانے بھی ہیں۔ کیا ہے جو اس جام میں نہیں ہے۔ ۳۲ صفحے میں ساری کائنات آ گئی ہے۔ گویا قابل اڈیٹر نے کوزہ میں سمندر بند کر دیا ہے۔ مگر اس میں پیسہ اخبار کے انتخاب لاجواب کا رنگ نظر آتا ہے۔ سالانہ چندہ صرف ڈیڑھ روپیہ ہے۔ اس قیمت پر یہ رسالہ درحقیقت بہت ارزاں اور لائق قدر ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔

مطبوعات انجمن

جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاصکر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا۔ کتاب کے ابتدائی حصہ میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے۔ جو ہمارے اہل وطن کے لئے بہت سبق آموز ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے۔ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات ہے۔ خاصکر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں (حجم ۴۸۲ صفحے)

قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کلدار

سرگزشت حیات یا آپ بیتی

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔ حیات کی ابتدائی حالت سے لیکر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا ہوا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا۔ یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے

(حجم ۲۰۰ صفحے)

قیمت غیر مجلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار۔

تذکرۂ شعرائے اردو

مولفۂ میر حسن دہلوی۔ میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ ان کی مثنوی بدر منیر کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر طبع کی گئی ہے۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے۔ قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنہ کلدار۔ غیر مجلد ایک روپیہ ۹ آنہ کلدار—

تاریخ تمدن

سر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا

ترجمہ ھے - الف سے ی تک تمدن کے ھر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ھے اور ھر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ھے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذھن میں وسعت پیدا ھوتی ھے۔ حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ مجلد دو روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ کلدار —

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ھے مگر انگلستان کے مشہور سائنس داں حکیم ھکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ھے۔ اس میں بظاھر فطرت کی بحث درج ھے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ھے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار - مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار —

القول الاظہر

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الارا تصنیف فوزالاصغر کا یہ اردو ترجمہ ھے - یہ کتاب فلسفۂ الٰہیین کے اصول پر لکھی گئی ھے اور مذھب اسلام پر انھیں اصول کو منطبق کیا گیا ھے قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار مجلد ایک روپیہ کلدار —

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ھوئے ھیں اُن سب کو جمع کر دیا ھے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ھے قیمت غیر مجلد

۱۰ آنہ کلدار - مجلد ۱ روپیہ کلدار

قاعدہ و کلید قاعدہ

یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا جن اصول اور طریقہ پر اس کی ت ھونی چاھئے ان کی تشریح کے لئے ا کلید بھی تیار کی گئی ھے - ق غیر مجلد ۲ آنہ کلدار - کلید قا غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

فلسفۂ تعلیم

ھربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ھے و فکر کا بہترین کارنامہ - والدین و م کے لئے چراغ ھدایت ھے - تربیت قوانین کو اس قدر صحت سے سا مرتب کیا ھے کہ کتاب الہامی مع ھوتی ھے - اس کا نہ پڑھنا گناہ ھے - قیم مجلد ۳ روپیہ کلدار - غیر مجلد ۲ رو ۸ آنہ کلدار —

دریائے لطافت

ھندوستان کے مشہور سخن سنج ، انشاءاللہ خاں کی تصنیف ھے - ار صرف و نحو اور محاورات اور ال کی پہلی کتاب ھے اس میں زبان متعلق بعض عجیب و غریب نکات در ھیں - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ کلدار مجلد ۲ روپیہ کلدار —

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ھے - تین صفحوں میں تقریباً جملہ مسا

علم ہندسہ کی ہیں۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی ملسلک ہے۔ قیمت غیر مجلد ۲ روپیہ کلدار مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

مشاہیر یونان و روما

ترجمہ ہے۔ سیرت نگاری اور انشا پردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ وطن پرستی اور بے نفسی عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے۔ قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپیہ کلدار۔ مجلد ۴ روپیہ کلدار جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

اسباق النحو

ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف ہے اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔ قیمت حصۂ اول غیر مجلد ۲ آنہ کلدار حصۂ دوم غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

علم المعیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں۔ اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔ حجم ۸۸۵ صفحے قیمت مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر۔ تحقیق و صداقت کا مرادف ہے۔ یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن۔ معاشرت۔ اصول۔ اخلاق۔ مذاہب و خیالات کا مرقع ہے۔ حصۂ اول مجلد ۳ روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔ اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے۔ قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار —

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۳۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار —

رسالۂ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے۔علمی اصطلاحات سے معرا۔طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار—

دیباچۂ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا۔پانی۔غذا۔لباس۔مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے ملک کی بہترین تصنیف ہے۔اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔حجم ایک ہزار صفحے۔قیمت مجلد چار روپیہ کلدار—

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے۔ بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار—

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ استادالشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے۔اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں۔نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں۔مولانا محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔قیمت مجلد دو روپیہ ۴ آنہ کلدار—

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ہے۔ متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے قیمت مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ کلدار—

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشاپرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مولف "یہ بالکل نیا موضوع ہے۔میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں"۔اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے۔سابقوں اور لاحقوں۔اردو مصادر اور ان کے

صفحات میں سیکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں۔ اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں۔ لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں اور ہمارے حوصلے بلند کردئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوئے ھچکچاتے تھے۔ مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔ اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے۔ تعداد صفحات ۲۰۵ قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ کلدار —

نفح الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے۔ خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے۔ علامۂ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۴۰۲ قیمت مجلد چھہ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

محاسن کلام غالب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ اردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے۔ یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا۔ صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار —

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں بعض قدیم اقوام۔ سلطنت کلدانی۔ آشوری۔ بابل۔ بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت۔ عقائد۔ صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھہ دئے ہیں۔ اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے حالات کی وضاحت کے لئے جابجا تصویریں دی گئی ہیں۔ صفحے ۲۷۴۔ قیمت مجلد دو روپیہ ۹ آنہ کلدار —

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے۔ ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے۔ کہاں سے آتی ہے۔ کیا کام آسکتی ہے۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے۔ قیمت دو روپیہ ۴ آنہ کلدار —

———:O:———

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

(دارالمصنفین اعظم گڈھ)

۱- سیرۃ النبی حصۂ اول ۴ روپیہ
۲- سیرۃ النبی حصۂ دوم ۳ روپیہ ۸ آنہ
۳- سیرۃ النبی حصۂ سوم ۶ روپیہ
۴- شعرالعجم مکمل ۵ حصے ۱۲ روپیہ
۵- سفرنامہ مولانا شبلی ۲ روپیہ
۶- علم الکلام ۲ روپیہ
۷- الکلام ۲ روپیہ
۸- کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۹- اسوۂ صحابہ مکمل دو حصہ ۸ روپیہ
۱۰- انقلاب الامم ۲ روپیہ
۱۱- برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۲- مکالمات برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۳- مثنوی بحرالمحبت ۱۲ آنہ
۱۴- تفسیر ابومسلم اصفہانی (عربی) ۲ روپیہ
۱۵- سیرالصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنہ
۱۶- روح الاجتماع ۲ روپیہ
۱۷- ابن رشد ۳ روپیہ
۱۸- گل رعنا ۵ روپیہ
۱۹- سیرالانصار ۳ روپیہ ۸ آنہ

(مطبع کاویانی - برلن)

۱- موش و گربہ (فارسی) ۵ آنہ ۶ پائی
۲- زادالمسافرین (فارسی) ۸ روپیہ
۳- گلستان (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۴- تیاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۵- تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۶- نصاب الصبیان (فارسی) ۱ روپیہ
۷- رہنمای پسران (فارسی) ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ
۹- ہزار و یک سخن (فارسی) ۱۱ آنہ

(جامعہ ملیہ - علی گڈھ)

۱- الخلافت الکبریٰ ۵ روپیہ
۲- الصراط المستقیم ۲ روپیہ
۳- بصائر ۶ آنہ
۴- سیرۃ الرسول ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- خلافت راشدہ ۲ روپیہ
۶- خلافت بنی امیہ ۱ روپیہ ۸ آنہ
۷- خلافت عباسیہ ۲ روپیہ
۸- خلافت عباسیہ بغداد ۲ روپیہ
۹- مبادی معاشیات ۱ روپیہ
۱۰- انتخاب مہر (از نورالرحمن صاحب) ۱ روپیہ
۱۱- قواعد عربی ۲ روپیہ
۱۲- عرض جوہر ۸ آنہ
۱۳- مجموعۂ کلام جوہر ۶ آنہ
۱۴- اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۴ آنہ
۱۵- ازہار العرب ۸ آنہ

۱۶- انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیہ
۱۷- ترکوں کی کہانیاں ۳ آنہ
۱۸- خطبہ شیخ الہند ۲ آنہ
۱۹- خطبہ حکیم اجمل خاں صاحب
۲ آنہ
۲۰- ہمارے نبی ۸ آنہ
۲۱- تاریخ ہند قدیم ۱ روپیہ
۲۲- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر
۱۲ آنہ

(نظامی پریس - بدایوں)

۱- قاموس المشاہیر جلد اول ۲ روپیہ
۲- نکات غالب مجلد ۱ روپیہ
۳- دیوان غالب مشرح مجلد دو روپیہ
۸ آنہ
۴- دیوان جان صاحب مجلد ۱ روپیہ
۸ آنہ
۵- دیوان درد ۱ روپیہ ۴ آنہ
۶- دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن)
۱ روپیہ ۸ نہ
۷- خطوط سرسید قسم اول ۳ روپیہ
۸- خطوط سرسید قسم دوم ۲ روپیہ
۹- لیتھوگرافی مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ
۱۰- انتخاب زرین مجلد ۲ روپیہ
۱۱- مراثی انیس جلد اول مجلد
۱۰ روپیہ
۱۲- مراثی انیس جلد دوم قسم اول
۸ روپیہ قسم دوم ۴ روپیہ
۱۳- تذکرۃ الصلحا ۸ آنہ
۱۴- کنز التاریخ ۱ روپیہ ۸ آنہ

(دائرۂ ادبیہ - لکھنؤ)

۱- یادگار غالب ۳ روپیہ
۲- مکاتیب امیر مینائی ۲ روپیہ ۸ آنہ
۳- مکاتیب اکبر ۱ روپیہ
۴- مہلائے سخن ۱ روپیہ
۵- حزن اختر ۸ آنہ
۶- درس عمل ۳ آنہ
۷- خواتین انگورہ ۱ روپیہ
۸- بیگمات بنگال ۹ آنہ
۹- اسلام کا اثر یورپ پر ۳ آنہ
۱۰- مشرقی ترکستان ۹ آنہ
۱۱- سیاحت زمین ۱ روپیہ
۱۲- سیاحت ہوا ۱ روپیہ

الناظر پریس - لکھنؤ

۱- تاریخ عرب ۷ روپیہ ۸ آنہ
۲- موازنہ انیس و دبیر ۳ روپیہ
۳- مقدمہ شعر و شاعری ۱ روپیہ ۴ آنہ
۴- اصول النسخ ۹ آنہ
۵- مسلمانان اندلس ۱ روپیہ ۸ آنہ
۶- اسرار رنگون ۱ روپیہ
۷- ہوم رول ۵ آنہ
۸- خوان دعوت ۱ روپیہ
۹- مصنوعی شوہر ۲ آنہ
۱۰- وکرم اروسی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱- مسلمانوں کی تہذیب ۲ آنہ
۱۲- الاحسان ۸ آنہ
۱۳- ارض نہرین ۳ آنہ
۱۴- تذکرۂ حزین ۳ آنہ
۱۵- حیات نظامی ۳ آنہ
۱۶- خطاب ۳ آنہ

۱۷–میلاد نبوی ۳ آنہ

۱۸–تصویر درد ۴ آنہ

۱۹–شمع و شاعر ۲ آنہ

۲۰–فریاد امت ۳ آنہ

(دوسری قابل قدر کتابیں)

۱–رسائل عملی ۱ روپیہ ۸ آنہ

۲–کتب خانہ اسکندریہ ۵ آنہ

۳–مسدس حالی ۱۲ آنہ

۴–جنگل کی پہلی کہانی ۵ آنہ

۵–بادل کے بچے ۱ روپیہ

۶–بانگ درا ۳ روپیہ

۷–یادگار غالب ۱ روپیہ ۸ آنہ

۸–مجموعہ نظم حالی ۸ آنہ

۹–اکبری اقبال ۳ آنہ

۱۰–الفاروق ۳ روپیہ

۱۱–اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ۸ آنہ

۱۲–نظم طباطبائی ۳ آنہ

۱۳–نفس اللغة ۱ روپیہ

۱۴–ترانۂ شوق ۱ روپیہ ۸ آنہ

۱۵–خوبی شعر ۸ آنہ

۱۶–دیگر ممالک میں قطع تعلق ۱۰ آنہ

۱۷–آزادی اسلام ۴ آنہ

۱۸–مصطفیٰ کمال پاشا ۱ روپیہ ۸ آنہ

۱۹–گوکھلے کی تقریریں ۱۲ آنہ

۲۰–سلف گورنمنٹ ۶ آنہ

۲۱–عالم خیال ۸ آنہ

۲۲–حیات خسرو ۸ آنہ

۲۳–نظام حیات انسانی ۸ آنہ

۲۴–فرہنگ فارسی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ

۲۵–فرہنگ عربی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ

۲۶–اسلامی حکومت ۲ آنہ

——:o:——

دیوان غالب جدید و قدیم

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا–اس میں میرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے–میر صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے–مع مقدمۂ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم مجلد ۵ روپیہ کلدار–غیر مجلد ۴ روپیہ کلدار (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار)—

مکاتیب

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر–دلچسپ–پر از معلومات اور بہترین مجموعہ–مرتبۂ مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ ریاست بھوپال ۱ روپیہ—

المشتہر

انجمن ترقی اردو–اورنگ آباد (دکن)

یہ کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

(کل قیمتیں سکۂ کلدار میں ہیں)

نیرنگ ارض
مولفہ مولوی سید راحت حسینی
صاحب بی-اے ۱ روپیہ ۴ آنہ

سیر المصطفیٰ
مولفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا
وکیل غازی آباد ۲ روپیہ

Hindustani Simplified (اردو آموز)
مہیش چندر دت صاحب بی اے ۳ روپیہ

شرح Hindustani Simplified
مولفہ مہیش چندر دت صاحب بی اے
۱ روپیہ

رسالہ نماز Prayer Book
خان صاحب عابد علی خاں صاحب
۱ روپیہ

ابتدائی تعلیم کی رام کہانی
مولفہ منشی رام پرشاد صاحب بی اے
۱ روپیہ ۴ آنہ

ہندو تہواروں کی اصلیت اور اُن کی جغرافیائی کیفیت
مولفہ منشی رام پرشاد صاحب بی اے
۹ آنہ

وہ جاندار جو نظر نہیں آتے
مولفہ منشی رام پرشاد صاحب بی اے
۴ آنہ

(دارالاشاعت پنجاب لاہور کی کتابیں)

اختر النساء بیگم	۱ روپیہ ۸ آنہ
دکھ بھری کہانی	۲ آنہ ۹ پائی
روشنک بیگم	۲ روپیہ
رانی ترونارت	۱ آنہ
رسوم دہلی	۳ آنہ ۹ پائی
ان پورنا دیوی کا مندر	۱ روپیہ ۸ آنہ
ایام غدر	۱ روپیہ ۴ آنہ
نقش فرنگ	۱ روپیہ ۴ آنہ
پریم پچیسی مکمل	۳ روپیہ
بانگ درا مجلد	۵ روپیہ ۸ آنہ
بانگ درا غیر مجلد	۴ روپیہ
نعمت خانہ	۱ روپیہ ۴ آنہ
خواب راحت	۴ آنہ
چندن ہار	۲ آنہ
انمول موتی	۱ آنہ ۹ پائی
سوکن کا جلاپا	۹ آنہ
گوہر مقصود	۹ آنہ
لیلیٰ	۲ آنہ
سواء السبیل	۱ روپیہ
سخندان پارس	۱۰ آنہ
قوانین دولت	۳ آنہ
مہتا	۱۲ آنہ
چترا	۱۲ آنہ

اُردو

۱- یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری-اپریل-جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا—

۲- یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی- حجم کم از کم ایک سو اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو صفحے ہو گا—

۳- بنظر احتیاط رسالہ ذریعۂ رجسٹری بھیجا جاتا ہے—

۴- قیمت سالانہ چھہ روپیہ کلدار- محصول ڈاک وغیرہ ملا کر آٹھہ روپیہ کلدار (سکۂ عثمانیہ سات روپیہ- محصول ڈاک وغیرہ ملا کر نو روپیہ سکۂ عثمانیہ)

۵- تمام خط و کتابت:- مولوی عبدالحق صاحب بی-اے آنریری سکریٹری، انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئیے—

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس- اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

فہرست مضامین



عالیجناب ڈاکٹر نواب عمادالملک بہادر مد ظلہ

سی-ایس-آئی، ال-ال-ڈی

نواب عمادالملک بہادر ہماری قوم کے اُن بزرگوں میں سے ہیں جن پر ہمیں بجا فخر ہے - باوجود خاندانی وجاہت اور ہر قسم کے وسائل کے انھوں نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سررشتۂ تعلیم ہی کو پسند کیا اور آخیر ملازمت تک اسی پر قائم رہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر ملک کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی - اگرچہ ابتدا اس کی لکھنؤ میں ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد وہ حیدرآباد بلا لئے گئے جہاں وہ چند سال بعد سررشتۂ تعلیم کے اعلیٰ افسر مقرر ہوئے اور گو بیچ بیچ میں وہ اس سے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے لیکن تعلیمی خدمت کو انھوں نے کبھی نہیں چھوڑا - آج جو تعلیم کا چرچا ہم حیدرآباد میں دیکھتے ہیں وہ انہیں کا طفیل ہے —

کتب خانۂ آصفیہ جس میں نادر اور بیش بہا قلمی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے اور اِن کتابوں کے بہم پہنچانے میں جو مشکلات پیش آئیں اس کے متحمل صرف نواب صاحب ہی ہو سکتے تھے - دائرۃ المعارف جس میں عربی زبان کی ایسی نادر اور کمیاب علمی کتابوں کی طبع و اشاعت کا انتظام کیا جاتا ہے جو اب تک نہیں چھپیں وہ آپ ہی کی سعی و توجہ کا نتیجہ ہے - یہ دونوں اب تک آپ ہی کی زیر نگرانی ہیں - قدیم دارالعلوم کی ترقی بہت کچھ آپ ہی کی ذات سے ہوئی - حرفت و صنعت

کے مدارس اس ملک میں آپ ھی نے قائم کئے۔ اس کا آپ کو ھمیشہ خیال رھا اور اب تک ھے۔ غرض ریاست حیدرآباد کی جدید و قدیم تعلیم کی بانی آپ ھی کی ذات گرامی ھے۔ حال میں جب جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کا جلسۂ تقسیم اسناد ھوا تو امیر جامعہ نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری عطا کرتے وقت جو الفاظ آپ کی نسبت فرمائے تھے وہ نہایت صحیح اور موزوں تھے جنھیں ھم یہاں نقل کرتے ھیں —

"..... اس سلسلے میں سب سے پہلے جو نام میں لیتا ھوں وہ جامع علوم مشرقی و مغربی نواب عمادالملک بہادر کا اسم گرامی ھے جنھیں میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعۂ عثمانیہ کی طرف سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی سند دیتا ھوں۔ اس نامور فاضل اور دیرینہ سال ماھر تعلیم سے آپ کا تعارف کرانا تحصیل حاصل ھے کہ اس بزرگ کے اوصاف اور کارناموں سے ملک کا ھر باخبر شخص آگاہ ھے اور یہ کہنا غلط نہ ھوگا کہ اس ریاست میں تعلیم جدید کی ساخت و پرداخت بہت کچھ صاحب موصوف ھی کے ھاتھوں ھوئی جو تیس برس تک ناظم تعلیمات سرکار عالی کے فرائض ادا کرتے رھے۔ آج جب کہ ھم اپنے ملک میں جدید تعلیم کے فروغ و ارتقا کا مشاھدہ اس جلسۂ تقسیم اسناد میں کر رھے ھیں عین مناسب ھے کہ مذکورۂ بالا ڈگری کے پیرائے میں ھم نواب عمادالملک کی تراسویں سالگرہ منائیں" —

نواب صاحب ممدوح کے علم و فضل اور ذوق سلیم سے کسی کو انکار نہیں ھو سکتا اور جامعۂ عثمانیہ نے اپنے پہلے جلسۂ اسناد میں ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری عطا کر کے اپنا حق ادا کیا ھے اور حقیقت یہ ھے کہ اُن سے بڑھ کر اس کا کوئی مستحق نہ تھا۔ یہ گویا اعتراف ھے اُن تعلیمی اور علمی خدمات کا جو انھوں نے اس ملک میں انجام دی ھیں —

علم و فضل سے قطع نظر کر کے جو بات آپ میں سب سے قابل قدر ھے وہ آپ کی سیرت ھے۔ آپ کی طالب علمانہ اور بے لاگ زندگی، آپ کی صاف

گوئی اور راست گفتاری، آپ کی تہذیب اور نفاست ذوق یہ ایسے جوہر ہیں جو بہت کم لوگوں میں پائے جاتے ہیں حیدرآباد ایک ایسا مقام ہے جہاں اچھوں اچھوں کو لغزش ہو جاتی ہے۔ لیکن نواب عمادالملک کا دامن اُن تمام باتوں سے پاک رہا جن کے لئے حیدرآباد بدنام ہے۔

آپ ہمیشہ طالب علم رہے اور اب بھی طالب علم ہیں۔ اس وقت بھی جب کہ آپ علالت کی وجہ سے جو ٹانگ کے سبب سے لاحق ہو گئی ہے) آپ بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ آپ مطالعہ فرماتے رہتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے تمام خطوں کا جواب دیتے ہیں۔ اُن کی صحبت میں اب بھی ادب و مذہب کی گفتگو ہوتی رہتی ہے اور اُن لوگوں سے بڑی خوشی اور بے تکلفی سے ملتے ہیں جو علمی اور ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ اگرچہ آپ کچھ زیادہ دولت مند نہیں ہیں تاہم طالب علموں کی دستگیری فرماتے رہتے ہیں۔ اورنگ آباد کالج جو آپ ہی کے اشارے اور تحریک سے قائم ہوا وہاں کے نادار طلبہ کی امداد آپ ابتدا سے اب تک برابر کرتے ہیں۔ علمی اور ادبی کاموں میں مدد دینے سے کبھی دریغ نہیں کرتے۔ انجمن ترقی اُردو پر اُن کی خاص عنایت ہے اور اس کے علمی کاموں میں جو قابل قدر امداد آپ نے فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔

آپ کے قویٰ بہت اچھے تھے۔ ہمیشہ صحت اور عافیت کے ساتھ بسر کی۔ اگر یہ پاؤں کا صدمہ نہ ہوتا جس کی وجہ سے آپ کو تکلیف رہتی ہے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ہیں۔ تو آپ کی صحت بہت اچھی رہتی اور اس قدر ضعف نہ ہونے پاتا جیسا اب نظر آتا ہے۔ تاہم اب بھی اُن کی صحبت مغتنمات میں سے ہے اور اس کی قدر وہی جانتے ہیں جن کو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔ ان کے مزاج میں خاص نفاست ہے اور وہی نفاست اُن کے کھانے پینے، رہنے سہنے، بات چیت اور علم و ادب میں ہے۔ مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے اس پر ایسا اچھا اور پاکیزہ مضمون لکھا ہے (جو اس کے بعد

آپ کی نظر سے گزرے گا) کہ مجھے اس پر لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی—

ہم اُس فیض و فلاح کی شکر گزاری میں جو ملک کو آپ کی ذات سے پہنچی ہے اُردو کا یہ نمبر آپ کی تراسیویں سالگرہ کی تقریب میں شایع کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ آپ دیر تک صحت و عافیت کے ساتھ زندہ و سلامت رہیں—

عبدالحق

نواب عماد الملک مولوی سید حسین خان صاحب بہادر بلگرامی

از

(جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی)

اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ھندوستان ایک عجیب عالم کون و فساد بنا ہوا تھا۔اس لئے کہ پرانی ریاستوں کے ساتھہ پرانے مذاق کے صاحبان علم و فضل بھی فنا ہو رہے تھے اور نئی حکومت و تعلیم نے جدید کمالات علمی کے نمونے اور نئی شان کے علما و فضلا پیدا کرنا شروع کر دیے تھے۔ان دونوں متضاد زمانوں کو ربط دینے والی کڑی فقط وہی اھل علم ہو سکتے تھے جو دونوں قدیم و جدید مذاقوں سے آشنا ہوں—

اسی قسم کے ذی علم و اھل کمال میں سے اضلاع اودھ کا ایک بہت پرانا فاطمی النسل علمی خاندان تھا جو مشہور مرکز علماے عظام یعنی قصبہ بلگرام کو چھوڑ کر بنگالے پہونچا اور پھر اُس کے ہونہار فرزندوں کی طالبعلمانہ سرگرمی سے پرانا علمی کمال جدید علوم کے لباس میں نئے اقبال کی عالم افروز آب و تاب کے ساتھہ چمکنے لگا—

بلگرام اودھ کا بہت پرانا قصبہ ہے جس میں پانچویں صدی ھجری کے آغاز سے اسلام کے شریف و وضیع اور صاحب علم و کمال عربی خاندان آکے آباد ہونا شروع ہو گئے اور اس سر زمین کو اپنا وطن مالوف بنا لیا۔انھیں

الوالعزم آنے والوں میں ایک فاطمی نژاد ذی علم بزرگ تھے جنھوں نے سنہ ۵۹۴ ہجری میں وارد بلگرام ہو کر وہاں کے ہندو راجہ کو شکست دی اور اُس کی قلمرو پر متصرف ہو کر اس علاقے کے حاکم بن گئے۔یہ بزرگ چونکہ علوم معقول و منقول میں کمال رکھتے تھے لہذا اطراف و جوانب کے مسلمانوں کی پیشوائی اور مقتدائی کا عمامہ بھی اُنھیں کے سر پر تھا—

اس کے بعد یہ خاندان اپنی اُسی محدود حکومت پر قناعت کر کے علم و فضل میں ترقی و ناموری حاصل کرتا رہا اور تاریخ بتا رہی ہے کہ ہر دور میں اس کے ارکان بڑے متبحر عالم اور فاضلانہ وقار کے مصنف تھے جن کی علمی عظمت کے آگے بڑے بڑے اسلامی درباروں کے سر جھکے رہتے تھے اور غالباً اسی علمی فضیلت و مرجعیت نے اس خاندان کے نسب نامے کو ہمیشہ محفوظ رکھا۔ اودھ کے تمام قصبات کے شرفا اپنے پرانے نسب نامے پیش کر رہے ہیں مگر جس قدر مستند اور قابل وثوق نسب نامہ شرفا و فضلاے بلگرام کا ہے شاید اور کسی خاندان کا نہ ہوگا اور پھر سب سے زیادہ حیرت کی یہ بات ہے کہ اس خاندان نے اپنی شرافت کے ساتھ اپنی آبائی و موروثی دولت علم کو بھی ہمیشہ محفوظ رکھا —

اسی خاندان کے ایک رکن رکین وہ بزرگ تھے جنھوں نے مذکورہ زمانہ کون و فساد یعنی انگریزی دور کے ابتدائی عہد میں زمانہ کی نبض پہچان کر دولت برطانیہ کی ملازمت اختیار کر لی۔اسی ملازمت کی کشش سے وطن کو خیر باد کہہ کر کلکتے پہونچے اور مغربی اقبالمندوں کے صحیفۂ اقبال کو مطالعہ کر کے اپنی قسمت انھیں سے وابستہ کر دی۔اُن کا قیام اکثر کلکتہ میں رہا اور وہیں اُن کے فرزند پیدا ہوے—

ان کے دو فرزندوں نے جو مولوی سید حسین بلگرامی کے والد اور چچا تھے خاندانی علوم عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کرنے کے بعد

"اورنٹل کالج آف لرننگ" میں تعلیم پانا شروع کی اور یہی پہلے عالی خاندان مسلمان شریف زادے تھے جنھوں نے باقاعدہ طور پر انگریزی اسکول میں تعلیم پائی —

ان دونوں بھائیوں میں سے ایک یعنی مولوی سید حسین صاحب کے چچا نے دولت برطانیہ کے ارکان سلطنت میں اعتماد حاصل کر کے بڑا عروج پایا وہ بڑی ذمہ داری کی سیاسی و اعزازی خدمتوں پر مامور ہوتے رہے۔مگر ان کے پدر بزرگوار نے اکزیکیو تیو محکمے میں ملازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۸۴۰ ع میں وہ ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے اور ایک مدت دراز تک ان خدمات کو اضلاع بنگالہ و بہار میں بکمال نیکنامی و اعلیٰ قابلیت انجام دے کر سنہ ۱۸۷۵ ع میں وظیفہ یاب ہوئے —

سنہ ۱۸۴۴ ع میں جب کہ وہ ضلع گیا میں ڈپٹی کلکٹر تھے مولوی سید حسین صاحب پیدا ہوئے جن کی جوبلی کے موقع پر ان کے مختصر حالات کو قلمبند کر کے ہم معترف کمال پبلک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ پہلے ہم ان کی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد اُن کے اخلاق و عادات اور دیگر ذاتی و صفاتی خصوصیات سے بحث کریں گے —

مولوی سید حسین صاحب کا یہ بھی ایک نمایاں شرف ہے کہ جس خاک سے "بدھا" کا ایسا عدیم المثال دانائے روزگار پیدا ہوا تھا وہی خاک اُن کو بھی عالم وجود میں لائی۔ چودہ پندرہ سال کی عمر تک خانگی مکتب میں خاندانی علوم عربی و فارسی کی تحصیل کی اور مشرقی علوم سے فارغ ہونے کے بعد انگریزی زبان اور اُس کے علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ پہلے بھاگل پور میں پھر پٹنے میں اور بعد ازاں کلکتے کے انگریزی مدارس میں تعلیم پا کر سنہ ۱۸۶۱ ع میں میٹری کیولیشن کی سند حاصل کی بعد ازاں سنہ ۱۸۶۶ ع میں فرسٹ گریڈ میں آنر کے ساتھ گریجویٹ ہوئے —

اب بہ ظاہر تعلیم تکمیل کو پہونچ گئی تھی - پدر بزرگوار نے چاہا کہ اپنے ہی محکمے میں کسی معزز خدمت پر مقرر کرادیں مگر سید حسین ابھی تک اپنے تئیں طالب علم سمجھتے تھے - انہیں دنیا میں بہت کچھ سیکھنا تھا - اسلئے گوارا نہ ہوا کہ کوئی ایسی ملازمت اختیار کرلیں جو ان کو اپنا پابند بناکر علمی ترقی سے روک دے - چنانچہ محکمہ تعلیمات کو پسند کیا اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوگئے - یوں اودھ کی شریف نسل کے اس ہونہار فرزند نے جو گیا میں پیدا ہوا تھا پھر خاک وطن پر قدم رکھا اور کالج کے طلبہ کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے تمدنی اسکول میں معاشرتی آداب و اخلاق سے بہرہ اندوز ہونے لگا —

سنہ ۱۸۷۲ ع میں مدارالمہام دولت آصفیۂ نظام نواب سر سالار جنگ بہادر اعظم سیاحت کرتے ہوے وارد لکھنو ہوئے تو جنرل بارو نے اس عجیب و غریب مجموعۂ علوم مشرق و مغرب یعنی نوجوان پروفیسر سید حسین کو ان سے ملایا اور ان کی ذاتی و علمی خوبیاں بیان کیں - نواب سالار جنگ بہادر کی مردم شناسی مشہور ہے - پہلی ہی ملاقات میں پہچان گئے کہ یہ نوجوان کیا سے کیا ہونے والا ہے - چنانچہ مولوی سید حسین کے کمالات کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اُنہیں دولت نظام کی ملازمت کا شوق دلایا اور فرمایا جب میں حیدرآباد میں پہونچ لوں تو آپ وہاں آکر مجھ سے ملیں —

مولوی سید حسین کی نظر میں علمی ترقی کے سوا اورکسی چیز کی وقعت نہ تھی اور ایسا مربی کمال بھی پھر ملنا دشوار تھا - زبانی وعدہ تو کرلیا مگر دکن کا سفر دور دراز اختیار کرنے میں دل پس و پیش کررہا تھا - یہاں تک کہ نواب سرسالار جنگ بہادر نے حیدرآباد پہونچ کر خود ہی خط بھیج کر انہیں بتاکید بلایا - یہاں ذوق علم نے اس درجہ مستغنی بنا رکھا تھا کہ اب بھی کئی مہینے لیت و لعل میں گزر گئے - آخر سنہ ۱۸۷۳ ع میں دکن کا سفر کرنا ہی

پڑا اور حیدرآباد پہونچے—

سر سالار جنگ بہادر نے صورت دیکھتے ہی اپنا پرسنل اسسٹنٹ مقرر کرلیا۔ سنہ ۱۸۷۶ ع تک اسی خدمت پر مامور رہے تھے کہ سالار جنگ بہادر سفر یورپ سے واپس آئے اور آپ کو اپنا پرایوٹ سکرٹری اور معتمد صیغہ متفرقات بنادیا۔جس میں سررشتہ تعلیم اور متعدد چھوٹے چھوٹے محکمے شامل تھے—

بعد ازاں جب حضور پرنور نواب میر محبوب علی خاں بہادر اریکہ آرائے سلطنت ہوئے تو مولوی سید حسین کو خاص اپنا پرایوٹ سکرٹری مقرر فرماکر "علی یار خاں موتمن جنگ بہادر" کے خطاب سے ممتاز فرمایا اور چند سال بعد اُنھیں "عمادالدولہ" اور پھر "عمادالملک" کے خطاب عطا ہوئے۔ تھوڑے زمانے کے بعد آپ ناظم تعلیمات مقرر کئے گئے جس خدمت کو آپ نے مدت دراز تک انجام دیا اور اگر غور سے دیکھئے تو قلمرو نظام کی ساری تعلیمی ترقی اور حیدرآباد کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں کی قابلیت اور دماغی روشن خیالی آپ ہی کی ہمیشہ بر قرار رہنے والی برکت اور بہترین یادگار ہے—

اس عرصہ میں سلطنت برطانیہ کے اعلیٰ احکام کو نواب عمادالملک بہادر کی سیاسی اور تعلیمی معاملات میں قابل قدر بصیرت سے بخوبی شناسائی ہوگئی تھی۔سنہ ۱۹۰۳ ع میں آپ کو مجلس وضع قوانین کا رکن نامزد کیا گیا۔پھر چند سال کے بعد "اصلاحات مارلے" نافذ ہوئیں تو نواب عمادالملک پہلے هندوستانی تھے جنھیں وزیر هند کی مجلس کا رکن منتخب کیا گیا اور وہ سنہ ۱۹۰۷ ع سے سنہ ۱۹۰۹ ع تک اس معزز منصب پر سرفراز رہے۔اسی دوران میں آپ کو سی۔ایس۔آئی کا خطاب اور تمغہ عطا ہوا—

مجلس مذکور کی رکنیت سے بوجہ علالت دست بردار ہو کر نواب عمادالملک واپس تشریف لائے تو آپ کو نوجوان مدارالمہام نواب سالارجنگ ثالث کی مدد کے واسطے مشیرالمہام مقرر کیا گیا اور گو کچھ عرصہ کے بعد اس

عہد سے علیحدہ ہو کر پھر آپ نے کوئی سرکاری خدمت کبھی قبول نہ فرمائی بایں ہمہ اعلحضرت شہریار دکن آپ کی اب تک نہایت عزت و توقیر فرماتے ہیں کہ شاید حیدرآباد میں دوسروں کو کم نصیب ہوئی ہوگی۔ زمانۂ مشیر الہامی میں آپ نے ملکی حرفت وصنعت اور اردو زبان کی ترقی کی تجویزیں نافذ فرمائیں —

یہ تو نواب عماد الملک بہادر کے حالات زندگی تھے اب یہ بتانا ہے کہ علمی استعداد اعتبار اور دینوی عزت و وقار حاصل کرنے کے بعد ان کا کیرکٹر کیا رہا اور ان کی کیا شان نمودار ہوئی - جن لوگوں نے ان کے صفحۂ زندگی پر غائر نظر ڈالی ہے وہ بالاتفاق مقربیں کہ اس سے زیادہ مہذب و شائستہ ہستی موجودہ ہندوستان میں نہیں نظر آسکتی —

باوجود اعلیٰ دولتمندی اور عالمانہ فضل و کمال کے آپ نہایت ہی سادی طبیعت رکھتے ہیں- حد سے زیادہ منکر المزاج واقع ہوے ہیں، اسوقت تک طالب علم ہیں - اور ہمیشہ رہیں گے - حیدرآباد کے سیاسی میدان میں بہت سے نامور لوگ آئے چلے گئے اور سب اپنے اپنے مقام پر اپنے خصوصیات دکھا کے اور انقلابات کے نمونہ بن کے رخصت ہو گئے مگر عماد الملک بہادر جو آج سے پچاس سال پیشتر تھے وہی آج ہیں اور جو سچی شائستگی اور فاضلانہ بے پروائی و یکرنگی آپ میں ہے کسی میں نہیں دیکھی گئی —

مشرقی اور مغربی دونو علموں ادبوں میں اعلیٰ کمال رکھنے کے باعث آپ اپنے جد امجد اور بزرگوار کی طرح آج بھی وہ کڑی ہیں جسلے یورپ و ایشیا کی خوبیوں کو باہم ملایا اور ہندوستان کے اگلے اور پچھلے غیر مربوط دوروں کو جوڑ کے ایک کر دیا —

عربی و فارسی علم و فضل میں اعلیٰ درجہ رکھنے کی وجہ سے آپ علما و فضلا اور صاحب علم اتقیاے زمانہ کے ایسے قدردان ہیں کہ اس زمانے میں اور

کوئی نہیں - پھر اس کے ساتھ انگریزی ادب اور جدید معلومات میں کامل بصیرت رکھنے کے باعث دانایان یورپ اور اس نئی روشنی کے ماہروں میں بھی ایسی مقبولیت رکھتے ہیں کہ علماے زمیں انھیں آنکھوں پر بٹھاتے اور اُن کی دو گھڑی کی صحبت کو اپنی زندگی کا یادگار حصہ تصور کرتے ہیں—

مجھے ایک مدت تک بالذات اُن کی روزانہ صحبتوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے طالبعلمانہ مشاغل میں شریک ہو کر میں نے ان کے علم وفضل سے فائدہ اُٹھایا ہے - اسی سلسلے میں مجھے اُن کی واقفیت عامہ، اُن کے مذاق، اور اُن کے اسلوب زندگی کے اندازہ کرنے کا بخوبی موقعہ ملا- شعراے کے کلام کا مطالعہ کرنے میں چند روز میں اُن کے ساتھ شریک رہا- اور نظر آیا کہ جیسی محققانہ و مبصرانہ نظر کلام عرب پر اُن کی پڑتی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے- سچ یہ ہے کہ میں نے اُنھیں ادب عربی میں یکتاے روزگار پایا- جاہلیت عرب کے سادے اور خالص عربی مذاق سخن کے دلدادہ ہیں- شعراے جاہلیت کے اشعار پر سر دھنتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل نہیں پسند کرتے—

یہی حال انگریزی ادب و انشا میں ہے- جیسی خوبصورت، سادی اور سہل ممتنع انگریزی عبارت وہ لکھتے ہیں اہل زبان ادیبوں میں سے بھی شاذ و نادر ہی کوئی لکھ سکتا ہے- اس سادے ادبی مذاق انگریزی نے انھیں انگریزی کا ایک سحر آفریں شاعر بنا دیا- ان کی انگریزی نظمیں شایع ہو چکی ہیں جو انگلستان کے سخن فہموں میں مزے لے لے کر پڑھی گئیں- ان میں بھی وہی سادگی بے تکلفی اور جدت طرازی نمایاں ہے جو ان کی سرشت میں داخل ہے ؏

آپ کو انگریزی زبان پر جو قدرت حاصل ہے اس کا اندازہ آپ کے ترجمہ قرآن سے ہو سکتا ہے- بہت دن ہوئے آپ نے کوشش شروع کی تھی کہ قران مجید کا ترجمہ انگریزی زبان میں کریں- جس کے لئے آپ نے بہت بڑا اہتمام کیا تھا اور تفسیروں کا بڑا بھاری ذخیرہ جمع کر لیا تھا- تقریباً سولہ پاروں کا ترجمہ کر کے پروف کی حیثیت سے چھپوا یا تھا کہ ضعف بصارت و علالت کی وجہ سے وہ مقدس کام پڑا

رہ گیا-میں نے وہ ترجمہ پڑھا ہے-بالکل انگریزی بائیبل کی زبان اختیار کی ہے-یورپ والوں کو توراۃ و انجیل میں خدا کے کلام کی جو شان نظر آتی ہے وھی شان نواب عماد الملک بہادر نے اپنی قادرالکلامی سے ایسی خوبی کے ساتھ قرآن کے ترجمہ میں دکھادی ہے کہ پڑھنے والے کو متحیر ہوکر ان کے اعلی ترین کمال انگریزی دانی کا معترف ہوجانا پڑتا ہے—

انگریزی کے علاوہ نواب عماد الملک بہادر فرانسیسی زبان میں بھی کامل دستگاہ رکھتے ھیں-اگرچہ ان کی کوئی فرانسیسی تحریر شایع نہیں ہوئی-مگر جس زمانے میں مجھے ان کے طالبعلمانہ مشاغل میں شرکت کا فخر حاصل تھا انھوں نے میرے شوق دلانے سے ڈوزی کی ھسٹری آف اسلام کا ترجمہ فرانسیسی سے اردو میں اس طرح شروع کیا تھا کہ وہ بتاتے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا-میں نے دیکھا کہ وہ بغیر کسی لغت کی مدد کے نہایت ھی صفائی سے بے تکلف فصیح اردو ترجمہ بتاتے چلے جاتے ھیں-اُن کی وجہ سے مجھے کبھی نہیں رکنا پڑتا بلکہ میری وجہ سے وہ بار بار رکتے ھیں-اور یہ ایسی بات ہے جو بغیر کسی زبان میں اعلی مہارت و قدرت ہونے کے غیر ممکن ہے—

بنگالے میں نشو و نما ہونے کے باعث بنگالی زبان بھی بے تکلف بولتے ھیں اور بعض اوقات میں نے دیکھا کہ بنگالی ملنے والوں کو اُن کے بنگالی زبان میں گفتگو کرنے پر حیرت ہوگئی—

اردو میں بھی اُن کا مذاق سخن بہت ھی سادہ ہے-سادی عام فہم زبان کو پسند کرتے ھیں اور عربی و انگریزی الفاظ استعمال کرنے کے سخت خلاف ھیں-شعرائے اردو میں سے دھلی والوں کے مذاق کو فوقیت دیتے بلکہ اسی کو اصلی مذاق شاعری جانتے ھیں-کلام میں عربی دقیق الفاظ اور شعرائے فارسی کے دقیق خیالات سے جو رفعت و شوکت پیدا کی جاتی ہے اس کو بالکل نہیں پسند کرتے-چنانچہ ناسخ کی شاعری کو نہیں تسلیم کرتے اور کئی بار مجھ سے فرمایا

ی " اُس کو شاعر کس نے کہا ہے؟ " —

لکھنؤ کے سادگی پسند شعراء بھی جو اکثر اوقات معشوق کے زیور و لباس اور چوٹی کنگھی کی تعریف کرجاتے ہیں اس کو ناگوار ابتذال تصور کرتے اور سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ لکھنؤ کی عام شاعری کو ناپسند کرتے ہیں —

ان ہی مغربی و مشرقی کمالات کے اجتماع نے اُن میں یہ مذاق پیدا کردیا ہے کہ کسی عالم یا طالب علم کی صحبت میں چاہے وہ کیسے ہی بے پایہ اور کم حیثیت ہو بڑا لطف آتا ہے اور جاہل دولت مند سے چاہے کیسا ہی باوقعت اور متین ہو اُنھیں سخت نفرت ہے۔غریب صاحب علم کی باتوں میں اپنے ضروری کاموں کو بھول جاتے ہیں اور نمایشی بڑے بڑے کے باتیں بنانے والے دولت مندوں کی فضول گوئی سے بھاگتے ہیں۔میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک غریب ذی علم شخص سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور اس اثنا میں کوئی عالی مرتبہ امیر آکے بیٹھہ گیا تو اُنھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کون آیا ہے اور کیوں آیا ہے —

اس کے ساتھہ غالباً اودھ کے قصباتی خاندانی رئیس ہونے کی ایک یہ جھلک بھی اُن کے اخلاق میں موجود ہے کہ شریف النسل لوگوں کی قدر کرتے ہیں اور فرومایہ رزیلوں کی صحبت سے جہاں تک بنتا ہے احتراز کرتے ہیں۔ایک آدھہ دفعہ میں نے یہ تماشا دیکھا کہ ایک فرومایہ دولت مند بے تکلف آکر اُن کے ڈرائنگ روم میں برابر بیٹھہ گیا۔ان کی نظر پڑی تو چہرہ سرخ ہوگیا۔اُٹھہ کھڑے ہوئے اور اس کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔اُن کا یہی اخلاق اور برتاؤ میں نے بعض ایسے لوگوں کے ساتھہ بھی دیکھا جن کی بد اخلاقی طشت از بام ہو رہی تھی —

طالبعلمانہ ہم صحبتی کے زمانے میں مجھے اُن کی اصلی معاشرت کے دیکھنے

کا بھی موقع ملا اور میں نے اُن کی اور اُن قدیم علما کی وضع و حالت میں سر مو فرق نہ پایا جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دنیاوی تکلفات سے بھاگتے اور کمال سادگی کے ساتھ جویاے علم رہتے ہیں۔عہدے یا درباری تعلقات کے باعث نواب عمادالملک بہادر کی ظاہری صورت تو یہ ہے کہ نہایت شاندار کوٹھی میں رہتے ہیں۔اچھا پہنتے اور اچھا کھاتے ہیں۔مکان اعلی درجے کے فرنیچر سے آراستہ ہے۔عمدہ پیچواں سامنے لگا ہے اور لکھنؤ کے بہترین خمیرے کے معطر دھوئیں سے سارا کمرہ مہک رہا ہے۔لیکن جب مخلا بالطبع ہوتے ہیں تو یہ شان نظر آتی ہے کہ زمین پر ایک بوریا یا دری بچھی ہے چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر لگا ہے۔جس میں عربی فارسی انگریزی فرانسیسی سب طرح کی کتابیں ملی ہوئی ہیں اور اس عالمانہ طومار علوم کے درمیان سادے کپڑے پہنے کمال بے تکلفی سے بیٹھے کسی مسئلے کی تحقیق یا کسی تاریخی واقعے کی گفتگو کر رہے ہیں۔مجھ سے کئی بار فرمایا کہ "مجھے اس زندگی میں جو لطف آتا ہے وہ تکلف کی درباری زندگی میں کبھی نہیں آیا"—

اسی وضع و مذاق نے ان کو حد سے زیادہ مستغنی اور بے پروا بنا دیا ہے۔حضور نواب میر محبوب علی خاں بہادر کے عہد حکومت میں جب نواب فتح نواز جنگ بہادر کا مقدمہ چل رہا تھا۔سرور جنگ بہادر کا زور تھا اور کوشش ہو رہی تھی کہ عمادالملک بہادر بھی فتنہ جو جماعت میں سمیٹ لئے جائیں اور ان پر حملے ہو رہے تھے۔مگر اُن کی وضع و حالت میں ادنیٰ تغیر بھی نہیں ہوا۔اُسی زمانے میں حضور مغفور چاہتے تھے کہ عمادالملک حاضر ہو کر اپنی پرائیویٹ سکرٹری کی خدمت انجام دیں۔مگر چونکہ ایوان خسروی سازشوں سے بھرا تھا اور وہاں کسی کے اوقات باقاعدہ اور منتظم نہیں رہ سکتے تھے وہ کسی طرح نہ جاتے تھے۔ان کے بہت سے احباب نے سمجھایا۔میں نے بھی کئی بار عرض کیا مگر اُنہوں نے اپنے علمی مشاغل کو

نہ چھوڑتا تھا نہ چھوڑا اور نہ جاتا تھا نہ گئے اور اُس پرفتن زمانے میں اپنی اُسی وضع سے نباہ دی اور یہ بات بجز اُن کے اور کسی سے نہ ہو سکتی تھی—

اُن کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ کذب و دروغ سے سخت متنفر ہیں۔ نہ کبھی ایک لفظ جھوٹ بولتے ہیں اور نہ جھوٹے کو منہ لگانے کے قابل تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح کیادی و مکاری کی کارروائیوں اور دغل فصل کی باتوں سے بھاگتے ہیں۔ ان کی عہدہ داری اور دربارداری کی طولانی زندگی میں حیدرآباد کے اندر بیسیوں پارٹیاں قائم ہوئیں۔ بڑی بڑی سازشیں ہوئیں۔ جن میں بڑے بڑے عہدہ داران ریاست شریک تھے مگر عمادالملک کا دامن اُن نجاستوں سے ہمیشہ پاک رہا۔ لوگوں نے ہزار چاہا کہ اُنھیں اپنے گروہ میں لیں مگر اُنھوں نے اس کو کبھی گوارا نہ کیا۔ حیدرآباد میں اعلیٰ خدمت پر ممتاز رہنے کے ساتھ اُن کا ایسا بے داغ رہنا حیرت کے قابل ہے اور یہ اُنھیں کے ساتھ خاص ہے کہ کبھی کسی سیاسی یا سازشی پارٹی میں نہیں شریک ہوتے اور ان کی اس استقامت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو اُن کی نسبت بعض لوگوں کا یہ خیال قائم ہو گیا کہ اسٹیٹمین ہونے کے قابل اور ڈپلومیسی کے اہل نہیں ہیں اور دوسری طرف ہر شخص کو اعتراف کرنا پڑا کہ اُن کے پایے کا سچا اور راست باز کوئی نہیں ہے اور مخالف پارٹیوں اور بڑوں ہمسروں سب طرح کے لوگوں میں بالاتفاق وہ بے عیب اور واجب الاحترام تسلیم کر لئے گئے—

سر وقارالامرا بہادر مرحوم کی مدارالمہامی کے آغاز میں عماد نواز جنگ حسن بن عبداللہ نے جو اپنے آپ کو ایک بہت بڑا اسٹیٹمین جانتے تھے مجھ سے کہا کہ نواب مدارالمہام کی خواہش ہے کہ فتح نواز جنگ اور اُن کی بیوی کے شرمناک واقعات کا ایک ناول آپ لکھ دیں۔ مجھے اس میں

تامل تھا بہانہ کیا کہ میرے پاس ایسے ناول کے لئے سواد واقعات نہیں موجود ہے اور نہ اُن کے حالات سے آگاہ ہوں۔حسن صاحب نے کہا "اس کے تمام واقعات آپ کو نواب عمادالملک بہادر سے ملیں گے" اُن کا نام سن کر مجھے حیرت ہوئی اور اُن سے وعدہ کر لیا کہ اگر اُنھوں نے مدد دی تو میں یہ ناول لکھ دوں گا۔دوسرے دن میں نے نواب عمادالملک بہادر سے اس کا تذکرہ کیا تو اُن کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی اور کہاں برھمی سے فرمانے لگے "میں ایسی بیہودہ باتوں میں نہیں پڑتا" چنانچہ حسن صاحب کو پھر نہ کچھ کہنے کی جرأت ہوئی اور نہ وہ شرمناک ناول لکھا گیا—

غرض میں نے اپنے تجربہ سے ان کو ہر موقع پر راست باز اور نہایت ہی شریف النفس پایا اور اس اصول پر وہ ایسی استقامت کے ساتھ قائم ہیں کہ دولت۔حکومت۔عزت اور کسی چیز کا لالچ یا شوق ان کے قدم کو لغزش نہیں دے سکتا۔کذب و دروغ میں نہیں وہ ہر قسم کی بد اخلاقیوں اور بد وصفیوں سے سخت متنفر ہیں اور جن لوگوں میں ایسی خرابیاں سنیں اپنی صحبت کو ان سے بچایا—

غور سے دیکھئے تو اُن کی زندگی اعلیٰ درجے کے حکیموں اور فلسفیوں کی ہے۔ہر نیک نفس اور خوش اطوار شخص چاہے کتنا ہی غیر ہو اُن کا عزیز قریب اور دوست ہے اور ہر بد کار و بد نفس آدمی چاہے اُن کا کتنا ہی قریب کا عزیز ہو غیر ہے۔یہ وہ اُصول ہے جس کو اگر ان کی زندگی کا ماٹو کہا جائے تو غلط نہیں ہو سکتا—

اپنے چھوٹے بھائی مولوی سید علی مرحوم کو اُنھوں نے بیٹوں کی طرح پالا۔سکھایا پڑھایا اور علم و فضل میں سرآمد روزگار بنا دیا مگر چونکہ اُنھوں نے بعض سیاسی پارٹیوں میں شریک ہوکر سازش اور انٹریگ کو گوارا کر لیا تھا لہذا اُن سے ملنا چھوڑ دیا۔اور اُن کی نظر میں وہ غیروں سے

بھی بدتر تھے۔ میرے سامنے کا ذکر ہے کہ ایک بار مولوی سیدعلی مرحوم سخت بیمار ہوے مگر نواب عمادالملک بہادر باوجودیکہ میں نے اور اُن کے کئی احباب نے بار بار اصرار کیا ان کی عیادت کو نہ جانا تھا نہ گئے۔

مذھباً نواب عمادالملک بہادر ایک آزاد خیال مسلمان ھیں۔ دینی احکام و عقائد کو تقلیداً نہیں بلکہ فلسفیانہ توجیہ و استدلال کے ساتھ مانتے ھیں۔ اور گوکہ عبادات میں پابند دین نہیں نظر آتے مگر اعتقاداً اسلام کو سچا اور برگزیدہ دین مانتے ھیں۔ اُنھیں سب سے زیادہ وثوق مسئلہ وحدت وجود پر ھے میں نے ایک بار اُن سے اس مسئلے میں بحث کی تو فرمایا "اور کسی حیثیت سے میں خدا کو مان ھی نہیں سکتا"۔

مگر یہ اعتقادات و خیالات فقط اُن کے دل ودماغ تک محدود ھیں۔ اس کو بالکل پسند نہیں کرتے کہ مختلف فیہ مسائل میں کسی سے بحث کریں یا اعتقاد کے اختلاف کی بنا پر کسی سے نفرت یا مخالفت کریں۔ ان کے اعتقادی مسائل کا کوئی اثر باھمی تعلقات پر نہیں پڑتا۔ اُن کی بے توجہی کی یہ شان ھے کہ اگرچہ راسخ العقیدہ مسلمان ھیں مگر انگریزوں اور مسیحوں کی بہت سی اخلاقی باتوں کو پسند کرتے ھیں۔ بلکہ اُن کو اخلاقاً سب سے زیادہ شائستہ مانتے ھیں۔ ھندوں پر نہایت مہربان ھیں۔ اور اُن کے قدیم روحانی فلسفہ کا بہت زیادہ احترام کرتے ھیں۔

اگرچہ شیعہ ھیں مگر سنی علما اور حنفی فضلا کا ویسا ھی ادب و احترام کرتے ھیں جیسا شیعہ مجتہدین کا۔ مولوی شبلی نعمانی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ "میں نے الفاروق کو شایع کیا تو اس کا ایک نسخہ نواب عمادالملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور خواھش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات ظاھر فرمائیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ گزشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ھوا جس کا نام عمر بن الخطاب ھے لہذا اُن کی لائف

لکھنا اسلام کی خدمت تھی جس کو آپ نے ادا کیا ، مگر خود مجھ سے اُن سے جب گفتگو ہوتی تو میں نے اُن کا یہ خیال پایا کہ حضرت عمر میں سختی اور درشتی زیادہ تھی - اور اگرچہ میں نے اُن کو وہ درشتی خلیفہ ہونے کے بعد نرمی سے بدل گئی تھی مگر اس کو انھوں نے نہیں مانا —

حیدر آباد کے مدرسہ دارالعلوم کی اعلیٰ مدرسی و مہتممی کی جگہ خالی ہوئی تو اُس پر نواب عمادالملک نے مولوی محمد الٰہی بخش صاحب کو مقرر کیا معین المہام تعلیمات نواب فخرالملک بہادر نے اس سے اختلاف کر کے ایک شیعہ عالم کو اس جگہ کے لیے نامزد کیے - اور مدارالمہام بہادر نے بھی اس سے اتفاق کر لیا - جب یہ حکم تعمیل کے لیے عمادالملک بہادر کے پاس آیا تو انھوں نے اس سے سختی کے ساتھ اختلاف کیے - اور کہا کہ یہ مدرسہ مدت سے خاص اہل سنت کے زیر انتظام و تعلیم چلا آتا ہے جس میں اہل سنت کے دینیات کی تعلیم ہوتی ہے لہذا اس خدمت پر کسی شیعہ کا تقرر نہیں ہوسکتا - نواب فخرالملک بہادر نے پھر اپنی رائے پر اصرار کیا اور تحریر فرمایا کہ اس بے تعصبی کے عہد میں ایسی تفریق نہ ہونی چاہئیے - مگر نواب مدارالمہام پر وقارالامرا بہادر نے اپنی پہلی رائے بدل کے عمادالملک بہادر کی رائے سے اتفاق کر لیا - اور مولوی الٰہی بخش صاحب مقرر ہو گئے —

یہی بے تعصبی اُن سے ہمیشہ ظاہر ہوتی رہی - اور سب جانتے ہیں کہ محکمہ تعلیمات دولت آصفیہ ایک مدت دراز تک اُن کے ہاتھ میں رہا - لیکن کبھی کسی شخص کو محسوس بھی نہ ہوسکا کہ ناظم تعلیمات ایک شیعہ شخص ہے - اُنھوں نے ہمیشہ غیر جانب داری سے کام لیا - اور وطنی و غیر وطنی سنیوں کو ویسا ہی خوش اور مطمئن رکھا جیسا کہ شیعوں کو —

الغرض نواب عمادالملک بہادر کی ذات غیر معمولی صفات سے آراستہ اور خدا کی ایک بے‌نظیر نعمت و برکت تھے اور وہ رعایائے نظام و ہندوستان کے عام

لوگوں کے ہر گروہ اور ہر طبقے میں ہر دلعزیز اور واجب الاحترام ہیں—

لہذا مسلمان بلکہ تمام اہل ہند اگر اُن کی درازی عمر پر خوشیاں منائیں اور ایک دوسرے کو مبارک باد دیں تو نہایت ہی مناسب بلکہ اپنے ایک ضروری فرض کا بجالانا ہے —

عرب کی شاعری

از

(جناب مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

تمہـــــــــید

ایک مشہور مقولہ ہے کہ "الشعر دیوان العرب" یعنی عرب کی شاعری عرب کا دفتر ہے۔ دفتر کے لفظ سے یہ مراد ہے کہ اُس میں عرب کا جغرافیہ۔ عرب کی تاریخ۔ عرب کا تمدن۔ عرب کا طریقۂ معاشرت۔ عرب کے خیالات و توہمات۔ عرب کی ملکی اور قومی خصوصیات سب کچھہ ہے۔ اگر کوئی شخص عرب کی شاعری کا مطالعہ کرے تو کوئی بات عرب اور اہل عرب کے متعلق ایسی نہیں ہے جو اس میں نہ مل سکے۔ میں عرب کی شاعری کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھہ ہی یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ادائے خیالات کے کیا طریقے عربی شاعری میں تھے —

میں نے اس غرض کے لئے ایام جاہلیت کی شاعری پر نظر ڈالی ہے۔ ظہور اسلام کے بعد اوایل بنی اُمیہ کی شاعری کو بھی شامل کر لیا ہے۔ ایام جاہلیت کی شاعری کا خالص عربی رنگ ہے اور وہ فی الواقع عرب کے تمام حالات و خیالات کا آئینہ ہے۔ اوایل عہد بنی اُمیہ تک بھی کچھہ اصلی خصایص عربی شاعری کے باقی رہے۔ مگر دولت عباسیہ کے زمانے میں اُس پر عجمیت غالب آگئی اور شاعری کا خالص عربی رنگ نہیں رہا۔ اگرچہ اس زمانے کی شاعری اُس زمانے کے عربوں کے انقلاب حالت کی تصویر ہے۔ مگر میں نے اُس کو اپنے موضوع

سے خارج کر دیا ہے-میں یہ سب کچھ اپنی محبوب زبان اُردو میں لکھنا چاہتا ہوں-اصل عربی اشعار اس مضمون میں نہیں لکھوں گا-اس کی دو وجہیں ہیں—

ایک تو یہ کہ بیچ بیچ میں غیر زبان کے اقتباسات لانے سے مضمون کی روانی میں فرق آ جاتا ہے اور پڑھنے والے اس کو دلچسپی کے ساتھ نہیں پڑھتے—

دوسرے یہ کہ اہل یورپ کی طرح میری دلی خواہش یہ ہے کہ غیر زبانوں کے ادبیات کے متعلق جو کچھ لکھا جائے وہ اپنی ہی مادری زبان میں ہو-تاکہ ہمارا ادب وسیع ہو اور ترقی حاصل کرے-اگر غیر زبانوں کے حاصل کرنے والے اُن کے تمام ادبی ذخیروں کو ہماری زبان کے ادب میں بھر دیں تو گھر بیٹھے ہم دنیا کے اعلیٰ اور لطیف خیالات پر عبور حاصل کر سکیں گے-دنیا کی ہر قدیم و جدید زبان کے اعلیٰ شاعروں اور ادیبوں کے شہپارے اُردو زبان میں بھر دینے چاہئیں-تا کہ زمانۂ حال کے انشا پردازوں اور شاعروں کو مدد ملے اور ایک محدود دایرہ سے نکل کر آگے بڑھنے کے رستے اُن کو نظر آنے لگیں-اگر ایسا نہ کیا جائے تو نہ ہمارا ادب کبھی ترقی کرے گا اور نہ اُس میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو گی—

ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے ایسے مضامین تحریر کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے-اگر ہمارے نوجوان انشا پرداز اور شاعر جو غیر زبانوں کے ادب سے نا بلد ہیں یہ معلوم کریں گے کہ ہر ملک کا ادب اُس ملک کی قومی اور ملکی خصوصیات کا آئینہ ہے-پھر اپنی شاعری اور انشا پردازی پر نظر ڈالیں گے تو اُن کو صاف دکھائی دے گا کہ اِس میں اِس ملک کی خصوصیات کا کوئی پتہ نہیں ہے-ہماری ساری شاعری اور ساری انشا پردازی بیرونی ادب کی نقالی ہے اور اس میں ہر چیز باہر سے لائی گئی ہے-کیا یہ

شرم و غیرت کا مقام نہیں ہے؟ کیا اس نقص کے معلوم ہونے کے بعد ہم کو اپنے ادب کی اس کھلی کمزوری کی تلافی نہیں کرنی چاہئیے؟ کیا زمانۂ سابق کی طرح آئندہ بھی ہم کو صرف بیرونی ادب کی نقالی پر قناعت کرنا لازم ہے؟ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنی زبان کے ادب میں انقلاب پیدا کریں اور اس کو ایک ملکی ادب بنانے کی کوشش میں سرگرم نہ ہوں؟ اگر یہ ضرورت مسلم ہے تو پھر ایسے مضامین ہی اہل فکر و بصیرت کے لئے تحریک و ترغیب کا باعث ہوں گے —

شاعری کے موضوع

عرب کی شاعری کے اہم موضوع حسب ذیل ہیں۔—

۱- بہادری کے جذبات

۲- اخلاقی جذبات

۳- عاشقانہ جذبات

۴- مدح و ذم

۵- غم کے جذبات

اِن میں سے ہر موضوع پر جو کچھ عرب شعرا نے کہا ہے وہ اُن کے دلی خیالات اور اصلی حالات کا آئینہ ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہی کر دکھاتے ہیں۔ اُن کی شاعری اصلی اور حقیقی شاعری ہے۔ اپنے عیب و صواب سب کھول کر رکھ دئیے ہیں۔ کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھی۔ اُن کی زبان اُن کی دلی واردات کی ترجمان ہے۔ اُن کی شیخیاں جھوٹی شیخیاں نہیں ہیں۔ اُن کے کارنامے اُن کی نیتوں کے گواہ ہیں۔ وہ اگر کسی کی مدح کرتے ہیں تو صرف اُس کی جس کے قول اور فعل میں مطابقت ہے اور جس کی ذات میں فی الواقع وہ خوبیاں موجود ہیں جن کا ذکر مدح میں کیا گیا ہے۔ اگر کسی کے مرنے پر آنسو بہاتے اور اُس کے اوصاف بیان کرتے ہیں تو وہ درحقیقت

ایسا ھی شخص ھوتا ھے جس کا وجود خیر و برکت کا باعث تھا-جھوٹی مدح وہ کبھی نہیں کرتے-جھوٹے آنسو وہ کبھی نہیں بہاتے-اُن کی زباں اور اُن کے دل دونوں ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ھیں —

یہاں مثال کے طور پر چند نمونے عربی شاعری کے پیش کئے جاتے ھیں جن سے ناظرین کو اندازہ ھو گا کہ اُن میں کس قدر سچائی اور اصلیت کی جھلک ھے اور اھل عرب کی بیرونی اور اندرونی کیفیات کا صحیح نقشہ اُن میں کس طرح کھینچ کر رکھا گیا ھے —

فخریہ اشعار

اے ھیضم کے دونوں بیٹو! کیا تم نے عزم و ھمت کے وقت میری تدبیر کو سست پایا؟ میں نے دنیا کے بہت سے واقعات کا امتحان کیا ھے اور واقعات نے میرا امتحان کیا ھے-گویا کہ میں گزری ھوئی قوموں کا آدمی ھوں-ھم ایسی ماں کے بیٹے نہیں ھیں جس کی چھاتیاں چھوٹی ھوں اور اُن کا دودھ منقطع ھو گیا ھو اور وہ صرف ایک ھی دفعہ جنی ھو-ھم ایسی صاحب نصیب عورت کی اولاد ھیں جس نے حوض ولادت سے مکرر پانی پیا ھے اور جس نے مکرر اولاد پیدا کی ھے-زمین کا انڈا شق ھوا اور ھم اُس میں سے نکل پڑے-اب ھم زمین کے سخت حصے اور ریگستانی حصے کے فرزند ھیں-ھمارے قبضے میں اجاء اور سلمی کے پہاڑی قلعے ھیں اور دونوں قلعوں کی مشرقی زمین بھی ھمارے پاس ھے-قلعۂ تیماء کے مالک بھی ھمیں ھیں-جو قوم عاد کے زمانے سے ھمارے قبضے میں ھے اور ھم نے اپنے برچھوں کے زور سے اُس کو بچایا ھے (قبیصہ بن جابر) —

ھم ھنشل کے پوتے ھیں اور اس پر فخر کرتے ھیں اور ھمارا دادا ھم پر فخرکرتا ھے-عزت اور برتری کی کسی حد تک گھوڑے دوڑائے جائیں-

ـب سے آگے بڑھنے والے جب پاؤ گے بنی ہیشل ہی کے گھوڑے پاؤ گے۔ہم میں سے کوئی سردار جب تک کہ کوئی لڑکا اپنا جانشین بننے کے لایق نہیں چھوڑ تا دنیا سے نہیں اُٹھتا۔لڑائی کے دن ہم اپنی جانیں سستی کر دیتے ہیں۔مگر امن کے زمانے میں اگر اُن کی قیمت پوچھئے تو وہ انمول ہیں۔ہماری مانگوں کو بن خوشبوؤں کے استعمال سے سفید ہیں۔ہماری دیگیں مہمانوں کے لئے گرم ہیں۔ہمارا مال ہمارے مقتولوں کے خونبہا کے لئے وقف ہے۔میں اُس قوم میں سے ہوں جس کے بزرگوں نے دشمنوں کے اتنے کہنے پر کہ ''کہاں ہیں روم کے حمایتی'' اپنے کو نیست و نابود کر دیا تھا۔اگر ہزار میں ہمارا ایک موجود ہو تو بھی جب یہ کہا جائے گا کہ ''کون ہے شہسوار'' تو اُس کی اپنے ہی پر نگاہ پڑے گی —

(بشامہ بن حزن)

اگر انسان کی عزت پر بخل کا داغ نہ ہو تو پھر وہ جو لباس پہنے اس کے بدن پر کھلتا اور زیب دیتا ہے۔اگر انسان اپنے تئیں بخل کے جذبات سے نہ روکے تو پھر مدح و ستائش کا رستہ اُسے نہیں ملتا۔وہ عورت ہم پر الزام لگاتی ہے کہ ہماری تعداد تھوڑی ہے۔میں نے جواب دیا کہ شریف انسان دنیا میں تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔وہ قوم کم نہیں سمجھی جائیگی جس کی یادگار ہم جیسے بلند مرتبہ نوجوان اور ادھیڑ عمر کے ہوں۔تعداد کی کمی ہمیں کیا نقصان پہنچا سکتی ہے۔جب کہ ہمارے ہمسایے طاقتور ہیں۔حالانکہ اوروں کے ہمسایے ذلیل ہوتے ہیں ہم ایک ایسے بلند پہاڑ کے مالک ہیں جس کی طرف اگر نظر اُٹھائی جائے تو وہ تھک کر واپس آجاتی ہے۔ہم جس کو چاہیں اس پر پناہ لینے کی اجازت دیتے ہیں۔اس پہاڑ کی جڑ تحت الثریٰ میں ہے اور اس کی چوٹی لمبی اور اس قدر بلند ہے کہ وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ہم وہ قوم ہیں کہ جنگ میں مارے جانے کو عیب نہیں جانتے۔حالانکہ بنی عامر اور بنی سلول ایسا ہی جانتے ہیں۔

هم موت کو پسند کرتے هیں-اس لئے هماری عمریں کوتاہ هیں-مگر وہ موت سے بھاگتے هیں اس لئے اُن کی زندگی اکثر دراز هوتی هے-همارا کوئی سردار بچھونے پر پڑکر نهیں مرا-هماری قوم کا کوئی ایسا مقتول نهیں هے جس کا انتقام یا خون بہا نہ لیا گیا هو-همارے خون بس تلواروں کی دهاروں هی پر بہتے هیں-هم نسل میں خالص اور غیر مکدر هیں-ماؤں اور باپوں نے همارے نسب کو خالص اور محفوظ رکھا هے-هم لطافت اور صفائی میں آب باران کے مانند هیں-نہ هم میں کوئی بخیل هے، نہ کند ذهن-اگر چاهیں تو اوروں کی بات کہیں تو پھر کسی کو انکار کی مجال نهیں هوتی-اگر همارا کوئی سردار مرتا هے تو اس کا جانشیں ایک ایسا هی سردار هوتا هے جس کا دل اور زبان شریفوں کی طرح ایک هو-رات کے آنے والے مہمانوں کے لئے هماری آگ کبھی نهیں بجھی اور نہ کسی مہمان نے کبھی هماری شکایت کی-دشمنوں کے ساتھ جو معرکے همیں پیش آئے وہ نہایت درخشاں اور نمایاں هیں-هماری تلواریں مغرب و مشرق میں مشہور هیں اور زرہ پوشوں پر بار بار پڑنے سے اُن میں دندانے پڑگئے هیں-هماری تلواروں کی عادت هے کہ جب تک ایک جماعت کا ستھراؤ نہ هو لے اور وہ اچھی طرح لہو نہ چاٹ لیں میانوں میں نهیں جاتیں-اگر تمهیں همارا حال معلوم نہ هو تو دنیا کے لوگوں سے پوچھ لو-اس لئے کہ نبی دیان اپنی قوم کے لئے بمنزلہ قطب کے هیں اور قوم کے سارے معاملات کی چکیاں اسی قطب کے گرد گھومتی اور چلتی رهتی هیں—

(سموءل بن عادیا)

شجاعت اور بزدلی کی تصویریں

اگر میں بنی مازن میں سے هوتا تو مجال نہ تھی کہ میرے اونٹ آل ذهل کے غارت گر لوٹ کر لے جاتے-اگر میں بنی مازن میں سے هوتا تو میری حمایت پر ایک ایسی قوم کمر بستہ هوتی جو غیرت اور غصہ کے وقت سخت هے گو کہ

بزدل آدمی اُس وقت نرم اور سست پڑ جاتے ھیں۔ بنی مازن وہ قوم ھے کہ جب لڑائی درندہ کی طرح اپنی ڈاڑھیں یا کُچلیاں نکال کر ڈراتی ھے تو یہ اکیلے اور اکٹھے اُس پر ٹوٹ پڑتے ھیں۔ وہ طالب حمایت سے کوئی دلیل نہیں پوچھتے اور فوراً اُس کی حمایت کے لئے دوڑ پڑتے ھیں۔ مگر میری قوم باوجود کثرت کے اس قابل نہیں ھے کہ تھوڑی سی مصیبت میں بھی لڑنے پر کمر بستہ ھو۔ اگر کوئی ظالم اُن پر ظلم کرے تو وہ بزدلی کے سبب اُس کو معاف کر دیتے ھیں۔ اور اگر کوئی اُن کے ساتھہ بدی سے پیش آئے تو وہ نیکی کرنے پر تلے رھتے ھیں۔ گویا خدا نے اُن کے سوا کوئی ایسی قوم دنیا میں پیدا نہیں کی جس کے دل میں خوف خدا ھو۔ کاش مجھے اس قوم کے بدلے کوئی اور ایسی قوم مل جائے کہ جب وہ گھوڑوں یا اونٹوں پر سوار ھو تو خوب غارت گری کرے۔۔

(قریط بن اُنیف)

ایک سو نو برس کے بڑھے عرب کے جذبات

اگر میں بہت بوڑھا ھوگیا ھوں تو کیا مضایقہ ھے۔ میں مدت تک جوان رہ چکا ھوں۔ میری پیدائش کے دن سے ایک سو نو برس گذر چکے ھیں جن کو میں نے لباس کی طرح اُتار پھینکا ھے۔ میں سواروں کے بہت سے رسالے مرتب کر چکا ھوں جو اوون کی ٹکڑیوں کی طرح ایک جگہ آکر جمع ھوتے تھے۔ وہ ایک ایسی گھٹا تھی جس میں موت بجلی کی طرح چمکتی تھی۔ میں نے ان سواروں کے ساتھہ لوٹ مار کی ھے اور بہت سے مزے اُڑائے ھیں۔ مگر دنیا کے تمام مزے چند روزہ ھیں۔ میں نے جنگ بھیما کے دن بہت سی عورتیں کو دیکھا جو مارے خوف کے مونھہ کے بل گری پڑتی تھیں۔ انھیں میں سے ایک عورت خوف کے سبب پیاسی دکھائی دی۔ اُس کا گلا گھٹا جاتا تھا۔ وہ بول نہیں سکتی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے متواتر آنسو بہ رھے تھے۔ جب میں نے اُس کے شوھر کو قتل کر دیا تو کھنے لگی کہ اے مجمع تو ھلاک ھو جیسا کہ تو نے مجھے ھلاک کیا ھے۔ میں نے کہا۔ میں نہیں۔

بلکہ اے اُم سجاشع! تو اور تیری قوم ہلاک ہوئی ہے-میں نے اس عورت کے شوہر کو ایک ایسے لمبے اور چمکدار نیزہ سے قتل کیا تھا کہ جب وہ ہلایا جاتا ہے تو اُس سے آگ کے شعلے لپکتے ہیں-اس کے سوا اور بہت سی عزت دار عورتیں تھیں جن کو میں نے ایسے حال میں چھوڑا کہ اُن کے مونھہ پر خراش تھی- وہ غمگیں تھیں اور زار زار روتی تھیں—

(سجمع بن ہلال)

فوج کشی کا سماں

ہم جب لڑائی پر کمر بستہ ہوتے ہیں تو ایسی فوج ساتھہ لیکر چلتے ہیں جس کے اطراف میں ابلق گھوڑے غایب ہوجائیں-جس کا پچھلا حصہ مدینہ میں اور اگلا حصہ دمشق میں ہوتا ہے-جب ہم مشرق اور مغرب کے درمیان چلتے ہیں تو جاگتی اور سوتی زمین لرزنے لگتی ہے-یعنی وہ زمین جس پر لوگ چلتے ہیں اور وہ زمیں جس پر لوگ نہیں چلتے ہیں یکساں طور سے زلزلہ میں آجاتی ہے—

(ابان بن عبدہ)

نشے کی ترنگ

میں نے چھوٹے اور بڑے پیالوں میں شراب ڈالکر پی ہے-جب میں نشے میں ہوتا ہوں تو اپنے تئیں بادشاہ نعمان کے شاندار محلات خورنق اور سدیر کا مالک سمجھتا ہوں-مگر جب ہوش میں آتا ہوں تو پھر وہی بکریوں اور اونٹوں والا ہوتا ہوں جو پہلے تھا—

(منخل بن حارث لشکری)

غم کے جذبات

قیس کا مرنا ایک شخص کا مرنا نہیں ہے-بلکہ وہ ایک قوم کی بنیاد تھا-جو گر گئی اور اس سبب سے وہ قوم بھی گر گئی—

(عبدہ بن طبیب)

میرے ایک دوست نے قبروں کے پاس رونے سے مجھکو ملامت کی اور کہا کیا تو ہر قبر کو دیکھکر روئے گا۔حالانکہ تو جس قبر کے خیال میں ہے وہ لوی اور دکادک کے درمیان واقع ہے۔میں نے کہا۔ایک غم دوسرے کو اُکساتا ہے۔ میرے حال پر چھوڑدے۔میرے نزدیک تو یہ سب قبریں میرے بھائی مالک ہی کی ہیں —

(متمم بن نویرہ)

وہ لوگ جو اُس کو قبر کی طرف لے گئے نہیں جانتے کہ انھوں نے کس چیز کو بے پروائی سے کفن میں لپیٹ دیا ہے —

(محمد بن بشیر خارجی)

میں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں پر اس کی فیاضی کا کس قدر احسان ہے۔ یہاں تک کہ اس کو پتھروں کی سلوں نے اپنے اندر چھپا لیا۔وہ مرکر زمین کی ایک تنگ جگہ میں سما گیا۔حالانکہ جب وہ زندہ تھا تو (فوج کی کثرت کے سبب) بڑے بڑے میدانوں میں بھی نہیں سما تا تھا۔اب میں تیرے مرجانے کے بعد کسی بڑی سے بڑی مصیبت سے بھی گھبرانے والا نہیں ہوں —

(اشجع سلمی)

اے معن کی قبر! تو نے اُس کی فیاضی کو اپنے اندر کیونکر چھپا لیا۔حالانکہ جب وہ زندہ تھا تو اس کی فیاضی سے زمین کی خشکی اور تری سب بھر گئی تھی۔ہاں بے شک فیاضی خود مرگئی ہے۔اس لئے وہ تیرے اندر سما سکی اور اگر وہ زندہ ہوتی تو اس کے سبب تو پھٹ جاتی۔وہ ایسا جواں مرد تھا کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اُس کی فیاضی سے زندہ ہیں۔جس طرح سیل کے گذرنے کے بعد زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔سچ یہ ہے کہ معن کے مرنے سے سخاوت بھی مرگئی اور اُس کا خاتمہ ہو گیا اور انسانی کمالات اور خوبیوں کی ناک کٹ گئی —

(حسین بن مطہر اسدی)

مرحوم کے احسانات نے مرحوم کو دوبارا زندہ کردیا ہے جب وہ احسان زندہ ہیں تو گویا وہ خود دوبارہ زندہ ہوگیا ہے۔ تہر کی زمین کا طول چار گز ہے اور عرض پانچ بالشت پھر تعجب ہے کہ اس میں ایک بلند پہاڑ کیونکر سما گیا —

(عبداللہ ابن ایوب)

اے میری نادان گھروالی! تو اس اونٹ کے جاتے رہنے پر کیوں غم کرتی اور روتی ہے جس کو بیچ کر میں نے شراب پی لی ہے؟ خدا کرے تیرے آنسو کبھی نہ تھمیں آخر زیدالفوارس اور زیداللات پر کیوں نہیں روتی اور بنی نضر کے دو گزرے ہوے نامور اشخاص کی موت پر کیوں آنسو نہیں بہتی؟ اُن نامور اور فیاض لوگوں نے مرکر زمانے کو مجھہ پر چھوڑ دیاہے اور میں اب زمانے کے حملوں کا نشانہ بنا ہوا ہوں —

(خراز بن عمرو)

سچی تعریف کا جذبہ

ہشام بن عبدالملک ایک بار حج کے لئے گیا۔ اُس نے سنگ اسود کو بوسہ دینے کے لئے بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھنا چاہا مگر ممکن نہ ہوا۔ اس اثنا میں امام زین العابدین تشریف لاے اُن کے آتے ہی بھیڑ چھٹ گئی اور وہ آسانی سے سنگ اسود تک پہنچ گئے۔ ہشام نے جان بوجھکر سرداران شام سے جو اُس کے ساتھہ تھے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اُس وقت فرزدق شاعر موجود تھا۔ اُس نے چند مدحیہ اشعار امام کی شان میں پڑھے اور ہشام کو بتایا کہ وہ کون ہیں۔ اشعار کا مضمون حسب ذیل تھا —

یہ وہ ہے جس کے قدموں کے نشان کو بطحا کی زمین پہچانتی ہے۔ کعبہ پہچانتا ہے اور حل و حرم بھی پہچانتے ہیں۔ یہ اُس شخص کا فرزند ہے جو خدا کے بندوں میں سب سے بہتر اور برتر تھا۔ یہ نامور شخص پاک و صاف اور متقی اور پرہیزگار ہے۔ جب قریش اُس کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ

بزرگی اور شرافت کا خاتمہ اسی شخص کی ذات پر ہے۔جب وہ سنگ اسود کو بوسہ دینے کے لئے بڑھا تو قریب تھا کہ وہ اُس کے ہاتھ کو پہچاننے کے سبب اُس کو روک لے اور اُس سے برکت حاصل کرے۔قبایل عرب میں سے کون قبیلہ ہے جس کی گردن پر اس شخص کے بزرگوں کے احسانات نہ ہوں۔اُس کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے جس کی خوشبو ہر طرف پھیل رہی ہے۔کیونکہ وہ ایک ایسے شخص کے پاس ہے جو حسین و جمیل بھی ہے اور بلند مرتبہ بھی۔وہ شرم و حیا کے سبب آنکھیں جھکائے رہتا ہے اور لوگ اُس کے رعب سے آنکھیں نیچی رکھتے ہیں۔کسی کی مجال اُس سے بات کرنے کی نہیں ہوتی مگر جب کہ حسن اتفاق سے وہ مسکرائے۔اُس نے کلمۂ شہادت کے سوا کبھی لا (نہیں) نہیں کہا۔اگر کلمۂ شہادت نہ ہوتا تو اُس کا لا (نہیں) نعم ہاں) سے بدل جاتا—

(فرزدق)

مختلف مدحیہ اشعار

وہ میدان جنگ میں ایسے اطمینان سے چلتے ہیں جیسے تیز زور کی بارش میں حرارت مزاج کے سبب چلتے ہیں—

جب بنی قیس اور اُن کے ساتھی بنی ذہل دریاے ذخار کی طرح جوش میں آجاتے ہیں تو مثل بڑے دریاؤں کے ہوتے ہیں۔جن میں اور بڑے دریا آملیں—

لطیف اخلاق روحیں ہیں اور آل مہلب اُن روحوں کے لئے اجسام ہیں—

تو اُن کی عزت دوسروں کو نہیں دے سکتا جب تک کہ کوہ یسوم کو معہ اُس کی پہاڑیوں کے اُس کی جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ نہ رکھ دے (یعنی یہ بات نا ممکن ہے)—

وہ اپنے آرادوں کے پورا کرنے میں اور قد کی درازی اور گردنوں کی لمبائی میں تلواروں سے تشبیہ دے جاتے ہیں—

زیاد کے دونوں بیٹے دو سیدھے گندم کوں خطی نیزے تھے۔زمیں اُن کے چلنے سے نیچے کو دبی جاتی تھی۔اے مخالف! تو ایسے ہی لوگوں کے بھروسے پر کسی قوم سے لڑ سکتا یا صلح کر سکتا ہے—

وہ شخص تلوار کے مانند ہے کہ اگر تو اُس کو نرمی سے چھوے تو نرم معلوم ہوتی ہے اور اگر اُس کو سختی سے چھوے تو پھر اُس کی دونوں دھاریں تیز ہیں—

لوگ اُس کے سامنے ایسے خاموش بیٹھتے تھے کہ گویا اُن کے سروں پر پرندے ہیں کہ اگر ذرا سر ہلائیں تو پھر سے اُڑ جائیں (رعب کی تصویر ہے)—

هجویه اشعار

تم ایسے ابر ہو جس میں خوفناک گرج ہے۔جس کے ساتھ تند ہوا ہے جو سنگ ریزے اُڑاتی اور خیموں کی رسیاں کاٹ دیتی ہے۔مگر وہ برستا کبھی نہیں—

تمہاری اونٹنیاں موٹی ہیں یعنی تم بخیل اور نامرد ہو نہ مہمانوں کے لیے اُن کو ذبح کرتے ہو اور نہ اُن پر سوار ہو کر میدان جنگ کو جاتے ہو—

وہ جب کھانا کھاتے ہیں تو آہستہ بولتے ہیں (تا کہ کوئی مسکین آواز نہ سنے) اور اپنے گھر کے بند دروازے سے عہد لے لیتے ہیں کہ جب تک ہم کھانا کھائیں کسی کے کھولنے سے مت کھلیو—

اگر میں تمہارے دروازے پر شراب لے آتا تو تمہارا کتا صاحب خانہ خیال کرتا اور نہ بھونکتا (یعنی تم شرابی ہو اور تمہارا کتا اُس کی بو سے مانوس ہے) مگر میں جب تمہارے پاس آیا تو مشک اور عود کی خوشبو میرے کپڑوں میں بسی ہوئی تھی (اسی لئے تمہارا کتا بھونکتا ہوا اور اُس نے اِس بو کو اجنبی سمجھا—

وہ گفتگو کی قدرت نہ ہونے کے سبب اپنے تالو کو زبان سے چاٹنے لگتا

راس کے دل کا ابر کبھی نہیں کھلتا (یعنے ہمیشہ شک و تردد کی حالت میں رہتا ہے) —

عاشقانہ جذبات

اے خدا کے بندو! کیا سچ مچ جب تک کہ ہمارے دن اپنی دمیں ہلاتے ہینگے میں بریدہ سے نہ مل سکوں گا —

جب اُس محبوب کی اونٹنی صبح کو روانہ ہوگئی تو میں نے اپنی اونٹنی راس کے پیچھے ہنکایا حالانکہ اُس کے پاؤں بندھے ہوئے تھے (یہ بیخودی کا عالم ہے)

نازنینوں کے شوق سے ہمارے دل اس طرح اہتزاز حاصل کرتے ہیں جیسے کھجوری کے پھول شبنم سے —

زمانے کی گردش نے اگر مجھے اُم عمرو پر کبھی قدرت دی تو پھر میں زمانے کا قصور معاف نہ کروں گا —

جب ہمارے قافلے کے اونٹ ہمیں شام کی طرف لے جارہے تھے تو یکا یک آدھی رات کے وقت تیرا خیال آیا اور میں شام کی طرف ایک قدم نہ چل سکا میں نے تیرے خیال کو لبیک کہا اور حدی خوانوں سے کہا کہ اونٹوں کو حجاز کی طرف واپس چلاؤ - اب شام کی طرف کوچ کرنے کی حاجت نہیں —

تاریک رات کی سردی میں جب کوہ جودی کے پہلوؤں پر بادل سے کچھ پانی برسا ہو اور شمال کی ہوا نے اس کو یخ کردیا ہو تو وہ پانی میری محبوبہ کے آب دہن سے اچھا نہیں ہو سکتا - اگرچہ میں نے اس کا مزا نہیں چکھا - مگر جس چیز کو میری آنکھ دیکھتی ہے میں اُس خوب پہچانتا ہوں —

اے نجد کی ہوا! تو کب چلی - تیرے جھوکوں نے مجھ پر عشق کی تہیں بڑھا دیں - جب چاشت کے وقت درخت اند کی تر و تازہ شاخ پر ایک کبوتری بولی تو اُس کی آواز سن کر میں بچوں کی طرح رونے لگا اور وہ بھید جو

میرے دل میں مدت سے چھپا ہوا تھا یکایک فاش ہو گیا—

تو نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ایسے نرم و شیریں کلام سے جو وحشی بکریوں کو بھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے میدانوں میں اُتار لائے۔یعنی وحشیوں کو رام کر لے مجھ پر قبضہ کر لیا۔پھر تو مجھ سے دور بھاگ گئی اور تو نے میری پسلیوں میں آگ لگا دی—

اے محبوبہ! تو بان کے سبز درخت سے پوچھ جو ریت کے ایک ٹیلے پر کھڑا ہے۔کیا میں نے تیری قیام گاہ کے کھنڈروں کو سلام نہیں کیا؟ کیا میں اُن کھنڈروں کے پاس شام کو دیر تک غمگین کھڑا نہیں رہا؟ کیا میری آنکھوں نے وہاں صبح کے وقت اس طرح آنسو نہیں بہائے کہ گویا موتیوں کی ایک لڑی ٹوٹ گئی ہے اور اُس کے موتی لگاتار گر رہے ہیں؟ لوگ موسم بہار کی آرزو کرتے ہیں مگر میرے لئے موسم بہار تیرا وصال ہے۔میں دنیا کو دیکھتا ہوں کہ وہ قحط کے نام سے کانپتی ہے مگر میرے لئے قحط تیرا کوچ کر جانا اور جدائی اختیار کرنا ہے—

جس رات میں نے سنا کہ لیلیٰ صبح یا شام روانہ ہو گی تو میرا دل اُس لوے کی طرح جو صیاد کے پھندے میں پھنس گیا ہو اور پھندے سے گردن چھڑانے کے لئے پھڑکتا ہو بے اختیار پھڑکنے لگا—

اے محبوبہ! تو میرے ہر سونے میں آخر شے ہے اور ہر جاگنے میں اول شے ہے—

اگر جنگل کے بھیڑیے میری محبوبہ کے ہم نسب ہوتے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اُن سے بھی محبت کرتا—

اے لیلیٰ کے کُنبے کے لوگو! خدا تم میں لیلیٰ جیسے بہت سے معشوق پیدا کرے تا کہ تم میری لیلیٰ مجھے دے ڈالو اور اُس کے دینے میں بخل نہ کرو—

میری معشوقہ یا تو پری ہے یا اُس کے ساتھ کوئی جن ہے جو بے چلہ

کہاں سے ڈالوں پر تیر چلانا اُسے سکھاتا ہے۔ وہ معشوقہ مقام جواء کی جنگلی گایوں کی طرح سنہری رنگ کی ہے۔

اے معشوقہ تو نے مجھے ایسے آرام کے وقت گھر سے نکلنے اور اپنی تلاش میں سفر کرنے پر مجبور کیا ہے جب کہ رنگ برنگ کے لوے نہر کے دونوں کناروں پر زمین سے چھاتی لگائے آرام کر رہے ہیں۔

اے معشوقہ! جب تو مجھ سے خفا ہوتی ہے تو میں ایسے اضطراب میں رات گزارتا ہوں کہ گویا بچھو نے کاٹ کھایا ہے۔

میں نک چھدے اونٹ کی طرح تیرے عشق کا تابع ہوں کہ جہاں وہ لے جاتا ہے اُس کے ساتھ جاتا ہوں۔

میں تیرے وصل کا ایسا آرزو مند ہوں جیسے کوئی پیاسا کنواں کھودے اور پانی کی جگہ کوئی سخت پتھر کی سل آجائے جس کو نہ وہ توڑ سکے نہ اُس میں شگاف دے سکے۔

میں فراق کی رات میں اس طرح بے چین تھا جیسے کوئی سانپ کوڑے سے پیٹا جائے اور اُس کی پشت کے مہرے ٹوٹ گئے ہوں اور وہ تڑپتا ہو مرتا نہ ہو۔ یعنی میں زندوں میں تھا نہ مردوں میں۔

امرءالقیس کی شاعری کا نمونہ

جب وہ دونوں نازنینیں کھڑی ہوتی تھیں تو اُن سے ایسی خوشبو آتی تھی گویا باد صبا لونگوں کے درختوں سے گزر کر آئی ہے۔

آنسو میرے سینے پر اس قدر جاری ہوئے کہ میری تلوار کا پرتلا تر ہو گیا۔

اے لمبی رات! کیا تیرے ستارے کتان کی مضبوط رسیوں سے سخت پتھر کی چٹان سے باندھ دیے گئے ہیں؟ (کہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے اور صبح ہونے میں نہیں آتی)۔

میں صبح کو ایسے وقت اُٹھتا ہوں کہ پرندے اپنے آشیانوں میں ہوتے ہیں-پھر گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتا ہوں-اس گھوڑے کا ڈیل بڑا ہے اور بدن پر بال کم ہیں-وحشی جانور اُس کے آگے سے بھاگ نہیں سکتے-جب تم حملہ کرنا چاہو تو وہ بڑا حملہ آور ہے اور جب اُس کو پیچھے ہٹانا چاہو تو بڑی تیزی سے پیچھے ہٹتا ہے-آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کے اوصاف اُس میں ایک ساتھہ جمع ہیں-تیز رفتاری کا یہ حال ہے کہ گویا پتھر کی ایک چٹان کو سیلاب نے پہاڑ کی بلندی سے نیچے دھکیل دیا ہے-عرق گیر جو زین کے نیچے رہتا ہے اُس کی سپاٹ پیٹھہ پر سے پھسل جاتا ہے-باوجود چھریرے پن کے جب اُس کو ایڑ کا اشارہ کیا جاتا ہے تو وہ بہت گرم ہو جاتا ہے اور چلنے میں ایسی آواز آتی ہے گویا ہنڈیا جوش کھا رہی ہے-جب اور گھوڑے روندی ہوئی پتھریلی زمین میں تھک کر قدم رگڑنے اور غبار اُڑانے لگتے ہیں تو وہ اس حالت میں بھی اس طرح چلتا ہے کہ گویا تازہ دم ہے-اگر کوئی نوسوار لڑکا اُس کی پشت پر سوار ہو تو اُس کی کمر پر سے پھسل جاتا ہے اور اگر کوئی شہسوار ہو تو اُس کی تیزی کے سبب وہ اپنے کپڑے سنبھال نہیں سکتا-کاوے میں اس طرح پھرتا ہے کہ گویا پھرکی ہے جسے کوئی لڑکا بار بار گھما رہا ہے-کمر کی کوکیں ہرن جیسی ہیں-ٹانگیں شتر مرغ جیسی-دوڑ بھیڑیے کے سی ہے اور پویہ چال میں وہ لومڑی کے بچے سے مشابہ ہے-اُس کے تمام اعضا کامل ہیں-سینہ فراخ ہے-دم دراز ہے کہ زمین سے کچھہ ہی اونچی رہتی ہے اور ایسی گھنی ہے کہ اگر پیچھے کی طرف سے تم اُسے دیکھو تو وہ اُس کی رانوں کے درمیانی فاصلے کو چھپائے ہوئے ہے-وہ کج دم نہیں ہے-جب وہ ہمارے مکان کے قریب کھڑا ہوتا ہے تو اُس کی پشت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا دلہن کی خوشبو پیسنے کی سل ہے-یا اندراین کا پھل توڑنے کا پتھر ہے-آگے آنے والی نیل گایوں کا خون جب کہ اُن کی سرینوں پر نیزہ لگتا ہے-اُس

گھوڑے کے سینے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کنگھی کے سفید بالوں میں مہندی کا رنگ ہے۔نیل گایوں کا ایک گلہ یکایک ہمارے سامنے سے گزرا یہ بسی خوش نما تھیں کہ جیسے کنواری لڑکیاں ہیں جو لمبی چادریں اوڑھے دوار بت کا طواف کر رہی ہیں۔ہمیں دیکھ کر وہ پیچھے پھریں اُس وقت اُن کی قطار یمن کے سفید و سیاہ مہروں کا ایک ہار معلوم ہوتی تھی۔اس گھوڑے نے اگلی گایوں کی طرف ہمیں اس تیزی سے پہنچا دیا کہ ابھی پچھلی گائیں بکھرنے نہ پائی تھیں۔پھر اُس نے ایک جھپٹ میں ایک گائے اور اُس کے نر کو آگے پیچھے سے دبا لیا اور باوجود اس قدر دوڑ کے اُسے پسینا بالکل نہیں آیا۔ہمارے ساتھ کے شکاری گوشت پکانے میں مشغول ہو گئے۔بعض دھکتے کوئلوں پر کباب لگا رہے تھے اور بعض نے ہانڈیاں چولھوں پر چڑھا دی تھیں۔شکار کے بعد جب شام کو ہم گھر واپس آئے تو باوجود اس قدر محنت کے گھوڑے کے حسن و جمال میں فرق نہیں آیا تھا۔اب بھی ہماری نظر اُس کے جسم پر پڑ کر پھسل جاتی تھی —

دوست! ذرا آسمان کی طرف دیکھ۔بجلی کس طرح چمک رہی ہے گویا بتھ ابر میں گویا کوئی شخص اپنے دونوں ہاتوں کو حرکت دے رہا ہے۔بجلی گویا راہب کا چراغ ہے جس کی بتی پر تیل خوب جھکا دیا گیا ہے۔ہم ضارج اور عذیب کے درمیان بجلی اور بادل کا تماشا دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔بجلی کی روشنی میں معلوم ہوتا تھا کہ دائیں طرف بارش کا سلسلہ کوہ قطن تک ہے اور بائیں طرف کوہ ستار اور یذبل تک موضع کتیف میں اس زور کی بارش نے کنہبل جیسے بڑے بڑے درختوں کو گرا دیا ہے۔تیماء میں کوئی مکان بے گرائے نہیں چھوڑا بجز اُن مکانوں کے جو پتھروں سے بنائے گئے تھے۔کوہ ثبیر بارش کی دھاروں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی بڑا سردار دھاری دار کملی اوڑھے بیٹھا ہے۔کوہ مجیمر اور اُس کی آس پاس کی چوٹیاں پانی کے سیلاب اور

وڑے کرکٹ میں اس طرح معلوم ہوتی ہیں کہ گویا تکلے کا دمکوا ہے۔ بادل نے پانی کا سارا بوجھ غبیط کے جنگل میں اُتار پھینکا۔ گویا ایک یمنی تاجر ہے۔ جس نے کپڑے کے رنگا رنگ تھان کھول کر پھیلادیے ہیں (اس سے مراد نباتات اور پھول ہیں) وادی جواء کے مکاکی پرند ایسی خوشیاں منا رہے ہیں کہ گویا فلفل آمیز شراب اُن کو پلادی گئی۔ وادی میں شام کے وقت وہ درندے جو کیچڑ یا پانی میں غرق تھے دور سے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گویا جنگلی پیاز کی جڑیں ہیں۔

عمرو بن کلثوم کی شاعری کا نمونہ

وہ ایسے چہرہ سے ہنستی ہے کہ گویا آفتاب نے اُس پر اپنی روشنی کی چادر ڈال دی ہے۔

جب تلواریں علم کی جاتی ہیں تو ہم ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا سب لوگ ہمارے بچے ہیں۔ ہماری قوم کے لوگ دشمنوں کے سروں کو کاٹ کر اس طرح لڑھکاتے ہیں جیسے لڑکے گیندوں کو لڑھکاتے ہیں۔ ہم ہی ایسے ہیں کہ جس بات کو چاہیں روک دیں اور جہاں چاہیں اُتر پڑیں۔ ہم اپنے فرمان برداروں کی حفاظت کرتے ہیں اور نافرمانوں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ جب ہم کسی چشمہ پر اُترتے ہیں تو بس ہم ہی صاف پانی پیتے ہیں۔ ہمارے سوا اور لوگ گدلا پانی پیتے ہیں۔ ہم نے روے زمین کی خشکی کو اپنی قوم سے بھردیا ہے اور سمندر ہماری کشتیوں سے پٹ گیا ہے۔ جب ہمارے کسی بچے کا دودھ چھڑایا جاتا ہے تو دنیا کے زبردست لوگ اُس کے سامنے ادب سے زمیں پر جھک جاتے ہیں۔

ابر کی تعریف

ابر کے ٹکڑے رات کے ابتدائی حصے میں مستانہ چال چل رہے تھے۔ بادلوں کی قطاریں جنگلوں میں اس طرح گرجتی تھیں جیسے اونٹنیاں ایک دوسرے کو دیکھکر چلاتی ہوں۔ بادلوں کے بلند کنارے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گوی وہ کوہ لبنان کی چوٹیاں ہیں۔ بارش کا زور اُن ہواؤں کا مقابلہ کرتا تھا۔ جو

حضر موت کی طرف سے چلتی تھیں۔اس بارش نے بلند مقامات کے درخت عرفج کو اور ثمکیں گھاسوں کی جڑوں اور ریشوں کو یکساں طور سے تر و تازہ کردیا ابر کے بوجھل ٹکڑے اس طرح آهسته چلتے تھے جیسے رسی بندھے کمزور اونٹ نرم زمین پر چلتے هوں—

ارقم سانپ کی تصویر

تم اُس کو سوکھی گھاس اور سوکھی لکڑیوں میں جو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی هوں، چلتا هوا دیکھوگے اُس نے کینچلی چھوڑ کر دی ہے۔اُس کی کمر پر یمن کی ایک پرانی منقش چادر پڑی هوئی ہے۔اُس کی کُھلی کھال اور گردن کی دونوں طرفوں میں خوبصورت نقش اور مختلف رنگ ہیں۔اُس کے گلے میں نیچے کی طرف شکن دار اور لٹکی هوئی کھال ایسی معلوم هوتی ہے کہ گویا اُس کے گلے میں دهرا گُندھا هوا تسمہ پڑا هوا ہے (سانپ جس قدر زهریلا هوگا اُس کے گلے کی نیچے کی کھال اُسی قدر شکن دار اور لٹکی هوئی هوگی) جب گرمی کے موسم میں سانپوں کے کینچلی ڈالنے کا وقت آتا ہے تو وہ همیشہ اپنی قدیم کھال کا استر پہنے رهتا ہے جس کا پوست اُتارا نہیں گیا (یعنی وہ شدت مزاج کے سبب کینچلی نہیں چھوڑتا)—

عورتوں کی مذمت

وہ حسن و ملاحت سے اس قدر دور ہے جس قدر زمین چاند سورج سے—

اُس کی ناک بجائے طول کے عرض میں بڑی ہے اور اُس کی آنکھیں بجائے عرض کے طول میں بڑی ہیں۔اُس کی دونوں باچھوں کی ملنے کی جگہ گدی کا گڑھا ہے—

اُس بد سرشت عورت سے ملاقات کرنا ایسا ہے کہ گویا سانپ کفتار اور مگر مچھ نے ایک ساتھ نکل کر مجھے گھیر لیا ہے۔اُس کی باتیں ایسی تکلیف دہ ہیں جیسے دانت کا اکھاڑنا یا موچھ کا بال نوچنا۔اُس کے غمزے ایسے ہیں

جیسے کوئی ناک پر گھونسا مارے-وہ زرد اور میلے دانتوں سے ھنستی ھے اور ایسی لمبی اور موتی کُھلیوں سے کہ گویا وہ قبیلہ طے کی دو پہاڑیاں ھیں-یا مصر کے مینار ھیں—

اگر تو اُس کی پست آواز سنے تو ایسا معلوم ھوتا ھے کہ گویا کسی پرندے کے بچے کی آواز ھے جس کو گھونسلے میں چکا دیا جا رھا ھے۔ اگر تو اُس کے سر کو بغور دیکھے تو وہ گوپھن کا ایک پتھر ھے- اُس کی هجو سے میرا مقصد یہ ھے کہ دنیا ایک عجیب الخلقت انسان کو دیکھے—

اے ریچھ کی ھمشکل عورت! تجھے کیا ھوگیا کہ تو بجاے طول کے عرض میں بڑھتی چلی جاتی ھے؟ کیا خدا نے تیری درازی قد کو عرض میں صرف کردیا-ھے اگر تیرے پیٹ پر سے کوئی انڈا پھسلایا جائے تو وہ ٹوٹ نہیں سکتا(کوتاہ قد ھونے اور جسم کے ھر حصے کے عریض ھونے کی طرف اشارہ ھے)—

تیرے جسم کا اگلا حصہ موٹا اور پچھلا حصہ پتلا ھے-کاش اِس کے برخلاف ھوتا۔

وہ عورت مرد صورت ھے-اُس کا سخت جسم سونٹے جیسا اور اُس کا قد کوتاہ ھے-وہ چوری میں اُس جنگلی کوے کو مات کرتی ھے جس کا رنگ چتکبرا ھو-اُس مونھہ سنگار کرنے کے وقت بندر کاسا اور اس کا رنگ لوے کے انڈوں کی طرح چتلا ھے-اُس کا بدن خون نہ رھنے اور گوشت نہ ھونے کے سبب زرد آلو جیسا ھے-اُس کی پنڈلیاں سوکھی اور کم گوشت ھیں جیسے ٹڈی کی پنڈلیاں-اس کے چھرے پر مسے کیا ھیں گویا کسی نے کشمش کے دانے بکھیردئے ھیں-اس کے سر پر ایسے چھوٹے چھوٹے بال ھیں جیسے ھوا میں بازی کرنے والے کبوتر کے پر—

مختلف اشعار

اے ضرار کے فرزندو!تم اُن ھرن جیسی خوبصورت اور گلگنانے والی نازنینوں کو پسند کرتے ھو جن کے ھاتھوں میں چمکتے کنگن ھیں اورجوان

معرز کویلے کے مکان میں نظر آتی هیں یا ان مکانوں کو پسند کرتے هو
جن کی چھتیں لوزوں اور تلواروں کے ستونوں پر کھڑی هیں ؟ (یعنی
عیش پرست بننا چاهتے هو یا جنگجو بہادر هونا چاهتے هو)—

میں هر قوم کے لوگوں کو دیکھتا هوں کہ اُنہوں نے اپنے اونٹوں
کی رسی چھوٹی کر رکھی هے حالانکہ هم نے اپنے اونٹوں کے پاؤں سے رسی
ڈال دی هے کہ وہ جہاں چاهیں چریں اُنہیں کوئی روک نہیں سکتا—

اگر سلمی پہاڑ پر هماری مصیبت نازل هوتی تو اس کے ٹکڑے
اڑ جاتے مگر هماری قوم بڑی عمر اس و صبر کے ساتھ برداشت
کر رهی هے—

سفیدی اور سیاهی میں اس کی آنکھیں پنیر اور خرما سے بنی هوئی هیں
اور اس کا باقی بدن گویا ترید هے (یعنی معشوقہ سراپا غذا هے)

بعض نازک اندام عورتیں هیں جن کی آنکھیں اس حلوے کے مانند
هیں جس میں گوشت پڑا هو یعنی سرخ و سیاہ هیں اور ان کے دانت
سفیدی میں ستو سے مشابہ هیں—

میں رات کو ایسے وقت چلتا هوں کہ ستارے دهکتے هوے انگاروں
کے مانند نمایاں هوتے هیں میرے گھوڑے کی پیشانی اور ایال کے بال
اس کی کود پھاند کے سبب کبھی اِدھر هوتے هیں کبھی اُدھر- وہ نشاط
میں ایسا معلوم هوتا هے کہ گویا کوئی شہباز اپنے پروں سے بارش کے قطرے
جھاڑ رها هے—

رات کو ایسی سردی تھی کہ کتا ایک دفعہ سے زیادہ نہ بھونکتا تھا
اور اگر دوسری دفعہ بھونکنا چاهتا تو اُسے اپنی ناک پر اپنی دم کو لپیٹنا
پڑتا تھا—

زمانہ جو مصیبتوں کے تیر هم پر چلاتا هے تو گویا وہ ایک

ایسے بلند اور سیاہ پہاڑ پر تیر مارتا ہے جس کی بلندی ابر کو چھو کر نکل گئی ہے (یعنی وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا)—

ہند کا حال سننے کے بعد جو شخص عورتوں سے کسی بات میں دھوکا کھائے تو جان لو کہ وہ بڑا ہی جاہل اور فریب زدہ ہے۔ عورتوں کی آنکھیں اور اُن کی باتیں شیریں ہوتی ہیں۔ مگر جو باتیں ان کے دلوں میں چھپی ہیں وہ سخت کڑوی ہیں۔ کوئی عورت کیوں نہ ہو اور ظاہر میں وہ محبت کی دلاسئیں کیسی ہی کیوں نہ ظاہر کرے تم یقین کر لینا کہ اُس کی محبت پائدار نہیں ہو سکتی—

جب خبر دینے والوں نے کلیب کے مرنے کی خبر دی تو میں نے کہا کہ زمین ہل گئی ہے اور پہاڑوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے۔ کاش آسمان اُن لوگوں پر گر پڑے جو اُس کے نیچے آباد ہیں اور کاش یہ زمین پھٹ جائے اور اہل زمین کے ٹکڑے اُڑ جائیں—

اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ "عرب کی شاعری عرب کا دفتر ہے" مذکورۂ بالا نمونے کافی نہیں ہیں۔ تاہم اس مقولے میں جو بات ظاہر کی گئی ہے اُس کی جھلکیاں جا بجا ان نمونوں میں بھی موجود ہیں۔ جو شخص عرب کی تمام شاعری کا مطالعہ کرے وہ اُن نتایج پر ضرور پہنچیگا جو ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں—

جغرافی اشارے

عرب کی شاعری میں قدم قدم پر بہت سے مقامات کے نام آتے ہیں۔ مثلاً

یثرب — دمشق — بصرہ — قنسرین — مکہ — بعلبک — اندرین (شام)

نجد — یمامہ — صنعا — طایف — حضر موت وغیرہ —

سینکڑوں دیہات اور چھوٹی بستیاں ہیں جن کے نام شعرائے عرب کے کلام میں نظر آتے ہیں مثلاً

حزن — لون — دکادک — حومل — توضح — جدیس — عسجل — مصامہ سلسلین — مقراۃ وغیرہ —

بہت سے پہاڑوں کے نام بھی اُن کے اشعاروں میں آتے ہیں مثلاً

اجاء — سلمیٰ — کویکب — لہیم — ستار — حایل — مجیمر — مذبل —
ثبیر — قطن — ثرم وغیرہ

عرب میں دریا نہیں ہیں مگر برساتی نالے اور چشمے بہت سے ہیں اُن کے نام بھی عرب کی شاعری میں جگہ جگہ آتے ہیں مثلاً

سحبل — صفوان — بہیما — دارۃ جلجل وغیرہ

بہت سی وادیوں اور جنگلوں کے نام بھی ہیں جو عربی اشعار میں ملتے ہیں مثلاً

غبیط کا جنگل — غمیر کا جنگل — وادی جواء — وادی بطحا وغیرہ

بہت سے رمنوں اور چراگاہوں کے نام بھی لئے گئے ہیں مثلاً

وقبیٰ — مرج راہط — خضرا وغیرہ

بہت سے مقامات ایسے ہیں جن کی خاص شہرت تھی اور کوئی نہ کوئی بات اُن کی طرف منسوب ہوتی تھی مثلاً

تبالہ یمن کا ایک زرخیز شہر ہے - اُس کی زرخیزی و شادابی مشہور تھی —

عبقر ایک گاؤں کا نام تھا جہاں خاص قسم کے کپڑے سفید رنگ اور لال سر کے نہایت نرم و نازک ہوتے تھے - ان کپڑوں کو اسروع کہتے تھے —

اندرین ملک شام کا ایک قصبہ تھا جہاں کی شراب شہرت رکھتی تھی —

عرب کے خاص خاص جنگل تھے جہاں شیر رہتے تھے اُن کے نام حسب ذیل ہیں —

خفیہ — شری - خفان — عفرین

خیبر کا قلعہ مشہور تھا عرب کی شاعری میں اُس کا ذکر اس سبب سے بھی آیا ہے کہ وہاں ایک قسم کا مہلک بخار پھیلا کرتا تھا —

عکاظ ایک مقام کا نام ہے جو نخلہ اور طائف کے درمیان تھا۔ یکم ذیقعدہ سے بیس دن تک یہاں ایک بازار لگتا تھا عرب کے شعرا ہر سال یہاں آتے اور فخر کا اظہار کرتے تھے —

ضریہ بصرہ کے قریب ایک گاؤں تھا جہاں شکاری پرندے کثرت سے تھے —

جواء ایک موضع ہے جہاں کی وادی میں زرد رنگ کی جنگلی گائیں چرا کرتی تھیں اور وہاں چکاکی نام ایک پرندہ بھی کثرت پایا جاتا تھا —

خط یمامہ کا ایک مشہور مقام تھا جہاں عمدہ نیزے فروخت ہوتے تھے اور وہ حطی نیزے کہلاتے تھے —

بصریٰ ملک شام کا ایک شہر تھا جہاں تلوار خالص فولاد کی بنتی تھی اور چوڑی ہوتی تھی —

ھجر یمن کا ایک شہر ہے جہاں کا خرما مشہور تھا —

وجرہ ایک گاؤں کا نام تھا جس کا جنگل وحشی نیل گایوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں کے سفید ہرن بھی مشہور تھے —

وادی عبد یا وادی حمار یمن کی ایک وادی ہے یہ پہلے نہایت سرسبز تھی مگر ایک بار بجلی نے اُس کو جلا کر خاک کر دیا اُس وقت سے ہر ویران مقام کو وادی حمار سے تشبیہ دینے لگے —

عدولی بحرین کا ایک قریہ تھا جہاں کشتیاں بنائی جاتی تھیں —

توضح ایک گاؤں تھا یہاں کی نیل گائیں بھی مشہور تھیں —

دومۃالجندل کا مکھن مشہور تھا —

ان کے علاوہ یمن کی ریشمی چادریں اور دو دھاری تلواریں اور شام کا کاغذ اور اعلیٰ ریشمی کپڑے شہرت رکھتے تھے۔ مشرقی تلواریں بھی

شام سے آتی تھیں—

ریگستانوں اور سرابوں کا ذکر عرب کی شاعری میں بار بار آتا ہے۔ موسموں کے ذکر میں سخت گرمی اور تمتماتی دھوپ کبھی کبھی بارش، راتوں کا سرد ہونا اور موسم سرما میں قحط کے آثار نمایاں ہونا عرب کے اشعار سے بار بار معلوم ہوتا ہے۔ شمال کی ہوا کو شمال، جنوب کی ہوا کو جنوب کہتے تھے۔ مشرق کی ہوا صبا اور مغرب کی ہوا دبور کہلاتی تھی۔ نکباء ایک ہوا چلتی تھی جس سے قحط کی علامت محسوس ہوتی تھی۔ بیابانوں کے سفر میں غریب ستاروں کو دیکھکر چلتے تھے۔ بنات النعش شال کی طرف کے ستارے اور سہیل یمن کی طرف کا ستارہ کہلاتا تھا۔ فرقدین اور کہکشاں کا ذکر بھی بار بار آیا ہے۔ قمری منزلوں سے بارش کے ہونے نہ ہونے کا حساب لگایا کرتے تھے۔ گرمی کا بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ جب ثریا صبح کو طلوع کرتا ہے اور جب جوزا آسمان پر نمایاں ہوتا ہے۔ سفری ستارے کا طلوع سخت گرمی کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ شامی ہوا کا چلنا جو ٹھنڈی ہوتی تھی قحط کی نشانی تھی۔ مردوں کو دعا دیتے تھے کہ خدا کرے تیری قبر کو ابر قبلہ تر کرے۔ یہ اس لئے کہ عرب میں بھی قبلہ سے جو بادل اُٹھتا ہے وہ بہت برسنے والا سمجھا جاتا تھا۔ بعد مغرب ثریا کا طلوع کرنا بھی سردی کی علامت تھی اور سردی قحط کی—

حیوانات میں عرب کے اونٹ اور گھوڑے خاصکر مشہور ہیں۔ اُن کی سینکڑوں نسلیں تھیں۔ ان دونوں جانوروں کا ذکر عرب کی شاعری میں کثرت سے آیا ہے۔ ان کے علاوہ جن جانوروں کے نام لئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں—

کتا جس سے پہرے اور شکار کا کام لیا جاتا تھا۔ کبوتر۔ فاختہ۔ قمری۔ اِن کا ذکر عاشقانہ شاعری میں بہت آتا ہے۔ شیر۔ بھیڑیا۔ گور خر۔ لومڑی۔ فیل گاے۔ شتر مرغ۔ بکری۔ چیتا۔ گرگٹ۔ کفتار۔ عقاب۔ باز۔ اُلو۔ گد۔ شکرا۔ لوا۔ ھد ھد۔ شہد

کی مکھی - ٹڈی - چمگادڑ - مینڈک - مچھلی - چیونٹیاں - چوھا - بلی وغیرہ ایک چھوٹے سے جانور کا ذکر بھی آتا ھے جس کو جد جد کہتے تھے اور جو جھڑا کا گر کہاتا تھا —

نباتات میں سب سے زیادہ کھجور کا ذکر آتا ھے - اِس کے علاوہ جن جنگلی درختوں کا نام لیا گیا ھے وہ حسب ذیل ھیں —

ببول - جھاو - پیلو - تھوء ر - جانڈ - آکھی - ارنڈ - کُھمبی - اندراین وغیرہ کنہبل - بشام - طلح - سیال - عرفج - اسحل خاص عرب کے درخت ھیں - شہزی ایک آبنوس جیسے درخت کی لکڑی تھی جس کے بڑے بڑے پیالے بنائے جاتے تھے - مرار ایک نہایت کڑوی گھاس کا نام تھا - نبعہ ایک درخت تھا جس کی لکڑی کمانوں کے لئے موزوں تھی - حرم بھی ایک ایسے ھی درخت کا نام تھا - درخت تنوم پر سانپ لپٹے رھتے تھے - پھولوں میں گلاب - سنبل - عرار - خیری - بابونہ - چمبیلی اور بنفشہ کا ذکر اکثر آیا ھے - اند اور بان دو نازک درخت ھیں جن کا نام عاشقانہ شاعری میں بار بار لیا جاتا ھے - ورس ایک گھاس کا نام ھے جو رنگنے کے کام میں آتی تھی - مہندی کا بھی نام لیا گیا ھے - کالی مرچیں شراب میں ڈالی جاتی تھیں تاکہ نشہ تیز ھو - میووں میں انگور اور انار وغیرہ کا ذکر آیا ھے —

تاریخی حوالے

ایام جاھلیت میں مختلف قبایل جو عرب میں آباد تھے اُن میں ذرا ذرا سی بات پر لڑائیاں ھوتی رھتی تھیں اور بعض لڑائیاں طول پکڑ جاتی تھیں شاعری نے ان قبایل کے نام کو اب تک زندہ رکھا ھے - جا بجا اُن قبایل کے نام عربی اشعار میں لئے گئے ھیں مثلاً

آل مازن - آل زبیان - آل رباب - آل ضرار - آل مطرف - آل حیہ - بنی مطر - بنی اسد - بنی کلب - بنی نمیر - بنی طریف - بنی زھیر - بنی ثعلب - بنی شیبان وغیرہ

اهم معرکے جو پیش آے هیں اُن کے نام عرب نے رکھہ لئے هیں-یہ نام
ب جا بجا مذکور هیں مثلاً

یوم هریر-یوم کلاب-یوم بردان-یوم خزاز-یوم بهیما وغیرہ

گھوڑے ان لڑائیوں میں خوب کام دیتے تھے-عربوں کو گھوڑوں سے
س محبت تھی اور وہ اُن کو اپنی اولاد کے برابر عزیز رکھتے تھے-وہ اعلی
ر شریف نسل کے گھوڑوں اور گھوڑیوں کے نام رکھتے تھے-یہ نام بھی عرب
ی شاعری میں مذکور هیں-مثلاً

گھوڑوں کے نام:- شمر-ورد-صموت-جون-عرقوب-عصا-ادهم-سبط-اغبر
ر-خطار وغیرہ

گھوڑیوں کے نام:- سکاب-دهماء-سوله-شقراء-خصات-غبراء-نعامه
نفاء وغیرہ

تلواروں اور زرهوں پر بھی عرب فخر کرتے تھے اور اُن کے بھی خاص
اس نام تھے مثلاً

تلواروں کے نام:- معلوب-اصرم-ذوالحیات وغیرہ

زرهوں کے نام:- ذات الحواشی-ذات السلاسل وغیرہ

عربوں کی رزم آرائیاں-غارتگریاں-فتح و شکست-صلح و معاهدے
ہد شکنیاں-خونبها اور انتقام وغیرہ سب کچھہ ان کے اشعار سے معلوم هو سکتا
ہے-ابن اثیر اور طبری وغیرہ مورخوں نے عرب کی شاعری هی سے مدد لیکر
س زمانے کی تاریخ مرتب کی هے-یہ شاعری هی کی برکت هے که آج تک اس
زمانے کے واقعات زندہ هیں—

اخلاق و تمدن

عرب کے اخلاق اور معاشرت و تمدن کا حال معلوم کرنا چاهو تو اُن کی
شاعری کا مطالعه کرو-وہ اس سارے دفتر کو تماری آنکھوں کے سامنے

کھولکر رکھہ دیگی —

عرب جس طرح جنگجو اور بہادر ہیں اُسی طرح عاشق مزاج بھی ہیں۔ اُن کی عشق کی داستانیں بھی اُن کے اشعار میں قلمبند ہیں۔جن جن حسین عورتوں کے ساتھہ عربوں نے عشق کیا ہے اُن کے نام اُنھوں نے بے تکلف اپنے اشعار میں درج کر دئے ہیں۔مثلاً

لمیس۔عبلہ۔اُمامہ۔طریفہ۔علیزہ۔زینب۔اُم رباب۔نوار۔سحابہ۔لیلی سلمی۔ذلفاء۔ریا۔خولہ۔سعاد۔تماضر۔اُم عامر۔سمیہ۔ردینہ۔اُم حسان وغیرہ—

اگر عاشق ایک قبیلے کا اور معشوقہ دوسرے قبیلے کی ہوتی اور دونوں قبیلوں میں رسم و راہ نہ ہوتی تو عاشق و معشوق چھپ چھپ کر راتوں کو ملتے تھے اور عاشق اپنی معشوقاؤں کو بھگا لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور اگر ضرورت ہوتی تو اس مطلب کے لئے لڑنے اور خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔خانہ بدوش قبایل جہاں کہیں پانی کے چشمے دیکھتے چند روز کے لئے ٹھیر جاتے تھے۔پھر گھاس اور پانی نہ ہونے کی صورت میں نقل مکانی کرتے تھے۔ایسے ہی موقعوں پر نوجوان مردوں اور نوجوان عورتوں کی آنکھیں لڑ جایا کرتی تھیں۔نقل مکانی کے بعد جب کوئی عاشق ایسے مقام پر پہنچتا تھا جہاں پہلے اُس کی معشوقہ ٹھیری تھی تو وہ اُس کے قیام کے نشانوں کو دیکھکر خطاب کرتا تھا اور اُس کے فراق میں دردناک اشعار کہتا تھا اور شعرائے عرب کے قصاید کی تمہید اسی خطاب اور نوحہ سے ہوئی ہے —

رہزنی اور غارتگری عربوں کی فطرت میں داخل تھی اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے بلکہ فخر کرتے تھے۔اِسی پر اُن کی معاش کا مدار تھا۔موقع پا کر ایک قبیلہ کے آدمی دوسرے قبیلے پر چڑھ دوڑتے تھے اور ان کے مویشی لوٹ لاتے تھے۔لوٹ کے لئے دھاوا اکثر صبح کے وقت ہوتا تھا جب کہ لوگ غافل

سوے ہوے ہوں- شارتگری کے دھاروں میں تیز رفتار اونٹوں اور اونٹنیوں سے کام لیتے تھے- اونٹوں کی خاص خاص نسلیں مشہور تھیں- ایک نسل کو مہاری کہتے تھے یہ نسل مہرہ بن حیداں کی طرف منسوب تھی جو یمن کا باشندہ تھا- شریف نسل کے اونٹوں کے ذرا ذرا سے کان کاٹ دیتے تھے اُن کو مزنم کہتے تھے- اونٹنیاں جن کی آنکھیں سیاہ اور بال سرخ ہوں نہایت قیمتی خیال کی جاتی تھیں—

گھوڑے دوڑانے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا شوق بھی عربوں کو تھا- گُھڑ دوڑ کے گھوڑے خاص اهتمام سے پالے جاتے تھے- شریف اور نسل دار گھوڑوں پر نشان لگائے جاتے تھے تاکہ وہ دور سے پہچانے جائیں- گُھڑ دوڑ کی هار جیت میں منجملہ دس گھوڑوں کے سات گھوڑوں کو حصہ دیا جاتا تھا- تین گھوڑے محروم رهتے تھے- دوڑ میں جو گھوڑا سب سے اول آتا تھا اُس کو مجلی، دوسرے کو مصلی، تیسرے کو مسلی، چوتھے کو تالی، پانچویں کو مرتاح، چھٹے کو عاطف اور ساتویں کو مومل کہتے تھے- باقی تین محروم گھوڑے خظی، لطیم اور سکیت کہلاتے تھے—

جوا طرح طرح سے کھیلا جاتا تھا- جوے کا مشہور طریقہ تیروں سے کھیلنے کا تھا- اونٹ کے دس حصے کئے جاتے تھے اور جو تیر آتے اُن کا حصۂ معینہ اونٹ کے گوشت میں سے دیا جاتا- جوے کے تیروں کے نام حسب ذیل تھے- فذ- توأم- رقیب- حلس- نافس- مسبل- معلق- ان سات تیروں میں سے پہلے تیر کا ایک حصہ تھا- دوسرے کے دو- تیسرے کے تین- اس حساب سے رقیب کے تین اور معلی کے سات حصے هوتے هیں- اگر کوئی شخص رقیب اور معلی نام کے تیر جیت لیتا تھا تو اونٹ کے دسوں حصے اُسی کو ملتے تھے- تین تیر اور تھے جن کے نام یہ تھے- سفیح- منیح- وغد- ان تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا- اگر قحط کا زمانہ هوتا تو جوا کھیلنے میں زیادہ فخر تھا- اس زمانے میں اگر کوئی مہمان آجاتا تو باهم جوا کھیلتے

تھے۔جو شخص جیت جاتا وہ جیت کی آمدنی سے مہمان نوازی کرتا تھا۔

شراب پینے کا رواج بھی عربوں میں تھا۔مختلف قسم کی شرابوں کے مختلف نام تھے۔شراب کی اعلی قسمیں اکثر ملک شام سے آتی تھیں۔اس کو عام طور پر مشکیزوں میں رکھتے تھے۔اکثر صبح یا شام کے وقت پی جاتی تھی۔صبح کی شراب کو صبوح اور شام کی شراب کو غبوق کہتے تھے۔صبح کے وقت اکثر چار جام پئے جاتے تھے۔شراب نوشی کو بھی عیب نہیں جانتے تھے۔بلکہ اس پر فخر کرتے تھے۔مے فروش کی دوکان پر ایک جھنڈی لہرایا کرتی تھی۔جس کو دیکھکر شراب پینے والے لوگ وہاں جمع ہوجاتے تھے۔سردی میں اکثر شراب میں گرم پانی ملا کر پیتے تھے۔نشہ تیز کرنے کے لئے کالی مرچیں ملادیتے تھے۔جو لوگ خود کشی کرنا چاہتے تھے وہ خالص شراب پیتے تھے۔چنانچہ زہیر۔عمرو بن کلثوم جو نامور شاعر تھے اور ابو عامر ملا عب الاسنہ نے اسی طرح خود کشی کی تھی۔جب دشمن سے انتقام لینے کی قسم کھاتے تھے تو قمار بازی کی طرح شراب نوشی کو بھی اپنے اوپر حرام کرلیتے تھے۔انتقام لینے کے بعد البتہ جی کھول کر جوا کھیلتے اور شراب پیتے تھے۔

مہمان نوازی تو گویا عربوں کے خمیر میں تھی۔اگر اتفاقاً کوئی شخص مہمان نواز نہ ہوتا تو اس کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔رات کے وقت میدانوں میں یا ٹیلوں پر آگ روشن کی جاتی تھی۔تاکہ بھولا بھٹکا مسافر وہاں آکر پناہ لے۔مہمانوں کے لئے اونٹ ذبح کئے جاتے تھے۔شیزی کے بڑے بڑے بادیوں میں لوہے کے بڑے بڑے چمچوں سے گوشت نکالا جاتا تھا اور مہمانوں کے آگے رکھا جاتا تھا۔اعلی درجہ کی مہمان نوازی یہ تھی کہ ایسی اونٹنیاں مہمانوں کے لئے ذبح کی جائیں جو ہمیشہ مادہ بچے جنتی ہوں۔کیونکہ ایسی اونٹنیاں قیمتی ہوتی تھیں۔گوشت کھانے کے وقت علی العموم چھریوں سے کاٹا جاتا تھا۔مہمان نوازوں کی دیگوں کا سیاہ رہنا تعریف کی بات تھی۔کیونکہ یہ ہمیشہ

پھانا پکنے کی علامت تھی۔شاعر جو اپنی مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہیں، اپنی قیام گاہ پر آگ جلانے، دیگوں کے سیاہ ہونے، اُن میں گوشت کے جوش کھانے، آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بلند ہونے، دیگوں میں پیالے یا چمچے ڈال کر شوربا اور گوشت نکالنے اور اُس وقت کنیزوں کی پھرتی اور سرگرمی کی تعریف مزے لے لے کر کرتے ہیں۔ہجو کے موقع پر کہتے تھے کہ فلاں شخص کی اونٹنیاں موٹی تازی ہیں، یعنی وہ مہمانوں کی خاطر ان کو ذبح نہیں کرتا۔عورتیں البتہ اپنے شوہروں کو حد سے زیادہ مہمان نوازی پر ملامت کیا کرتی تھیں۔مگر اس کی پروا نہیں کی جاتی تھی۔مہمان نوازی کے علاوہ قیدیوں کو چھڑانا، تاوان و دیت ادا کرنا سائلوں کو دینا اور یتیموں کی پرورش کرنا بھی عربوں کے نزدیک نیکی اور بھلائی کے کاموں میں داخل تھا۔

عورتوں کا درجہ عربوں کے نزدیک نہایت ادنیٰ تھا۔وہ گھروں میں باندیوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں۔ان کی بات کی مطلق پروا نہیں کی جاتی تھی۔وہ لوٹ کے مال کی طرح لوگوں کے ہاتھ آسکتی اور غیروں کے ہاں باندیاں بنائی جاسکتی تھیں۔عربوں کا قول تھا کہ عورتوں کی موت ان کی زندگی سے بہتر ہے۔چنانچہ اس خیال کو بار بار عرب شعرا نے بیان کیا ہے۔لڑکیاں ذرا بالغ ہوتیں تو اکثر زندہ دفن کردی جاتی تھیں۔اس رسم کو اسلام نے آکر فنا کیا اور عورتوں کے درجے کو بلند کیا۔اُس زمانے کی عورتیں طرح طرح کے توہمات میں مبتلا تھیں۔اس کا ذکر آگے آتا ہے۔آسودہ حال عورتیں ریشم کا سفید یا زرتار لباس پہنتی تھیں۔وہ اکثر آرام طلب ہوتی تھیں اور چاشت کے وقت تک سوتی رہتی تھیں۔وہ رات کے وقت جامۂ خواب پر پٹکا نہیں باندھتی تھیں۔یہ عادت خادمہ عورتوں کی تھی۔کرتی اور انگیا کا بھی رواج تھا۔مگر کرتی جوان عورتیں پہنتی تھیں اور انگیا وہ لڑکیاں جو قریب بلوغ ہوں۔بدن کے حصوں کو سوئی سے گودنے اور اُن میں سرمہ یا نیل بھرنے کا بھی

رواج تھا۔دولت مند اور آسودہ حال گھرانوں کی عورتیں جو ریشم کی چادریں استعمال کرتی تھیں ان پر کجاوہ کی تصویر اور دوسری قسم کی تصویریں اور گل بوٹے بنے ہوتے تھے۔زیوروں میں خلخال بازو بند کنگن اور ہار کا رواج تھا۔اکثر عورتیں سرمہ سے دانتوں اور مسوڑھوں کو سیاہ کرتی تھیں۔اور یہ بات اُن کے نزدیک زیبائش و آرایش میں داخل تھی۔عرب کوتاہ قد اور دبلی پتلی عورتوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ان کے نزدیک عورتوں کا موٹا تازہ ہونا اور دراز قد ہونا ممدوح تھا—

مردوں کی پوشاک عام طور سے تہبند اور کرتہ اور دھاری دار چادر تھی۔ لڑائی کے وقت چرمی کرتہ پہنتے تھے اور اُس پر زرہ پہنا کرتے تھے زرہ اکثر ایران سے آتی تھی باریک بنی ہوئی اور چھوٹے حلقوں والی زرہ کو پسند کرتے تھے اور اس کو داؤدی زرہ کہتے تھے۔ سغد ایک زرہ ساز کا نام تھا۔ اس کی بنائی ہوئی زرھیں مشہور تھیں۔ سر پر خود لگاتے تھے۔ تلواروں اور برچھوں سے لڑتے تھے یمنی اور ھندی تلوریں اور ردینی نیزے مشہور تھے ردین ایک نیزہ ساز کا نام تھا۔ دور کی لڑائی میں تیروں کا استعمال کرتے تھے۔ اگر تیر نہ رھتے تو کمانوں کولا ٹھیاں بنا کر لڑتے تھے۔ لڑائی کے بردے فروخت کردئیے جاتے تھے۔ یا ان کے ناک کان کاٹ لئے جاتے تھے۔ عورتیں باندیاں بنالی جاتی تھیں۔ اِن باندیوں سے گھر کا تمام کام کاج لیا جاتا تھا۔ وہ جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتی تھیں پانی بھرتی تھیں مہمانوں کی خدمت کرنا بھی ان کے فریض میں داخل تھا۔ان کا لباس بمقابلہ گھر کی عورتوں کے ادنیٰ درجہ کا تھا۔ باندیوں کو ناچنا گانا بھی سکھایا جاتا تھا چنانچہ ایک گویا ابن محرز باندیوں کو گانا سکھانے کا کام انجام دیتا تھا۔ باجوں میں رباب دف عود اور مبربط کا رواج تھا۔ لڑائی میں جو باندیاں زخمیوں کی مرھم پٹی کرتی تھیں وہ رواسی کہلاتی تھیں۔ یہ کام عرب بذات خود عیب سمجھکر نہیں کرتے تھے۔ فوج کے

سرداروں کو لڑائی فتح ہونے کے بعد مال غنیمت کا چوتھائی حصہ ملتا تھا۔ اپنے گروہ اور دشمن کے گروہ میں جنگ کے وقت تمیز کرنے کے لیے کوئی علامت مقرر کرلیتے تھے۔ مثلاً سرمنڈالیتے۔ عربوں کے نزدیک بستر پر گل سڑ کر مرنا سخت عیب تھا وہ چاہتے تھے کہ چلتے ہاتھ پاؤں لڑکر مارے جائیں۔ ان کی عورتیں اپنے شوہروں کی جوانمردی پر فخر کرتی تھیں۔ اسی لئے شاعر لڑائی کا ذکر عورتوں سے مخاطب ہوکر کرتے ہیں۔ وہ نسب پر فخر کرتے تھے دوغلوں کو نامرد اور بہادری ان کے نزدیک شریفوں کی علامت تھی۔ لڑائی میں پیٹھ پھیرنا ان کے نزدیک بہت معیوب تھا۔ ان کا قول تھا کہ ہمارے زخموں کا خون ہماری ایڑیوں پر نہیں گرتا۔ بلکہ قدموں پر گرتا ہے۔ لڑائی کے تازہ مقتولوں کا ماتم عورتیں ننگے سر ہوکر صبح شام کیا کرتی تھیں۔ مردوں کو کفن دیکر دفن کرنے کا رواج تھا۔ قبر اکثر چار گز لمبی اور پانچ بالشت چوڑی ہوتی تھی۔ کوشش کی جاتی تھی کہ اپنے مقتولوں کا انتقام لیاجائے یا دیت لی جائے۔ مگر دوسری صورت اکثر کمزور اور نامردی کی علامت خیال کی جاتی تھی۔ دستور تھا کہ صلح کی گفتگو کے وقت ہر ایک فریق دوسرے کی طرف نیزہ کی بوڑی رکھکر بیٹھتا تھا اگر صلح منقطع ہوجاتی تو نیزے کی بھال ایک دوسرے کی طرف کردی جاتی تھی قوم کے سردار اسی محفلوں میں گوٹ باندھکر بیٹھتے تھے اور آگے تلوار رکھلتے تھے معاہدوں کی پابندی کی جاتی تھی مگر کبھی کبھی عہد شکنی پر بھی مایل ہوجاتے تھے۔ اس صورت میں عہدشکنی کرنے ولا شخص یافریق تمام عرب میں بدنام ہوجاتا تھا۔ اس کے بدنام کرنے کے لئے اونچے مقامات پر آگ جلائی جاتی تھی اگر کوئی شخص پناہ میں آتا اور قتل سے بچایا جاتا تو جو آدمی پناہ دیتا تھا وہ پناہ مانگنے والے پر چادر ڈال دیتا تھا—

عرب اکثر خیموں میں زندگی بسر کرتے تھے مکان بناکر بہت کم رہتے تھے۔ شہروں اور قصبوں میں مکان بھی تھے تو وہ معمولی قسم کے تھے۔ اِس زندگی کے

علاوہ عربوں کے اخلاق و تمدن کے متعلق متفرق باتیں عرب کی شاعری سے معلوم ہوتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں—

زمانہ امن کا مشغلہ اکثر شکار ہوتا تھا۔ نیل گایوں اور ہرنوں کا شکار نہایت پھرتی اور مستعدی کے ساتھ کیا جاتا۔ شکاری کتوں سے بھی شکار میں کام لیا جاتا تھا۔ اعلی نسل کے شکاری کتوں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ ان کے کان لٹکے ہوئے اور کمر پتلی ہوتی تھی ان میں سے بعض کے نام بھی عرب کے اشعار میں مذکور ہیں۔ مثلاً کساب اور سخام دو اعلی نسل کے شکاری کتوں کے نام تھے۔ شکار میں تیر اور نیزہ کا استعمال کرتے تھے اور شکار کے وقت پھرتی کی غرض سے چادر سر سے اُتار کر کمر سے باندھ لیتے تھے—

زبردست لوگ اپنے اونٹوں کو داغ دیا کرتے تھے تاکہ لوگ پہچان جائیں کہ یہ فلاں سردار کے ہیں اور اُن کو چشموں پر پہلے پانی پینے دیں۔ اس کے علاوہ طاقتور لوگ اپنی ہیکڑی جتانے کے لئے طرح طرح کی تجویزیں کرتے رہتے تھے۔ مثلاً کلیب نے ایک کتا پال رکھا تھا۔ لوگوں کا فرض تھا کہ اِس کتے کے دائیں بائیں سے گزریں۔ اُس کے پاس نہ آئیں۔ بنی ابیعہ داڑھیاں منڈواتے اور مونچھیں کترواتے تھے۔ اگر کوئی اور ایسا کرتا تو گویا اُن سے لڑائی مول لیتا تھا۔ بنی عبدالقیس کا دستور تھا کہ اگر کوئی گالی دے تو یہ اُس کے طمانچہ مارتے تھے۔ اگر وہ بھی طمانچہ مارے تو قتل کیا جاتا تھا۔ بنی بکر ایک پرندہ کو وسط سڑک میں باندھ دیتے تھے۔ ضرور تھا کہ لوگ اُس رستے سے نہ جائیں۔ اشد ضرورت کی حالت میں اُس کے دائیں بائیں سے گزریں—

عرب اپنے بچوں کو سونگھتے تھے اور اسی لئے ان کو ریحانہ کہتے تھے۔ ان کے گلوں میں اکثر کوڑیوں کا ہار ڈالتے تھے۔ بچے کپڑے کے کوڑے بناکر ایک دوسرے کو مارتے اور کھیلتے تھے۔ بچوں میں پھرکیوں سے کھیلنے کا بھی رواج تھا۔ بچوں کے ایک خاص کھیل کا نام اشعار میں آیا ہے جس کو فیال کہتے تھے۔

مٹی یا ریت کو دو حصوں میں تقسیم کرکے کسی حصے میں کوئی چیز دباتے اور پوچھتے کہ وہ چیز کس حصے میں ہے ۔اسی پر ہار جیت کا مدار تھا۔

رات کا سفر اور دوپہر کے وقت کا سفر عرب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔کیونکہ اس میں جفاکشی اور جرأت پائی جاتی۔ سفر کے وقت ان کی عادت تھی کہ تجربہ کار اونٹ کو آگے بڑھاتے تھے اور وہ زمین کو سونگھکر معلوم کرلیتا تھا کہ پانی یہاں سے اس قدر دور ہے اور منزل مقصود کتنے فاصلے پر ہے۔اگر دونوں مقام دور ہوتے تو وہ جلد جلد چلنے لگتا تھا۔۔وت عربی میں سونگھنے کو کہتے ہیں اور اسی سے مسافت کا لفظ بنا یا گیا ہے—

سرسبز مقامات مثلاً یمامہ وغیرہ میں پانی سے زمین کو سینچنے کے لئے رھٹ بھی جاری تھے جن کو عرب منجلوں کہتے تھے۔اس کے علاوہ عرب کے اشعار سے پن چکی کے رواج کا بھی پتہ چلتا ہے۔

لکھنا پڑھنا عرب کے لوگ بہت کم جانتے تھے۔عہد رسالت میں بھی اس فن کے جاننے والے انگلیوں پرگنے جاسکتے ہیں۔قرآن مجید میں اسی سبب سے عرب کی قوم اُمی بتائی گئی ہے۔ایام جاھلیت کے شعرا فن کتابت کو روم و فارس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ہرن کی پتلی کھال پر لکھنے کا رواج تھا جس کو عربی زبان میں رق کہتے ہیں۔قرآن مجید میں یہ لفظ آیا ہے—

عقائد و توھمات

اسلام سے پہلے حجاز اور وسط عرب میں بت پرستی ہوتی تھی۔کعبہ میں تین سو ساٹھ بت بتائے جاتے ہیں۔ان میں سے مشہور بتوں کے نام حسب ذیل ہیں—

لات۔منات۔عزیٰ۔اساف۔نائلہ۔دوار۔ان میں سے دوار کا ذکر اکثر آتا ہے اور کہیں کہیں لات اور عزیٰ کا بھی۔دوار کے گرد نوجوان عورتیں سروں پر چادریں ڈالے طواف کرتی تھیں—

عیسائی، یہودی اور مجوس بھی عرب میں جا بجا تھے۔ حضرت ابراهیم کا دین توحید ماننے والے بھی تھے ایام جاهلیت میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حشر ونشر کے قایل تھے اور اس بات پر عقیدہ رکھتے تھے کہ مرنے کے بعد ایک دن آئے کاجب کہ نیکیوں اور بدیوں کی جزا اور سزا دی جائے گی —

عوام عرب طرح طرح کے توهمات میں گرفتار تھے۔ عورتیں مختلف رنگ کے تورے گلے میں ڈالتی تہیں تاکہ نظر بد سے بچیں۔ ان توروں کو بریم کہتے تھے۔ عرب مراد پوری ہونے کے لئے طرح طرح کی منتیں مانتے تھے۔ ان منتوں کے پورا کرنے میں کبھی کبھی لوگ چالاکی بھی کرتے تھے۔ مثلاً بعض لوگ منت مانتے تھے کہ اگر اُن کا بکریوں کا گلہ سو تک پہنچ جائے گا تو بتوں کے نام پر ایک بکری ذبح کی جائے گی مگر منت پوری ہونے پر بکری کی جگہ ہرن کا بچہ ذبح کیا جاتا تھا۔ دستور تھا کہ کسی شخص کے مرنے پر اُس کی اونٹنی اُس کی قبر پر باندھ دی جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے تھے اور بھوکا پیاسا رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ مرجاتی تھی۔ خیال تھا کہ قیامت کے دن مرنے والا اس اونٹنی پر سوار ہوگا۔ ایسی اونٹنی کو بلیہ کہتے تھے۔ عرب خیال کرتے تھے کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن رہتا ہے جو شعر کا القا کرتا ہے۔ اگر کوئی شعر لکھنے میں عاجز ہوتا تو کہتے کہ اس کا جن بھاگ گیا جن لوگوں سے عجیب و غریب یا غیر معمولی کام سرزد ہوں ان کو دیونی کی اولاد بتاتے تھے۔ وہ بھوتوں کے بھی قایل تھے۔ ان کے سروں کے گرد آلود ہونے اور تیزی کے ساتھ چلنے کا ذکر بھی اشعار میں آتا ہے۔ اگر کسی مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو خیال کرتے تھے کہ اس کی قبر میں ہمیشہ اندھیرا رہے گا۔ وہ گھوڑوں کی سعادت و نحوست کے قایل تھے۔ منحوس گھوڑوں کو ایک منحوس گھوڑے کی اولاد بتاتے تھے جس کا نام راحس تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر تیر چلانے والا اپنے تیر پر تھوک دیتا ہے تو پھر اُس کے تیر کا نشانہ جو شخص ہو وہ زندہ نہیں بچتا۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر

بادشاہ کے بائیں ہاتھہ کی بیچ کی انگلی میں پچھنے لگا کر خون لیا جائے اور یہ خون چھوارے میں رکھکر اُس شخص کو کھلایا جائے جسے باولے کتے نے کاٹا ہے۔تو اس کو شفا ہوجاتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب مردہ گل کر مٹی ہو جاتا ہے تو اس کے سر میں سے ایک پرندہ نکلتا ہے اور اس قبر پر آواز لگاتا ہے۔اس پرندہ کو صدی یا ہامہ کہتے تھے۔عرب شگونوں کے بھی قایل تھے اور اکثر پرندوں سے شگون لیا کرتے تھے۔جب وہ کسی دوست کو رخصت کرتے تو اسے بار بار مڑ کر دیکھتے تھے۔ یہ ایک شگون تھا اور اس غرض سے کیا جاتا تھا کہ جانے والا جلد واپس آئے۔نامرد کو ابن صبح کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر عورت صبح کو حاملہ ہو تو بچہ نامرد پیدا ہوتا ہے۔عربوں کے نزدیک قزح ایک فرشتے کا نام تھا جو بادلوں پر مامور ہے۔اسی کی کمان کو قوس قزح کہتے تھے—

غرضکہ عرب کی شاعری کے مطالعہ سے عرب کے متعلق جغرافی آثار تاریخی واقعات اخلاقی و تمدنی مناظر اور ان کے عقاید و توہمات کے متعلق سب کچھہ معلوم ہوسکتا ہے اور یہ جو کچھہ لکھا گیا اسی مطالعہ سے معلوم ہوا ہے۔ اگر مضمون کی طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو اور بہت کچھہ بیان ہو سکتا تھا۔ تاہم اس قدر بیان سے بھی ناظرین اس مقولہ کی صداقت مان جائیں گے کہ فی الحقیقت عرب کی شاعری عرب کے حالات و خیالات کا دفتر ہے—

اب آخر مضمون میں مجھے یہ بیان کرنا ہے کہ عرب کی شاعری میں اظہار خیالات کے کیا طریقے تھے—

خیالات کے سانچے

خیالات کے اظہار کے لئے جو اہم پیرایے عرب کے شعرا نے استعمال کئے ہیں۔ وہ تین ہیں۔ (۱) کنایہ (۲) استعارہ (۳) تشبیہ۔ذیل ہیں تینوں طریقوں کی مثالیں لکھی جاتی ہیں—

عربی شاعری کے کنایے | پاؤں کا جوتی کے تسمے سے نکل جانا موت سے کنایہ ہے—

اونٹ کا کسی پر اپنی چھاتی ٹیک کر بیٹھنا ہلاک ہونے سے کنایہ ہے—

مادر کرگس یا گدوں کی ماں موت سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ موت لوگوں کو ہلاک کرکے گدوں کے لئے خوراک مہیا کرتی ہے—

تبالہ میں اُتر پڑنا مالا مال ہونے سے کنایہ ہے۔ تبالہ یمن کا ایک زر خیز شہر تھا۔ بے دانت کی درانتی تلوار سے کنایہ ہے—

کانوں کا جڑ سے کٹ جانا ذلیل ہونے سے کنایہ ہے—

نامرد کتے والا سخی سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ مہمانوں کی کثرت آمد رفت کے سبب کتا بھونکنا چھوڑ دیتا ہے—

دبلے شتر بچے والا بھی سخی سے کنایہ ہے۔ کیوں نہ اونٹنی کا دودھ مہمانوں کو پلایا جاتا ہے اس لئے اُس کا بچہ دبلا ہو جاتا ہے—

بہت راکھ والا بھی سخی سے کنایہ ہے۔ کیوں کی مہمانوں کی کثرت کے سبب اُس کے ہاں کھانا بھی کثرت سے پکتا ہے اور باورچی خانے میں راکھ کا ڈھیر لگ جاتا ہے—

اندراین توڑنا بے اختیار آنسو جاری ہونے سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ جب کوئی شخص اندراین کا پھل توڑتا ہے تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں—

ہونٹوں نے دانتوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ خوف سے کنایہ ہے کیوں کہ خوف کے وقت منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے—

چمڑے کے خیمے والے بڑے اور مالدار آدمیوں سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ اس کا مقدور امیروں اور بڑے آدمیوں ہی کو تھا—

پنڈلی کھلنا مصیبت سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ مصیبت کے وقت پردہ نشین عورتیں گھر سے باہر نکل بھاگتی ہیں —

پریشاں ہوا میں چلنا قحط سے کنایہ ہے کیوں کہ عرب میں ہمیشہ ایسی ہواؤں کا چلنا قحط کی علامت خیال کیا جاتا تھا —

سر کی چادر بائیں ہاتھ میں لینا عورتوں سے خوف زدہ ہونے سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ خوف کے وقت وہ اکثر یہی عمل کیا کرتی تھیں —

لونگوں یا سنبل کا سرمہ لگانا رونے سے کنایہ ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے آنکھوں سے بے اختیار پانی جاری ہوجاتا ہے —

اُس زمین میں شترمرغ کے انڈے کثرت سے ہیں یا پھیلے پڑے ہیں۔ یہ زمین کے سرسبز ہونے سے کنایہ ہے کیونکہ شترمرغ ایسی ہی زمین میں انڈا دیتے ہیں —

لمبے پرتلے والا' دراز قد انسان سے کنایہ ہے کیوں کہ جس کا پرتلا لمبا ہوگا۔ اس کی تلوار لمبی ہوگی اور جس کی تلوار لمبی ہوگی اس کا قد بھی دراز ہوگا —

ہمارے گھوڑے بنات النعش کی طرف جارہے ہیں۔ یعنی ہم شام کی طرف کوچ کررہے ہیں یہ بھی کنایہ ہے۔ کیونکہ بنات النعش شامی ستارے سمجھے جاتے ہیں

آگ میں لکڑیاں یا ایندھن ڈالنا فتنہ فساد بڑھانے سے کنایہ ہے —

تہ بند ڈھیلا ہونا خوف سے کنایہ ہے —

دامن کمر پر باندھنا مستعدی سے کنایہ ہے —

گرگٹ کا درخت پر دم ہلانا گرمی کے وقت سے کنایہ ہے۔ کیونکہ گرمی کے وقت گرگٹ یہی حرکت کرتا ہے —

عربی شاعری کے استعارے

میں موت کے تھنوں سے اس وقت دودھ نکالتا ہوں جب کہ بڑے بڑے بہادر آدمی بھاگ نکلتے ہیں۔ یہاں موت کا

استعارہ فاقہ سے ہے—

لڑائی کا استعارے اس درندہ سے جو ڈاڑھیں نکالکر اپنے شکار کو ڈراتا ہو۔

نسب کے صاف و خالص ہونے کا استعارہ بارش کے پانی سے—

کمزور اور نامرد کا استعارہ اس گوشت سے، جو قصائی کے تختے پر رکھا ہو کہ جو چاہتا ہے اُسے خرید کر لے جاتا اور اپنے کام میں لاتا ہے—

ذلیل وخوار آدمی کا استعارہ چھوٹے کان والے شترمرغ سے—

گلے کا ہار بد نامی کا استعارہ ہے—

موت کے قریب ہونے کا استعارہ اس شکاری پرندے سے جو سنق لاتا اور پر تولکر شکار پر گرنا چاہتا ہو—

ڈولوں میں ڈول ڈالنا اوروں کے ساتھ خود بھی کوشش کرنے کا استعارہ ہے—

شعری ستارہ کا ڈوب کر نکلنا تنزل کے بعد ترقی حاصل ہونے کا استعارہ ہے—

تنور گرم ہونا لڑائی کی شدت کا استعارہ ہے—

سمندر کی موجوں کا چاروں طرف سے گھر آنا رات کی تاریکی پھیلنے کا استعارہ ہے—

بھوکے بھیڑیوں کا جھپٹنا بہادروں کے حملہ آور ہونے سے استعارہ ہے—

دل کے لئے گھاس چارہ تلاش کرنا دیدار معشوق سے تفریح چاہنے ؟ استعارہ ہے—

دبی ہوئی چنگاریوں کا سلگ اٹھنا کینوں کے ظاہر ہونے کا استعارہ ہے

موتی خاک پر بکھیرنا نصیحت ضایع کرنے کا استعارہ ہے—

صبح کی روشنی میں جاگنا بڑھاپے میں ہوشیار ہونے کا استعارہ ہے—

دل کے کناروں پر ابر چھایا رہنا شک و تردد کی حالت میں مبتلا رہنے کا استعارہ ہے—

یمن کے ریشمی ملقش تھانوں کا وادی میں پھیلایا جانا رنگ برنگ کی نباتات کا نمایاں ہونے کا استعارہ ہے—

م پردے کے اندے کواری پردہ نشین لڑکیوں کے لئے استعارہ ہے—

بچھو کے سوراخ سے کئی بار کاٹا جانا بار بار ایک ہی مصیبت میں مبتلا ہونے کا استعارہ ہے—

بان یا اند کی شاخوں کا لچکنا معشوق کے ساتھ چلنے کا استعارہ ہے—

ریت میں تیرنے والے سفینے اونٹوں کا استعارہ ہے—

اُس کے چہرہ پر خالص کُندن کی اشرفیاں بکھری ہوئی ہیں۔یا اُس کے رخسارے پر شعری ستارہ نے طلوع کیا ہے۔ یا ثریا اُس کی پیشانی سے آویزاں ہے۔یہ سب حسن و جمال کے استعارے ہیں—

موت کا ہنستے ہوئے گھات سے نکلنا میان سے تلوار کھینچنے کا استعارہ ہے

وادی جواء کی نیل گائیں یا وجیرہ کی سفید ہرنیاں حسین عورتوں کا استعارہ ہے—

لہراتے سانپ لچکتے نیزوں کا استعارہ ہے—

لباس کا داغدار ہونا عزت بگڑنے کا استعارہ ہے—

تلوار کی دھار کُند ہونا جذبۂ شجاعت کے فنا ہونے کا استعارہ ہے—

عربی شاعروں کی تشبیہات | حملہ آور کی تشبیہ غضبناک اور بھوکے شیر سے—

نیزے کے کوچے سے خون تیزی کے ساتھ جاری ہونے کی تشبیہ بھری ہوئی مشک کے دھانے سے، جب کہ مشک کھول دی جائے—

لڑائی کی تشبیہ چکی سے—

سینے میں عداوت کے جوش کی تشبیہ ہانڈی کے جوش سے—

چوکنے آدمی کی تشبیہ شکرے سے—

پہاڑ کی گھاٹی سے تیزی کے ساتھ اُترنے کی تشبیہ شہباز کے جھپٹنے سے

جو اپنے شکار پر آ رہا ہو—

گھوڑوں کے دم اُٹھا کر بھاگنے دوڑنے کی تشبیہ دودھ والی اونٹنی سے جو بچہ گُھپا دودھ دھنیے سے گھبرا کر دم اُٹھاتی ہے—

تیز نگاہی کی تشبیہ گھوڑے کے بچے کی نگاہ سے جس کی عمر دو سال کی ہو—

لڑائی کے گھوڑوں کی تشبیہ بھوتوں سے جو تیز چلتے ہیں اور جن کے سر گرد آلود ہوتے ہیں—

جنگجو بہادروں کی تشبیہ شری کچھار کے شیروں سے—

زرہ پوش کی تشبیہ چیتے سے—

غصے سے ہلاک کرنے والے کی تشبیہ مقید اُونٹ سے جو ہری گھاس کو روند ڈالتا ہے—

انبوہ لشکر کی تشبیہ ٹڈی دل سے—

مددگار انسان کی تشبیہ تلوار سے جو وقت پر کام دینے میں کبھی خطا نہیں کرتی—

بری اور موذی اولاد کی تشبیہ وجع القلب (درد دل) سے—

چھوٹی لڑکیوں کی تشبیہ لوے کے بچوں سے—

غلام کی تشبیہ ترکش سے کہ جیسے وہ تیروں کا مخزن ہوتا ہے اسی طرح غلام اسرار کا مخزن ہوتا ہے—

چغل خوروں کی تشبیہ بچھوؤں سے—

دباؤ نہ ماننے کی تشبیہ اونٹنی کی اُس حالت سے جب کہ وہ با وجود پاؤں باندھنے کے دودھ نہ دے—

بہادر آدمی کی تشبیہ شیر کی ناک سے جس نے ذلت کی بو کبھی نہیں سونگھی—

عورت کی تشبیہ ہرن سے، نیل گائے سے اور پتھر کی مورت سے—

نیزوں کے باہم ٹکرانے کی تشبیہ بھوکے مینڈکوں کی آواز سے—

لڑائی کے سخت دن کی تشبیہ ایسے تاریک دن سے جس میں تارے نظر آئیں—

ایسا شخص جو دوسروں کو تکلیف پہنچائے اور اُس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے، اُس کی تشبیہ نیلی مکھی سے، جو اونٹ کو کاٹتی ہے اور اونٹ کا اُس پر قابو نہیں چلتا—

لڑائی ہوتی دیکھکر لڑائی میں شامل ہونے والے کی تشبیہ خارشتی اونٹ سے کہ اس کے سبب سے تندرست اونٹوں کو بھی خارش ہوجاتی ہے—

رات کی تاریکی کی تشبیہ سمندر کی موج سے—

کانے میں درد ناک آواز کی تشبیہ بچہ دار اونٹنیوں کے رونے سے، جن کے بچے ایام بہار میں مرچکے ہیں—

نازک اندام عورتوں کی تشبیہ آکھی یا رنڈ کے پودوں سے—

ارادے کے پکے انسان کی تشبیہ سانپ کے سر سے کہ جہاں چاہتا ہے بے تکلف گھس جاتا ہے—

اونٹنی کی چال کی تشبیہ ایسے بادل کی چال سے، جو جنوبی ہوا کے ساتھ دوڑتا ہو اور پانی سے خالی ہو—

گھوڑی کی رفتار کی تشبیہ پیاسی کبوتری کے اُڑنے سے—

سخی آدمی کی تشبیہ موسم بہار سے—

گوری پنڈلیوں کی تشبیہ ہاتھی دانت یا سنگ مر مر کے ستونوں سے—

لٹیروں اور حملہ آوروں کی تشبیہ عقاب سے—

شراب کے پینے سے انگلیوں کے پوروں میں جو دوران خون ہوتا ہے، اُس کی تشبیہ چیونٹیوں کے رینگنے سے—

نازنین عورتوں کے نزاکت کے ساتھ چلنے کی تشبیہہ سفید پتلے سانپ ۔
رینگنے سے جس کو صبح کی شبنم نے ٹھنڈا کر دیا ہو اور اچھے پورے بل نہ کھو
سکتا ہو—

عاشق کے رونے کی تشبیہہ کبوتری کے رونے سے—

آگ کے شعلوں کی تشبیہہ اونٹ کے سرخ پھیپڑوں سے—

نامرد انسان کی تشبیہہ کفتار، خرگوش اور شتر مرغ سے—

آسانی سے مطلب حاصل ہونے کی تشبیہہ خرما کھانے سے—

تکلیفیں برداشت کرنے کی تشبیہہ ایلوا چاٹنے سے—

ذلیل آدمی کی تشبیہہ میدان کی کھمبی سے کہ جو چاہے اُسے توڑ کر لے جائے

جو لوگ کاہل ہوں اور سفر کے عادی نہ ہوں، اُن کی تشبیہہ بنات النعش سے۔کیونکہ وہ قایم ہیں اور دیگر ستاروں کے ساتھ حرکت نہیں کرتے—

وہ شخص جو کسی کا مطیع و محکوم ہوجائے، اُس کی تشبیہہ خارشتہ اونٹ سے، جو روغن قار* ملنے والے کا مطیع ہوجاتا ہے۔(خارشتی اونٹوں کے بدن پر روغن قار ملا جاتا تھا اور اس سے ان کی خارش کو سکون حاصل ہوتا تھا)

اونٹوں کے کوہانوں کی تشبیہہ مٹی کے ان ڈھیروں سے جو چیونٹیوں کے گھروں کے آس پاس جمع ہوتے ہیں—

دانتوں کی تشبیہہ بابونہ کے پھولوں سے—

اونٹنی کی چربی کی تشبیہہ بٹے ہوئے سفید ریشم کی جھالر سے—

---

* ہمارے ہاں روغن قاز ملنا محاورہ ہے۔یعنی خوشامد کی باتوں سے کسی کو خوش کرنا۔عجب نہیں کہ اسی محاورہ میں روغن قاز کی جگہ روغن قار ہو کیونکہ جس طرح روغن قار ملنے سے خارشتی اونٹ کو سکون حاصل ہوتا ہے اسی طرح خوشامد پسند انسان خوشامد کی باتوں سے خوش ہوتا ہے۔اگر کاتبوں نے ر کو ز بنادیا ہو تو کیا تعجب ہے (سلیم)

عورتوں کی تشبیہہ شتر مرغ کے انڈوں سے (یہ تشبیہہ رنگ کے لحاظ سے ہے۔ شتر مرغ کے انڈے کے رنگ میں سفیدی کے ساتھہ هلکی زردی ہوتی ہے اور یہ رنگ اہل عرب کے نزدیک پسندیدہ تھا)—

معشوقہ کی گردن کی تشبیہہ گردن آهو سے—

حسین عورتیں کی کمر کی تشبیہہ اونٹ کی مہار سے—

ساق کی تشبیہہ نرکل کی شاداب پوری سے—

گھنے بالوں کی تشبیہہ درخت خرما کے خوشے سے—

نرم و نازک اُنگلیوں کی تشبیہہ موضع ظبی کے اُن کیڑوں سے جو سفید رنگ کے ہوتے ہیں اور جن کے سر لال ہوتے ہیں اور جن کو اسروع کہتے ہیں—

انگلیوں کی تشبیہہ اسحل کی مسواکوں سے (یہ عرب کا ایک درخت ہے جس کی شاخیں پتلی اور نرم اور سیدھی ہوتی ہیں اور اِن شاخوں کی مسواکیں بنائی جاتی ہیں) —

ایسا آدمی جو شریر ہو اور جسے کوئی آدمی پاس بٹھانے کا روادار نہ ہو اس کی تشبیہہ جوے کے اُس تیر سے جس کا کچھہ حصہ نہیں ہرتا اور جسے ہر شخص اپنے پاس سے ہٹاتا ہے—

ذلیل آدمی کی تشبیہہ آب پاشی کے اونٹ سے جو چرس کھینچنے کی حالت میں کبھی آگے جاتا اور کبھی پیچھے ہٹتا ہے۔ یعنی آب پاشی کرنے والے شخص کے اشارے کا تابع ہوتا ہے—

لشکر کی تشبیہہ پھیلے ہوے برسنے والے ابر سے یا سیلاب سے کہ جو کچھہ اُس کے سامنے آتا ہے اُس کو بہا لے جاتا ہے —

جلا قوم شخص کی تشبیہہ خارشتی اونٹ سے جو تندرست اونٹوں سے الگ باندھا جاتا تھا—

زلفوں کی تشبیہہ درخت تنوم کے سانپوں سے جو اُس کے گرد بیٹھے

رهتے هیں —

تند حو آدمی کی تشبیه شیر سے جو اپنے بچوں سے جدا کیا جائے —

تیز رفتار گهوڑے کی تشبیه ایسے شاهین سے جس نے میدان میں خرگوش کو دیکھا هو اور درختوں کے جھنڈ میں اُس کے بھاگ کر چھپ جانے سے پہلے اُس کو آ لیا هو —

بے صبر آدمی کی تشبیه چتکبری اونٹنی سے جو دردِ زہ میں مبتلا هو۔ (خیال تھا کہ اس رنگ کی اونٹنی صابر نہیں هوتی) —

فریب زدہ اور احمق آدمی کی تشبیه اُس شخص سے جو سراب کی لہروں کو دیکھکر اپنی مشک کا پانی بہادے —

زرہ کی تشبیه ایسی جھیل کی سطح سے جس کے پانی کو بادِ دبور آهسته آهسته حرکت دے —

نیزوں کے پے درپے پڑنے کی تشبیه جلاهوں کے اُس آله سے جسے برولہ کہتے هیں اور جسے تھان کے ناهموار تاروں کے برابر کرنے کے لئے تھان پر پھیرتے هیں اور وہ تھان کو خوب کھرچتا اور اُس میں گھس جاتا هے —

جنگجو آدمی کی تشبیه زرد رنگ کے پتلے سانپ سے جو زهر اُگلتا رهتا هے —

چالاک اور پھرتیلے آدمی کی تشبیه کفتار کے بچے سے —

شراب کی صراحیوں کی تشبیه بطخوں سے —

حسین عورت کی تشبیه شعری ستارے سے جو کہکشاں سے گزر رها هو —

شهد کی مکھی برابر هاتھ پر هاتھ مارتی هے جس طرح اُنگلی کٹا آدمی آگ نکالنے کے لئے چقماق کے پتھروں کو ایک دوسرے پر مارتا رهتا هے —

و اور هم ایک دوسرے سے اس طرح دور هیں جیسے فرقدین کے ستارے۔

دنیا اُس پر اس طرح تنگ هوگئی جیسے وہ چھوٹا سا گول گڑھا جس پر

میدان اپنا جال بچھاتا ہے —

اُن کے ہمسایے آفتوں سے اس طرح محفوظ ہیں جیسے پہاڑی بکریاں جنگلی درندوں سے —

دشمن جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس طرح زور لگا رہے ہیں جیسے کوئی حاملہ عورت بچہ جننے کے وقت کونتھتی ہے —

سردار کے گرد اُس کے محافظ اس طرح گھومتے تھے جیسے دوار بت کے پرستار اُس کا طواف کرتے ہیں —

محبوبہ میرے ساتھ اس طرح شوق سے چلی جیسے لو اور پیاس میں چشمے کی طرف لپکتا ہے —

ناظرین ان کنایوں استعاروں اور تشبیہوں پر بھی اگر غور کی نظر ڈالیں گے تو یہ بات اُن پر روشن ہو جائے گی کہ عرب کے شاعروں نے ان میں بھی اپنی ملکی خصوصیات کا لحاظ رکھا ہے۔غرضکہ عرب کی شاعری اُن تمام خصوصیات کی ترجمان ہے جو عرب اور اہل عرب سے تعلق رکھتی ہیں۔جب تک ہماری زبان کا ادب ہندی شاعری اور عربی شاعری کی طرح ہماری ملکی خصوصیات کا ترجمان نہ ہو گا اُس کو ملکی ادب کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ہم نے اپنے قومی اور مذہبی خیالات و روایات کو اپنے ادب میں بھر دیا ہے۔اس کا کوئی مضائقہ نہیں ہے۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہم صدیوں سے جس ملک میں آباد ہیں اُس کی خصوصیات کی جھلک ہماری نظموں اور نثروں میں نہیں ہے۔ہندوستان میں کونسی ایسی دلربا اور شاندار چیز نہیں ہے جو ہندوستان سے باہر کے ملکوں ہی میں پائی جاتی ہے۔یہاں بلند اور شاندار پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہے۔یہاں گنجان جنگل ہیں جن میں عجیب اور خوفناک درندے آباد ہیں۔یہاں ایسے دلکش سبزہ زار ہیں جن کے منظروں کو دیکھکر انسان اچھل کرتا ہے۔یہاں ایسے

رنگ برنگ کے پھول ہیں جن کی رنگینیاں قوس قزح کو ماند کرتی ہیں-یہاں ایسے خوش الحان طیور ہیں جن کی راگنیاں روحانی جذبات کو زندہ کرتی ہیں-یہاں ایسے دریا ہیں جن کے پانیوں کی روانی اور دوانی تھل کی سطح میں ہلکورے پیدا کرتی ہے-یہاں ایسی نسلیں آباد ہیں جن کے اسلاف تمدن کی شاندار عمارتیں کھڑی کر چکے ہیں-یہاں قدم قدم پر حسن ہے، عظمت ہے، رنگینی ہے، دلفریبی ہے-غرضکہ شاعر مزاج انسانوں کے لئے وہ سامان موجود ہے کہ اگر وہ ذرا کروٹ لیں اور غفلت کی آنکھیں کھول دیں، تو ایک شاندار اور جمیل ادب کی بنیاد رکھ سکتے ہیں-ہندؤں نے اب سے پہلے فطرت کے ان منظروں پر نگاہ دوڑائی ہے-اگر ہم بھی اُسی عینک سے کام لیں تو ہمارا ادب اور ان کا ادب ایک ہوجائے گا اور آج نہیں کل ضرور ہم ایک علم کے سایے میں ترقی کے قدم بڑھائینگے-مگر اُس وقت کے آنے سے پہلے اپنی غلطیوں اور غفلتوں کی تلافی کرنی ضروری ہے—

پیپل

از

(جناب محمد عظمت الله خاں صاحب بی اے)

اونچے اونچے پھیلے پھیلے فطرت کے پالے پیپل
سرد و گرم زمانہ دیکھے
جتنے مضبوط اُتنے ہی پرانے گہری جڑوں والے پیپل
جتنا اوپر اُتنا نیچے

———:o:———

لوں کی لپٹیں تجھکوں جھلستیں آندھیاں دیتی ہیں تھپیڑے
اولوں کی چھالیں جاڑوں کے پالے
بادل کی گرج بجلی کی کڑک مینہ کے دھواں دھار دڑیڑے
سب سہتا ہے سینہ نکالے

———:o:———

گرمیاں آئیں تیرے پتے سوکھنے پیلے پڑنے لگے
رت کی سختی کیا جھیلینگے
اے لو! پتے سوکھے سوکھے اپنے آپ ہی جھڑنے لگے
پتوں کے نیچے ڈھیر لگینگے

———:o:———

ننھی ننھی ننگی لنڈوری ٹھنٹھ ہوئی اک اک ڈالی
پت جھڑ نے ہاتھ یہ پھیرا ہے
ڈرونا سا سوکھا سوکھا دھڑ تیرا خالی خالی
ایک رنڈاپا سا چھایا ہے

———:o:———

نوع نے تیری سختیاں جھیلیں اس کا ہی شاید ہے پھل
جنم نیا تو پھر لیتا ہے
ترت ہی تونے کایا پلٹی پیپلیاں ہیں اور کونپل
قدرت کا ایک تماشا ہے

———:o:———

کونپلیں تازی سوئیوں جیسی رنگ وہ دھانی ہلکا سا
اس میں جھلک وہ پیاری پیاری
ننھی ننھی پیپلیاں ہیں جڑے ہوئے تک ہیں گویا
جان کی ہے اک شعبدہ بازی

———:o:———

دو اک دن میں کونپلیں ساری پتے بنی ہیں کھل کھل کر
ننھے ننھے چکنے چمکتے
پیپلیاں بھی ہو چلیں گدری پکشی آتے ہیں تل تل کر
کھاتے پھدکتے اور چہکتے

———:o:———

چند ہی دن میں بڑھ گئے پتے لدی ہوئی ہے ہر ڈالی
جان پڑی ہے رونق آئی

چھاؤں ھے ٹھنڈی روکھہ ھرے ھیں آنکھوں میں ٹھنڈی ھریالی
ایک دلہن سنوری سنورائی

—:o:—

پتے چکنے ٹھنڈے ھرے بھرے ٹہنی ٹہنی
تو ھے اک قدرت کا ڈیرا
پکشی بولیاں بولنے والے دن رات کی تیری بستی
دن کا ٹھکانا رین بسیرا

—:o:—

کوئی بڑا سا تیرا پتا بالک کے ھاتھہ آتا ھے
موڑا اپنا ماتھے پہ ٹھونکا
کمر پہ ڈنٹھل باندھ پپیہیا اک خاص بن جاتا ھے
منہ سے پھونکا اور بول اٹھا

—:o:—

میری ھستی بھی اے پیپل! تیری سی اونچی کھڑی ھو
گھنی گھنی پھیلی پھیلی ھو
جان کی سوتوں تک اک اک جڑ گہرائیوں میں پہنچی ھو
آندھیاں جھیلی مضبوطی ھو

—:o:—

سوکھے سکھائے آدھ موے بیدم جھڑ جائیں من کے پتے
آئیں پتے تازے
لے کوئی بیکل روح بسیرا بھٹکا من چھاؤں میں بیٹھے
بھوں کو ھاتھہ آئیں پپیہے

غالب کا فلسفہ

از

جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

مرزا اسد اللہ خان غالب کے حالات زندگی اور شاعری قریب زمانے کی تاریخ اور اسلامی ہند کی مخلوط تہذیب کا خاص دلچسپ مرقع ہے۔ مرزا کے دادا شاہ عالم (ثانی) کی بادشاہی میں سمرقند سے ہندوستان آئے اور اُن کی زبان ترکی تھی۔ مرزا کی تعلیم فارسی میں ہوئی لیکن مادری زبان اُردو بن گئی! ابتداً اسی زبان میں اُنہوں نے شعر کہنا شروع کیا —

مرزا کے اجداد تلوار کے دھنی، جانباز سپاہی پیشہ لوگ تھے اور شاہ عالم کے آخر زمانے کی لڑائیوں تک ہم انہیں مصروف جنگ و پیکار دیکھتے ہیں۔ لیکن خود مرزا صاحب کو دیکھئے تو محض ایک ناز پروردہ بزمی امیر زادے ہیں جنہیں میدان رزم کی ہوا بھی نہیں لگی —

اسی طرح مذہبی خیالات اور قومی جذبات میں تغیر نظر آتا ہے کہ مرزا کے بزرگ اور دیگر اہل خاندان تو "ماوراالنہری" سنی ہیں مگر خود اُن پر شیعیت غالب ہے اور کچھ اپنے نومسلم پارسی اُستاد کے فیض تربیت سے اور غالباً کچھ فارسی تاریخوں کے نامعتبر قصص و روایات پڑھکر وہ ذوق و مزاج کے اعتبار سے خالص ایرانی بن گئے ہیں اور ترک نژاد ہونے کے باوجود اپنے آپ کو دولت پارسی کا سورث و نوحہ خواں سمجھنے لگے ہیں۔ جیسا کہ اشعار ذیل سے تراوش ہوتا ہے—

گہر از رایت شاہان عجم بر چیدند ۔۔۔ بہ عوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند ۔۔۔ بہ سخن ناصیۂ فرکیانم دادند
ہرچہ از دستگہہ پارس بہ یغما بردند ۔۔۔ تا بنالم ہم از اں جملہ زبانم دادند

حالات و خیالات کی یہ نیرنگی اس بات کی دلیل ہوسکتی ہے کہ مرزا غالب کو بہت تغیر پسند طبیعت ملی تھی اور عجب نہیں کہ اسی مزاج کی بدولت ان کے کلام میں وہ بو قلمونی پیدا ہوگئی ہو جس پر غالب کے ہر طالب علم کی نظر پڑتی ہے۔یہ خصوصیت دیوان اردو کی نسبت فارسی کلیات میں زیادہ نمایاں ہے اور اس کی غزلیات و قصائد میں کہیں بیدل کی خاص فلسفیت' کہیں عرفی کا شکوہ' حزیں کا تیکھاپن نظر آتا ہے کہیں نظیری کا حکیمانہ حسن بیان اور طالب و ظہوری کی سنجیدہ روانی۔یہ شبہ جس طرز پر جو کچھہ کہا ہے وہ اس رنگ میں نہایت خوب ہے لیکن اسی خصوصیت نے مرزا کے دیوان میں ایک خاص تلوع پیدا کر دیا جو معتقدین کے نزدیک تو ہمیں بہت سے اساتذہ متاخرین کے مطالعہ سے مستغنی کر دیتا ہے مگر نکتہ چینوں کی نگاہ میں شاعر کی یہ رنگا رنگی خامی کی دلیل ہے اور یہی خیال مفتی صدرالدین خاں آرزو نے ایک موقع پر ظاہر کیا تھا*—

مولانا حالی مرحوم نے طرز بیان کے اس اختلاف کی بہت خوبی سے توجیہ کی اور وضاحت سے بتایا ہے کہ ابتدا میں مرزا صاحب نے زمانے کے مقتضی سے بیدل و اسیر کا رنگ اختیار کیا تھا اور یہ اُن کی بڑی ترقی اور سلامتئی طبع بلکہ اجتہاد فکر کی علامت تھی کہ وہ از خود اس راہ کی خرابیوں سے آگاہ ہوے اور اسے چھوڑکر انہوں نے ظہوری اور نظیری کا تغزل اختیار کیا—

خود مرزا غالب نے اپنے بعض خطوط میں یہی بات لکھی ہے لیکن اس قول

---

* یادگار غالب

کی سب سے اچھی تصدیق اُن کے اردو دیوان خاص کر "نسخہ حمیدیہ" کے دیکھنے سے ہوتی ہے کہ ابتدائی زمانے کا کلام تو اس درجہ مغلق اور پیچیدہ ہے کہ بعض شعر بالکل معما بن گئے ہیں مگر بخلاف اس کے آخر زمانے کے اشعار حسن سلاست کا نمونہ ہیں اور مثال کے طور پر الف و یا کی ردیف میں آخر عہد کی متعدد غزلیں ایسی موجود ہیں جو لطافت و سادگی میں کسی طرح میر و داغ کے منتخب اشعار سے کم نہیں اور یہ اُس شخص کی یقیناً بڑی تعریف ہے جس نے شاعری اس قسم کے شعروں سے شروع کی تھی کہ —

خودآرا وحشت چشم پری سے شب وہ بدخو تھا
که موم آئینہ تمثال کو تعویذ بازو تھا
غم مجنوں عزاداران لیلیٰ کا پرستش گر
خم رنگ سیاہ از حلقہ ہاے چشم آہو تھا

(نسخہ حمیدیہ صفحہ ۲۹)

لیکن مرزا غالب کے شعر سادہ ہیں یا پیچیدہ ، اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی شخصیت کا نقش ہر جگہ متجلی ہے - ہر خیال جو نغمہ و صوت کی صورت میں ملفوظ ہوا شاعر کے اوصاف ذاتی اور جذبات امتیازی کا سراغ ہے - یہ وہ خصوصیات طبعی ہیں جن سے مرزا کی زندگی اور شاعری ابناے ملک میں ممتاز ہوئی - یعنی اُن کی بلندخیالی ، عالی ظرفی مہر و صداقت ، استغنا و خودداری وغیرہ - زندگی ہی میں اُن کی مہر و مسالمت ضرب المثل ہو گئی تھی - اُن کی شرافت و راستی کے قصے آج تک زباں زد ہیں وہ نہایت فیاض اور عالی حوصلہ طبیعت رکھتے تھے اور گو عملی دنیا میں انہوں نے کوئی بڑا کام نہیں کیا لیکن عالم خیال میں ان کا ظرف جب کرتا وہ بجلی طلب کرتا جس کی طور کو تاب نہ آئی تھی اور ان کی آنکھ جب چاہتی وہ قطرۂ اشک چاہتی جس نے موتی بننا پسند نہ کیا تھا۔

کلام کی سادگی کے متعلق ایک اور بات بھی قابل گزارش ہے - وہ یہ کہ اگر ہم اُن کے اردو کلام کو سامنے رکھیں جس کے تقدم و تاخر کا حال زیادہ یقینی طور پر معلوم ہے تو یہ اندازہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ شاعر کی یہ سلاست وسہل گوی سن و سال کے ہمقدم بڑھی ہے اور طرز سخن کے ساتھ مضامین شعر میں بھی تغیر ہوا ہے - یعنی فلسفیانہ مسائل اور نازک خیالی کے بدلے آخری غزلوں میں زیادہ تر عاشقی اور "معاملہ بندی" کے مضمون آتے ہیں اور نئی ترکیبوں اور عجیب و نادر تشبیہوں کی بجاے عام فہم استعارے اور صرف سادہ اور شستہ الفاظ سے کام لیا گیا ہے - یہ اشعار سلاست کے زیور سے آراستہ ہیں اور سلاست بجاے خود شعری کی بڑی خوبی ہے - لیکن اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ گو تخیل کی قوت اور بلندپروازی میں کمی نہ آی ہو، اس کے صرف کرنے میں سن رسیدہ شاعر محنت و کاوش سے ضرور پہلوتہی کرنے لگا ہے - اُس کی مثال نامدار اس پہلوان کی سی ہے جو فن کشتی کا مشتاق ماہر ہے مگر عمر کے اقتضا سے زور طاب اور گہرے دانو کرنے سے بچتا ہے اور انہی چند دانو پیچ سے کام نکال لیتا ہے جو اُسے خوب رواں اور دیکھنے والوں کو مرغوب ہیں —

اس سلسلے میں مجھے مرزا غالب کے سب سے آخری کلام کا خیال آیا - نواب احمد سعید خاں صاحب طالب مرحوم فرماتے تھے کہ مرزا کی سب سے آخری غزل جس کے چندھی روز بعد وہ مرض الموت میں مبتلا ہوے یہ ہے : —

شب وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ

خراج بادشہ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج
کہ بن گیا ہے خم جعد پر شکن تکیہ

بنا ہے تختۂ گلہاے یاسمیں بستر
ہوا ہے دستۂ نسریں و نسترن تکیہ

فروغ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رخت خواب ہے پرویں تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر
اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگرچہ زانوے فل پر رکھے دمن تکیہ

بضرب تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
کہ ضرب تیشہ پہ رکھا تھا کوہکن تکیہ

یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک
رکھو نہ شمع پہ اے اہل انجمن تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے لیکن
اٹھائے کیوں کہ یہ رنجور خستہ تن تکیہ

غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
ہوئی ہے اس کو مری نعش بے کفن تکیہ

شب فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے من تکیہ

روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکیہ کلام"
اب اس کو کہتے ہیں اہل سخن "سخن تکیہ"

هم اور تم " فلک پیر " جس کو کہتے ھیں
فقیر غالب مسکین کا ھے کہن تکیہ *

غزل میں مرزا صاحب کا خاص انداز نمایاں ھے اور شعر لطف سے بھی خالی نہیں مگر ایک تو ردیف سے کلام میں کچھہ تکلف پیدا ھوگیا دوسرے دو تین کے سوا باقی سب شعر صرف " قافیہ پیمائی " نظر آتے ھیں حالانکہ مرزا صاحب نے اپنی راے کو خود کئی جگہ ظاھر کیا ھے کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں، مضمون آفرین کا نام ھے —

———:o:———

مگر یہاں ھمیں کلام غالب کی خصوصیات پر بحث کرنی نہیں ھے - بہترین قلم یہ خدمت انجام دے چکے ھیں اور یادگار غالب میں اگر جس اعتقاد اور غالب پرستی کے عنصر کی یا اسے مغربی شاعری سے تکران کی کمی رہ گئی تھی تو اسے ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے لاجواب مضمون نے پورا کر دیا ھے - ھم اس موقع پر ایک مختصر تمہید کے بعد صرف " فلسفۂ غالب " کا مطالعہ کرنا چاھتے ھیں - یعنی غالب کے اردو دیوان کی روز افزوں قبولیت دیکھکر ھمیں اس بات پر غور کرنے کا خیال آیا کہ غالب کی تعلیم کیا ھے ؟ اور کس قسم کے خیالات ھیں جنھیں شاعر اپنے سامعین کے دلنشیں کرنا چاھتا ھے ؟

یہ سچ ھے کہ شاعری حکمت و فلسفہ نہیں مگر حکیمانہ اور فلسفیانہ ضرور ھوسکتی ھے - اسے درس کے نصاب میں داخل نہ کیا جاے لیکن لوگوں کے ذوق اور خیالات پر اس کے اثر سے کوی انکار نہیں کرسکتا - شاعری کی تعریف

---

* یہ غزل کسی مشاعرے کے واسطے لکھی گئی اور غالباً اس کے کل دستے میں چھپی بھی تھی - مگر حال میں اسے طالب مرحوم کی قلمی بیاض سے اڈیٹر الھلال نے نقل کر کے اپنے اخبار میں شائع کیا اور اس سے مطبع نظامی بداوں لے لے کر اپنے نسخۂ دیوان غالب کے آخر میں شامل کر دیا ھے —

میں اهل فکر نے عجیب عجیب موشگافیاں کی هیں-انهیں پڑهکر بعض دفعه
گمان هوا که شاید تعریف کرنے والے سوچتے سوچتے شاعری کی بجائے
رین شاعری "کی تعریف کرنے لگے هیں اور اس لئے اُن کے بیانات میں
اختلاف و بتائن نظر آتا هے-کیونکه اچهی شاعری کا تصور هر شخص کے
میں جداگانه هے-ورنه میری دانست میں نفس شاعری کی همه‌گیری اس
ف میں سماسکتی هے که "شاعری حسن بیان کا دوسرا نام هے" وه هر
میں الفاظ کے صحیح اور پر تاثیر استعمال کا مستقل فن هے اور قواعد
ض-موسیقی اور تمثل سب سے بے نیاز و آزاد هے-یه چیزیں اس کے لطف
لکشی میں اضافه کرتی هیں مگر اس کا لازمه نهیں اور اگر ایسا نه هو تو
ئد قاآنی کا ثنا خواں و هفت میں اور تاگور کی شاعری کا کبهی لطف نه اٹهائے
نظیری کا مداح "نهاں دمے" سن کر کبهی نه جهومے—

یه درست هے که هر شاعر کی شاعری پر تاثیر و حکیمانه نهیں هوتی-اسی
ح جس طرح هر نام نهاد واعظ، خطیب اور هر جبه پوش درویش صاحبدل
یں هوجاتا-عروض و موسیقی نے شاعری کو صنعت بنادیا هے اور اکثر نا اهل
ر کهنے اور شاعر سمجهے جاتے هیں-یهی رنگ دیکهکر مرزا غالب نے فریاد
د کی تهی که:-

آنکه صور ناله در شور نفس موزوں دمید
کاش دیدی کایں نشید شوق، فن خواهد شدن
چشم کور آئینۂ دعوی بکف خواهد گرفت
دست شل مشاطه زلف سخن خواهد شدن

یکن اگر مذکوره بالا تعریف تسلیم هو تو تاثیر شعر میں کسی گفتگو کی گنجائش
ہیں رهتی-حسن بیان کا جلوه و هر شخص نے صحبت احباب میں، بازر کی دکان
یں، وعظ کی محفل میں، سیاسی جلسوں میں مشاهده کیا هوگا- وه یونانی

حکیم بھی جس نے شعرا کو اپنے خیالی ملک سے قابلِ اخراج قرار دیا تاثیرِ شعر کا منکر نہ تھا بلکہ اس کے برے اثرات سے خوف کھاتا تھا۔ عالم گیر بادشاہ کی طرح جس نے دیوان حافظ کا درس حکماً موقوف کردیا تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ جرمنوں کو دنیاکی نامی گرامی قوم بنانے کے اسباب قوی میں ایک شاعر کا قلم بھی ناگزیر شمار ہے ―

---:o:---

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مرزا غالب نے مولوی رومی کی طرح رشد و ہدایت کے لئے شاعری کا پیرایہ اختیار کیا تھا لیکن اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ انہوں نے محض تفنن یا عاشقانہ مضامین لکھنے کے واسطے یہ دردِ سری نہیں اٹھائی اور اکثر اشعار مسائل زندگی پر اُن کے افکار و آرا کا ایک جامۂ خوشنما ہیں۔ ابتدائی کلام سے اس قسم کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:― غزل (۱)

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب― دل نہ سمجھ بلا سمجھ

وحشت درد بے کسی بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمر خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

اے بہ سراب حسن خلق تشنۂ سعی امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ

گاہ بہ خلد امید وار گہ بہ جحیم بیمناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفت ما سوا سمجھ

ہے خط عجز ما و تو اول درس آرزو
ہے یہ سیاق گفتگو۔کچھ نہ سمجھ خدا سمجھ

نغمہ ہے' محو ساز رہ۔نشہ ہے' بے نیاز رہ
رند تمام ناز رہ خلق کو پارسا سمجھ

غزل (۱)

قطع سفر هستی و ارارم فنا هیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزش پا هیچ
حیرت همه اسرار پہ مجبور خموشی!
هستی نہیں جز بستن پیمان وفا هیچ
تمثال گداز آئینه هے عزت بینش
نظاره تصیر ' چمنستان بقا هیچ
کس بات پہ مغرور هے اے عجز تمنا
سامان دعا وحشت و تاثیر دعا هیچ

اسی طرح اس قصیدے کی تشبیب:—

توڑے هے عجز تنک حوصله بر روے زمیں
سجده تمثال وه آئینه کہیں جس کو " جبیں "

اور یه پورا قصیده: ع:—

جو نه نقد داغ دل کی کرے شعله پاسبانی
تو فسردگی نہاں هے بکمین بے زبانی

جو پہلی مرتبه بحالت اصلی نسخه حمیدیه میں چھپے (صفحه ۳۰۷،۳۰۱) فلسفیانه کلام کا نمونه هیں اور انہیں پڑھنے میں بعض وقت معلوم هوتا هے که گویا شاعر الفاظ کے راگ میں انسانی زندگی پر ایک دلچسپ و عبرت آموز خطبه کا رها هے—

یہی فلسفیت غالب کی قبولیت کا راز هے- فارسی شاعری میں بلند رتبه فلسفیانه کلام کے بہت سے نمونے موجود هیں لیکن هندوستان کے جدید تعلیم یافته جس کی نگاه سے فارسی ادب محجوب هوتا جاتا هے- اردو زبان میں

کلام غالب کو نادر و مختلف شے پاتے ہیں۔ سوقیانہ اور فرسودہ مضامین عاشقی کی بجائے انہیں جا بجا مشرقی تغزل کے لباس میں ایسے بلند اور حکیمانہ خیالات نظر آتے ہیں جن سے دماغ میں جودت و تازگی اور تخیل میں رفعت اور پرواز کی قوت پیدا ہوتی ہے—

غالب کے فلسفیانہ خیالات کو پرتالنا اس مضمون کا مقصود ہے—

جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا، فلسفہ شعر کو درسی باقاعدگی کی نظر سے جانچنا نہ چاہئے۔ خیال کی دنیا جس میں شاعر مصروف سیر ہے، حقیقی دنیا سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ حیران ساز ہے اور بلند فکر شعرا میں بہت کم ایسے ہیں جو کسی خاص نقطے کو اپنا مطمح نظر بنا سکے ہوں ورنہ جس طرح دماغ شاعر متضاد افکار و اوہام کا مہبط ہے اسی طرح کلام شاعر میں بھی بالکل مختلف جذبات اور متبائین خیالات نظر آتے ہیں۔ مرزا غالب کی شاعری اس عام قاعدے سے مستغنی نہیں۔ پھر بھی غور کرنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مسائل زندگی پر اُن کی راے کیا ہے اور وہ خیال کی کن کن منزلوں سے گزری ہے۔ چنانچہ اگر ہم ان خیالات کو بطور خود چند مدارج میں مرتب کرنا چاہیں تو پہلی منزل کو شوق تماشا سے منسوب کرسکتے ہیں جس میں شاعر نہایت اشتیاق کے ساتھ صحیفۂ حیات کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہے۔ یہ شوق کچھ عرصے کے بعد تحیر و کم گشتگی سے بدل جاتا ہے اور آخر میں اسے معلوم ہوتا ہے اس دید و تماشا کا حاصل کچھ نہ تھا۔ یہ گویا سالک راہ کی تیسری منزل تھی اور اس سے آگے بڑھنے میں اس پر ایک خاص قسم کا ہیجان و اضطراب طاری ہوتا ہے کیونکہ اگلی منزل محض یاس و تاریکی کا عالم ہے جہاں شاعر پر دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی بے حقیقتی پوری طرح آشکار ہوجاتی ہے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ وہ عالم تسلیم و فنا میں آجاتا ہے جو اگرچہ عشق کی معراج اور نہایت دلکش مقام ہے

لیکن انسان کو جیتے جی مردہ اور معطل کر دیتا ہے۔اس لئے اہل ہمت یہاں سے بھی ترقی یا رجوع الی البقا کرتے ہیں اور اسی بے بود اور معدود زندگی کو طلب صادق میں گزارنا مقصود حیات سمجھتے ہیں۔ مطلوب حقیقی کی طلب و تلاش کا سب سے آخری مرتبہ وہ ہے جسے صوفیہ کی اصطلاح میں وری الوری کہتے ہیں اور حسن ظن چاہتا ہے کہ غالب کا تصور اس مقام بلند تک پہنچا ہو جہاں طالبان شہود کو عجز ادراک کا ادراک ہوا ہے مگر بہتر ہے کہ اس کا فیصلہ خود ارباب فہم کی رائے پر چھوڑ دیا جائے—

ا ۔ شوق تماشا

دشت و چمن میں طرح طرح کے غنچے کھلتے دیکھکر غالب کو یہ سبق ملا ہے کہ ہر آنکھ، خواہ اس کی صلاحیت کچھ ہی ہو، کھولنے اور دیکھنے کے لئے عطا ہوئی ہے

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھر، باغبان قدرت نے جو رنگیں بساط دنیا میں بچھائی ہے وہ اس قابل ہے کہ خود مہر و ماہ اس کا تماشا کریں اور گل نرگس دیدۂ بینا بن جائے:—

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوے مہر و ماہ تماشائی

دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر — روکش سطح چرخ مینائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے — چشم نرگس کو دی ہے بینائی

یہ بہار آفرینی اور عالم آرائی جہاں بلبل کے بد نما پر کو لہلہاتا چمن بنا دیتی ہے وہیں شوق دید اور قوت سیر پیدا کر دینا بھی اس کا خاصہ ہے—

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار
دل پروانہ چراغاں، پر بلبل گلزار

آغوش گل ہے آئینۂ ذرہ ذرہ خاک
عرض بہار، جوہر پرواز ہے مجھے

اور اس ذوق شوق کے طفیل شاعر کو مٹی کا ہر تودہ حسن مجسم اور خاک کا ہر ذرہ نگاہ محبوب کی چمک نظر آتا ہے—

طاوس خاک، حسن نظر باز ہے مجھے
ہر ذرہ چشمک نگۂ ناز ہے مجھے

اپنے شوق کی اتنی ہمہ گیری اور دور رسی پر خود صاحب شوق کو تعجب ہے اور وہ اپنے جذبات کو کسی اور نفس کلی کی کارفرمائی سمجھنے پر مائل ہے—

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھسے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

لیکن شوق دید کی خوبی اور صداقت یہ ہے کہ دیکھنے والا غور و تدبر کی صلاحیت پیدا کرکے اس چمن میں آئے جہاں کا ہر پتا صحیفۂ کائنات کا پر معنی ورق ہے—

بے چشم دل نہ کر ہوس سیر لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق، ورق انتخاب ہے

اس مضمون کو مرزا نے اور بھی کئی جگہہ بیان کیا ہے کہ اگر انسان غفلت و خود پسندی میں مبتلا نہ رہے تو ٹہانس کے ہر پتّے میں صنعت ایزدی اور پتھّر کے ہر ٹکڑے میں خود صانع کا ظہور جلوہ نما ہے —

غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

اے وائے غفلت نگہہ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لخت دل کوہ طور تھا

مرزا اس بات سے نا واقف نہیں کہ ارباب شوق کو بعض اوقات اپنے مقصد میں سخت نا کامی ہوتی ہے لیکن وہ اس سے بد دل نہیں ہوتے۔اُن کے نزدیک چشم بصیرت کو کُل کا مشاہدہ کرنے کے لئے ایک جزو کا دیکھہ لینا کافی ہے —

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

—:o:—

۲-عالم تحیر و گم گشتگی

لیکن شوق تماشا جب اس طرح با معنی اور بالمقصد ہو جائے تو پھر سالک کو بہت دن عالم حیرت میں رہنا پڑتا ہے کیونکہ فطرت کے ازلی اور عالمگیر حسن کے رموز سمجھنا کوئی آسان بات نہیں ہے —

ھنوز محرمی حسن کو ترستا ھوں   کرے ھے ھر بن مو کام چشم بینا کا

سراغ آوارۂ عرض دو عالم شور محشر ھوں
پر افشاں ھے غبار آں سوے صحرا ے عدم میرا

یعنی طالب تلاش حقیقت میں بھٹکتے بھٹکتے عدم کے پار پہنچ گیا ھے اور وھاں بھی بصورت غبار ھاتھہ پاؤں مار رھا ھے۔یہ اُس کی مثال شمع کی سی ھے جو کسی کی جستجو میں ھر طرف رخ کئے کھڑی جل رھی ھے مگر اُسے کہیں نہیں پاتی —

شمع ھوں لیکن بہ پا در رفتہ خار جستجو
مدعا گم کردہ ھر سو ھر طرف جلتا ھوں میں

خود حیرت کی مرزا نے لباس جسمانیت میں عجیب و غریب تصویر کھینچی ھے کہ وہ ایک دیوانہ ھے جسے شوق نظارہ نے مقید کر رکھا ھے اور اسی لئے وہ زنجیر جس میں اسے جکڑا ھے چشم تماشائی کے حلقوں سے بنی ھے —

وحشی خو کردۂ نظارہ ھے حیرت جسے   حلقۂ زنجیر جز چشم تماشائی نہیں

اس طلسم حیرت میں جہاں حقایق و معارف کی تجلی گردش ساغر کی طرح پیہم و متصل ھے، سالک زندگی کا مقصود ھی حیرانی کو سمجھنے لگتا ھے —

گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھسے   آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھسے

یہاں تک کہ تمام کائنات دل مبہوت کی مثل جلوۂ حقیقی کی جستجو میں "آئینۂ حیراں" نظر آنے لگتی ھے۔: ع:

از ذرہ تا بہ مہر دل و دل ھے آئینہ

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

یہ وہ مقام ہے جہاں اہل باطن کے نزدیک اکتساب و کوشش کے پاؤں ٹوٹ جاتے ہیں اور جس سے آگے جانا بجز تائید غیبی اور توفیق الٰہی کے ممکن نہیں۔ یہاں سالک پر ایک قسم کی پراسیمگی اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے —

حیرت حجاب جلوہ و وحشت غبار رہ
پاے نظر بد دامن صحرا نہ کیجئے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

یہ اور اسی قبیل کے اشعار جن کی بنا پر بجنوری مرحوم نے غالب کو گروہ مشککین میں شامل کر دیا ہے میری دانست میں اسی عالم حیرت کے واردات ہیں جہاں تمثال تماشا کی فراوانی نے تماشائی کو اس قدر متحیر و مبہوت کر دیا ہے کہ اسے اپنے عجز و شرمندگی کا اظہار کرنے کی بھی قوت باقی نہیں رہی —

تمثال تماشا ہا اقبال تمنا ہا عجز عرق شرم ہے اے آئینہ حیرانی

اور اس عالم سے جب کہ اوپر اُٹھایا جا رہا ہے، اس وقت بھی سالک کی راے تردد و شک سے خالی نہیں ہے —

میں ہوں اور حیرت جاوید، مگر ذوق خیال
بہ فسون نگہ ناز ستاتا ہے مجھے

---:o:---

۳-حاصل بے حاصلی

اس حیرت و پریشانی سے نجات اس وقت ملتی ہے جب یہ ظاہر ہو جائے کہ دید و تلاش بے سود اور اس کا نتیجہ ہیچ ہے۔ لوگ جسے منزل پر پہنچنا سمجھے ہیں اصل میں وہ تھک کر بیٹھ رہنا ہے۔ ورنہ منزل مقصود ہی موہوم ہے تو اُس تک کسی کی رسائی کیونکر ہو—

"رسیدن" گُل باغ واماندگی عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھسے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھسے

دوسرے شعر میں اشارہ نکلتا ہے کہ خود وہ منزل مشتبہ ہے جس کی تلاش میں یہ تگ و دو ہو رہی تھی اس لئے اس مقام پر دنیا کی ہر دلکش اور قابل تماشا شے بیکار و بے معنی، بے نظم اور بے تکی نظر آتی ہے۔ انسانی ہستی ایک پیچ در پیچ طومار ہے جس کا کوئی مدعا نہیں اور فصل بہار چند عناصر کا مجموعہ ہے جس میں وحشت و پریشانی کے سوا کوئی اتحاد و رابطہ نہیں:—

نہ ہو وحشت کش درس سراب سطر آگاہی
میں گرد راہ ہوں بے مدعا ہے پیچ وخم میرا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

خلاصہ یہ کہ ہمای سیروتلاش اور جس شے کی سیروتلاش میں تھے وہ

سب ہیچ اور خواب وخیال ہیں—

تھا خواب میں خیال کو تجھسے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

یہی وہ قیام ہے جہاں پہنچ کر سیر وتماشا جس کا وہ کچھ شوق لےکر چلے تھے، دیوانہ پن معلوم ہونے لگتا ہے اور آنکھ کا کھلنا اور بند ہونا تازیانہ ندامت کا کام دیتا ہے—

زبس کہ مشق تماشا جنوں علامت ہے
کشاد وبست مژہ سیلئی ندامت ہے

مرزا صاحب اہل غفلت کے حال پر جنہیں پہلے طعن دیتے تھے اب رشک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اُن سے اچھے ہیں جو جو ہوشیار ہوے مگر دنیا کی آگہی سے پریشانی کے سوا کچھ نہ پایا—

رشک ہے آسایش ارباب غفلت پر اسد
پیچ و تاب دل نصیب خاطر آگاہ ہے

اسد، جمعیت دل در کنار بیخودی خوشتر
دوعالم آگہی سامان یک خواب پریشاں ہے!

بے حاصلی کا احساس، یاس و نومیدی کا آغاز ہے۔ لیکن اس موقع پر شاعر کے دل میں غیریت کا ہیجان پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس مایوسی کو شوق کی کمی، اور اظہار یاس کو اس کی کم ظرفی پر محمول نہ کیا جاے چناچہ جابجا صداقت و افراط شوق کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی قوت ضبط اور عالی

ظرفی کو بار بار جتاتا ہے۔ ان مضامین کو جس جوش کے ساتھ مرزا غالب نے لکھا ہے، اسے یقیناً ہر غالب شناس جانتا ہوگا۔ مختصر طور پر اتنا لکھنا کافی ہے کہ مرزا کا معیار عشق بہت بلند ہے۔ عشاق کی ساری تاریخ میں وہ صرف قیس عامر کو عشق میں کامل اور منتخب سمجھے ہیں ورنہ خضر و موسیٰ علیہما السلام اور منصور و فرہاد سب کی قابلیت عشق میں انہیں کلام ہے وہ اپنے ظرف کی وسعت اور شوق کی تشنگی کو خلیج ساحل سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں بے تکلف سمندر سما جائے —

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

انہیں شکایت ہے کہ وہ بجلی جس کی طور کو تاب نہ آئی تھی اُن پر کیوں نہ گری —

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

لیکن اس عالی ظرفی کے باوجود دل میں شوق کا جو طوفاں برپا ہے وہ ضبط کے پردے میں چھپائے نہیں چھپ سکتا بلکہ جس طرح سمندر کی موجیں ساحل کی گود یوں تک پہنچ کر بے اختیار اُچھل جاتی ہیں اور طوفان کا حال کھل جاتا ہے اسی طرح وہ تلاطم جو سینے کے اندر بپا ہے پھیلتے پھیلتے جسم کی بالائی سطح تک پہنچتا اور "زخم نمایاں" کی صورت میں سامنے آجاتا ہے —

ذوق سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا
موج خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

دوسرے، آخر تک ضبط کا قائم رہنا، افراط شوق کے منافی ہے اور وہ گریبان جس کا چاک سلامت رہ گیا، گویا ایک ناشگفتہ پھول ہے جسے

غنچے کی صورت میں مقید و مجبور کر دیا گیا ہو۔

چاک گریباں کو ہے ربط تامل ہنوز
غنچے میں دل تنگ ہے حوصلۂ گل ہنوز

غم عشق کی دائمی آتش کو دل جیسی نازک چیز میں چھپانا محال، اور اگر کبھی بتقاضائے بشریت دامن ضبط ہاتھ سے چھوٹ جائے تو یہ خطا قابل معافی ہے —

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

۴-عالم یاس و نو امیدی

اس عذر معذرت کے بعد کامل یاس کا اظہار شروع ہوتا ہے اور بزم حسن و عشق کی ناپائے داری پر شاعر اس طرح رائے زن ہے کہ:-

بزم داغ طرب و باغ کشاد پر رنگ
شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

دنیا کی تمام خوشیاں محض عارضی اور قابل مضحکہ ہیں—

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرت انجام گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
جائے استہزا ہے عشرت کوشی ہستی اسد
صبح و شبنم فرصت نشو و نما خندہ ہے

زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسد
غفلت آرامی یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

تنگنائے دھر میں خوشدلی کی خفیف سی ہوس فوری خرابی کا سامان ہے۔

برہم ہے بزم غنچہ بہ یک جنبش نشاط
کاشانہ بسکہ تنگ ہے غافل ہوا نہ مانگ

اس مقام پر نفس انسانی کی کمال بے حقیقتی آشکار ہوتی ہے۔ مرزا اپنی ہستی کو صدا سے تشبیہہ دیتے ہیں جو بلند ہوتے ہی فضا میں معدوم ہو جائے۔ پھر یہ صدا بھی گویے کی تان یا رباب کے تار کی آواز نہیں، جس میں فی الجملہ دلکشی پائی جائے بلکہ — فقط ٹوٹنے اور ختم ہونے کی آواز ہے —

نہ گُل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ہستئی مایوس کی مرزا کے تخیل نے جو تصویریں اتاری ہیں، اُن پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی آدمی سناٹے میں آجاتا ہے: —

سراپا یک آئینہ دار شکستن
ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

همه نا امیدی همه بد گمانی
میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا
بصورت تکلف، به معنی تاسف
اسد میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

آخر غور کرتے شاعر حکماے رواقیہ کے اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے کہ ہستی کا مقصود ہی نیستی ہے۔ یہ کہنا کہ جو چیز وجود میں آئی فنا ہوگی بیان کی غلطی ہے کیوں کہ وجود میں آنا بجاے خود ناقص و نا تمام فعل ہے جب کہ اس کا پورا ہونا فنا پر موقوف ہو۔ اسی لئے خود زندگی کی سرگرمی دیکھکر مرزا کو یقین ہوتا ہے کہ یہ فنا کی تیاریاں ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمن راحت خون‌گرم دہقاں ہے

محیط دہر میں بالیدن، از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہر اک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

آفرینش کے تمام اجزا زوال پذیر ہیں۔یہاں تک کہ چشم حقیقت بیں کو سورج کا عظیم کرۂ آتشیں محض ایک ٹمٹماتا دیا نظر آتا ہے جو ہوا کے جھونکوں

میں بجھلنے کے لئے رکھدیا گیا ہو—

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار باد یاں

اسی لئے مرزا صبح کے طلوع کو فقط شام ہونے کے آثار میں شمار کرتے ہیں—

صبح سے معلوم آثار ظہور شام ہے غافلاں! آغاز کار آئینۂ انجام ہے

—:o:—

۵-مقام تسلیم و فنا

طالب حقیقت کے عالم مایوسی سے نکلنے کی عجیب راہ یہ پیدا ہوتی ہے کہ اُن چیزوں کی طرف سے جن کی بے حقیقتی منکشف ہوئی تھی اس کا دل ہی سرد ہو جاتا ہے—

تن بہ بند ہوس در نہ دادہ رکھتے ہیں
دل زکار جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں

اس "دل افتادگی" کے طفیل یاس جاوداں کو برداشت کرنے کی مشکل حل ہو جاتی ہے—

بہ فیض بے دلی نو میدی جاوید آساں ہے
گشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اور سالک کو یاس و نا مرادی میں ایسی مستقیم دلجمعی کا لطف آتا ہے جو امید خام کے طوفان میں ممکن نہ تھا کیوں کہ صرف کامل یاس کی حالت میں وہ اپنے آپ کو ساری دنیا سے خوش دل و مطمئن پاتا ہے—

خاک بازئی أمید کار خانۂ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

وحشت اگر رسا ہے، بے حاصلی ادا ہے
پیمانۂ ہوا ہے مشت غبار صحرا۔

پس یہاں اگر اسے کوئی خواہش ہوسکتی ہے تو یہ کہ وہ دل ملے جس میں کسی خواہش کا گزر نہ ہو—

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

یہ کامل تعطل کا مقام ہے جہاں رفتہ رفتہ امید و نا امیدی کی بحث ختم ہوجاتی ہے اور ہر قسم کی آرزو موجب زحمت و تعب محسوس ہوتی ہے:—

چہ امید و نا امیدی، چہ نگاہ و بے نگاہی
ہمہ عرض نا شکیبی ہمہ ساز جانستانی
اگر آرزو ہے راحت تو عبث بخوں طپیدن
کہ خیال ہو تعب کش بہ ہوائے کامرانی
شر و شور آرزو سے تب و تاب عجز بہتر
نہ کرے اگر ہوس پر غم بے دلی گرانی

بہ بیچ و تاب ہوس سلک عافیت مت توڑ
تجھے کہ عجز سر رشتۂ سلامت ہے

اس حال میں شوق تماشا ایک گناہ معلوم ہوتا ھے اور نہ گریباں آرائی کا ذوق باقی رہتا ھے نہ دامن دری کی شکایت:—

تماشائے گلشن' تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم!
نہ ذوق گریباں نہ پروائے داماں
نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

یہاں دل بے مدعا کو غم و عشرت دونوں یکساں مقبول ہیں: —

غم و عشرت قدمبوس دل تسلیم آئیں ھے
دعائے مدعا گم کردگان عشق "آمیں" ھے!

یہ تسلیم اس علم و یقین کی بنا پر ھے کہ وھی مختار حقیقی جس کے ھاتھ میں اسباب راحت و کامیابی ہیں' بندہ نامراد کا بھی اصلی مالک و خبر گیراں ھے اور مناسب حال سمجھتا تو اسے کامیابی سے ھمکنار کرنے میں کیا دیر لگتی۔ اس عارفانہ مضمون کو مرزا غالب نے جس بلیغ استعارے میں ادا کردیا وہ شاعری کا اعجاز ھی۔فرماتے ہیں —

اسد سودائے سرسبزی سے ھے تسلیم رنگیں تر
کہ کشت خشک اُس کا ابر بے پروا خرام اُس کا!

پھر یہ کہ جس "ساقی" سے معاملا پڑا ھے اس کی شان اتنی بلند و ارفع ھے کہ جب تک یہ عبد ذلیل بالکلیہ اپنے آپ کو اس کے حوالے نہ کردے اس کے ساتھہ کوئی "سودا" ھو نہیں سکتا۔ بہ الفاظ دیگر' کامل تسلیم کے سوائے طالب و مطلوب ۔حقیقی عزاسمہ میں اور کوئی سبیل ربط کی ممکن نہیں ھے —

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاع دستگرداں ہے

عالم تسلیم میں عشق مزاجی کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا لیکن مطلوب سے ملنے کی آرزو شوق فنا پیدا کر دیتی ہے۔ طالب حصول فنا کے لئے بیتاب ہے اور اسے اپنی معراج خیال کرتا ہے —

ڈھونڈے ہے اُس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

ع : عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا !

بزرگان صوفیہ نے فنا کو عشق کا ایک مرتبہ شمار کیا ہے اور اس کی جیسی تفصیل وتشریح کی ہے اس کے مقابلے میں مرزا کا بیان ادھورا ہے مگر فنا کی تعریف میں اسے کائنات کے متباین و منتشر اجزا کا واحد ذریعہ اتحاد قرار دینا غالباً مرزا کی اپنی تلاش و مضمون آفرینی ہے —

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا!

پھر مرزا کہتے ہیں کہ نقائص طبعی کی پردہ پوشی بغیر فنا کے اور کسی طرح ممکن بھی نہ تھی —

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

——:O:——

۲- رجوع الی البقا

نہ لائی شوخئی اندیشہ تاب رنج نومیدی
کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے!

درجۂ فنا کو جو راہ سلوک میں حاصل ہوتا ہے اگر دوام ہو تو انسان کی زندگی بیکار ومعطل ہوجائے اور ترک دنیا یا رہبانیت اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہ رہے حالانکہ اس طرح خود روحانیت کی تکمیل نہیں ہوسکتی کیونکہ زندگی میں روح وجسم کا تعلق خوشبو اور پھول کا سا ہے کہ جب تک قوانین فطرت کے مطابق پھول کو پورا نشوونما اور بالیدگی نہ حاصل ہوگی، اس میں پوری مہک نہ آئے گی، اسی لئے آگے چل کر مرزا فنا کو طلب صادق کا وسطی مرحلہ تجویز فرماتے ہیں—

تھی نو آموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

شعر کے دوسرے مصرعہ میں ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ "بقا بعد فنا" یا مرتبۂ فنا سے گزرنے کے بعد کی زندگی، عالم فنا سے بھی زیادہ دشوار ہے اور اسی مجبور ومقید زندگی میں، مطلوب اصلی کی دھن میں رہنا عشق، بلکہ ایمان کا کمال ہے جسے لوگ جنون تعبیر کرینگے-شاید اسی حالت کو مرزا ایک عجیب تشبیہ دے کر سمجھاتے ہیں جس سے بہتر خیال میں نہیں آتی—

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

یہاں یہ حقیقت نہایت صفائی سے شاعر کے ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ
انسان کی طول طویل کوشش و آرزو کا نتیجہ دنیا میں بہت ہی خفیف و حقیر

میسر آتا ہے یا بالکل نہیں آتا، بایں ہمہ اس کی فطرت صحیح کا مقتضی ہی یہ ہے کہ تھکے جائے اور کوشش کئے جائے:—

باعث واماندگی ہے عمر فرصت جو مجھے
کر دیا ہے پابہ زنجیر رم آہو مجھے

اس لئے مرزا تاکید کرتے ہیں کہ اگر اصلی حاصل دستیاب نہ ہو تو بھی مایوس و بے کیف ہو کر انتظار سے ہاتھ اٹھانا نہ چاہئے—

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

۷—مقام وری الوری

مرزا غالب وحدت وجود کے قائل ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے اسلامی تعلیم کے اثر سے کبھی کبھی انکا فکر بلند مقام ''وری الوری'' تک رسا ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں بعض بزرگان باخدا کے ان کلمات سکر کا ذکر نہیں ہے جو کبھی کبھی کمال محویت واستغراق کی حالت میں مجذوبانہ ان کی زبان سے نکل گئے ہیں اور ان سے اتحاد وعینیت کی بو آتی ہے۔ بلکہ یہاں ہماری مراد اس نظری فلسفے سے ہے جس کے ماننے والوں میں قدیم ہند ویونان کے حکما، مصر وشام کے مسیحی اور بعد کے مسلمان فلاسفہ، دہری و لاادری، مذہبی اور ملاحدہ سبھی قسم کے حضرات شامل ہیں اور نئے نئے پیرایوں میں اس مطلب کو ظاہر کرتے ہیں کہ مخلوقات ذات خالق سبحانہ وتعالے شانہ ہی کی ایک دوسری صورت یا ''شئونات'' ہیں۔ یہ سارا فلسفہ عجیب قیاسات و مفروضات نیز متضاد دلائل پر مبنی ہے جن کی بظاہر نہ کوئی معقول توجیہ ہو سکتی ہے نہ یقینی تصدیق۔ اور اگر طالب علم مصطلحات کے رعب میں نہ آے تو عجیب نہیں

کہ ارباب وحدت وجود کے تصویر خدا اور ھیولوں میں کچھہ زیادہ فرق نہ رہے.
نعوذ باللہ من ذالک —

مرزا غالب کے ھاں بھی اس مضمون کے شعر جا بجا آتے ھیں —

ھے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ھے قطرہ و موج حباب میں

اصل و شہود و شاھد و مشہود ایک ھیں
حیراں ھوں پھر مشاھدہ ھے کس حساب میں

مرزا غالب منصور کے دعوی "اناالحق" کے دل سے قائل ھیں لیکن اس کا اظہار کرنا ان کے نزدیک عالی ظرفی کے خلاف ھے —

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ھے دریا لیکن
ھم کو تقلید تنک ظرفئی منصور نہیں

دل ھر قطرہ ھے ساز اناالبحر
ھم اُس کے ھیں ھمارا پوچھنا کیا ؟

اے ندا گوے اناالحق ترا دعوی حق ھے
لیک دستور نہیں قطرے کو دریا کہنا

لیکن جیسا کہ ھم نے لکھا ھے ان کی عقل سلیم بعض اوقات "عجزادراک" کی انتہائی منزل تک پہنچتی ھے اور وہ مطلوب حقیقی کے ماوراے ادراک ھونے کا صاف صاف اعتراف کرتے ھیں —

ع: ھے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود

اور جوش میں آکے کہتے ھیں کہ دیدہ کی یہی نارسائی تو تھی جس نے طالب دیدکی چشم نظارہ طلب کو جلادیا —

ناکامئی نگاہ ہے برق نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوی!

پس حضرت حق سبحانہ کا جلوہ مطلوب ہے تو اسے ھمیشہ عقل و علم انسانی کے ماوراء ڈھونڈنا چاہئیے کہ "ہرچہ در دید و دانش ہے آید مقید ست و از صرافت اطلاق متنزل۔ و مطلوب آنست کہ از جمیع قیود منزہ و مبری باشد۔ پس ماوراے دید و دانش او را باید جست۔ این معاملہ وراے طور نظر عقل ست چہ عقل ماوراے دید و دانش را جستن محال ہے داند راز درون پردہ ز رندان مست پرس الخ" * —

مرزا نے اس نکتے کو جس شاعرانہ پیراے میں بیان کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے —

خبر، نگہ کو، نگہ، چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے!

——:o:——

یہ ایک سرسری تبصرہ تھا مرزا غالب کے فلسفیانہ خیالات کا، جنھیں ہم نے اس عہد کے متصوفانہ عقائد کو مدنظر رکھکر کہ ایک خیالی ترتیب میں مرتب کرنے کی کوشش کی اور کلام کے تقدم و تاخر کا ایک حد تک لحاظ رکھا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھئے تو یہ خیالات قواے عملی کو مضمحل کرنے والے، یاس فزا اور حوصلہ شکن ہیں اور مسلمانوں کے عہد انحطاط کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی بنا پر ہمارے ایک فاضل دوست ایک مرتبہ غالب و حافظ کا محاکمہ کرتے وقت فرماتے ہیں کہ حافظ زندگی کی مصائب و مشکلات کو چٹکیوں میں اُڑاتا ہے مگر غالب ان سے مغلوب ہو گیا ہے! یہ راے غلط نہیں لیکن یاد رکھنا چاہئیے کہ غالب

---

* مبدء و معاد۔ لحضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ

کی یہ مغلوبیت کسی نادان وہم پرست یا بزدل پست ہمت کی مغلوبیت نہیں ہے بلکہ ایسے شخص کی جس نے مسائل حیات پر عرصۂ دراز تک غور کیا اور دنیاوی زندگی اور مساعی کو نہایت ناپائدار اور بے حقیقت پایا ہے مزید برآں ماننا پڑے گا کہ شاعر کا طبعی جوش اور زندہ دلی اُس پژمردگی کا، جو اُس کے فلسفیانہ افکار و آرا سے پیدا ہوتی ہے بہت اچھا مصلح ہے--

اجتماعی یا قومی زندگی کے معاملے میں مرزا غالب کی شاعری صفر ہے انہیں ملک و ملت سے بتقاضاے انسانیت محبت و ہمدردی تھی۔ دلی کی عبرت ناک تاراجی اور نام نہاد بادشاہی کے خاتمے سے بھی یقیناً اُن کو دلی صدمہ ہوا ہو گا لیکن نہ وہ اتنے مذہبی آدمی تھے کہ محض انگریز "کفار کا استیلا ان کے دل میں جذبۂ جہالت کی گُد گُدی پیدا کرتا۔ نہ ایسے سیاسی مفکر کہ اپنے ابناے ملک سے بلند ہو کر کسی قومی اور ملکی حکومت جمہوری کا خواب دیکھتے اور نہ اتنے نادان قدامت پرست کہ اپنے زمانے کی مغلیہ بد نظمی کو انگریزی کمپنی کی با قاعدہ حکومت پر ترجیح دیتے۔ ذاتی طور پر ان کا حال بھی انھی ہندوستانی امرا کا سا تھا جن کی اغراض نے انہیں شروع سے انگریز حکام کے دامن دولت سے وابستہ کر دیا تھا۔ پس جن حضرات نے مرزا کے اشعار میں کسی قومی تعلیم کی جھلک دیکھی یا انہیں کسی وطنی جذبے کی بنا پر اجانب کی حکومت سے برگشتہ و بد دل سمجھا ہے یہ محض ان کا حسن توہم اور بے گناہ مرزا پر اتہام ہے جس کی فی الواقع کوئی بنیاد نہیں فقط

ضمیمہ

جس زمانے میں انجمن ترقی اُردو نے دیوان غالب کا ایک عمدہ نسخہ طبع کرنے کا ارادہ کیا تو راقم الحروف نے مختلف ذرائع سے مرزا غالب کا

غیر مطبوعہ کلام بھی جمع کیا تھا۔ اس میں سے بعض اشعار تو بھوپال کے نسخۂ حمیدیہ کے ساتھ چھپ گئے اور بعض غزلیں اور قطعات بداونی نسخے میں شامل کر لئے گئے ھیں۔ لیکن ان کے علاوہ چند قطعے اور غزلیں میرے پاس موجود ھیں جو کسی مطبوعہ دیوان میں ابھی تک مندرج اور شایع نہیں ھوئی ھیں چونکہ اب انجمن کی طرف سے کسی نئے نسخے کے طبع کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ھوتی اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اب اس باقی ساقی کلام کو انجمن کے رسالے میں چھاپ دیا جاے تاکہ آئندہ جو صاحب دیوان طبع کریں وہ اگر چاھیں تو اس کلام کو بھی شامل کر لیں جو غالباً مرزا صاحب کے آخری زمانہ کی یادگار ھے اور اسی لئے ان کے مطبوعہ دیوان میں چھپنے سے رہ گیا—

غزل (۱)

آپ نے "متنی الفر" کہا ھے تو سہی
یہ بھی یا حضرت ایوب گاہ ھے تو سہی

رنج طاقت سے سوا ھو تو نہ بیٹھوں کیوں کر
ذھن میں خوبی تسلیم و رضا ھے تو سہی

ھے غنیمت کہ بہ اُمید گذر جاے گی عمر
نہ ملے داد مگر روز جزا ھے تو سہی

دوست ھی کوئی نہیں ھے جو کرے چارہ گری
نہ سہی لیک تمناے دوا ھے تو سہی

غیر سے دیکھئے کیا خوب نباھی اس نے
نہ سہی ھم سے، پر اس بت میں وفا ھے تو سہی

نقل کرتا ھوں اسے نامۂ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ھے تو سہی

کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ تیزیِ شمشیر قضا ہے تو سہی

(اس زمین میں دو غزلہ نسخہ حمیدیہ میں پہلی مرتبہ چھپا ہے لیکن ذیل کی غزل ان دونوں کے علاوہ ہے)

غزل (۲)

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ گہ اشک چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بس کہ تلخیِ غم ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھکو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بقیمت اول خریدہ ہوں

ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام نغز و لئے ناشنیدہ ہوں

اہل ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں*

۳-قصیدہ تہنیت بتقریب سالگرہ مہاراجہ الور

گتی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں سو ہزار گرہ

گرہ کی ہے بھی گنتی کہ تا بروز شمار
ہوا کرے گی ہر اک سال آشکار گرہ

یقین جان برس گانٹھ کا جو تاگا ہے
یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ

گرہ سے اور گرہ کی اُمید کیوں نہ بڑھے
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ

دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ دیکھ کتنی اُٹھا لائے کا یہ تار گرہ

کہا کہ چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنیں گے تو پائیں گے نو ہزار گرہ

خود آسماں ہے مہاراجہ راو پر صدقے
کرے کا سیکڑوں اس تار پر نثار گرہ

وہ راجہ راو بہادر کہ حکم سے جن کے
رواں ہو تار پہ فی‌الفور دانہ وار گرہ

---

* یہ صائب کے مشہور شعر کا گویا اُردو ترجمہ ہے—

چوں سگ گزیدۂ کہ نخواہد کہ آب دید
آئینہ می گزد من مردم گزیدہ را

انھی کی سالگرہ کے لئے ہے سال بہ سال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی نو بہار گرہ

انھی کی سالگرہ کے لئے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو ابرتگرگ بار گرہ

انھی کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے
کہ ہو گئے ہیں گہر ہائے شاہوار گرہ

انھی کی سالگرہ کے لئے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں ثمر ہائے شاخسار، گرہ

سن اے ندیم برس گانٹھ کے یہ تاگے نے
تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ

پئے دعائے بقائے جناب فیض مآب
لگیگی اس میں ثوابت کی استوار گرہ

ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے بنے
بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ

عطا کیا ہے خدا نے وہ جاذبہ اس کو
کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زینہار گرہ

کشادہ رخ نہ پھرے کیوں جب اس زمانے میں
بچے نہ از پئے بند نقاب یار گرہ

متاع عیش کا ہے قافلہ چلا آتا
کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شتر قطار گرہ

خدا نے دی ہے وہ غالب کو دستگاہ سخن
کروروں ڈھونڈ کے لا تا یہ خاکسار گرہ

کہاں مجال سخن سانس لے نہیں سکتا
پڑی ہے غم کی مرے دل میں پیچدار گرہ

گرہ کا نام لیا پر نہ کر سکا کچھہ بات
زباں تک آکے ہوی اور استوار گرہ

کھلے یہ گانٹھہ تو البتہ دم نکل جاے
بری طرح سے ہوی ہے گلے کا ہار گرہ

ادھر نہ ہوگی توجہ حضور کی جب تک
کبھی کسی سے کھلیگی نہ زینہار گرہ

دعا یہ ہے کہ مخالف کے دل میں از رہ بغض
پڑی ہے یہ جو بہت سخت نا بکار گرہ

دل اس کا پھوڑ کے نکلے بشکل پھوڑے کے
خدا کرے کہ کرے اس طرح ابھار گرہ

———:o:———

۴- نامہ منظوم- بخدمت لفٹنٹ گورنر پنجاب

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرماں رواے کشور پنجاب کو سلام

حق گو و حق پرست و حق اندیش حق شناس
نواب مستطاب امیر شہ احتشام

جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقت رزم
ترک فلک کے ہاتھہ سے وہ چھین لیں حسام

جس بزم میں کہ ہو انہیں آہنگ میکشی
واں آسماں شیشہ بنے، آفتاب، جام

چاہا تھا میں نے تم کو سے چارہ لکھوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیال خام

دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عزو جاہ رہے گا علی الدوام

سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
دریائے نور ہے فلک آبگینہ فام

میری سنو کہ آج تم اس سر زمیں پر
حق کے تفضلات سے ہو مرجع انام

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام

وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے لیا ہے کلیجہ تھام

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا انتظام

ستر برس کی عمر میں یہ داغ جاں گداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہوگئے لب دریا پہ جو خیام

اس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشست میں از روے اہتمام

سمجھا اسے گراب ہوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھپہ چلی چشمک عوام

عزت پہ اهل نام کی هستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ هستی رهی نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اس ناز کا فلک نے لیا مجھسے انتقام

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا اژدهام

اس کشمکش میں آپ کا مداح نامور
آقاے نامور سے نہ کچھہ کر سکا کلام

جوواں نہ کہہ سکا وہ لکھا ہے حضور کو
دیں آپ میری داد کہ هوں فایزالمرام

ملک وسپہ نہ هو تو نہو کچھہ ضرر نہیں
سلطان بروبحر کے در کا هوں میں غلام

وکٹوریہ کا دهر میں جو مدح خوان هو
شاهان عصر چاهئے عزت لیں اس سے وام

خود ہے تدارک اس کا گورنمنت کو ضرور
بیوجہ کیوں ذلیل هو غالب ہے جس کا نام

امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
بارے قدیم قاعدے کا چاهئے قیام

ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاهیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

دستور فن شعر یہی ہے قدیم سے
یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دعا کہ زیرنگیں آپ کے رہے
اقلیم ہند و سندھ سے تا ملک روم و شام

———— o :————

۵-رقعہ منظوم بنام علائی (رئیس لوہارو)*

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کی
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں

سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم
کہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں

سوا "ناج" کے جو ہے مقلوب جاں
نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں

ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں

وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں؟

فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

---

* پہلی دو غزلیں اور دو قطعے نواب احمد سعید خاں صاحب طالب مرحوم کے قلمی کلیات غالب (اردو) سے مجھے ملے اور یہ منظوم رقعہ جو نواب علاءالدین احمد خاں مرحوم کو لوہارو بلانے کے جواب میں بھیجا گیا تھا، نواب صاحب موصوف کے بیاض سے دستیاب ہوا ہے :— (ہاشمی)

قطعه

خوانی بسوی خویش وندانی که مرده ام
دانی که مرده ره را ورسم خرام نیست

ای شیخ مدو ام نه اله بخش مرگ من
از عالم جنابت ومرگ حرام نیست

آئندہ کا خواب

از

(جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم)

یورپ کے بعض مدبرین کا خیال ہے کہ ایک اور عظیم الشان جنگ ظہور میں آئے گی اور حب وطن اور حب قوم نے جو ہنگامے برپا کر رکھے ہیں، وہ اس جنگ کے بعد فرو ہو جائیں گے اور دنیا حب انسان کا سبق سیکھے گی۔ آیندہ مختلف قوموں، ملکوں اور مذہبوں کے انسان روا داری، انصاف اور مساوات کا برتاؤ باہم کریں گے۔ آئندہ کے متعلق یہ دلکش خواب ذیل کی نظم میں بیان کیا گیا ہے —

روز آئندہ کے عریاں نظر آتے ہیں مجھے
پھر نئی جنگ کے ساماں نظر آتے ہیں مجھے

کئی قوموں کا چھلکنے کو ہے پیمانۂ عمر
ٹوٹتے شاہوں کے پیماں نظر آتے ہیں مجھے

آنے والے ہیں جو ہنگامے قیامت انگیز
پردۂ غیب میں پنہاں نظر آتے ہیں مجھے

پھر اُفق پر نظر آتی ہے کدورت کی گھٹا
اُٹھتے پھر غیظ کے طوفاں نظر آتے ہیں مجھے

اُٹھ گئے مہر کے جذبات دلوں سے اک بار
نازل اب قہر کے فرماں نظر آتے ہیں مجھے
نظر آتے نہیں ارام و سکوں کے آثار
لرزہ میں دھر کے ارکاں نظر آتے ہیں مجھے
سر کشی دیکھہ کے افراد بشر کی پیہم
ملک انگشت بدنداں نظر آتے ہیں مجھے
عقلیں اب امن کی تدبیر سے عاجز ہیں تمام
فلسفے سر بگریباں نظر آتے ہیں مجھے

ہے یہ اُس جنگ کا آغاز جسے دیکھہ کے اب
دیوتا جنگ کے حیراں نظر آتے ہیں مجھے
کرتے ایجاد ہیں اس کے لئے ساماں نئے
اپنی عقلوں پہ جو نازاں نظر آتے ہیں مجھے
آگ اُگلنے کو تفنگوں نے دھن کھول دیے
خوں فشاں خنجر براں نظر آتے ہیں مجھے
قتل انساں کے لئے دوڑتی ہے برق کی رو
گیس کے بقے پریشاں نظر آتے ہیں مجھے
منہ ہیں توپوں کے کھلے چرخ بریں کی جانب
صاعقے ابر میں رقصاں نظر آتے ہیں مجھے
غول طیاروں کے افلاک کی جانب ہیں رواں
گرتے اب قلعہ و ایواں نظر آتے ہیں مجھے
بم پہ بم گرتے ہیں ہیبت ہے جہاں پر طاری
درو دیوار بھی لرزاں نظر آتے ہیں مجھے

بال و پر طایروں کے اوج ہوا پر ہیں کباب
لوٹتے خاک پہ انساں نظر آتے ہیں مجھے

آگ ہی آگ ہے پھیلی - جدھر اُٹھتی ہے نظر
شعلہ زن شہر و بیاباں نظر آتے ہیں مجھے

لہلہاتے ہوئے جو کھیت تھے جنگل میں کھڑے
آتش جنگ میں سوزاں نظر آتے ہیں مجھے

محفلیں عیش و طرب کی ہوئیں برہم ساری
خاک کے ڈھیر شبستاں نظر آتے ہیں مجھے

باغ جنت نظر آتے تھے مسافر کو جہاں
اب وہ سب مرحلے ویراں نظر آتے ہیں مجھے

جن مکانوں میں بھرے عیش کے ساماں تھے تمام
اب وہ سب بے سر و ساماں نظر آتے ہیں مجھے

زیب تن جو کبھی کرتے تھے سنہری پوشاک
بچے ان شاہوں کے عریاں نظر آتے ہیں مجھے

سرخ چہرے کبھی تھے غیظ و غضب میں جن کے
اب وہی خوں میں غلطاں نظر آتے ہیں مجھے

جن مقامات میں جمگھٹ تھے امیروں کے کبھی
اب وہ سب گور غریباں نظر آتے ہیں مجھے

جن کو ارباب حشم نے کبھی ٹھکرایا تھا
محتشم اب وہی دھقان نظر آتے ہیں مجھے

خال خال اب کہیں باقی ہیں ستمگار اگر
ظلم سے اپنے پشیماں نظر آتے ہیں مجھے

فتنہ پروازیاں تھیں جن کی جہلت میں بھری
اب وهی امن کے خواهاں نظر آتے هیں مجھے

جس مساوات کی کرتے تھے تمنا اسلاف
اُس کے آثار نمایاں نظر آتے هیں مجھے

خود پرستی کے جہاں دوڑتے رهتے تھے سمند
حریت کے وهی میداں نظر آتے هیں مجھے

اپنی قوت پہ جو مغرور تھے بیداد سے خوش
اب وهی حق کے نگہباں نظر آتے هیں مجھے

حب اِنساں کی ضیا جن کے دلوں میں هے بھری
چہرے اُس قوم کے تاباں نظر آتے هیں مجھے

مہر والفت کا جو هے نور جہاں میں پھیلا
اُس سے آفاق درخشاں نظر آتے هیں مجھے

عدل و انصاف کی دنیامیں پھر آتی هے بہار
جس سے معمورے گلستاں نظر آتے هیں مجھے

حال پر جن کے بہاتی رهی شبنم آنسو
اب شگوفے وهی خنداں نظر آتے هیں مجھے

وہ چمن جن پہ خزاں پھیر چکی تھی پانی
اب سراپا گل و ریحاں نظر آتے هیں مجھے

بیٹھتے تھے کبھی کوے بھی نہ جن شاخوں پر
اُن پر مرغان خوش الحاں نظر آتے هیں مجھے

جو مقامات کہ اس جنگ میں دوزخ تھے بنے
اب وهی گلشن اخواں نظر آتے هیں مجھے

دوڑتی ضو ہے محبت کی جو بجلی کی طرح
سینے اِس ضو سے فروزاں نظر آتے ہیں مجھے

مختلف مذہب و ملت کے جوانان حسین
سبزہ زاروں میں خراماں نظر آتے ہیں مجھے

یہ سماں نور کا آیا جو تصور میں نظر
دیدہ و دل بھی چراغاں نظر آتے ہیں مجھے

متروکات

از

(جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی اسسٹنٹ
فارن سکریٹری کشمیر (جموں)

طب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چند برسوں کے بعد انسان کا گوشت اور
وست بالکل نیا بن جاتا ہے-زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ اپنی غذا کے لئے
، شمار بیرونی اشیاء کا محتاج ہے اس پر بھی جراح نے جو کبھی کسی
نسان کے جسم پر نشتر چلایا تھا اس کا نشان مرتے دم تک باقی رہتا ہے-یہی
ال دنیا کی نئی اور غیر صرفی زبانوں کا ہے یعنی اخذ اور ترک اُن میں
رابر جاری رہتا ہے-لیکن ان کے جگری نشان اور جوہر جوں کے توں
ہتے ہیں—

حضرت ولی کو اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مان کر اُردو کی عمر
و سو برس سے کچھہ اوپر ٹھہرتی ہے-ولی مرحوم محمد شاہ گورکانی کے عہد
یں دکن سے دہلی آے-اس بادشاہ کی حکومت کا زمانہ سنہ ۱۷۱۹ ع سے سنہ
۱۷۴ ع تک شمار کیا جاتا ہے-زبان کے باب میں یہ تھوڑی سی مدت بھی کچھہ
حقیقت رکھتی ہے؟ بلا مبالغہ کہنا پڑتا ہے کہ اُردو والوں کا اخذ اور ترک
ن دو صدیوں کی قلیل مدت میں تعجب خیز اور تحسین انگیز ہے-
میرا روے سخن متروکات سے ہے-اس لئے ماخوذات سے سروکار نہیں رکھا
جاے گا—

شروع شروع میں جو لفظ یا ترکیبیں متروک قرار دی گئیں اُن کی بنیاد اس اُصول پر ہو گی کہ ریختہ یا اُردو زبان کا ذاتی تشخص اور اپنی جگہ اس کی ایک مستقل ہستی قائم کی جاے۔ پھر لطافت اور نغزیت، ترنم اور سلاست کا نظریہ ترک کا معیار ٹھیرا ہو گا۔ متقدمین اور متوسطین غالباً اسی اُصول پر کاربند رہے ہوں گے۔ ہاں کہیں یہ بھی ہوا کہ اُردو کی دنیا میں اپنی ایک خود مختار حیثیت تسلیم کرانے کی غرض سے زبان کی گردن پر ترک کی کُند چھری ریت کر ایک امر مابہ‌الامتیاز قائم کیا گیا۔ یہاں سے اُردو میں بدعت کی بنیاد پڑی —

زبان مانجھنے اور معقولیت کی بنا پر اخذ اور ترک کا سہرا شاہ حاتم کے سر ہے۔ شاہ صاحب محمد شاہی عہد کے شاعر اور ولی کے ہم عصر تھے۔ یہ تحقیق کرنا مشکل ہے کہ اُن کا زمانہ کتنی دور تک اِن کے زمانہ کا ہم ردیف ہے۔ شاہ حاتم نے بہت سے ہندی اور دکنی الفاظ جو ولی کے کلام کی زینت تھے ترک کر کے اُن کی جگہ فارسی کے ایسے الفاظ زبان میں داخل کئے جو غیر مانوس نہ تھے۔ بلکہ اُنھوں نے زبان کی اصلاح میں یہاں تک کیا کہ اپنے ابتدائی کلام میں جہاں رکیک لفظ نظر آے اس حصہ کو ہی اپنے کلیات سے خارج کر کے اپنے کئی دیوانوں سے غزلوں اور غزلوں سے شعروں کا انتخاب کر کے ایک منتخب دیوان ترتیب دیا جس کا نام دیوان زادہ رکھا۔ اس کے شروع میں ایک دیباچہ لکھا اور اس میں اپنے تمام متروکات کی فہرست دے دی۔ غرض کہ شاہ حاتم دہلوی کی ذات سے زبان کی خراش تراش اور اس میں کاٹ چھانٹ کی بنیاد پڑی۔ زبان کی اس خدمت کے اعتبار سے آزاد مرحوم نے شاہ صاحب کو پہلے دور سے نکال کر جہاں ان کی جگہ تھی دوسرے دور کے شعرا میں رکھ دیا ہے —

میں یہاں متروکات کی تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں ورنہ میر تقی۔ مرزا

یعنی سودا، مظہر، درد، جرات، سوز، مصحفی، انشا، نصیر اور اساتذہ
ثلاثہ یعنی مومن، ذوق اور غالب اور ناسخ اور آتش کے متروکات کی عہد
بہ عہد کی تفصیل وار تاریخ پیش کرتے۔ مرزا غالب کا اُردو دیوان تیسری
بار سنہ ۱۲۷۸ ھجری میں چھپا۔ اس کے خاتمہ کی عبارت میں مرزا صاحب
لکھتے ھیں:—

"ایک لفظ سو بار چھاپا گیا ہے کہاں تک بدلتا۔ ناچار
جا بجا یوں ھی چھوڑ دیا۔ یعنی کسو۔ میں یہ نہیں کہتا
کہ یہ لفظ صحیح نہیں۔ البتہ فصیح نہیں۔ قافیہ کی
رعایت سے اگر کہا جائے تو عیب نہیں ورنہ فصیح بلکہ
افصح کسی ہے"—

اسی طرح ذوق کے ھاں کبھو قافیہ کی رعایت سے ایک دو جگہ ھی آیا ہے۔
مومن خاں نے بھی بہت سے الفاظ ترک کئے لیکن چونکہ ذاتی تشخص قایم کرنے
کی ضرورت نہ تھی میر علی اوسط رشک کی طرح ان کی ایک فہرست مرتب
کرکے تالے کنجی میں نہیں رکھی۔ جناب شوق لکھتے ھیں:—

"اس لفظ سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ ناسخ کے
ساتھ اور شعرا بھی زبان کی اصلاح میں شریک ھیں۔
جب مومن و آتش وغیرہ کا کلام بہت سے رکیک مستعملات
سے پاک ہے تو میں ان لوگوں کے مصلح زبان ہونے سے
کیونکر انکار کرسکتا ھوں•"—

کہا جاتا ہے کہ حضرت ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک نے چالیس
پینتالیس کے قریب الفاظ متروک قرار دئے تھے جن سے ان کا تیسرا دیوان پاک

• اصلاح مع ایضاح — مصنفہ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی صفحہ ۱۰

تھا-لیکن وہ دیوان افسوس ہے کہ چھپا ہی نہیں-رشک مرحوم ان متروکات کے دفتر کو ہمیشہ مقفل رکھتے تھے اور اپنے خاص شاگردوں کے سوا کسی کو اس سے مستفیض نہ ہونے دیتے تھے-ان صورتوں میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ متروکات کی اس فہرست میں کون کون سے لفظ داخل تھے-وہ متروکات کس اصول پر مبنی تھے اس کا اندازہ ان کے کلام سے کیا جائے تو ان کے اجتہاد کے خلاف شبہات کی بڑی گنجایش ہے نمونہ ملاحظہ ہو —

چاول الماس گوشت لخت جگر   فرقت یار میں پلاؤ نہیں
میرے کھانے سے کیوں فلک ہے کباب   پاؤ روٹی ہے نان پاؤ نہیں

دیکھو نزاکت آپ کی دھروا کے آئینہ   لگواتے ہیں ضماد مہاسے کے عکس پر

رشک مرحوم کے سینہ بسینہ متروکات سے قطع نظر کرکے اس بحث میں یہ کتابیں اور رسالے ذکر کے قابل ہیں:-

۱- آب حیات-مصنفہ آزاد مرحوم

۲-اصلاح معہ ایضاح شرح اصلاح-مصنفہ جناب مولانا محمد ظہیر احسن صاحب شوق نیموی-مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ سنہ ۱۸۸۷ ع—

۳-تسہیل البلاغت-مصنفہ جناب محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی سنہ ۱۳۳۹ ہجری—

۴-قرارالمحاورات و قرارالمتروکات-مولفہ جناب سید تصدق حسین صاحب قرار شاہجہان پوری-مقیم لکھنؤ—

۵-اصلاح زبان اردو-مصنفہ جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی سنہ ۱۹۱۹ ع—

۶-نوراللغات (دیباچہ) مولفہ جناب مولوی نورالحسن صاحب نیر کاکوروی سنہ ۱۹۲۴ ع—

۱- آب حیات میں خاص خاص شعرا کے حال میں کبھی ایک دور کے شروع یا آخر میں اس کے متروکات کا ذکر آیا ہے۔ مگر وضاحت اور ترک کی وجہ مفقود ہے —

۲- حضرت شوق نے پہلے پہل اپنی کتاب سنہ ۱۸۸۷ ع میں لکھنؤ سے شایع کی اس کا پہلا اڈیشن کئی برس بعد جناب حسرت موہانی نے معائزاحتہ الاغلاط نے اردو پریس علی گڈھ سے شایع کیا۔ حضرت شوق لکھتے ہیں —

"جس طرح مہر و مرزا نے ولی و حاتم کے اکثر مستعملہ الفاظ ترک کردیے تھے اسی طرح مومن و غالب و ناسخ و آتش وغیرہ نے مہر و مرزا کے بہت سے لفظ متروک کر دئیے۔ جیسے اودھر۔ ایدھر۔ یگانہ بجائے بیگانہ۔ دوانہ بجائے دیوانہ۔ پیار۔ و پیاس با شباع یا۔ تئیں تو کے معنی میں۔ تلک۔ ٹک۔ ذرا کے معنی میں۔ سکی۔ سوں۔ سجن۔ کنے۔ کسو۔ لوہو۔ مکھہ۔ نت۔ نون۔ مجھہ پاس۔ کرے ہے۔ آئیاں۔ جائیاں۔ ان میں سے اکثر الفاظ تو وجوباً ترک کر دئیے اور بعض الفاظ ایسے ہیں کہ کسی نے کہیں کہیں استعمال بھی کئے ہیں۔ اس کے بعد ان کے تلامذہ کا دورہ ہوا۔ انہوں نے بھی کچھہ لفظ ترک کئے" —

۳- جناب سجاد مرزا صاحب کی تسہیل البلاغت کے صفحہ ۴۹ سے متروک الفاظ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس میں واچھڑے۔ بہتایت۔ سرس (زیادہ بہتر) نہت وغیرہ الفاظ بھی موجود ہیں۔ ان میں سے کئی الفاظ شاہ حاتم متروک ٹھہرا چکے تھے۔ یہی حال زور۔ بل بے۔ خوباں اور عزیزاں کا ہے۔ ایسی فہرستوں سے کچھہ فائدہ مترتب نہیں ہوتا۔ پڑھنے والا سوچتا ہے کہ جب امیر اور داغ جن کو ہم نے کل دیکھا اور سنا تھا تلک اور بل بے لکھہ گئے تو ضرورت کے وقت ہم بھی

کیوں نہ وہ لفظ استعمال کریں —

۴ - جناب قرار کی کتاب کے خاتمہ پر چودہ صفحہ متروکات کے موضوع دئیے گئے ہیں۔ شروع میں جو لکھا ہے اس میں بہت کچھ عیوب ترکیب وغیرہ کی ذیل میں آتا ہے جس کا تعلق ٹھیٹھ متروکات سے ہرگز نہیں۔ مثلاً (صفحہ ۳۹) ایک جنس کے دو حروفوں کا قریب قریب آنا۔ کلام کا یہ نقص علم معانی میں تنافر حروف کی ذیل میں آتا ہے۔ اگر متروکات کی فہرست کو اس طرح طوالت دی جائے تو کلام کے تمام نقایص جس کا ذکر علم معانی اور علم بیان وغیرہ میں آیا ہے اس میں داخل ہو جائیں گے۔ اخیر میں ایک فہرست بھی دی گئی ہے۔ اس میں وہ الفاظ مثالوں کے ساتھ لکھے ہیں جو میر، سودا اور مصحفی وغیرہ متقدمین نے استعمال کئے، مگر اب متروک ہیں۔ امیر، داغ اور جلال بھی اس فہرست میں آجاتے ہیں۔ یعنی بقول مولف ان کے بھی بعض مستعملہ الفاظ اب متروک ہیں۔ اس اقتباس میں زمانہ وغیرہ کسی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ اخیری متروک لفظ " ہے گی " ہے اور اس کے لئے سودا کا شعر نقل کیا ہے۔ اس فہرست کے تین خانے ہیں، اول خانہ میں جائز الفاظ ردیف وار درج نہیں [بلکہ] دوسرے میں متروک تیسرے میں مثال کے شعر۔ چاہئے یہ تھا کہ اول خانہ میں متروک الفاظ کو لاتے —

۵ - اصلاح زبان اردو۔ کہتے ہیں لکھنؤ میں ایک انجمن اصلاح سخن تھی وہ ایک رسالہ گلچیں نکالا کرتی تھی۔ اس کے ممبروں نے زبان کے کچھ قواعد مرتب کئے۔ غالباً انہیں قواعد کی بنا پر یہ رسالہ ترتیب دیا گیا۔ راقم اس انجمن۔ اس کے ممبروں اور رسالہ سے قطعاً نا واقف ہے۔ اگر یہ انجمن ایک دوسری جماعت، انجمن دایرہ کی نوعیت رکھتی تھی جس کا ذکر نومبر سنہ ۱۹۰۸ ع کے معیار میں آیا ہے تو اُس کے معتبر ہونے میں شبہ کی بہت گنجایش ہے۔ یہ چھوٹی تقطیع کا رسالہ ۴۸ صفحوں میں اردو کی اصلاح اور متروکات کو

ہوتا دیتا ہے —

۹ - نور اللغات کے دیباچہ پر نومبر سنہ ۱۹۲۳ ع درج ہے اس لئے اس بحث سے متعلق یہ تازہ ترین کتاب ہے۔ فاضل مولف نے دیباچہ میں ۲۹۰ متروکات کی فہرست دی ہے۔ یہ فہرست مولف کے خیال میں ساری فہرستوں سے بڑی ہے اس میں ایسے تمام لفظ آجاتے ہیں جنہیں اردو شعرا نے اون سے آج تک مولف کے قول کے مطابق متروک قرار دیا ہے۔ میں محض اسے فضول طوالت اور تحصیل حاصل کہوں گا۔ گھر جانا، گھر ویران ہونا کی جگہہ۔ گھنا، پکڑنا کے بدلے سوں، سیتی، سیں، سے کی جگہہ اب نون لکھتا ہے یا اب سے پچیس برس پہلے کون نظم میں لاتا تھا جو یہ بھی اس فہرست میں داخل کردے گئے ہیں۔ متعلم کو اس فہرست سے کچھہ فایدہ نہیں ہوسکتا۔ چاہئے یہ تھا کہ داغ اور امیر کے متروک الفاظ اور ان کی وفات سے آج تک جو الفاظ ترک کئے گئے ان کی فہرست دے دیتے۔ یا زمانہ اور دور کا تعین کرکے ایک مسلسل مکمل فہرست پیش کرتے۔ مولف نے اس طویل فہرست کے بعد چند اصول بھی متروکات کی بحث میں قلم بند کئے ہیں جن کی تعداد ۴۹ تک پہنچتی ہے۔ ان میں صرف هدایتیں ہیں۔ وجہ اور علت کا ذکر کہیں نہیں آیا کہ کیوں فلاں لفظ متروک سمجھا جائے ؟ کیوں ایسا ایسا کرنا معیوب ہے ؟

ان چھوٹوں مطبوعات میں سے کئی ایسے ہیں کہ محض تجارتی مفاد پر نظر رکھکر شائع کئے گئے ہیں۔ کئی ایسے بھی ہیں جنہیں سندی حیثیت دینا انصاف کے قریں نہ ہوگا کیوں کہ ان کی مندرجات مقامی پاسداری سے مبرا نہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ لکھنؤ والے نے جو کچھہ لکھا اس میں اس نے وہ الفاظ متروکات کی ذیل میں درج کر دئے جن کو لکھنؤ والوں نے استعمال ہی نہیں کیا اور ان میں اکثر ہلدی کے مانوس الاستعمال الفاظ ہیں۔ جاننا چاہئے کہ ترک، اخذ یا استعمال کے وجود کو ممکن ہی نہیں لازم ٹھہراتا ہے۔ جب ایک لفظ

کبھی آپ کے استعمال آیا ھی نہیں تو آپ کا اس کو ترک کرنا کیا معنی رکھتا ھے؟ اس قبیل سے ایک لفظ سندیسا ھے * یہ لفظ لکھنؤ کے مشاھیر شعرا نے استعمال نہیں کیا۔ مگر دھلی میں استعمال ھوتا رھا ھے۔ یہاں تک کہ مہذب داغ میں آیا ھے پھر اسے متروکات کی فہرست میں شامل کرکے داغ کا شعر لکھہ دینا معقولیت سے خارج ھے۔ اگر یہ فرض بھی کرلیں کہ یہ لفظ کسی شاعر نے سوائے داغ کے استعمال کیا ھی نہیں، تو اس کے خلاف یہ کہا جا سکتا ھے کہ ناسخ وغیرہ نے ایسے بہت سے الفاظ استعمال کئے ھیں جو ان کے سوا اور کسی شاعر نے استعمال کئے ھی نہیں، خواہ وہ کہیں کا رھنے والا اور زبان کے کسی مرکز کا متبع تھا۔ مثلاً سپرغم، جریدتین، خالق الاصباح، سباح وغیرہ۔ تو کیوں نہ انھیں بھی متروکات کی فہرست میں درج کیا جائے۔ ان اصحاب نے یہ بھی کیا ھے کہ عام متروکات کی تمثیل میں چن چن کر دلی والوں کے اشعار اقتباس کئے ھیں اور لکھنؤ والوں کے کلام سے مجبوری کی حالت میں استفادہ کیا ھے غالباً وہ روش اسی وتیرہ کا جواب ھوگی جو جناب سجاد مرزا بیگ صاحب نے اپنی تسہیل البلاغت میں اختیار کی۔ راقم کے اعتقاد میں ادیب اور نقاد کا مسلک ان دونوں رستوں سے پرے پرے ھونا چاھئے۔ جناب شوق کے ھاں یہ افراط تفریط نام کو نہیں —

تاریخی کوایف کہئے یا مبادیات ان کے بعد چند امور ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ھیں۔ پھر بعض الفاظ کے متروک قرار دینے کے متعلق بحث کی جائے گی۔ سب سے اول جو سوال ذھن میں اٹھتے ھیں یہ ھیں کہ

(۱) ایک لفظ مدت سے اردو میں مستعمل ھے اب جو اُسے ترک کیا جاتا ھے تو کس بنا پر؟ اس کے خلاف کونسی نئی باتیں پیدا ھوگئیں اور اسی معنی اور

* اس کا مفصل ذکر آگے آئیگا

موقعہ کا کونسا لیا اور بہتر الفت مل گیا ہے جو اسے متروک الاستعمال قرار دیا جاتا ہے؟—

(۲) وہ کون شخص یا اشخاص ہیں جو الفاظ کو متروک قرار دینے کے اہل ہیں؟—

(۳) جو الفاظ وغیرہ متروک بتائے جاتے ہیں آیا وہ اردو زبان سے نکالدئے گئے ہیں یا صرف اردو کی نظم سے؟ اگر صرف نظم سے خارج کئے گئے ہیں تو اس اخراج کا اطلاق محض غزل اور عاشقانہ شاعری پر ہے نئی طرز کی شاعری پر بھی جسے بوجہ اختصار نیچرل شاعری کہا جائے گا؟—

اس ضمن میں اور بھی بہت سے امور تنقیح ہیں لیکن طوالت کے خوف سے نہیں تین امور کا ذکر کیا جائے گا—

(۱) جن الفاظ یا ترکیبوں کو ہم سب اردو میں ترک کر بیٹھے ہیں ان میں سے کسی ایک کی نسبت بھی کبھی یہ سننے میں نہ آیا کہ ان وجوہ سے یا اس اصول کے تحت میں یہ لفظ ترک کیا گیا۔ ابتدا سے اب تک یہ بد عنوانی چلی آئی ہے اس سے بدعت اور طوایف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوگیا۔ جو جس کے جی میں آیا کر گزرا۔ متروکات کی فہرست پر جب غور کی نظر ڈالی جاتی ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ چھانت چھانت کر ٹھیٹھ اردو الفاظ جو زبان میں مدتوں سے رچے بچے تھے کان پکڑ کر اردو کی سبھا سے باہر کئے جاتے ہیں۔ اور اردو کو عربی، فارسی لغات سے گرانبار کیا جاتا ہے۔ میں اس ضمن میں اُن کا ذکر نہیں کرونگا جو دوسری طرف سنسکرت لغات کی بھرمار کررہے ہیں۔ کیونکہ وہ تعداد اور اثر میں کم ہیں۔ اردو کے کسی ہندو شاعر یا ادیب کو جس کی ادبی حیثیت مسلمہ ہو یہ الزام نہیں دیا گیا کہ وہ زبان میں اس طرح ثقالت پیدا کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ کیا ہندو اور کیا مسلمان اردو لکھنے والے سب ہی ارادی یا غیرارادی متروکات کے باب میں برابر ہیں—

میں اس جگہ ہندوستانی کے دو لفظ لکھتا ہوں۔سندیسا اور بتھا۔یہ دونوں لفظ اردو لغات میں موجود ہیں۔ان میں سے سندیسا نوراللغات کی متروکی فہرست میں داخل ہے۔دوسرا لفظ بتھا اس میں نہیں آیا۔شاید اس نے استعمال بھی نہیں کیا۔راقم نے ایک جگہ استعمال کیا ہے اب ذرا ان دونوں لفظوں کے معنی کو دیکھئے۔سندیسا کے معنی ہیں۔راضی خوشی کا پیغام۔خیر سے کی خبر۔عربی فارسی کا کوئی لغت جو اس معنی کا حامل ہو ابتک اردو کے علم سے باہر ہے۔اُن زبانوں میں اس کا کوئی مترادف ہوگا بھی تو وہ لغت کے محبس میں قید ہوگا۔مژدہ یا نوید سندیسا کے مترادف نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ ایک خاص مسرت آمود واقعہ کی خبر دیتی ہیں۔پیغام بری بھلی دونوں قسم کی خبر پر محتوی ہوتا ہے۔صلح کا پیغام بھی ہوتا ہے اور جنگ کا بھی نوراللغات کے جامع سے پوچھنا چاہئیے کہ یہ لفظ کس وجہ سے متروکات کی فہرست میں شامل کیا گیا۔اور یہ کہ سندیسا کا مترادف لفظ پیغام انہوں نے کس تحقیقات کی بنا پر لکھدیا ہے۔وہ اس میں غلطی پر ہیں۔اگر پیغام سندیسا کا مترادف ہوسکتا ہے تو سنانی کو بھی کیوں نہ ایسا مانا جائے۔آپ کاکوری کے رہنے والے ہیں جو قصبہ زبان کے اعتبار لکھنؤ کا متبع ہے۔اگر لکھنؤ نے اس لفظ کو ترک کردیا تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے اس لفظ کو استعمال کب کیا تھا۔اخذ، اختیار یا استعمال کئے بغیر ایک شے ترک نہیں کی جا سکتی ہے - کسی ہندو کا یہ کہنا کہ ختنے کا ترک کیا جائے یا کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ مردے کو جلانا متروک ہے ایساہی لایعنی ہے جیسے یہ کہنا کہ سندیسا اردو میں متروک ہے - غلط ہے - کیون کہ یہ لفظ لکھنو نے کبھی استعمال ہی نہیں کیا۔ بہر حال انہیں چاہئیے تھا کہ لکھنو کے متروکات کی اور ان

---

* دیکھو فرہنگ آصفیہ۔مولفہ شمس العلما سید احمد صاحب دہلوی

ان الفاظ کی جگہیں اور مقاموں کے برخلاف لکھنو نے استعمال نہیں کیا ایک ایک علحدہ فہرست مرتب کرتے تا کہ پڑھنے والے کو دھوکا نہوتا۔ متروک الفاظ کی مثالوں میں انہوں نے جابجا دھلی اور لکھنو اور سب مقاموں کے شاعروں کے کلام نقل کر دئے ھیں۔ اس سے یہ شبہ ھوتاھے کہ ان کی یہ فہرست کل اردو دنیا کی مسلمہ ھے۔ مگر جہاں تک اس لفظ کا تعلق ھے یہ ادعا درست نہیں۔ داغ کے ھاں یہ لفظ مہتاب میں آیا ھے—

سنکے وہ حال مرا غیر سے فرماتے ھیں

آئے ھیں آپ محبت کا سندیسا لیکر

میری رائے میں ھمارے پاس کوئی وجہ موجود نہیں کہ اس لفظ کو متروکات مین داخل کیا جائے۔ دوسرا لفظ جسکا ذکر آگے آیا بتھا ھے۔اسکے معنی ھیں تکلیفوں یا مصیبتوں کی روداد یاداستان غم۔ میرے علم میں مختلف زبانوں کے ان لغات میں سے جنسے اردو کو شناسائی ھے ایسا پر معنی مفرد لفظ کوئی نہیں دکھائی دیتا۔پھر کیوں نہ اسے رواج دیاجائے۔ ابتک ھم یہی سنتے آئے ھیں کہ فلاں لفظ فلاں ترکیب فصحا یا اکثر فصحا نے ترک کردی۔کوئی پوچھے کہ حضرت آخر اس ترک کی وجہ۔ اسکا موجب؟ تو جواب ندارد۔ یہ کبھی ظاھر نہ ھوا کہ فصاحت اور فصیح کی تعریف کیا قرار دی گئی ھے۔ اسکا معیار کیا ھے؟ اس کے مرونے کے کیا اصول ھیں۔ مزاج کی سودائیت نے ایک حساسی کیفیت پیدا کرکے قوت ممیزہ کو ماؤف کردیاھے۔ نتیجہ یہ ھوا کہ ھرشے میں "آدم بو" کا مضموں صورت پذیر ھو گیا۔ نہ لفظ کی صرفی ماھیت پرنظر کی گئی، نہ اس کی معنوی اھمیت کا لحاظ ھوا اور خرج یخرج ترک یترک کی گردان شروع ھو گئی۔ یہ دیکھہ کر بڑا اچنبھا ھوتاھے کہ اس اچھوت سدھار دلت اودھار، تبلیغ اور مساوات کے زمانے میں جب ھرایک دوسرے کو اپنے میں لینے کو لپکتا ھے اردو میں "نکالو! باھرکرو!" کے سوا اور کوئی صدا

سننے میں نہیں آتی- یہ بیوقت کا راگ ہے- اردو والے یاد رکھیں اور خوب یاد رکھیں کہ اگر اُن کے متروک الاستعمال کی لے اسیطرح بڑھتی گئی تو ان کی وہی گت ہوگی جو "خارج از برادری" کی لے نے ھندؤں کی بنائی- خوف ہے کہ کہیں اردو ادب کو ان "تارکان ادب" کے ھاتھوں وھی دن دیکھنا نصیب نہو جو چھوت چھات اور سوجھ کی مریضانہ حساسی نے ھندؤں کے قومی ادبار کا ملبتے ثابت کیا- کوڑھی کے ساتھہ کوئی کھانا نہیں کھاتا- کھجلی والے سے سب الگ رہتے ہیں- ہیضہ اور پلیگ کے مریض سے سب ہی بچنا چاہتے ہیں یہاں تک تو احتیاط کرنا درست - اس سے زیادہ بیماری ہے خواہ وہ سوشل معاملہ میں ہو یا ادبی میں —

(۳-۲) اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر داغ اور امیر نے یا غالب اور مومن نے- میں کہتا ہوں شاہ نصیر اور ناسخ نے کچھہ الفاظ اردو کی برادری سے خارج کئے تو کیا وہ اب پھر اس میں داخل نہیں ہوسکتے ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ سو کوئی تیس چالیس برس متروک رہنے کے بعد اب اردو میں واپس آیا ہے ان سب باتوں سے قطع نظر دیکھنا تو یہ ہے کہ متاخرین اور معاصرین شاہ نصیر سے لیکر داغ تک اور داغ سے لیکر آج تک - جن شاعروں نے نظم کے فن کے قاعدے وضع کئے اور خاص خاص لفظوں یا ترکیبوں کو متروک قرار دیا ان کی حیثیت اردو نظم کے باب میں کیا تھی بلحاظ اس کے مختلف اصناف اور موضوع کے تنوع کے- متقدمین سے قطع نظر کرکے شاہ نصیر سے لیکر مرزا داغ تک کیا لکھا کرتے تھے- ان کے کلام کی نوعیت کیا تھی- اس کا میدان کتنا وسیع تھا؟ "نام نیک رفتگاں" کو ضایع کرنا اپنا شیوہ نہیں- یہ اور دوسرے بزرگ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ تمام اردو دنیا کے لئے ہمیشہ واجب التعظیم رہینگے- لیکن سچ کہنے سے چارہ نہیں- کہنا پڑتا ہے کہ غزل اور کبھی کبھی قصیدہ کے سوا اور صنف میں یا کسی مفید اور کار آمد موضوع پر انہوں نے کبھی فکر نہیں کی- وہ جس صنف میں بھی

لکھتے اس پر وہی مجاز کا رنگ حاوی تھا-لیکن اس سے ان پر کوئی الزام عاید نہیں ہوسکتا-اس زمانہ کی چال یہی تھی اور ملک کا مذاق ہی ایسا تھا-آزاد مرحوم نے بیشک چھاتی پر سل رکھہ کر یہ سطریں لکھی ہونگی -

".........دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دخان سے
ایجاد کی ہوائیں اڑائینگے اور برج آتشبازی کی طرح
اس سے رتبۂ عالی پائینگے-انہوں نے اس ہوا سے بڑے
کام لئے مگر یہ غضب کیا کہ گرد و پیش جو وسعت
بے انتہا پڑی تھی اس میں سے کسی جانب میں نہ گئے-
بالاخانوں میں سے بالا بالا اڑ گئے" *—

جس شاعری کی یہ بساط ہو کہ مخفی خیال بندی اور قافیہ پیمائی سے شروع ہو کر اسی پر اس کا خاتمہ ہوجاے-یعنی غزل-اور غزل کی ہر بیت بجاے خود ایک قایم بالذات نظم-مطلع میں رستم سے کشتی لڑ رہے ہیں-حسن مطلع میں موت کا فرشتہ شاعر کی روح قبض کرنے آتا ہے لیکن آپ اتنے نحیف اور ضعیف ہیں کہ اسے دکھائی ہی نہیں دیتے اور وہ خالی کا خالی چلا جاتا ہے-اگلے شعر میں آپ کا جنازہ اٹھتا ہے اور آپ شرمسار ہیں کہ نازنین معشوق کو چالیس قدم ساتھہ چلنے کی اذیت ہوئی-اُس سے اگلے شعر میں آپ ساغر اور پیمانہ پٹک کر مٹکا ہی منہہ سے لگاکر شراب پی رہے ہیں-اور آگے چل کر آپ کا اپنے محبوب سے اختلاط ہو رہا ہے.. مقطع میں آپ میں اور آپ کے خدا میں نام کو فرق اور امتیاز نہ رہا-یہ گڑ بڑ جھالا ایران سے ہندوستان میں آئی اور یہاں اسے اور بھی بگاڑ دیا گیا-مختصر یہ کہ غزل کیا ہے؟ چند قوافی کا خوش اسلوبی سے نباہ-قصیدہ کیا ہے؟ مبالغہ کا قطب مینار-جس شعر گوئی کی یہ کائینات اور

---

* آب حیات-پانچویں دور کی تمہید

غرض و غایت ہو اُسے شاعری کہنا ہی معقولیت سے خارج ہے اول تو انھوں نے یا کسی اچھے شاعر نے کوئی قاعدے شعر کے فن یا متروکات کو بھی وضع کئے ہی نہیں۔یہاں یہ ذکر کرنا بر محل ہوگا کہ کسی زبان میں بھی بڑے شاعروں نے شاعری کے قاعدے نہیں باندھے۔اور اگر کہیں اس کے خلاف ہوا ہے تو النادر کالمعدوم کی مصداق ہے۔خیر، اردو کے ان استادوں کے کلام یا ان کی اصلاحوں سے لوگوں نے بالواسطہ کچھہ باتیں استنباط کر کے ان کا نام قاعدہ اور ضابطہ رکھہ لیا۔بہر حال آج کل کے زمانہ اور موجودہ صورتوں میں نہ وہ قاعدے جوں کے توں واجب التعمیل ہیں اور نہ ان کے وضع کرنے والے یہ اہلیت رکھتے تھے۔ان کا اطلاق زیادہ سے زیادہ پرانی چال کی عاشقانہ شاعری پر ہوسکتا ہے۔ دوسروں پر۔کہئے نیچرل شاعری پر لازم نہیں آتا کہ وہ بھی ان الفاظ اور ترکیبوں کے استعمال سے محترز رہیں محض اس بنا پر کہ فلاں استاد نے ایسا کیا۔وہ دہلی کی سادہ کاری ہو یا لکھنؤ کی مرصع سازی۔یا پنجاب کی ہر ہنت پردازی غزل کی شاعری کے متعلق متروکات کی لے جتنی جی چاہے بڑھاتے جائیے لیکن یہ قیدیں نیچرل شاعری پر عاید نہیں ہوسکتیں۔حالی مرحوم کا تقریباً وہ تمام کلام جو مسدس کی تصنیف کے بعد موزوں ہوا۔حضرات صفی۔چکبست۔سرور مرحوم اور اقبال کی اکثر اور بیشتر نظمیں اور اسی قبیل سے اردو کے اکثر اچھے شعرا کا کلام " تنگنائے غزل " سے پرے پرے جاتا ہے۔جب آپ معشوق سے باتیں کرینگے یا اس کا ذکر۔تو بیشک چھوٹے چھوٹے سہانے لفظ۔نازک اسلوب اور میٹھی بولی میں گفتگو ہوگی۔لیکن جب زندگی کے جدید مسایل یا حقیقت اور انسانی جذبات کے شدید موضوعات پر لکھنے بیٹھینگے تو سخن کا طرز اور ہوگا۔ غرض کہ خیال کی شاعری کام کی شاعری سے جداگانہ ہے۔اس کے قاعدے اور ضابطے بھی جداگانہ ہونے چاہئیں اور ان کے وضع کرنے والے بھی۔ان وجوہ سے میں یہ عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ وہ قاعدے جو اب تک نظم کے لئے

؛ندھے گئے ھیں اور وہ الفاظ اور ترکیبیں جنھیں ترک کردیا گیا ھے ان سب
ی نظر ثانی اور ترمیم کی ضرورت ھے-جبھی تو ہم دیکھتے ھیں کہ کئی لفظ
تیس چالیس سال متروک رھنے کے بعد اب پھر زبان میں داخل ھو گئے ھیں
بیسے سو، خیر یہ بات تو دور کی ھے نہ اب تک کسی کے ذھن میں آئی نہ
اب سے پہلے کبھی اس سے بحث ھوئی-غزل کو ھی لیں تو ظاھر ھو گا کہ جو
الفاظ وجوباً یا ترجیحاً متروک بتائے جاتے ھیں ان کے ساتھہ غزل کے فاسی
شاعر اور دوسرے شعرا کا کیا عمل ھے؟—

آیندہ مندرجات کے متعلق راقم نے یہ التزام دیا ھے کہ داغ اور امیر کو ایک حد قایم کرکے دکھایا گیا ھے کہ آیا انھوں نے ایک لفظ جسے متروک کہا جاتا ھے استعمال کیا یا نھیں اور یہ کہ ان کی وفات سے آج تک مشاھیر شعرا کا کیا سلوک اس لفظ کے ساتھہ رھا ھے اس زمرہ کے اکثر شعرا اس وقت موجود ھیں اور اردو دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ھیں—

اب میں چند ایسے الفاظ سے بحث کرونگا جنھیں متروک ٹھرایا جاتا ھے-استعمال کے ثبوت میں اساتذہ اور مشاھیر شعرا کے تازہ ترین کلام سے جو دستیاب ھوسکا اشعار نقل کئے گئے ھیں-داغ کے تمام اشعار مہتاب سے-امیر کے صنمخانہ سے-جلال کے نظم نگارین سے اور جلیل کے جان سخن اور تاج سخن سے لئے گئے ھیں-میری علم میں ان اصحاب کے یہ سب سے اخیری مطبوعہ دیوان ھیں-اور حضرت جلیل کے دونوں دیوانوں کی عمر دس بارہ برس سے زیادہ نھیں-ان شعرا کے کلام کی طرف اس مضمون میں جہاں کہیں اشارہ کیا گیا ھے وھاں ان کی انھیں کتابوں سے مطلب ھے جنکا ذکر ابھی کیا گیا-دوسرے شاعروں کا کلام جہانتک ممکن ھوا ھے معتبر رسالوں اور کتابوں سے لیا گیا ھے-ناظرین کی آسانی کے لئے ان کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جاتی ھے—

ابر مرحوم-آنیربل پنڈت بشن نراین در صاحب لکھنوی-بیرسٹر ایٹ لا—

ابر۔ مقلد میر و غالب جناب حکیم سید علی حسن صاحب لکھنوی ــ
اقبال۔ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال۔ ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا۔
سیال کوٹی ــ
اکبر۔ جناب سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی۔ مرحوم ــ
امیر۔ جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی۔ لکھنوی۔ مرحوم ــ
باسط۔ جناب سید محمد باسط علی صاحب بسوانی ــ
برق۔ جناب منشی جوالا پرشاد صاحب بی۔ اے لکھنوی۔ سشن جج اودھ
مرحوم ــ
برق۔ جناب منشی مہاراج بہادر صاحب دہلوی۔ منشی فاضل ــ
برہم۔ جناب حکیم عبدالکریم صاحب گورکھپوری۔ اڈیٹر مشرق و فتنہ وغیرہ۔
بلیغ۔ جناب نواب سید عسکری مرزا صاحب لکھنوی ــ
بیخود۔ جناب منشی سید وحیدالدین صاحب۔ دہلوی ــ
جلال۔ جناب حکیم سید ضامن علی صاحب لکھنوی۔ مرحوم ــ
جلیل۔ جلیل القدر فصاحت جنگ جناب حافظ جلیل حسن صاحب مانکپوری ــ
چکبست۔ جناب پنڈت برجنرائن صاحب چکبست بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔
وکیل ہائی کورٹ۔ لکھنوی* ــ
حسرت۔ جناب مولانا سید فضل الحسن صاحب موہانی۔ بی۔ اے۔ اڈیٹر
اردوئے معلی ــ
داغ۔ فصیح الملک دبیرالدولہ ناظم یار جنگ جناب نواب مرزا خاں صاحب
دہلوی۔ مرحوم ــ

---

* آپ نے کوئی تخلص ہی نہیں رکھا چکبست آپکا خاندانی عرف ہے آپ چونکہ اسی نام سے معروف ہیں اس لئے خمخانۂ جاوید کے اتباع میں عنوان آپ کے نام کے لئے اختیار کیا گیا ــ

راسخ - جناب مولوی سید عبدالرحمن صاحب دهلوی - مرحوم —

ریاض - جناب سید ریاض احمد صاحب خیرآبادی —

زکی - جناب مولانا سید زکریا خاں صاحب دهلوی - مرحوم —

سایل - جناب نواب سراج الدین احمد خاں صاحب - دهلوی —

سرور - جناب منشی درگا سہائے صاحب جہان آبادی - مرحوم —

سلیم - جناب مولانا وحید الدین صاحب پانی پتی - پروفیسر عثمانیه یونیورسٹی —

شاد - یمین الملک سر مہاراجه کشن پرشاد صاحب - حیدرآبادی —

شاد - خاں بہادر جناب مولوی سید علی محمد صاحب عظیم آبادی —

شاعر - افسرالشعرا جناب آغا شاعر صاحب دهلوی شاعر دربار جهالا وار

شوق - جناب منشی احمد علی صاحب قدوائی - لکھنوی مرحوم —

صفدر - جناب مولوی صفدر علی صاحب مرزا پوری —

صفی - جناب مولانا سید علی نقی صاحب لکھنوی —

ضامن - جناب مولوی سید ضامن علی صاحب کنتوری —

ظہیر - جناب مولانا سید ظہیرالدین حسین صاحب - دهلوی - مرحوم —

عزیز - جناب مولوی مرزا محمد هادی صاحب بی اے لکھنوی - پروفیسر عثمانیه یونیورسٹی —

محروم - جناب منشی تلوک چند صاحب - ڈیرہ اسمعیل خانی —

مضطر - جناب حکیم اسد علیخاں صاحب دهلوی —

نادر - جناب مولوی نادر علیخاں صاحب کاکوری مرحوم —

نظر - جناب منشی نوبت رائے صاحب لکھنوی مرحوم —

نظم - نواب حیدر یار جنگ جناب مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی لکھنوی —

وحشت - جناب سید رضا علی صاحب کلکتوی —

یاس - جناب مرزا واجد حسین صاحب عظیم آبادی —

پہ - بمعنی پر | حضرت شوق نے اسے اپنی متروکات کی فہرست میں نہیں شامل کیا حضرت عشرت لکھنوی نے اس کا ذکر کیا ہے - فرماتے ہیں پہ کا استعمال اب اکثر فصحا نے ترک کردیا ہے - اس کے بدلے (پر) بولتے ہیں آخر میں داغ و جلال نے بھی ترک کردیا" صاحب نوراللغات اس لفظ کی نسبت یہ لکھتے ہیں - "یعنی فصحا نے اس کا استعمال نثر اور بول چال میں ترک کردیا ہے" اس باب میں راقم کے خیال میں حضرت عشرت کے مقابلے میں نوراللغات کا قول زیادہ معتبر ہے - اس سے ظاہر ہے کہ نظم میں یہ کلمہ متروک نہیں - اکثر شعرا کے کلام سے بھی ایسا ہی پایا جاتا ہے - خود داغ اور جلال کے ہاں یہ لفظ موجود ہے —

داغ

کاش تو گور غریباں پہ نہ مضطر پھرتا
صبر سے ناز سے تمکین سے ٹھہر کر پھرتا

دیکھو دیکھو مجھ پہ برساتے رہو تیر نگاہ
صید جس دم آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا رہا

دل کو لے لیتے ہیں در پردہ وہ عیاری سے
چار غیروں پہ جو کھلجائے تو پھر گھات ہی کیا

امیر

کیوں مرے سر پہ نہو لغزش پا کا احساں
ہاتھ پڑجائے جو بیساختہ اس شانے پر

درکار ہے بہانہ پئے مغفرت امیر
تقوے پہ منحصر ہے نہ صوم صلوت پر

ظہیر

کس کو غرض کہ دل کی مصیبت میں جی جلائے
اپنی خوشی کسی پہ اگر آئے آئے دل

شاد عظیم آبادی

ان محنتوں پہ بھی یہ مرا ہو رہا تھا حال
لڑکوں کی بھی سند تھی پہ میں غیر مستند

نظم

کیوں تن آسانی پہ مایل ہو گئے
جو فضایل تھے رذایل ہو گئے
دامن ہستی پہ تھیں داغ سیاہ
مٹ گئیں اس طرح جیسے دھو گئیں

جلیل

میرے زخموں پہ چھڑک کر وہ نمک کہتے ہیں
وہ تھا تلوار کا جوہر یہ ہے جوہر اپنا

بیخود

کیوں اُلجھتے ہو ہر اک بات پہ بیخود ان سے
تم بھی نادان بنے جاتے ہو ناداں کے ساتھ

حصر کعبہ پہ کیا ہے دیر سہی حج کا موسم نہیں تو سیر سہی

سایل

منہ پہ ملتا ہوں تری خاک قدم رو رو کر
کرنا پڑتا ہے وضو کر کے تیمم مجھ کو

برق لکھنؤ

گھونگٹ اک ناز سے نکالے
سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے

چرخ چہارم پہ ہے نمایاں
فیاض زماں مسیح دوراں

ابر

غور سے جب کسی دیوانہ کی حالت دیکھی
دل پہ اک چوٹ لگی ہائے میں وحشی نہ ہوا

صفی

حسن رسوا ہو دل اس بات پہ راضی نہ ہوا
اک نظر دیکھ لیا اس کو جو کوئی نہ ہوا

عزیز

طبقۂ گور گریباں پہ ذرا یوں نہ چلو
اک قیامت ہوئی یہ زور جوانی نہ ہوا
میں نے مجموعۂ جذبات پہ کی جب کہ نظر
تیری تاثیر تھی اے جلوۂ جاناں نہ جدا

وحشت

تیری رعنائی قامت کا بھلا کیا کہنا
ایسے مصرع پہ تو استاد ازل صاد کرے

چکبست

موت کے رنگ سے مٹتا ہے کہیں رنگ شباب
سرد ہونٹوں پہ جوانی کی ہنسی آتی ہے

سرور

جس پہ اتراتی ہے اب تک آہ تیری خاک پاک
دفن ہے زیر زمیں پہ کوں فخر روز گار

مضطر

تیرے وعدہ پہ مرتا ہوں قیامت کے لئے ظالم
کوئی تہمت لگا مجھ پر کوئی طوفان پیدا کر

برق دہلوی

گر مجھ سے تیرا دل نہیں ملتا نہیں سہی
تو جس پہ جان دیتا ہے کر اس کی دلدھی

باسط

آئینہ زانو پہ رکھا جب وفور جوش میں
ماہ کامل کو لئے بیٹھا تھا میں آغوش میں

سلیم

ہیں تیری شمع حسن پہ پروانہ اس لئے
شعلوں سے کھیلتے ہیں تری انجمن میں ہم

راسخ

اس پہ عاشق ہیں نگہ باز ہیں راسخ ہم بھی
دیکھ لیں گے نہ دکھاے رخ روشن سہرا

میں نہیں جانتا وہ کون سے فصحا ہیں اور کہاں رہتے ہیں جنہوں نے بقول جناب عشرت پہ بمعنی پر اب ترک کر دیا ہے۔جن شاعروں کے کلام سے ابھی اقتباس کیا گیا ہے وہ بیشک فصیح سمجھے جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر اس وقت بفضلہ موجود ہیں۔حضرت عشرت کو اس قسم کے اجتہاد سے آئندہ احتیاط چاہئیے۔اب رہا نوراللغات کا قول۔اس مضمون میں ہمارا روے سخن اردو کی نظم کی طرف ہے۔بول چال کا جو اس میں ذکر آیا ہے سو بول چال کی کوئی سند نہیں—

جلال مرحوم کے ہاں (ان کو چوتھی دیوان نظم نگاریں میں) بیشک یہ

لفظ نہیں آیا-اس کے بدلے ہر جگہہ انہوں نے پر ہی لکھا ہے لیکن بوجہ ادغام کے جو انہیں اکثر و بیشتر موقعوں پر کرنا پڑا ہے بیسوں جگہہ " پر آیا " کا " پرا یا " وغیرہ شکلیں پیدا ہوگئی ہیں-اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ وہ پہ ہی استعمال کرتے-اس کے علاوہ متروکات کے باب میں جناب جلال کو سند پیش کرنا شاید ٹھیک نہ ہوگا کیوں کہ ان کے ہاں بہت سے قدیم اور مسلمہ متروکات موجود ہیں- جیسے انکھڑیاں-اسی دیوان میں فرماتے ہیں:—

اپنی شوخ انکھڑیوں میں کچھہ تو حجاب آنے دو
راہ پر آئیں جو یہ خانہ خراب آنے دو

اس کے علاوہ چٹیلا' بے مرمتے نہ جاے' بہ سہل' پری کات' رسوا کن و غماز' جانی' بن ٹھن رہنا' پیش اہل مذاق' جاویداں' نذری' نفس چند کے مہماں' گہ' پھبن کی تذکیر وغیرہ الفاظ اور ترکیبیں ان کے ہاں کثرت سے موجود ہیں-میں یہ ضرور کہونگا کہ بعض اُمور کا لحاظ اُنہوں نے بہت کیا ہے چنانچہ اُن کے ہاں کہیں خود رفتہ نہیں آیا ہر جگہ بڑے جد و جہد سے از خود رفتہ اور از خود رفتگی ہی لاے ہیں-حکیم صاحب مغفور کے مداح آزردہ ہوں گے ورنہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ چند فارسی اور بعض اُردو "متروکات" سے بچنے میں ان کا ذہن اتنا صرف ہو گیا کہ اُن کے کلام میں تخیل شاعرانہ کا اتنا نشان بھی نہیں ملتا جتنا بیچاری غزل کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے—

پر بمعنی مگر یا لیکن

حضرت شوق لکھتے ہیں "پر بمعنی لیکن بعض فصحا نے ترک کر دیا ہے" معلوم نہیں وہ بعض فصحا کونسے ہیں جنھوں نے یہ لفظ متروک قرار دیا-جناب عشرت لکھتے ہیں "آخر میں داغ و جلال نے بھی ترک کر دیا تھا" جلال کی متروکات کی نسبت اوپر کچھہ ذکر آگیا ہے-داغ کے اخیری دیوان میں ایسے بہت سے لفظ اور ترکیبیں موجود

ھیں جلمیں متروک بتایا جاتا ھے مثلاً سو، ساقیا، گلابی پوش، وہ ھی، بسا فلہمت، تا بہ حشر، دستگاہ، روسیہ، سدا، دیکھ بجاے دیکھئے وغیرہ۔اس لئے اس باب میں نہ جلال کی سند مسلم ہو سکتی ھے نہ داغ کی۔نورا للغات شوق کا ھمنوا ھے چونکہ اس معنی کا حامل اور کوئی لفظ اتنا مختصر نہیں ھے اس لئے اگر اسے صرف عشقیہ غزل کے متعلق متروک سمجھا جاے تو مضائقہ نہ ہوگا مگر نظموں میں یا نیچرل مضمون کی غزلوں میں ہرگز ایسا نہیں ہونا چاہئے۔اس لفظ میں نہ کوئی ثقالت ھے نہ ذم کا پہلو اور پھر اتنا مختصر۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے ترک کیا جاے چند فصحا کے کلام سے استفادہ کیا جاتا ھے —

امیر

سیہ کاری سے جی بھرتا نہیں پر شام آتی ھے
کہاں تک بوجھہ رکھئے کاتب اعمال کے سر پر

لگایا تو گلے سے پر لگائی تیغ بھی آکے
ملا تو عید کے دن وہ مگر چیں برجبیں ہوکر

اس قدر ھے دراز ھجر کی رات پر تڑپنے سے جی نہیں بھرتا

نظر

نظر ھم کو علاقہ شعر سے کیا پر یہ حسرت ھے
نہ رھتے ھم تو اپنا ذکر اس محفل میں رہ جاتا

صفی

لب پر اک موج تبسم ھاتھہ میں ھلکی سی تیغ
نیم بسمل سیکڑوں پر نیمِ جاں کوئی نہیں

ابر مرحوم

جو نازک طبع ھیں مت جاتے ھیں پر اُف نہیں کرتے
شکست رنگِ گل کی کب صدا آتی ھے گلشن میں

برق لکھنوی

ہر ایک کا جدا ہے رنگ و روش   پر سبزہ پہ ہے بلا کا جوبن

بہ ظاہر یہ پایا جاتا ہے کہ پر کلمۂ استثنا کی معنی میں متروکات دہلی میں سے ہیں—

گر، بجاے اگر | شوق لکھتے ہیں ''گر بجاے اگر بعضوں نے وجوباً ترک کر دیا ہے'' عشرت نے اس لفظ کو متروکات میں نہیں لیا۔نورا للغات اُردو نثر میں متروک اور نظم میں اگر کو فصیح قرار دیتا ہے۔اس کی نسبت بھی میرا وہی قول ہے جو پر، کی نسبت آچکا ہے اب شعرا کا قول سنئے:—

داغ

فتنہ سازی بھی مرے دل کی قیامت ہوتی
گر ترے کوچے کی مٹی سے بنایا جاتا

اے واعظ اس کا ڈر ہے کہ آے نہ آے راس
گر بادۂ ظہور مرے حق میں سم ہوا

امیر

✓ کرتے تو ہو سوال امیر اس سے حشر میں
اور اس کو گر جواب نہ آیا تو پھر کہو

بیخود

✓ سنو گے اسی طرح گر بن کے پتھر
نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکو گے

جلیل

✓ یہی عالم ہے گر جوش جلوں میں خاک اُڑانے کا
زمیں بھی سر پہ اک دن آرھیگی آسماں ہو کر*

---

* تارکان ادب کے قول کے مطابق اس شعر میں دو متروکات موجود ہیں۔دوسرے مصرعہ میں بجاے پر، کے پہ، آیا ہے مگر شعر کی شان ملاحظہ کے قابل ہے—

نظر

نہ دیتا گر سہارا کچھ اُمید وصل کا طوفاں
شناور بحر غم کا حسرت ساحل میں رہ جاتا

معروم

ہم کو گر ہستی جاوید عطا کی تو نے
اپنے الطاف پہ اک اور اضافہ کر دے

برق دہلوی

گر اور ہی کسی پہ ترا دل نثار ہے
دم بھر بھی گر تجھے مرے ملنے سے عار ہے (مثنوی)

صفدر

وزیر اس وقت گر ہوتے تو ان سے پوچھتے ہم بھی
لیا ملک معانی کس نے شاہ شاعراں ہو کر

راسخ

گر مال طلب کروں تو کتنا چاہو
کیا مجھ پہ بنی ہے کیوں یہ فتنہ چاہو

نظم

اُلٹ جانے کی شایاں گر زمیں ہے
تو پھٹ پڑنے کے قابل آسماں ہے

تلک جناب شوق کے قول کے مطابق "اکثر خواص نے ترک کر دیا ہے" اور یہ امر واقعہ ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ جناب عشرت کی متروکی فہرست میں یہ لفظ شامل نہیں۔ بقول نوراللغات "خاص خاص شعرا نے ترک کر دیا ہے" معلوم یہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۷ء کے بعد یہ لفظ پھر تناسخ پذیر ہو گیا اور صرف خاص خاص شعرا ہی اسے مردہ سمجھتے رہے۔ لیکن موجودہ شاعروں کا

کلام دیکھنے سے پایا جاتا ہے کہ غالباً اس خوف سے کہ مبادا تقلید کے توپ خانہ کا منہ ان کی طرف موڑ دیا جائے اول صنف کے اکثر شاعر اس کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔جو عہد متروکات کے باب میں تعین کر چکا ہوں اس میں اس کے استعمال کی مجھے صرف تین نظیریں ملیں۔بعض الفاظ خواہ مخواہ مرعوب ہو کر بھی ترک کر دئے جاتے ہیں۔اگر یہ لفظ ترک کر دینے کے قابل ہے تو اس کی وجہ کیوں نہیں بتائی جاتی۔مانا کہ تک، اس کا مرادف اور اس سے مختصر لفظ موجود ہے۔مگر جب نظم میں قافیہ کی قید لازمی ہے تو ملک اور فلک کا ایسا بولتا ہوا قافیہ کیوں لغات سے خارج کیا جاتا ہے۔اگر امیر مرحوم فصاحت کے باب میں خصوصیت رکھتے تھے تو سنئے وہ کیا کہتے ہیں:—

امیر

دھوم کرتا ہے تو اے وحشت تو خاطر خواہ کر
شہر گردی کب تلک صحرا سے بھی کچھ راہ کر
کعبہ نہ جائے جو رہ نہ پہنچے خدا تلک
زاہد خدا کے گھر کی یہی ایک راہ ہے

اقبال

ہمنشیں افسانۂ بیداری جمہور چھیڑ
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک (کب تلک ردیف)

معلوم ہوتا ہے کہ تلک کا ترک دہلی کے اجتہادات میں سے ہے نہ داغ کے ہاں آیا اور نہ دوسرے مشاہیر کے ہاں ملا۔لکھنؤ بھی اب اس سے محترز ہو چلا ہے۔بہر حال غزل کے متعلق راقم کو اس لفظ کی حمایت میں اصرار نہیں—

یاں۔واں بقول شوق محض غیر فصیح ہے اور اکثر شعرا نے ترک کر دیا ہے۔ قرار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔نوراللغات کے ارشاد کے بموجب "فصحاے دہلی استعمال کرتے ہیں لکھنؤ کے بعض شعرا احتراز کرتے ہیں" لیکن تحقیق کا نتیجہ اس کے برعکس ہے۔داغ کے ہاں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔نہ شاہیر دہلی کے کلام میں دیکھا گیا۔ہاں لکھنؤ اور اس کے توابعات میں اس کا استعمال کم و بیش پایا جاتا ہے۔جس لفظ کو امیر آخیر تک استعمال کرتے رہے اور جلیل اور چکبست اب تک کر رہے ہیں وہ بقول شوق غیر فصیح کیسے ہو سکتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ شوق کا اجتہاد اس باب میں دیکھ چکے تھے —

امیر

✓ کسی پہ زخم پڑا یاں جگر پہ آئی چوٹ
بھلا ہو زخم کا اپنی ہوئی پرائی چوٹ

✓ مجھ سے ہو سکتا کہ دیتا بازوے قاتل کو رنج
واں ہوئی ابرو کو جنبش یاں بدن پر سر نہ تھا

جلیل

وعدے پہ نہ یاں آنا وعدہ نہ وفا کرنا
آنا تو الگ رہنا کرنا تو جفا کرنا

واعظ کی کیا مجال جو مستوں میں آسکے
یاں ہوش کا گزر نہ کسی ہوشیار کا

چکبست

ملتے ہیں انہیں کے لئے ہے کوثر و تسنیم
یاں جو رہ مولا میں لٹاتے ہیں زر و سیم

یاس

رهائی کا خیال خام ہے یاں کان بجتے ہیں
اسیرو بیٹھے کیا ہو گوش بر آواز ور ہوکر
ہوا کا دخل نہیں یاں وہاں ہوا کا عمل
قفس کی سمت بنا ہے کہ آشیانے کی

بلیغ

تم گھر گئے یاں دل میں اٹھا درد قضا آئی
کیا پوچھتے ہو حال عدم کے سفری کا
عالم نزع میں اٹھوائے گئے ہم واں سے
ہائے کس وقت ہوا ہے در جانانہ جدا

حسرت

نکلا جو واں سے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں ہے
ہوں دولت و حشمت پر ارباب ہوس نازاں
یاں بے سر و سامانی سامان مصیبت ہے

ضامن

اس کی جمعہ کی کل غنیمت
واں ہوتی تھی زیب خوان نعمت

الف ندا کا اختلاط منادیٰ کے ساتھ

بقول شوق ''اب غیر فصیح ٹھہرا ہوا ہے'' تعجب ہے کہ مہتاب اور صنمخانہ میں یہ ترکیب کیوں فصیح سمجھی گئی- شوق کے یہ لفظ سنہ ۱۸۸۷ ع سے آج تک کئی بار چھپ چکے ہیں مگر فصحا اور شعرا نے دلا تو ترک کر دیا لیکن ساقیا- زاہدا وغیرہ اب تک برابر لکھہ رہے ہیں- یہ ترکیب مع خوشا کے (جلال '' خوشا نصیب اس

..ایسی ترکیبوں بہت استعمال کرتے ہیں) وجوباً ترک کر دینا چاہئیے—

رفیع کے وزن پر نئی اُر۔اُور کے بدلے

حضرت شوق لکھتے ہیں بعض فصحا واؤ نہیں گراتے۔جناب عشرت نے رسالہ میں یہ لفظ نہیں آیا۔قرار صاحب نے بھی اسے چھوڑ دیا ہے۔نوراللغات میں اسے متروکات کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔راقم کی رائے ہے کہ غزل میں یہ لفظ غور کے وزن پر ہی استعمال کرنا بہتر ہے۔داغ۔جلال اور جلیل نے یہ لفظ بر وزن نفع استعمال نہیں کیا۔عزیز۔سرور۔شوق قدوائی۔برق لکھنوی۔وحشت۔نظم۔اور نادر کے ہاں بھی کہیں آیا ہے۔غزل کے شاعروں نے خوب کیا کہ اسے ترک در دیا—

پکھا۔رکھا۔لکھا۔اٹھا

جناب شوق فرماتے ہیں دوسرے حرف کی تشدید کے ساتھ فصیح ہے تحتی نوت میں لکھتے ہیں "حتی الوسع بالتشدید ہی استعمال کرنا چاہئیے مگر بضرورت بالتخفیف بھی بے تکلف استعمال کرسکتے ہیں کیونکہ تلک اور سدا کی طرح یہ متروک نہیں" ہمارے اصول نہیں تو اصول کی پرچھائیں ہی سہی کچھ تو پتہ چلا اس سے صاف ظاہر ہے کہ ضرورت کی شرط پر ان لفظوں کے استعمال یا ترک کا انحصار ہے۔میں کہتا ہوں یہ ضرورت کی شرط اور متروکات سے وابستہ کیوں نہو۔کیا وجہ ہے کہ تلک اور سدا ضرورت پر بے تکلف استعمال نہ کئے جائیں۔جناب قرار کی فہرست میں حرف رکھا ہی ہے۔راقم کا قول یہ ہے کہ غزل میں ان تینوں لفظوں کا ک تشدید بغیر آنا وجوباً متروک قرار دینا چاہئیے۔میں نے ایک اور۔چوتھا لفظ بھی لکھدیا ہے یعنی اٹھا۔اس کے ماضی مطلق واحد کے صیغے میں ت پر وجوباً تشدید لانی چاہئیے

• امیر مرحوم نے صنمخانہ میں ایک جگہ ضرور استعمال کیا ہے—

دل جو دیں ان سے تو اے جان یہ کہرا پردا
اور روا رکھتے ہو پردے میں پھر آنا دل کا

† راقم "پار" کو ترک کے قابل نہیں سمجھتا—

تاکہ امر کے واحد حاضر صیغہ اور اسی طرح فعل کے دوسرے صیغوں کا آپس میں التباس بالکل نہ رہے—

ذیل کے شعرا کا کلام دیکھکر جنکی فصیح بیانی کے سب قایل ھیں یہ شبہ ہوتا ھے کہ وہ بزرگ اِن " تارکان ادب " کے اجتہاد کو نہیں مانتے جس کا سبب غالباً انھیں کی نازک مزاجی ھوئی-جب ترک کی لئے بے حد بڑھی تو شاعروں نے اس " تارکان ادب " کو نظر انداز کردیا—

داغ

روزہ رکھیں نماز پڑھیں-حج ادا کریں
اللہ یہ ثواب بھی ھے کس عذاب ھے
لڑیں گے وہ حوروں سے فردوس میں
یہ فتنہ اٹھے گا قیامت کے بعد
لکھا ھے داغ نے اس کا یہ مصرعہ تاریخ
ھزاروں سال مبارک یہ جشن سالگرہ

امیر

ضبط کرتے ھی اثر نالوں کا ظاھر ھوگیا
بول اٹھے گھبرا کے ھے ھے 'وہ آخر ھوگیا
خط طویل یار کو میں نے لکھا مگر
مطلب کو دیکھئے تو کہیں کچھہ پتا نہیں

جلال

بے تمہارے یہ رھی شکل نشست و برخاست
بیٹھے دل ھوکے اٹھے درد جگر کی صورت
تقدیر کا لکھا اسے کہتا ھے نامہ بر
خط آئے غیر کا مرے خط کے جواب میں

ریاض

ریاض اب کیا کریں اس شہر سے هم قصد جانے کا
نصیبوں میں لکھا هے خاک گورکھپور هوجانا

جلیل

دل چیخ اٹھا خیال جو ابرو کا آگیا
خنجر لگا گیا کوئی حنجر لگا گیا
لکھا هے شان میں اس کی جو سہر برج شاهی هے
چمک جاے نه کیوں اس بندۂ درگاه کا سهرا

عزیز

پرده اٹھا تو سرجع دل یه جہاں تھا
شرمندگی هوئی مجھے اپنی خمیر سے

مہاراجه شاد

هوا جو تاریخ کا میں خواهاں تو بول اٹھا شاد هو کے شاداں

برهم

میں نے اے برهم لکھا ترتیب دیواں کا یه سال

برق لکھنوی

مرغان چمن چهک اٹھو تم   گلهاے چمن مهک اٹھو تم

لیجیے۔دیجیے بجاے لیجئیے۔دیجئیے | جناب شوق لکھتے هیں ''ایک ی' گرانا اور بر وزن فعلن استعمال کرنا غیر فصیح ٹھرا هوا هے'' نوراللغات شوق کا هم زبان هے۔عشرت اور قرار کے هاں اس کا ذکر نہیں۔کیا وجوه لاحق هوے که فعل کی ان دو شکلوں میں سے ایک کو قطعاً متروک قرار دینے کی ٹھرائی ؟ پایا جاتا هے که یه لکھنؤ کے متروکات میں سے هے۔وهاں معاصرین کے کلام میں ایسے صیغے فعلن کے وزن پر نہیں آتے۔هاں دهلی میں یه شکل اب تک مروج هے—

داغ

وہ خریدار ہی دل کے نہ ہوے کیا کیجیے
ہم بھی کچھہ دیتے کچھہ ان کو بھی دبایا جاتا
میرے ہی ہاتھہ سے مشکل مری آسان ہوگی
مجھکو دیجیے جو نہیں آپ سے خنجر پھرتا

بیضود

ناپ لیجیے اپنے گیسو کی درازی قد سے آپ
اب تو یہ فتنہ قیامت کے برابر ہوگیا

زکی

دلیل راہ اس نقش پا سے سر فدا کیجیے
طریق عشق میں یہ ارمغاں ہے پہلی منزل کا

راسخ

ہے توڑ یہ بھوک کا کہ سم کھا لیجیے
ٹھوکر بھی لگے تو ہر قدم کھا لیجیے

سایل

دونوں جملوں کو جمع کر لیجیے
سن ہجری کی ہوگئی تکمیل

شاعر

سر شوریدہ میں وہ بات نہیں پہلی سی
اب تو وقت آگیا کیجیے بھی سبکدوش مجھے

بتلانا دکھلانا وغیرہ | بتلانا دکھلانا وغیرہ بتانا دکھانا وغیرہ کی جگہہ استعمال کرنا دہلی کے متروکات میں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نسبت بھی راقم کی یہ راے ہے کہ اگر اس کا ترک واجب رکھا جاے تو

تو غزل تک محدود رہے —

امیر

سنتا ہوں محتسب نے کیا میکدہ کو قرق
بٹھلا دیا یزید نے پہرا فرات پر

آنکھ دکھلاتے ہیں وہ دیکھیں کے مجھکو بیتاب
یہ نکالا ہے نیا درد جگر کا تعویذ

جلال

وہ ٹھکانا تمہیں بتلاؤ جہاں رہتا ہے
ہوش میں اپنے زخود رفتہ کو جب لاؤ ابھی

چکبست

نہ بتلائی کسی نے بھی حقیقت راز ہستی کی
بتوں سے جا کے سر پھوڑا بہت دیر برھمن کے

عزیز

ایک حالت ہو تو اس منظر کو دکھلائے کوئی
سیکڑوں دیکھے تماشے اے بلائے ناگہاں

سدا | سدا کے خلاف دھلی اور لکھنؤ نے غضب کی تلوار سوتی ہوئی ہے - حضرت اکبر مرحوم اور جناب جلیل کی جوانمردی توصیف کے قابل ہے کہ انہوں نے اس غریب کو اچھوت نہ مانا —

اکبر

صدائے سرمدی سے مست رہتا ہوں سدا اکبر
مجھے نغموں سے کیا مطلب مجھے سرگم سے کیا مطلب

جلیل

جلیل سنگ حوادث کا کیا کریں شکوہ
ہمارے دل نے سدا چوٹ پر اُٹھائی چوٹ

یہ سوال نہایت اہم ہے کہ کیوں اس لفظ کو ترک کیا جائے - اگر یہ کہا جائے کہ صدا سے التباس نہو اس غرض سے اس غریب کو اردو کی برادری سے کان پکڑ کے نکال باہر کیا - تو میں کہوں گا کہ ہماری زبان میں بہت لفظ ایسے موجود ہیں جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور وہ بے تکلف استعمال کئے جاتے ہیں - مگر حرت استثناء ہے - اور ایک دریائی جانور کا نام بھی ہے اور کسی سے سرگوشی کرنے کا امتیاز بھی رکھتا ہے - کیوں نہ اس لفظ کو صرت ایک معنی میں استعمال کیا جائے اور باقی در میں ترک کردیا جائے - ایک اور لغت صلوت ہے جو دو بالکل متناقض معنوں میں استعمال ہوتا ہے بہاشا کے ایسے بہت لفظ اردو میں موجود ہیں جو سدا اور صدا سے بھی زیادہ متشابہ باہم ہیں - کہئے کہ تلفظ اور املا میں عربی یا فارسی الفاظ سے بالکل یکساں ہیں جیسے کالا - سالی - مور - بندر - در - وغیرہ کیوں بہاشا لفظ متروک قرار دیا جائے اور عربی فارسی کے نہیں - جلکے مترادت اردو میں موجود ہیں یہ دیکھکر نہایت تعجب ہوتا ہے کہ اُدھر تو ایک لفظ کو اس کے مقدس معنے سے ہٹا کر نہایت مکروہ معنی پہنائے جاتے ہیں اور ادھر ایک لفظ کو جس کا ہموزن ہم معنی میسر نہیں اس بنا پر ترک کیا جاتا ہے کہ اس کی آواز ایک اور لفظ کی آواز سے ملتی ہے - ہمیشہ - دایم - دایما مدام وغیرہ الفاظ رباعی ہیں بلکہ بعض ان میں خماسی بھی - جناب جلیل اور جناب اکبر نے بہت معقولیت سے کام لیا کہ انیس اور مومن کے استعمال کی تقلیدکی - میں ان "تارکان ادب" سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ان کا عندیہ یہ ہے کہ سے میں - کا - جیسے چند روابط - گنتی کے مصدروں - دس پانچ اسمائے ذات اور

دو چار صفات سوا باقی تمام اردو اور سودیشی لفظ زبان سے خارج کردئے جائیں اور ان کی جگہ عربی، فارسی، ترکی، مصری، عراقی وغیرہ الفاظ بھرتی کئے جائیں - ایسا ہے تو اس کا اعلان ہونا چاہئے تاکہ کوئی دھوکے میں نہ رہے - جن لوگوں نے ہندی اور اردو بنائی وہ ایک اور زبان بھی بنا سکتے ہیں - اساتذہ اور مشاہیر کے کلام کے اقتباسات سے واضح ہو سکتا ہے کہ اِن اکثر نام کے متروکات کی متروکی حیثیت کہاں تک اسم با مسمی کی شان رکھتی ہے - ان تارکانِ ادب نے یہ بھی کیا ہے کہ اگر ایک شاعر نے کوئی غلطی کی یعنی غلط استعمال کیا یا ایک استاد کے باب میں کہدیجے کہ تصرف کیا تو اسے بھی متروکات میں شامل کر کے اپنی فہرست کی طوالت میں اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً حضرت خواجہ کے المضاعف کو بھی متروکات ذیل میں لے آئے ہیں۔ خواجہ مرحوم نے لا علمی سے یا بے خیالی میں المضاعف کو غلط باندھ دیا تھا —

زہر پرہیز ہوگیا مجھ کو۔درد درماں سے المضاعف ہوا۔

اسی طرح صاحب نوراللغات نے خواجہ مرحوم کی دوسری غلطی یا "تصرف استادانہ" یا شاعرانہ مجبوری کو جو "حلوۂ بیدود" کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی تھی متروکات کی فہرست میں رکھ دیا ہے۔ "سندیسا" کا ذکر پہلے آچکا ہے۔یہ واقعات طویل استدلال سے مستغنی کرکے یقین دلاتے ہیں کہ ان کی فہم نے "متروک" کی تعریف ہی متروک قرار دیتی ہے۔غرابت مخالفت قیاس۔ لغوی۔ ضعف تالیف وغیرہ کے تحت میں جو ذمایم اور نقایص بیان کئے گئے ہیں ان سب کو متروکات میں گلدستہ کردینا ایسا کرنے والوں کی علمی استعداد اور فن کی واقفیت کی قلعی کھولتا ہے۔متروک کی تعریف یہ قرار دیجا سکتی ہے —

متروک وہ لفظ یا ترکیب ہی جو ایک وقت ایک زبان میں بغیر کسی قید اور تخصیص کے مستعمل ہو لیکن پھر اس کا استعمال بالکل یا اس کے ایک مخصوص معنی میں ترک کردیا گیا اس اہم موضوع پر کسی نے تفصیل اور طویلوں

کے ساتھ بحث تو کی نہیں، ہاں کیا تو یہ کیا کہ اپنی زعم میں جن لفظوں یا صیغوں کو رکیک اور مذموم یا غلط سمجھا انہیں آنکھ بند کرکے متروکات کی فہرست میں داخل کردیا۔ لکھنؤ والوں نے دھلی کی خصوصیات کو اور دھلی والوں نے لکھنؤ کے خصوصیات اور اغلاط کو متروکات کی مثل میں نتھی کردیا اور سب نے پنجاب کے خصوصیات کو متروکات قرار دے دیا۔ اردو کے متروکات اور متروک کی تعریف ہر ایک کے ذہن سے پرے پرے ہی رہی۔ اور یہ بھی ہوا کہ ایک جگہ کے مستقل متروک کی پروا اس شخص نے جو وہاں سے ادبی واسطہ نہیں رکھتا مطلق نہ کی۔ مثلاً آگے ذکر آچکا ہے کہ صاحب نوراللغات نے اپنی ہاں متروکات کی فہرست کو فضول طول دیا ہے لیکن اس پر بھی وہ فہرست سکمل نہیں۔ جاننا چاہئیے کہ دھلی کے فصحا میں "دکھنا" متروک اور غیر فصیح ہے وہ اس کے بدلے "دکھائی دینا" کہتے ہیں۔ اگرچہ میں اس ترک کے خلاف ہوں کیونکہ مجھے کوئی برہان ناطق نظر نہیں آتی نہ کیوں ایک چار حرف کا لفظ ترک کرے اس کی جگہ نو حرف کا لفظ وجوباً استعمال کیا جائے۔ میرے ہاں یہ لفظ ایک جگہ آگیا تھا۔ احباب نے ٹوکا۔ میں نے کہا آپ سے نکلے تو نکالدیجئے۔ اس میں وہ سب قاصر رہے۔ آخر وہ اُسی طرح قایم رہا۔ یہاں جو یہ ذکر آگیا ہے تو میں ایک اصول کی بات بتانا چاہتا ہوں۔ ہم لوگ یعنی ہندوستان کے ہندو مسلمان خواہ کسی خطے اور حصے میں رہتے ہوں مذہبی عقیدت اور دینی احکام کی پابندی میں نہایت راسخ اور استوار ہونے کے باوجود تہذیب اخلاق کے باب میں نہ صرف یقین سے بلکہ عمل سے بھی ضعیف الاعتقاد اور ڈھلمل یقین ہیں۔ "شبھ ھنکا" شگون بد شگون، سعد و نحس وغیرہ ارکان دین کے ساتھ ساتھ ہمارے دلوں پر مسلط ہیں۔ نذر نیاز، بھینٹ چڑھاوا، سامنے سے چھینک پڑی ابھی مت جاؤ!۔ بلی راستہ کاٹ گئی کسی سے لڑائی ہوگی۔ اُس طاقچے کو جمعرات کے دن سہرا اور گھی کا دیا چڑھاؤ۔ اس پیپل کے پیڑ کو پورنماسی کی رات کو دودھ پلاؤ اور کلاوہ

پہناؤ"وہ پھرجی پرانے بخار کا تیر بہدت تعویذ دیتے ہیں"۔ "سول سرجن موجائیں تو ضرور ان پھرجی کو بلائینگے"۔ "وہ بھکت جی تلی کا حکمی جھاڑا کرتے ہیں"۔ کل مسہل ہولے تو جھڑوا لایا کرو"۔ مختصر یہ کہ جب افراد کے مزاج میں سودائیت غلبہ پا جاتی ہے تو نظام اعصابی ماؤف ہوکر ذکی الحس ہوجاتا ہے۔یعنی ذرا سی سردی یا گرمی سے طبعیت بگڑ جاتی ہے۔برائے نام تری یا خشکی کی زیادتی بیماری کی صورت پیدا کر دیتی ہے۔خاص اسباب سے جو کیفیت افراد کی جسمانی صحت میں مریضانہ ذکی الحسی کی شکل میں صورت پذیر ہوتی ہے ویسی ہی کیفیت انسانوں میں من حیث الجماعت ذہنی صحت میں احساس کی مریضانہ شدت کی شکل میں صورت پذیر ہوجاتی ہے۔جس کی آئینہ بردار اس کی زبان ہوا کرتی ہے۔جنھوں نے علمی اصول پر زبانوں کی تحقیق کی ہے وہ ایک زبان کی ساخت' اس سے محاورں' کہاوتوں اور صنایع بدایع سے اس کے استعمال کرنیوالوں کے سیر اور تہذیب معاشرت کا مجسمہ تیار کر لیتے ہیں۔جب کہ ہماری معاشری اور جماعتی حالت وہ ہے جس کی طرف ابھی اشارہ ہوا تو یہ امر لابد تھا کہ ہماری زبان شکوک اور واہمہ کی زیر مشق ہو۔جبھی تو آپ دیکھتے ہیں کہ نقایص اور سقایم' عیوب اور ذمایم جتنے ہمارے ہاں بتائے جاتے ہیں اس قسم کے کسی اور زبان میں نہیں پائے جاتے۔ ایک ذم کا پہلو ہی ایسا جن ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ شاید کوئی اس سے بچا ہوگا۔جو بولو وہی لکھو نہیں تو فصاحت کی ٹکسال سے باہر۔یہ کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا' وہ لفظ اب تک کسی نے استعمال نہیں کیا یہ روز مرہ کے خلاف' وہ محاورہ کی سند کا محتاج' وغیرہ وغیرہ۔ان سب باتوں پر طرہ یہ کہ لے دے کے تین حروف علت تو ہماری زبان کی پونجی مگر وہ بھی منھہ کھول کر اپنا نام نہیں بتانے پاتے۔کوئی کہتا ہے فارسی الفاظ کا الف گرانا جایز نہیں۔کوئی حکم لگاتا ہے الف' واؤ' ی' کسی کا بھی تقطیع سے ساقط ہونا جایز نہیں۔کوئی یہ فتویٰ

دیتا ہے کہ واؤ اور ی کا مضایقہ نہیں لیکن الف سالم الصوت اور تقطیع کے اندر رہنا چاہئیے۔ یہ شاید اس ادب کے پاس سے کہ رام اور خدا میں یہ حرف آیا ہے۔ اور یہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اردو نظم میں آخر ایسی کیا بات ہے کہ اس غریب تثلیث کی گوشمالی ناگزیر ہے * —

عرصہ | ایک صاحب فرماتے ہیں "عرصہ بمعنی مدت آج کل زبانوں پر بہت جاری ہے۔ مگر احتیاط لازم ہے کیونکہ عرصہ بمعنی میدان ہے" محض یہ واقعہ کہ یہ لفظ آج کل اس معنی میں زبانوں پر بہت جاری ہے اس ترک کے خلاف بیٹھتا ہے۔ پھر ہرج کیا ہے اگر دونوں معنوں میں استعمال کیا جائے۔ لیکن لکھنے والے نے یہ غلط کہا کہ عرصہ بمعنی مدت آج کل زبانوں پر بہت جاری ہے۔ ہم تو شاہنشاہ اورنگ زیب کے وقت سے اس لفظ کو اس معنی میں سن رہے ہیں نعمت خان عالی وقایع اول میں فرماگئے ہیں:—

یکے بشرط کہ فردا ست کوچ تا دہلی   تواں بہ عرصۂ چل روز یا دو ماہ رسید

عادی۔مشکور | یہ بھی ہو رہا ہے کہ عرصہ کی طرح فارسی عربی کے وہ الفاظ جو ابتدا سے ابتک ایک خاص معنی میں مستعمل تھے، اب ترک کئے جارہے ہیں۔ وہ لوگ یہ بھولتے ہیں کہ ایک لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ اور معنی بھی ہوا کرتے ہیں اور کہ کلام کی عقلی حقیقت یا عقلی مجاز متکلم کے عندیہ اور اعتقاد پر منحصر ہے۔ جب عادی اور مشکور مدتوں سے عادت کیرندہ اور احسان مند کے معنی میں استعمال ہو رہے ہیں اور متکلم اور سامع دونوں کا ذہن انہیں معنوں کی طرف جاتا ہے تو اب قاموس اور صراح سے فتویٰ لیکر ان الفاظ کو اردو سے خارج کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ گلاب کی مانند ان کو بھی مہند کیوں نہ مانا جائے۔ جس طرح گُلاب سے گُلابی بنالیتے ہیں

---

* یہ موضوع اتنا تفصیل طلب ہے کہ اس سے یہاں بحث نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کسی آیندہ وقعہ پر ملتوی رکھا جاتا ہے —

اسی طرح مشکور سے مشکوری بنا لیا تو کیا حرج ہوگیا۔ معنی یا املا اور ہجا کی تبدیلی کے ساتھ بے شمار الفاظ مفرس اور معرب ہوگئے ہیں۔ذکی مرحوم فارسی عربی میں مسلمہ قابلیت رکھتے تھے اور مرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں تھے انہوں نے مشکور استعمال کیا ہے۔فرماتے ہیں -

ہوئی تقدیم احساں احسن تقویم سے ثابت
نہو مشکور پھر کیوں بندہ لطف کبریائی کا

جناب ضامن کنتوری " گلزار نسیم اور تنقید نقاد " والے معنوں میں مشکور لکھتے ہیں—

عادی ہر اہل زبان کی زبان پر ہے۔حضرت جلال نے اس بنا پر اس لفظ کو اردو سے خارج کیا تھا کہ اس کا وجود اردو کے ثقات شعرا کے کلام میں پایا نہیں جاتا۔حکیم صاحب اگر نواب مرزا لکھنؤی کو ثقات شعرا میں نہیں سمجھتے تھے جو کہہ گئے ہیں—

ہم تو دشمن ہیں جعل سازی کے
آپ عادی ہیں رندی بازی کے

تو خواجہ وزیر لکھنؤی تو یقیناً ان ثقات حضرات کے حلقے کے ایک اعلیٰ رکن ہیں۔فرماتے ہیں،

تیغ ابرو کی زباں عادی ہوئی
بات سیدھی بھی جو کی تیڑھی ہوئی

اسی پر اور الفاظ کے ترک کے اسباب اور علل کو قیاس فرما لیجئے--

اضافتیں یہ قرار دیا گیا ہے کہ تین مسلسل اضافتوں سے زیادہ کلام میں لانا ممنوع ہے۔لیکن اس کی پابندی کم ہوتی ہے۔حضرت ریاض ایک جگہہ چار اضافتیں لکھہ گئے ہیں۔فرماتے ہیں:—

رہ گئے ہم گرد پس کارواں　　نقش کف راہرو طوفان سخن

نقش کف پا بھی نہیں نقش آب　　　خاک سر آب روانی سخن

دیکھئے چھوٹی بحر کے ان مصرعوں میں بارہ اضافتیں آئی ہیں—

اضافت وہیں تولا بد لانی پڑتی ہے جہاں تشبیہ اور استعارہ سے کام لیا جائے اور ان صنعتوں میں ہندی اردو سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ ہندی والے کس طرح اضافت کے بغیر ان کا نباہ کرتے ہیں؟ اس کے علاوہ فارسی میں اضافتوں کی اتنی بھر مار کیوں نہیں ہوتی۔ خواجہ حافظ اور نظیری کی غزلیں پڑھئے اضافت کی وہ بہتات ان کی ہاں ہرگز نہیں جو اردو میں مرزا غالب اور اقبال کے ہاں پائی جاتی ہے۔ بلکہ خود مرزا صاحب کی فارسی کلام میں اضافتوں کا وہ ہجوم نہیں جو ان کی اردو کلام میں موجود ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جب آپ نے دو تین کے سوا باقی تمام حروف تشبیہ متروک قرار دیدے * جیسے آسا، ساں، نمط۔ صفت، رنگ وغیرہ تو پھر تشبیہ اور استعارہ کا بناہ ناممکن کے قریب ہوجائے گا۔ ان سب امور کو نظر میں رکھ کر راقم کی رائے ہے کہ نثر میں اضافت وجوباً متروک قرار دی جائے اور نظم میں دو سے زیادہ اضافتیں نہ لائی جائیں۔ نظم میں غزل بھی داخل ہے۔ لیکن غزل گو شعرا سے میں یہ کہوں گا کہ اگر یہ درست ہے کہ غزل میں معشوق سے بات چیت کی جاتی ہے اور وہ معشوق اناث کی جنس کا ایک فرد ہے۔ فعل خواہ کسی صیغہ میں لایا جائے۔ تو انسب ہے کہ ایسی غزل کو اضافت سے معرا رکھا جائے۔ کیوں کہ عورتیں اضافت نہیں بولتیں۔ ریختی کے دیوانوں میں اضافت کا نشان کہیں نہ ملے گا غزل کا معشوق اسی زبان میں بات سننا پسند کرے گا۔ جو وہ خود بولتا ہے—

نون | نون کے غنہ رکھنے یا اس کے اعلان کا قاعدہ بھی کلیہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ تو مانا کہ اضافت کے بعد اس کا اعلان ناجایز ہے، لیکن اضافت

---

* اس بات میں راقم کا کلی اتفاق ادب کے تارکوں کے ساتھ نہیں ہے —

کے بغیر اس کے اعلان یا غنہ ہونے کے متعلق کوئی التزام نہیں رکھا گیا- بس یہی کہدیا ہے کہ بلا اضافت نون کا اعلان ہونا چاہئیے مگر جن الفاظ کا نون روز مرہ میں غنہ بولا جاتا ہے اس کا اعلان مکروہ ہے-ان الفاظ کی مکمل فہرست چاہئیے تھی—

مت — بعض ہندو فرقوں میں عورتوں اور ملک کے ایک خاص حصے میں اس لفظ کا جا وبیجا استعمال دیکھہ کر یہ حکم لگا دیا کہ مت نفی کے معنی میں متروک ہے-راقم بھی اس معنی میں اس کے ترک کا حامی ہے لیکن فعل نہی حاضر کے صیغہ کےاستثنا کے ساتھہ اِس موقع پر مت کے بغیر نہی کی تاکید آدھی بھی نہیں رہتی—

اب میں اس قسم کی بحث کو بالفعل بند کر کے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ابتک کوئی اصول اور قاعدہ الفاظ اور ترکیبوں کے ترک کرنے کا اردو میں وضع نہیں کیا گیا ہے - راقم کے نزدیک ایک لفظ یا مرکب کو متروک اعلان کرنے سے پہلے ان اصولوں کا لحاظ رکھنا چاہئیے—

(ا) جو لفظ کریہہ الصوت ہو یا ثقیل التلفظ جب کہ اس کا مترادف موجود ہو—

(ب) جس میں بذاتہ یا دوسرے الفاظ کے ساتھہ ملکر ذم کا پہلو نکلتا ہو—

(ج) علاوہ ان نقایص کے جو غرابت اور مخالفت قیاس لغوی کے تحت میں آتے ہیں ایسے الفاظ اور ترکیبیں جنکو پوری طور پر سمجھنے کے لئیے عربی یا فارسی لغات دیکھنے ضرورت پڑے - یعنی اردو کو عربیرانی نہ بنایاجائیے (عرب اور ایران کی زبان سے ماخوذ) —

(د) جو الفاظ سلاست، فصاحت اور ترنم کے منافی ہوں اور اردو کی شخصیت کے قیام میں حارج ہوں—

انہیں تجوجہ تعمیہ ہو سکتا ہے۔اصل میں ایسے اصول قایم کرنا کسی ایک انسان کا کام ہے ہی نہیں ۔ انجمن ترقی اردو کا فرض ہے کہ وہ ایک جامع اجلاس کسی مرکزی مقام پر منعقد کرنے کا انصرام کرے ۔ جہاں ملک کے ہر حصے کے ادیب اور مطلف جمع ہوں اور اس معاملہ اور زبان کے متعلق دوسرے امور کا فیصلہ پوری بحث مباحثہ کے بعد ہوکر قراردادہ قایم کئے جائیں راقم کے ذہن میں چند الفاظ اور باتیں ایسی ہیں جنہیں ترک کردینا چاہئے مگر میرے متروکات دوقسم کے ہیں لفظی اور معنوی ۔ لفظی متروکات کا ذکر ہر شخص کرتا ہے اور انہیں سے اس مضمون میں ابتک بحث کی گئی ہے ۔ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ متروکات کے دفتر میں معنوی متروکات کی جدا مثل ترتیب دیجائے —

معنوی متروکات

معنوی متروکات	میری راے میں امور ذیل کا (التزام) بطور معنوی متروکات کے ہونا چاہئے —

(۱) خط عارض یا معشوق کی ڈاڑھی مونچھہ کا تذکرہ قطعاً ترک کردینا چاہئے ۔ مشاہیر میں حضرت جلیل تک اس کا وجود پایا جاتا ہے ۔ تاج سخن میں لکھا ہے —

نمود سبزۂ رخ پر سکوت ان کو ہوا
یہ خط وہ آیا ہے جس کا کوی جواب نہیں

امید کی جاتی ہے کہ غزلگو حضرات عاجز کی یہ تجویز بلا چوں چرا منظور فرمائنگے —

(۲) معشوق کی کم سنی —

وہ کم سنی میں کھیل بھی کھیلیں گے تو یہی
مٹی کے تیغ و ناوک و خنجر بنائیں گے

ابھی سن ھی کیا ہے جو بیباکیاں ہوں
انہیں آئیں کی شوخیاں آتے آتے

سہمے جاتے ہیں ڈرے جاتے ہیں وہ عاشق سے
کمسنی ہے ابھی اس سن میں جھجک ہوتی ہے

جلیل

وہ کمسنی کے سبب واقف عتاب نہیں
دم سحر ہے ابھی گرم آفتاب نہیں

غزل کی یہ بیہودگی شرافت اور صالح مذاق کے اسقدر منافی ہے کہ ایراد و تعریض کی محتاج نہیں۔ اس اخلاقی جرم سے بچنا چاہئیے —

۳۔ معشوق کا روٹھنا سر آنکھوں پر۔ مگر گالیاں دینا اور کوسنا سوقیت اور رکاکت کی خبر لاتا ہے۔ اس لئے ناشایستہ حرکت سے اُسے وجوباً باز رکھنا چاہئیے۔

۴۔ قصابی مضمون۔ یہ نام میں ایسے مضامین کو دیتا ہوں:-

نہ سوچے ہم کہ تہ تیغ ہوگی خلق اللہ
گھٹا نہ حوصلہ قاتل کے دل بڑھانے کا

معشوق نہ ہوا کسی شہر کے سلخ کا میر قصاب ہوا:—

لگائیں لاش پہ تلواریں اس نے مقتل میں
جو میرے بعد بھی آیا مرا ہی وار آیا

امیر

اتر کر اس نے مقتل میں جو کھینچا میاں سے خنجر
قضا میداں سے بھاگی بیٹھ کر قاتل کے توسن پر

مہتاب داغ میں ۸۸ جگہ اس قسم کے قصابی مضمون آئے ہیں۔ اس قبیل کے مضامین میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ معشوق کی جنسیت کے متعلق سامع کا ذہن ایک خاص جانب منتقل ہوتا ہے اور شاعر کے مذاق کو مذموم

ٹھہراتا ہے۔ ستمگر اور ظالم کے ساتھ سفاک اور قاتل معشوقوں کے ناموں میں رھلے دیکھئے' مگر یہ قتل اور سفاکی' بوندی کی کٹاری' سروہی کی تلوار اور اصفہانی شمشیر سے نہیں ہوتی۔اس کے لئے قدرت نے اُن کو اور ہتیاروں سے مسلح کیا ہے' جیسے تیغ ادا' تیر نظر' شمشیر تغافل' سناں مژگاں۔قدرت کی کارپردازی آپ کی اصلاح اور ترقی سے مستغنی ہے' یہ ہتیار آپ کے تیغ اور تیر سے زیادہ کاری ہیں اور معشوق کی جلسہت بھی قائم رہتی ہے —

۵-وصل-اس مضمون کے اشعار میں ایسی بد مذاقی اور عریاں نویسی سے کام لیا جاتا ہے کہ کوئی شاعر سینہ پر ہاتھہ مار کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنی غزلیں اپنی ماں اور باپ اور بہن کے سامنے پڑھا کرتا ہوں۔معشوق کے عاشق کے ساتھہ تلوار بیچ میں رکھکر سونا' خلخال پائے دوست کی جھنکار منہہ اور زبان کے مضامین' اور زیادہ کیا لکھوں۔بھلا ان باتوں میں شاعری کا کونسا کمال اور ادب کا کونسا معجزہ دکھایا جاتا ہے۔راقم کی ناقص رائے میں اس قسم کے مضامیں اور وصل کا یہ مفہوم یک قلم متروک قرار ہونا چاہئے۔ وصل کا اطلاق خلوت صحیحہ پر کرنا وجوباً متروک ہونا چاہئے اور اسکا مفہوم صرف اور محض عاشق معشوق کا ایک جگہ بیٹھنا جیسے دو پیارے دوست بیٹھتے ہیں۔شکوہ شکایت اور پیار محبت کی میٹھی میٹھی باتیں' باغ میں ساتھہ پھرنا وغیرہ وغیرہ ہونا چاہئے۔سونا' پلنگ اور شبستاں یا خواب گاہ میں معشوق سے تخلیہ کرنا وجوباً متروک ہوجانا چاہئے—

۶-جوبن کی نسبت یہ ضرور کہا گیا ہے کہ اس کا اطلاق شباب کی عام کیفیت تک محدود ہونا چاہئے' زنانہ سینے کی ایک خاص کیفیت پر نہیں۔لیکن اسپر کاربند کوئی نہیں ہوتا۔تذکرہ نویسوں اور رسالہ والوں کو چاہئے کہ ایسے شعر قلمزد کر دیا کریں۔اپنے شاگردوں کی غزل بناتے وقت استادوں کو بھی اسکا اور نیز دوسرے امور کا خیال چاہئے' جن کا ذکر اس ذیل میں آیا ہے

مختصر یہ کہ معشوق کا سر اور گردن' ہاتھ کو کہنی تک-پانوں ٹخنے تک ری کی ملکیت ہونی چاہئے-کمر کو وحدہٗ لاشریک کی مصداق پر مانکر اس نازکی کا تذکرہ کر سکتے ہیں-جسم کے باقی حصوں اور عضوں سے لادعوی جانا چاہئے—

۷-معشوق کا لباس-معشوق کی کج کلاہی اور ایک پیچھ وغیرہ تو اب ے بھول گئے ہیں اور زیادہ توجہ زنانہ لباس کی جانب ہے-لیکن اکثر یہ ہوتا کہ اپنی من مانتے کپڑے پہناتے ہوئے شاعر غریب معشوق کو ننگا کر دیتے ہیں یان نویسی کا یہ دوسرا قبیح اور مذموم پہلو ہے-جب یہ تسلیم ہوچکا کہ شوق ہمیشہ اناث کی جلس سے ہے تو اس باب میں اور بھی احتیاط درکار ہے-ل پوشاک کا ذکر کرتے کرتے جسم کے ان حصوں کا بھی صراحتاً یا کنایتاً ذکر جاتے ہیں جن کو اس پوشاک میں مستور رہنا چاہئے-نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کلام لکل ننگا ہو جاتا ہے-دوپٹہ یا آنچل اس تذکرہ میں کافی ہے-یہ ساڑھی پہننے لوں اور دوسری قسم کی پوشاک والوں سب پر عاید ہوسکتا ہے-کیونکہ ندوستان کی ہر زنانی پوشاک میں آنچل کا وجود ثابت ہے-دامن اور یریں لباس کے گھیر کا بھی مضایقہ نہیں-یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی خاص رقہ یا ملک کے حصہ سے مختص نہیں-پوشاک کی باقی چیزوں کا ذکر وجوباً تروک ہونا چاہئے—

۸-غزل میں ایک اور انوکھا سوانگ بھرا جاتا ہے-شاعر اپنے آپ کو برند بنا کر صیاد کے جال میں پھنساتا ہے وہاں سے پنجرے میں منتقل کیا جاتا ہے جہاں میاں مٹھو بنا چڑیمار کو کوسا کرتا ہے-کبھی "دشت جنوں" میں تنکے چننا بھول کر جو اس کا منصبی فرض تھا سچ مچ کے تنکے چننے لگتا ہے اس سے اپنا گھونسلا بناتا ہے-وہ تو خیریت گزری کہ اس نشیمن کو بجلی نے فنا کر دیا ورنہ عجب نہ تھا کہ انڈوں بچوں کی نوبت آجاتی-فہم قاصر ہے

کہ ان مضمونوں میں عاشقی اور شاعری کی کونسی شان اور نازک خیالی مضمر ہے۔بلبل اگر پھول کی شیدا ہے تو ہو، آپ کو خدا نے انسان پیدا کیا ہے انسانیت کی باتیں کیجئے —

۹-دل کی تجارت-ہمارے شعری عاشق دل کے معاملے میں بھی بد نظمی سے کام لیتے ہیں-دل دینے میں ایسی جھک جھک اور تکرار ہوتی ہے کہ چھٹ بھیا دکانداروں سے سودا کرنا بھول جاتا ہے-گلی کوچوں کا وہ نظارہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوگا جب پھیری والا سرمہ، مسی، لچھے اور چوڑیاں بیچنے آتا ہے یا ایک جہانیاں جہاں گشت "زری گوٹا پرانا" کی آواز لگاتا ہے-اکثر عورتیں اُن سے لین دین کرتی ہیں، دام چکانے میں پیسے پیسے پر وہ تکرار ہوتی ہے کہ الہی امان! یہی گت ان زبانی عاشقوں نے جو انفس جذبات اور لطیف حسیات کے لئے سردہ ہیں دل جیسی چیز کی بنا رکھی ہے۔ متاخرین تو لکھتے ہی تھے:—

غالب

کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے اس سے مدعا پایا

دل نہ ہوا کسی کی اچکن کا ٹوٹا ہوا بٹن ہوا کہ اس طرح پڑا مل جائے۔ اُستاد ذوق نے اس پر ترقی کی —

ذوق

مال جب اس نے بہت رد و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اُٹھا اپنی بغل میں مارا

"ہم" نہ ہوئے تنت پونجئے پھیری والے ہوئے کہ ایک گاہک سے سودا نہ بنا تو اپنا بقچہ باندھکر چلتے بنے اور آگے جاکر "سرمہ، مسی" پکارنے لگے داغ اور امیر کے ہاں بھی دل کا سودا ہوا ہے-جلال فرماتے ہیں:—

جلال

، دل کا فیصلہ کچھ ہو چکے   لے چکو سودا یہ جتنے کو چکے

نہی عاشق آز بیٹھتا ہے کہ ایک بوسہ دو تو دل دوں-یہ باتیں

رکیک ہیں، اس میں ابتذال کی پھٹکار ہے-دل بھی کوئی بیع و شرا کی

ہے-وہ جب کسی پر آتا ہے تو کسی کی اجازت سے نہیں آتا، اپنے آپ آتا ہے

سی کے روکے نہیں رکتا-قوت ارادی کا اس میں دخل نہیں، عاشق

ی نہیں ہوا کرتے-دیکھئے اللہ بخشے میر تقی کس خوش اسلوبی سے دل کے

ے جانے کا نقشہ اتار گئے ہیں-شاعر پر اگر یہ روحانی کیفیت کبھی

، نہیں ہوئی تو اس کا بیان ہی کیا ضرور ہے اور پھر آپ بیتی نہیں

کتا تو جگ بیتی ہی کہے-لیکن عشق کے مسلک کو پینٹھ اور نخاس تو

دے—

میر

ز کئی اُس پہ اک نظر اِس کی   پھر نہ آئی اسے خبر اس کی

ہی نظر یا کہ جی کی آفت تھی   وہ نظر ہی وداع طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ   صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

یقراری نے کج ادائی کی   تاب و طاقت نے بے وفائی کی

یہ چند معنوی متروکات ہیں جن کی طرف شاعروں اور ادیبوں کی

، دلائی جاتی ہے-اس قبیل سے اور بہت سے امور احتراز کے قابل ہیں

کا بیان طوالت کے خوف سے اس وقت ملتوی رکھا جاتا ہے—

لفظی متروکات

ا-نثر میں اضافت کا استعمال قطعاً ترک کیا جائے-اصطلاحیں، محاورے

، لفظوں کے مقررہ جگ مستثنیٰ ہیں جیسے علت غائی، نام خدا، گوشہ خر

ان سگ وغیرہ—

۲- واؤ عاطفہ کے ساتھ بھی اضافت کا سلوک کرنا چاھئے —

۳- تا بہ ابد- تا، بمعنی تک اور جب تک، تا چند وغیرہ فارسی روابط سے احتراز لازم ھے- یہ اُصول قرار پانا چاھئے کہ فارسی روابط اور مرکبات جہاں تک ھو سکے اُردو میں کم ملائے جائیں —

۴- نظم میں اضافت- غزل میں قطعاً متروک سمجھی جائے- نیچھول نظموں میں دو سے زیادہ اضافتیں ایک ساتھ نہ لائی جائیں- اس کے متعلق آگے مفصل مذکور آ چکا ھے —

۵- نظم میں واؤ عاطفہ ایک دفعہ سے زیادہ مسلسل نہ آئے- کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ھے کہ پورے مصرعے کے تمام الفاظ تسلسل کے ساتھ معطوف معطوف علیہ واقع ھوئے- اس اسلوب سے مصرعے کا مصرعہ فارسی ھو جاتا ھے —

آخر میں یہ عرض کرنا ھے کہ یہ مضمون اجتہاد کے طریق پر نہیں بلکہ استشہاد کے طور پر لکھا گیا ھے- راقم ممنون ھوگا اگر فن کے واقفوں، ادیبوں اور نظم، نثر کے لکھنے والوں نے اس طرف توجہ فرمائی- یہ نہ سمجھنا چاھئے کہ متروکات کے باب میں راقم کا یہ مذھب ھے:—

سر برھنہ نیستم دارم کلاہ چار ترک
ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک مولا، ترک ترک

میں ادب اور زبان کے معاملوں میں "برچھیگردی" کے سخت خلاف ھوں جس کا ثبوت خود میرا کلام ھے- ھاں زیادت جیسی کلام کا سقم ھے ویسی ھی فن کے قواعد کی توضیع کا- میں دیکھتا ھوں کہ ایک فریق ایک امر میں ایک حد پر جاتا ھے تو دوسرا دوسری حد پر- یہ بازگشتی حرکت قدرت کے قانون کا خاصہ ھے- شاید اسی نہج پر جناب عزیز نے ایک صدی کے مردہ لفظ کو پھر زندہ کرنے کا خیال کیا- فرمایا ھے:—

هر داغ دل ہے گویا تاریخ میرے تن میں
جلوے ہیں رفتگاں کے پیدا اسی چمن میں

عربی کا ایک مشہور قول ہے "یجوز للشاعر ما لا یجوز لغیرہ" یعنی جو دوسروں کو جایز نہیں وہ شاعر کو جایز ہے۔اس جواز کا جایز استعمال مفقود ہے۔اگر عریاں نویسی، ابتذال نگاری، با سلیقہ سرقہ اور زبان سے اخلاقی جرایم کا ارتکاب اس قول کا مفہوم ہے تو میں خاموش ہو جاؤں گا۔ ورنہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر اس کا مفہوم انشا اور اسلوب سے علاقہ رکھتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ جتنی قیدیں نظم کہنے والوں پر عاید کی گئی ہیں وہ سراسر جابرانہ اور نا جایز ہیں اور اُس قول کے بالکل منافی۔نہ اس سے زبان کی ترقی ہو گی نہ تخیل شاعرانہ کی توسیع، ایسی کا جو بھو جو زبان جو ہمارے نقاد اور غیر مصنف ادیب بنانا چاہتے ہیں سرسبز نہیں ہو سکتی۔ ہمارا دستورالعمل یہ ہونا چاہئے ع: مصلحت بین و کار آساں کن۔ورنہ خوف ہے کہ اگر اس خرج بخرج اور ترک بترک کی لے یونہیں بڑھتی گئی تو کہیں مرزا غالب کا یہ قول ہمارے حال کی مصداق نہ ہو جاے —

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

تیتری

(رقص و سکون کی دونوں حالتوں میں)

از

(حضرت ابوالمعانی اختر شیرانی الافغانی سلمہ)

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگ پریدہ ہے؟ بوے چکیدہ ہے؟
آغوش گل میں یا کوئی نقش دمیدہ ہے؟ عکس کشیدہ ہے؟
اُٹھے تو ایک بوسۂ رقصیدہ سامنے! پاشیدہ سامنے!
بیٹھے تو ایک لذت خوابیدہ سامنے! دامن کشیدہ ہے!
موج ہوا میں ہلکا سا طوفان رنگ و بو! ہیجان رنگ و بو!
اوج فضا میں چھوٹا سا نیسان رنگ و بو! جو صف کشیدہ ہے!
اک عکس ہے جما ہوا رنگیں غبار کا؟ کیف و خمار کا؟
یا شاخسار گل پہ عروس بہار کا! حسن رمیدہ ہے؟
ہلکی سی اک شعاع ہے طور کلیم پر، اوج نسیم پر!
رقاصۂ بسنت کا فرش شمیم پر، رقص پریدہ ہے!
موج شراب کی اسے اک تھرتھری کہوں؟ ننھی پری کہوں؟
یا موسم بہار کی اک تیتری کہوں؟ جو آرمیدہ ہے!!

ادبی بات چیت

۱ - فرانس

از

(جناب شاہد سہروردی صاحب)

مسٹر شاہد سہروردی ہندوستان کے اُن چند نوجوانوں میں سے ہیں جو اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے نہایت قابل قدر ہیں اور جو باوجود ہندی ہونے کے اپنے وطن سے دور، یورپ کے ممالک میں محض اپنی قابلیت کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں - فنون لطیفہ اور ادب میں اُن کا ذوق نہایت پاکیزہ ہے - زبانوں کی تحصیل کا خاص ملکہ ہے - یورپ کی جتنی بڑی بڑی زبانیں ہیں وہ سب جانتے ہیں اور صرف جانتے ہی نہیں بلکہ اس خوش اسلوبی سے بولتے اور لکھتے ہیں اور اُن کے ایسے اچھے ادیب ہیں کہ اہل زبان بھی قائل ہیں - اُنہوں نے میری درخواست پر اُردو کے اس نمبر کے لئے یہ مضمون لکھ کر بھیجا ہے - میری درخواست یہ تھی کہ جنگ کے بعد یورپ کے ممالک میں ادبیات میں کیا انقلاب ہوا، آج کل ادب کا رنگ کیا ہے، کونسی ادبی تحریکات رواج پذیر ہیں اور عام میلان کس طرف ہے - مسٹر شاہد نے یہ مضمون فرانس پر

لکھا ھے اور آج کل کے ادبی رنگ پر بحث کی ھے - دوسرا
مضمون وہ جرمنی پر لکھنے والے ھیں - میری درخواست پر
وہ یہ مضامین بہت صاف اور سلیس لکھیں گے جیسے کوئی
کسی کو خط لکھتا ھے —

اصل مضمون انگریزی میں تھا - ترجمہ ھمارے دوست
پروفیسر وھاج الدین (اورنگ آباد کالج) نے کیا ھے اور
خوب کیا ھے (اڈیٹر) —

اگر ھم موجودہ زمانے کے ان رسالوں پر جو کتابوں سے بحث کرتے ھیں ایک سرسری نظر ڈالیں تو ھمیں ان میں ایک چیز خاص طور پر تعجب خیز نظر آے گی اور وہ یہ کہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے ھر ملک کے مصنفین ایسے واقعات پر قلم اٹھانے لگے ھیں جو عام طور پر افسانوں کے دائرے سے باھر ھیں اور ان پر جو بحثیں ھوتی ھیں وہ ایک عجیب دلچسپ اور مخصوص انداز میں ھوتی ھیں - اب کوشش یہ ھوتی ھے کہ ان مباحث کو جو پہلے صرف ہمارے مورخین، ماھرین حیاتیات اور منجمین کی بے مزہ اور صبر آزما کاوشوں کے لئے مخصوص سمجھے جاتے تھے، عام لوگوں کے سامنے بھی دلچسپ بنا کر پیش کیا جاے اور یہ اسی کوشش کا نتیجہ ھے کہ تحریروں اور تصنیفوں میں ایک جان سی پڑ گئی ھے - اس میں شک نہیں کہ اس عمل کا آغاز جنگ سے پہلے ھو چکا تھا، چنانچہ ھم میں سے اکثر اشخاص ایسے ھوں گے جن کے دلوں میں فابر (Fabre) کی یاد اب تک موجود ھوگی - یہی وہ مصنف تھا جس نے حشرات الارض کی سوانح حیات کا مطالعہ انسانی نقطۂ نظر سے کیا، ھماری اور ان کی مختلف فعلیتوں میں ایک خاص مطابقت ڈھونڈ نکالی اور دنیا پر یہ حقیقت ثابت کر دی کہ اختلاف اجزا کے با وجود کل کائنات ایک ھی

رمانٹ وحدت میں سلسلک ہے' فابر کی طرح ایک اور مصنف فلے ماریئن (Flammarion) تھا۔ اس کے انتقال کو ابھی کچھہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اس سن رسیدہ منجم نے ستاروں کی دنیا کے بھید کچھہ ایسے دلچسپ اور مانوس انداز میں بیان کئے کہ پڑھنے والوں کے دلوں پر مصطلحات اور اصطلاحی جملوں کی جو دہشت بیٹھی ہوئی تھی وہ نکل گئی اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے ہول کھا کر عام لوگ علوم طبیعی کی حدود کی طرف جاتے ہوے ہچکچاتے ہیں —

اس میں شک نہیں کہ فابر اور فلے ماریئن جنگ سے پہلے کے مصنفین ہیں لیکن یہ لوگ ادیب نہیں بلکہ سائنس داں تھے - ان کی کوشش یہ رہتی تھی کہ اپنے مخصوص مباحث کے اشکال کو کم کر کے انہیں عام پڑھنے والوں کی ذہنی سطح پر لے آئیں - ہمارے زمانے کے مصنف ان کی طرح ماہر خصوصی نہیں ہیں - وہ صرف اہل فن ہیں اور ان کی یہ آرزو رہا کرتی ہے کہ اپنے قلم کی ایک ہلکی سی جنبش سے اس علمی مواد میں جان ڈال دیں جو مدرسوں میں بچوں کو پڑھایا جاتا ہے اور محض اس وجہ سے کہ درس میں داخل ہے ہمارے لئے مردہ ہے اور ہماری حیات اور تخیل پر اس کا اثر کچھہ زیادہ نہیں پڑ سکتا —

جب ژان دارک (Jeanne D' Arc) کی سہ صد سالہ برسی بڑی دھوم دھام اور مذہبی اہتمام کے ساتھہ فرانس میں منائی گئی تو اس سے مختلف پائے کے مصنفوں کو یہ خیال پیدا ہوا، کہ اس برگزیدہ دوشیزہ کے سوانح حیات پر کچھہ لکھیں - فرانس میں اس موقع پر جو رسومات ہوتی رہیں ان سے فائدہ اٹھاکر یہاں لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آبادی کے غالب حصے کے رجحانات کیتھولک (Catholic) مذہب کی طرف ہیں اور وہ جمہوریہ فرانس کی غیر مذہبی پالسی کی تائید نہیں کرتے چنانچہ پارس

اور آرلیان میں اس موقع پر جو جلوس نکالے گئے ان کا نظارہ متعدد جھلک
اور مذھبی نشانیوں کی موجودگی کی وجہ سے حد درجہ موثر تھا - یاد ر
کہ یہ اس ملک کا ذکر ھے جہاں مذھب کی ظاھری وقعت تو کی جاتی ھے لی
اس کے عقاید دلوں سے محو ھو چکے ھیں، ژان دارک کی زندگی کی داس
جس قدر دلگداز اور موثر ھے اس کی نظیر انسانیت کی تاریخ میں مشکل
مل سکتی ھے - جس زمانے میں یہ ناخواندہ دھقانی لڑکی منظر عام پر آئی
اور اس نے یہ ظاھر کیا ھے کہ اس کے کان میں غیبی صدائیں آتی ھیں اور
حکم دیتی ھیں کہ فرانس کی سیوا کے لئے اٹھ کھڑی ھو - وہ فرانس کی تار
میں نازک ترین زمانہ تھا، ایک طرف بادشاہ اپنے درباریوں کو جلو م
لئے ھوئے طواف زمین کرتا پھرتا تھا، تو دوسری طرف تمام ایسے شہر
تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھے انگریزوں کے قبضہ میں آچکے تھے، غرض کہ ا
نازک وقت پر یہ لڑکی اٹھ کھڑی ھوتی ھے - معمولات و فرائض زندگی کی ادائ
نے اسے عام دنیاوی باتوں کے متعلق تھوڑی بہت عقل سکھا دی ھے اور محض ا
کے سہارے اور مشیت ایزدی کے اشارے پر یہ فوجیں لے کر میدان جنگ
طرف بڑھتی ھے اور جن زمینوں کو بڑے بڑے شاطر سپہ سالار کھو بیٹ
تھے، انہیں دشمنوں سے چھین کر شاہ فرانس کے حوالہ کرتی ھے - لیکن اس الم
داستان کا انجام کس قدر حسرت ناک ھے، اھل کلیسا انگلستان سے ساز باز کر
اس مجاھدہ کو ملعون قرار دیتے ھیں - اس پر مقدمہ چلایا جاتا ھے اور حکم ھو
ھے کہ اسے زندہ جلا دیا جائے - آج کل کیتھلک کلیسا نے اس کی ولایت کو تسل
کر لیا ھے - لیکن اس کی زندگی میں اھل کلیسا برابر یہ استدلال کرتے رھے
کوئی انسان پیغمبری کے دعوے کا مجاز نہیں ھو سکتا اور ھو بھی کیسے سک
تھا - حکم ربانی سننے اور اسے لوگوں تک پہونچانے کا ٹھیکہ تو اھل کلیسا پہلے ھ
سے لے چکے تھے -

یوں تو ژان دارک کی داستان اکثر ادبیت کا موضوع رہا کرتی ہے۔ لیکن شلر کی کتاب "آرلیاں کی دوشیزہ" (Maid of Orleans) میں جو بطافتوں کی سی نرم رو موسیقیت اور خاص حزنیہ شان پائی جاتی ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔اس مصنف نے اُس کی سیرت نگاری میں جن رنگوں سے کام لیا ہے وہ رومانیت اور مثالیت کے رنگ ہیں جو اس کے زمانے میں مقبول تھے۔اُس کی خوبیوں کو شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ اور اُس کی تقریروں کو دلکش اور متین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔شلر نے اس کے روحانی پیغام پر خاص طور پر زور دیا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ہم اس کے ڈرامے کو پڑھیں اور اس مقدس دوشیزہ کے مجذوبانہ جوش اور علویت سے مرعوب نہ ہوں ژان دارک کی خیالی تصویر الہامی مثالیت (Idealism) کے مخفی رجحانات کے عین مطابق تھی۔ تیوتن (Teuton) قوم کے قصص میں جو حیثیت (Brundhilde) کو حاصل ہے، وہی شلر کی تصنیف کی مذہب عیسائیت کے قصص میں ہے—

اور تو اور اناتول فرانس بھی ژان دارک کی پر اسرار شخصیت کی کشش سے نہ بچ سکا۔پہلے اس مصنف کا یہ خیال ہوا کہ دوسرے مباحث کی طرح اس موضوع کو بھی اپنے ذہن کی تیز اور نقادانہ روش میں دیکھے اور جس طرح وہ اپنی علمی زندگی کے دوران میں عیسویت کے پیدا کئے ہوئے توہمات کو غارت کرتا رہا۔اسی طرح اپنے قلم کی نوک سے ژان دارک کے احترام اور تقدس کے حباب کو بھی توڑ ڈالے، لیکن اناتول فرانس صرف عہد قدیم کی شان اور یک رنگی کا دلدادہ نہ تھا، بے رحمانہ تنقید اور عقاید کی منطقی کمزوریوں کے علاوہ اس کی فطرت کا ایک اور رخ بھی تھا، یعنی وہ ایک متبحر عالم تھا۔اس کی کسی کتاب کو اٹھا کر پڑھو تو تمہیں خود بخود محسوس ہوجائے گا کہ اس کی تصانیف میں کس قدر علمی شان ہوتی ہے۔چنانچہ جب وہ ژان دارک کی تاریخ لکھنے لگا اور اس نے اپنی عادت کے موافق تمام

قدیم تحریروں اور ماخذوں پر نظر ڈالی تو اس برگزیدہ لڑکی کی شخصیت نے اس کو بہت متاثر کیا - ایسی ایسی چیزیں اس کی نظر کے سامنے آئیں کہ اس کا معقولیت پسند ذہن بھی ان کی تہ کو نہ پہونچ سکا - طعن و طنز سے کام لینا تو درکنار، اُس نے اس خدا رسیدہ دہقانی لڑکی کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا اور بے بس اور مجبور ہو کر، اپنی عادت کے خلاف اس کے تقدس اور اپنے عجز کا مقر ہو گیا —

مسٹر برنارڈ شا نے بھی گزشتہ چھہ ماہ میں ژان ڈارک کی سوانح پر اظہار خیال کیا ہے، اس تصنیف نے یورپ کے علمی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے - یہ ایک ڈراما ہے، جو یورپ میں ہر جگہہ کھیلا جا چکا ہے اور اب بھی کھیلا جاتا ہے - یہ ایک انگریزی ایکٹرس مس سی بل تھارن ڈایک (sybil Thorndike) کے لئے لکھا گیا تھا جو المیہ پارٹ کھیلنے کا خاص ملکہ رکھتی ہے - مبصرین فن کی رائے ہے کہ وہ اپنے پارٹ کو کامیابی کے ساتھہ نہ کھیل سکی - یہ ڈراما برلن، پیرس، پریگ، ماسکو میں بہت مقبول ہوا ہے، مگر روم اور وانیا میں اسے ممنوع قرار دیا جا چکا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ژان ڈارک کی زندگی جس پہلو سے پیش کی گئی ہے وہ مذہبی اعتقاد کے خلاف ہے —

مسٹر برنارڈ شاہ کی حیثیت بہ لحاظ صاحب فن ہونے کے اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی کہ بحیثیت ایک پمفلٹ باز، اشتراکی، اور مصلح کے ہے، وہ ژان ڈارک، یا بقول خود "مقدس جون" کو دہقانی ذہانت اور عملی قابلیت کا ایک اعلیٰ نمونہ سمجھتے ہیں اور بس - وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس خاتون کی زندگی میں کچھہ ساعتیں مکاشفہ اور الہام کی بھی ہوتی تھیں، لیکن حلو کی طرح وہ ان کے وجود پر زور نہیں دیتے - ان کی کتاب کے سب حصین (متجلسین) یکے بعد

دیکھے پڑھتے چلے جاؤ کہیں تم دیکھوگے کہ ژان ڈارک بادشاہ کو سکھا پڑھا رہی ہے، خود بادشاہ کی سیرت یہ ہے کہ وہ ایک کند ذہن نوجوان ہے جو ہر وقت سیب چوستا رہتا ہے اور عجیب و غریب لباس پہنتا ہے۔کبھی تم ژان ڈارک کو اس رنگ میں دیکھوگے کہ وہ بڑے بڑے طرے اور دستار والے با رعب جنرلوں کو اصول جنگ کی تعلیم دے رہی ہے اور حربی مدارس میں جو قواعد جنگ ان لوگوں نے سیکھے ہیں انہیں بالائے طاق رکھ کر ان کی بجائے اپنی پر زور طبعی ذہانت کے بنائے ہوئے اصول حرب پیش کر رہی ہے۔ مسٹر برنارڈ شا کی یہ خصوصیتیں صرف اسی تصنیف تک محدود نہیں ہیں، جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس میں ایک نہ ایک رجحان یا عمرانی مقصد ضرور پیش نظر ہوتا ہے، اس تمثیل (Play) کے پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ مصنف حسب عادت اپنے زمانہ کے انتہائی جدید خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ مسٹر شا آئرش ہیں، انگریزی ظرافت نگاری ان کا پایہ بلند ہے اور یورپ میں عموماً اور جرمنی میں خصوصاً ان کی تحریریں نہایت مقبول ہوتی ہیں، لیکن ان کی ظرافت کا مزہ صرف انگریزوں ہی کو آ سکتا ہے۔اگر ظرافت کو چیستان کا مرادف مان لیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کے ظریف ہیں، لیکن بد قسمتی سے ان کی ظرافت زیادہ تر سطحی ہوتی ہے، اور کہیں کہیں تو اسکی حیثیت محض ایہام کی سی ہو جاتی ہے، اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ہنسنے ہنسانے کی باتوں میں بہت بڑا حصہ لیا ہے، لیکن انسانی فزر و فکر کو بہت کم اُکسایا ہے۔ان کے خیالات کا سرمایہ زیادہ تر ماخوذ ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انگریز مصنفوں کے زمرے میں صرف وہی ایک ایسے ہیں جو یورپ کے خیالات حاضرہ سے با خبر ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ آئرلینڈ میں پیدا ہوئے۔اگر کسی کو مسٹر شا کے خیالات کا ماخذ دیکھنا ہو، تو اُسے چاہئیے کہ اِبسن (Ibson) برایو (Brieux) ویگنر (Wagner)

مارکس (Marx) اور اسٹرن ڈن برگ (Strindenburg) کی تصنیفات کو پڑھ
جاے-ان کتابوں سے اُسے معلوم ہوجاے گا کہ مسٹر شا کے جذبہ اشتراکیت کی
سوت کہاں سے پھوٹتی ہے-جب سے کہ روس میں اشتراکیت کا تجربہ شروع ہوا
ہے' اسوقت سے یورپ میں تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے مخالفت پیدا ہوگئی
ہے-اور یہ اس لئے کہ یہ طبقہ صلح جو ہے اور ہنگامہ آرائی کا اہل نہیں-عمال
اور مزارعین کے ساتھہ ہمدردی ہو چلی ہے-ہم یہ نہیں کہتے کہ خیالات کا
موجودہ بہاؤ صحیح راستے پر ہے یا غلط راستہ پر' لیکن اتنا ضرور ہے کہ
مسٹر برنارڈ شا نے بھی اسی عام احساس سے متاثر ہوکر ژان دارک کی
شخصیت کو دہقانی زندگی کا ایک کامل نمونہ بناکر پیش کیا ہے' اور اس کے
مقابلہ میں نالایق " ماہرین فن " اور زوال آمادہ اشرافوں کا خاکہ اُڑایا ہے
اس کی تمثیل کی آخری مجلس میں فردوس کا ایک منظر دکھایا گیا ہے-یہاں
ایک شخص جو جدید وضع کے لباس (فراک کوٹ اور ٹاپ ہیٹ) میں ملبوس
ہے ژان دارک کی خدمت میں اس کی ولایت کی سند پیش کرتا ہے' وہ اس پر
متعجب ہوتی ہے اور پھر سے زندہ ہونے کی آرزو کرتی ہے' اس کے منھہ سے
یہ الفاظ سن کر ہمارا دور جدید کا نمائندہ خوف سے چلا اٹھتا ہے کہ اس کا
دوبارہ دنیا میں آنا ایک عذاب عظیم ہو جاے گا-ایک طرف یہ گفتگو ہو رہی
ہے' اور دوسری طرف چارلس شاہ فرانس شب خوابی کا لباس پہنے ہوے ایک
بادل کے ٹکڑے پر سر رکھے ہوے لیٹا ہوا ہے' اور بوکاشو (Boccacio) کے
ولولہ انگیز افسانوں کی ایک ضخیم جلد کے مطالعہ میں مشغول ہے—

ژان دارک کے سوانح حیات کو اس طرح علمی بحثوں کے موضوع قرار
دینے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ان علمی حلقوں میں جو ولایت' اور اولیاء اللہ
کے قایل ہیں ادبی رد عمل کا آغاز ہوا-بد قسمتی سے جن لوگوں نے اس خاتون

کی حمایت میں قلم اٹھایا ہے وہ استعداد جوہر ذاتی' اور ظرافت' غرض ہر اعتبار سے مسٹر برنارڈ شا سے پیچھے ہیں۔ایم پورشے (M-Porche) نے جو تمثیل " عالی ظرف دوشیزہ " (La Vierge au grand coeur) کے نام سے لکھی ہے' اس کی بڑی خامی مبالغہ آمیزی ہے۔اگر ایک طرف یہ کتاب اس سنجیدہ اور متین انداز سے خالی ہے جو شلر کی تصنیف کی امتیازی خصوصیت ہے تو دوسری طرف اس میں ژان دارک کی زندگی کے پر اسرار رخ کو اتنا بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ہے کہ اس کی انسانیت پر پردہ پڑ گیا ہے حالاں کہ یہ انسانیت ہی اس کی زندگی کا حسین ترین پہلو ہے۔اس پارٹ کو ایک مشہور ایکٹرس نے ادا کیا ' لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ہوسکی' اگرچہ اس حیثیت سے اسے ضرور کامیاب کہا جاسکتا ہے کہ اس میں اس دوشیزہ کی شخصیت کو مسٹر شا کے خلاف دوسرے ہی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ایک موسیو دل تیل (M Delteil) ہیں یہ اگرچہ نوجوان ہیں لیکن بڑی قابلیت رکھتے ہیں' ان کی تصنیف " خیرالامور اوسطہا " کی مثال ہے' سنجیدہ تاریخی واقعات کو متانت کے ساتھ مذہبی اعتقاد کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ان کی تصنیف ہی کی بدولت بہت سے ایسے اشخاص جو پہلے پورا اعتقاد نہ رکھتے تھے اب ژان دارک کے حامیوں کی صف میں مل گئے ہیں یہ عام فہم ہے۔اپنے مو قلم کی ھاکی جنبشوں سے انھوں نے اس ولیہ کی شخصیت کو جیتا جاگتا' اور ہم سب کے لئے مانوس بنا دیا ہے اور اس طرح ان عام فہم اور مقبول عام تصانیف کی فہرست میں جس کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں ایک اور تصنیف کا اضافہ کیا ہے —

جن لوگوں نے گزشتہ چند ماہ کے فرانسیسی ادب کا مطالعہ کیا ہے ' ان کو یہ دیکھکر تعجب ضرور ہوا ہوگا کہ آج کل اس میں رومانیت (Romanticism) کا رنگ کتنا گہرا جھلکتا ہے ' فرانسیسی مزاج خاص طور پر قدامت پسند واقع ہوا ہے ' اس کے ثبوت کے لئے اس قوم کی مصوری '

سنگتراشی اور جسم بندی پر نظر ڈالنا کافی ہوگا' ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم میں صحیح سنظر کشی اور جسم انسانی کے خط و خال کو ہوبہو بیان کرنے کا کتنا ملکہ ہے۔ رومانیت دراصل المانی اور اینگلو سیکسن لوگوں کا مذہب ہے۔اور اگرچہ فرانسیسی ادب میں بھی وکٹر ھیوگو (Hugo) کی طرح رومان نگار ہوئے ہیں' لیکن اس نے بہت جلد پارناسی* قدامت پسندی کی شکل اختیار کرلی۔ اس لئے کہ موخرالذکر طرز لوگوں کے مذاق اور ان کی ادبی ضروریات کی ہمنوا ہے' اگر خود وکٹر ھیوگو کی تصانیف سے تاریخی مناظراور تاریخی اثرات کو خارج کردیا جائے تو اسکی حیثیت بھی ایک ایسے کلاسک (قدیم) مصنف کی سی رہجاتی ہےجو صناعوں کی طرح صورت نگاری میں خاص کمال رکھتا ہے - فرانسیسی رومانیت کل وجز پارناسیت (Parnassianism) نہیں ہے ' بلکہ اس کے رد عمل کے طور پر اس نے مثالیت†

---

* پارناسیت (Parnassianis) لفظ Parnassus سے مشتق ہے ' یہ وہ ایک پہاڑ ہے جو یونان میں اتھنس کے شمال مغرب میں واقع ہے اور خدائے نغمہ اپالو کا مسکن خیال کیا جاتا تھا ' مذہب پارناسیت فرانسیسی شاعری کا ایک مشہور مذہب ہے اس مذہب کا مقولہ "L' Art pour l' art" " فن بحیثیت فن " ہے - اس خیال نے سب سے پہلے سنہ ۱۸۶۶ میں مذہب شاعری کی حیثیت اختیار کی صرف فنی حیثیت پرزور دیا جاتا ہے اور ذاتی تاثرات اور اخلاقی پند و موعظت کو معیوب سمجھا جاتا ہے یہ مذہب فی الحقیقت رومانیت کی ایک شاخ ہے ' اس کے بڑے بڑے حامی Catulle Mendes,Sully Prudhomme,Francois Coppee Armande Silvestr وغیرہ ہیں بعد میں اس مذہب نے مسخ ہو کر لفاظیت کی بالکل وہی شکل اختیار کرلی جس کے لئے ہمارا لکھنؤ بدنام ہے —

(مترجم)

† مثالیت (Symbolism) بحیثیت ایک مذہب ادبیات کے یہ چیز فرانس میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئی 'اس مذہب کے حامی فطرت کے خارجی مظاہرات کو ایک باطنی اور روحانی حقیقت کی نشانیاں سمجھتے ہیں اور اپنی

(باقی صفحہ آئندہ)

(Symbolism) کی شکل اختیار کرلی ہے ۔ یہ صورت کے اعتبار سے رومانیت ہی ہے۔ پارناسیت کی طرح مثالیت میں بھی ادب کی ظاہری شکل کا مسئلہ تھا، اور اگرچہ یہ مذہب اپنی خیال آرائی کے لحاظ سے عجیب و غریب ضرور ہے، لیکن اس میں ہمیں تحقیق و تلاش کا وہ پر جوش رجحان نظر نہیں آتا جو Novalis یا Coleridge کی تصنیفات میں ملتا ہے۔ مذہب مثالیت اپنا ایک علیحدہ اسلوب رکھتا تھا جس کی اساس اصوات تھیں—

رومانیوں کا رجحان جس شکل میں ظاہر ہوتا ہے وہ نئے ملکوں کی سیر کی خواہش ہے جہاں کی زندگی ہماری زندگی سے مختلف ہوتی ہے، اور جہاں کے عورت مرد انوکھے اور دلکش طور طریقوں کے شیدا ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ عجیب و غریب درختوں ، نئے نئے پھولوں ، غیر معمولی آرائش و زیبائش کے شوقین ہیں ، دیومالا ، خاندانی کہانیاں جو مائیں اپنی اولاد کو سناتی ہیں، انجان دلوں کے نغمے، یہ چیزیں انہیں مرغوب ہیں۔ چوں کہ مشرق کا رجحان بھی زیادہ تر یہی ہے اور وہ اپنے سونے اور جواہرات کے خزانوں اور بوقلمونیوں کے لئے مشہور ہے ۔ اس لئے وہاں کا شوق ہمیشہ سے رومانیت کے تخیل کو اکساتا رہا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس کتاب سے انگلستان میں رومانیت کی تحریک کا آغاز ہوا ، وہ بک فورڈ کا ناول "واتیک" ہے۔ یہ الف لیلہ کی وضع کا ایک خیالی افسانہ ہے جرمنی میں اس تحریک کا آغاز شلیگل (Schlegel) کی سنسکرت زبان کے متعلق تصانیف اور گوئٹے کے دیوان (West - Ostliche) " پیام مغرب " سے ہوتا ہے۔ فرانس میں اس کی سب سے

تصانیف میں اسی پس پردہ حقیقت کو آشکار کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود صاحب مضمون نے بتلایا ہے ' یہ مذہب پارناسیت کی واقعہ نگاری کی ضد پر پیدا ہوا' یہ لوگ خواب' اور روحانی مکاشفوں کو اکثر بیان کرتے ہیں' اس مذہب کے مشہور مصنف Stephane mallarme ' Paul Verlaine ' Maeterlinck وغیرہ ہیں

پہلی سظہر و کڑھیو کی کتاب (Orentales) ھے۔

شاید یہ فرانسیسی ادب کی تاریخ میں پہلا موقع ھے کہ آج کل کی ادبیہ جس آرزو سے لبریز نظر آتی ھے وہ رومانیت کے مفہوم سے بہت قریبی تعلق رکھتی ھے، اب عالم اور با کمال لوگ خوب سیر و سیاحت کیا کرتے ھوں اور دور دراز ملکوں کے حالات لکھتے ھیں۔ اس دل کے جوش کی شدت کو دیکھکر کسی کو یہ یقین نہیں آسکتا کہ طرز انشاء کی خشکی اور بے مزگی ھمیشہ سے اس ادب کی خصوصیات رھی ھیں اس چیز کی ابتداء اب سے بہت پہلے اسی زمانہ میں ھو چکی ھے جب گاگنیں (Gangain) نے اپنی ایک کتاب میں تاھی تی (بحر ساکن کا ایک جزیرہ) کی عورتوں کا حال لکھا۔ آج کل دھامل (Dunrhel) جن کے کلام میں عصر جدید کے سب فرانسیسی شعرا سے زیادہ جدت پائی جاتی ھے، برابر سیر و سیاحت میں مصروف رھتے ھیں، اور نئے ملکوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے ھیں۔ پال کلاندیل (Paul clandel) فرانس کے زندہ شاعروں میں سب سے زیادہ مشہور ھیں، یہ صوفی منش بھی تھیں۔ کسی زمانہ میں سفیر کی حیثیت سے ان کا قیام جاپان میں بھی رہ چکا ھے، انھوں نے بھی نظموں کا ایک اعلیٰ اور کسی قدر ادق مجموعہ شایع کیا ھے۔ (مشرق کے متعلق اپنی سب معلومات اس میں بیان کی ھے، (L' Connaissance-esit) (مشرق کے متعلق معلومات) نثر نما نظموں کا ایک مجموعہ ھے۔ اس میں سرسری قلبی واردات کا بیان اور اقصائے مشرق کے علم و دانس کے تذکرے ھیں تا یہ کتاب بہت لاجواب چھپی ھے۔ دورجیلیس (Dorgelis) ایک قابل اور نوعمر فرانسیسی مصنف ھیں۔ ان کی ایک کتاب (Sur Laroute Mandarius) (چینیوں کے نقش قدم پر) ھے، یہ کتاب فرانس کے مشہور معمور رسالہ (L' Iliustration) میں مضامین کی شکل میں شایع ھو چکی ھے۔ اس میں مصنف نے رنگین بیان کے ساتھہ ھندی چین کمبوڈیا، سیام اور چین میں اپنی سیاحت کا حال لکھا ھے۔ ایک اور صاحب

مان تورلان فرانس کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار (L' Intransigient) میں ھسپانیہ کے دیہات اور سرحدی قصبات کے متعلق اپنے تجربات شایع کر رھے ھیں۔ آج کل ھسپانیہ نے بہ ایک تمام یورپ کے تخیل میں جگہ پالی ھے اور اکثر افراد کے رومانی رجحانات کا قبلۂ مقصود بن گیا ھے۔ یہ ملک قدیم روایتوں میں ڈوبا ھوا ھے، ادب اور فن کے اعتبار سے اس کا ماضی نہایت شاندار رہ چکا ھے اور آج بھی جب کہ یورپ کے دوسرے حصوں میں جمہوریت کی آندھیاں اُٹھ رھی ھیں، اس ملک میں پرانی شرافی (Anistocratie) زندگی کا توازن بدستور موجود ھے، گزشتہ سال ایک جرمنی کتاب -Der Unbe kannte spanien (نا معلوم ھسپانیہ) لکھی جا چکی ھے، اس کتاب کو جو حیرت انگیز قبولیت حاصل ھوئی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس میں اس سرزمین ھسپانیہ کے حالات درج تھے۔ جو قریب ھونے کے باوجود ھم سے دور ھے اور جہاں قدیم رنگینیاں اور سادہ عقیدے آج تک باقی ھیں۔ مان تورلان کے جن مضامین کا ذکر سطور بالا میں ھو چکا ھے اس قدر بصیرت کے ساتھ لکھے گئے ھیں اور ان میں اس ملک کی رنگینیاں کچھ ایسے انداز میں بیان کی گئی ھیں کہ نا ممکن ھے کہ پڑھنے والے کے دل میں اس پیرے نیز (Pyrennese) پار ملک کے دیکھنے کی آرزو نہ پیدا ھو اور ملک بھی کیسا! جہاں پرانے پادری اور گرجا آج تک موجود ھیں، جہاں کا رقص و نولہ انگیز ھے محبتیں سادہ ھیں اور جہاں کی مہمان نوازی پرانے زمانے کے سورماؤں کی سی ھے۔ یہ وہ ملک ھے جس پر آج بھی ایک پراسرار پردہ پڑا ھوا ھے اور جہاں لوگ آج تک سیاسی اور مذھبی "پیر پرستی" پر ایمان لاتے ھیں --

سیاحت ناموں کے علاوہ زمانہ حال کی دوسری تصنیفوں سے بھی یہی رومانی رنگ جھلکتا ھے، فرانکواے ماریس نے ایک نہایت اھم اور دلچسپ کتاب "صحرائے محبت" کے نام سے لکھی ھے۔ یہ صاحب Le baiser anx lepreux

(جذامیوں کے لئے ھدیۂ محبت' کے بھی مصنف ھیں' ان کا شمار زمانہ حال کے اُن مذھبی مصنفین میں ھوتا ھے جو عیسویت کے ان اُصولوں پر قائم ھیں جن کی مثال اور جن کی تعلیم "سینٹ فرانسس آف اے سی سی" کی زندگی سے ملتی ھے' محبت' مفاھمت اور تواضع ان کی زندگی کے اُصول ھیں' عشق میں مبتلا ھونے کے بعد انسان کو جو کشمکش اپنے وھبی جذبہ افانیت پسندی سے کرنی پڑتی ھے اس کو یہ خاص طور پر سراھتے ھیں' یہ صاحب ایک مخصوص طرز تحریر کے مالک ھیں اور اگرچہ انھیں مشکل اور متروک الفاظ استعمال کرنے کا شوق ھے' تاھم ان کی تصنیفات کی سطح کے نیچے سنجیدہ مزاجی' ذھانت اور سرمدی حب الٰہی کے اعتقاد کی جھلک دکھائی دیتی ھے۔ وھی اعتقاد جو ایک دن انسان کو ھمیشہ ھمیشہ کے لئے آلام سے نجات دلائے گا —

کے سل (Kessel) کی کتاب Les Roi Avengles (نابینا بادشاہ) اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذکورۂ بالا تصنیف سے کسی قدر مختلف ھے' لیکن روحانی تاثر اس میں بھی بھرا ھوا ھے' اس کتاب کی اشاعت نے لوگوں کو کو متعجب کر دیا ھے اور اس پر بہت کچھ بحث و مباحثے ھوتے رھتے ھیں' اس کتاب کو فرانسیسی مجلس علمی کے ادبی انعام پانے کا موقع بہت کچھ تھا' لیکن چونکہ اس میں بہت قریب زمانہ کے تاریخی واقعات سے بحث کی گئی ھے' اس لئے رد اسے کر دیا گیا' اس میں سلطنت روس کے آخری زمانہ کا ذکر ھے۔ اصل قصہ ایک رسالہ کے افسر کے عشق کا ھے۔ یہ شخص اپنے ھی طبقہ کی ایک خاتون پر عاشق تھا' اسی سلسلہ میں سلطنت روس کی تباھی کی داستان بھی آگئی ھے۔ کے سل نے یہ کتاب کاونٹ ازوالسکی سابق سفیر روس متعینہ پاریس کی لڑکی کے ساتھ مل کر لکھی ھے' اسے زار روس کے دربار کے حالات اس خاتون سے معلوم ھوے اور اپنے تخیل سے کام لیکر اس نے ان حالات کو

ایک ترکیبی جھلک دی، جو لوگ ان آخری ایام سے کچھ بھی تعلق رکھتے تھے ان سب سے مشورہ کیا۔ غرض کہ اس کد و کاوش کے بعد اِس نے اُس پرآشوب زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے جب فوج قلت رسد کی وجہ سے مجبور تھی اور بہادری کے ساتھ درباری پارٹی کی خاطر اپنی جانیں قربان کر رہی تھی اور دوسری طرف دربار ہپناٹزم (نومیت) کے تماشوں اور راگ رنگ کی محفلوں سے اپنا جی بہلا تا تھا، خصوصاً اس نے راس پوتن کے جو حالات بیان لئے ہیں وہ منصفانہ نظر اور بلند تخیل کا نمونہ ہیں۔ راس پوتن سابریا کا دہقان اور پادری تھا اس نے اپنے پر اسرار اور ساحرانہ علاج سے ولی عہد کو اچھا کر دیا تھا اور اس وجہ سے بادشاہ بیگم اور اس کے توسط سے زار پر اس کا اثر بہت کچھ تھا، اس قوی ہیکل دہقان کی جو تصویر کے سل نے اپنے قلم سے کھینچی ہے۔ اس کے وہ کرتے جو شاہزادیوں کے ہاتھوں کی بوی ہوئی روئی سے بنے تھے۔ اس کی وہ رنگ رلیاں، لیکن ساتھ ھی ساتھ بہت لوگوں پر اس کے احسانات، اس کی زندگی، جو عورتوں میں گزری، لیکن اس کے باوجود اس کی بیوی اس کے متعلق یہی کہا کرتی تھی "اس سے زیادہ محبت کرنے والا شوہر ہونا ناممکن ہے" وہ اس کی سیرت جو خوبیوں اور کمزوریوں کا مجموعہ تھی اور اس سیرت کے متزاد اجزا جو سب روسیوں میں پائے جاتے ہیں، وہ اس کی ترحم آمیز قوت و طاقت جو صرف کھیتوں میں زندگی بسر کرنے والوں میں ہوتی ہے، یہ سب باتیں جس انداز سے بیان کی گئی ہیں وہ ایسا ہے کہ بہت دنوں تک پڑھنے والوں کی یاد سے محو نہ ہو سکے گا۔ اس کی موت کا سماں بھی نہایت پر زور انداز سے کھینچا گیا ہے، عزرائیل اور ساحر کی جنگ، خوبصورت شاہزادہ یوسو پوف کا اسے زہر ملی ہوئی روٹیاں دینا، اس کا زہریلی شراب کا پینا، یکے بعد دیگرے بندوقوں کی تین گولیاں کھانے کے بعد بھی اپنے قاتل کو محبت کے ساتھ

نام لے کر پکارنا، موت کی پرچھائیں کا محسوس کرنا، لیکن اپنے ارادے کے ز
سے اس سے محفوظ رہنا، اسی حالت میں اس کوٹھری سے جس میں اس کو ما
کر دیا گیا تھا رینگ رینگ کر نکلنا اور نیم بستہ صحن سے ہوکر گزرنا، اس
دماغ کا پاش پاش کر دیا جانا اور تب اس کی روح کا پرواز کرنا، یہ سب واقع
خاص زور کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں—

کے سل کی یہ تصنیف نہایت زبردست اور پر اثر ہے، اس کے مطالعہ
ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی بہت سی ایسی باتیں جنھیں ہم آسان او
قابل توجیہ سمجھتے ہیں، فی الحقیقت پیچیدہ اور دقائق سے بھری ہوئ
ہیں، کے سل کے قلم میں توازن و تعدیل کا وہی احساس موجود ہے جو ہر صاح
فن میں ہوتا ہے- وہ کبھی کسی طرف جنبہ داری کے خیال سے مائل نہیں ہوت
جن افراد انسانی کا وہ ذکر کرتا ہے وہ جتنے جاگتے انسان ہوتے ہیں، خواہ ز
روس ہوں، یا فوج کے جنرل، یا پھر معمولی خدمتگار، اس کا منظر کشی
احساس بھی جنچا تلا اور اعلیٰ درجے کا ہے. اس کی تصنیفات میں حد درج
توازن اور موسیقیت پائی جاتی ہے اور وہ ان گنتی کے چند مصنفین میں
ہے جو اشیا اور مقامات کے طول طویل بیانات دیکر اپنی کتاب کو غارت نہیں
کرتے- ذہنی حالت کا لحاظ رکھتے ہوے مناظر کی عضوبندی کرنا اور موسیقیان
توازن کو قائم رکھنا یہ چیزیں اس نے فن افسانہ نویسی کے استاد
ایوان ترجی‌نوت سے حاصل کی ہیں کیونکہ وہ (کے سل) روسی زبان جانتا ہے
اور اس نے ضرور اس مصنف کا گہرا مطالعہ کیا ہوگا- سنیٹ پٹرس برگ کی
راتوں کا جو حال اس نے لکھا ہے، وہاں کی بدنما برفستانی گاڑیاں، راتوں کے
وقت کی بھیانک پرچھائیاں، زرد رنگ کی پھیکی روشنی جس سے کبھی تو اس
مرطوب شہر کے قصر چمک اٹھتے ہیں، اور کبھی دھندلے ہوجاتے ہیں، وہاں کی
سایہ دار شاہراہیں، رات کے سناٹے میں اس شہر کی پر سکوت شوکت و

عظمت، یہ سب چیزیں جس انداز سے پیش کی گئی ہیں وہ یقیناً اس قابل ہے کہ دورجدید کے فرانسیسی ادب کی تاریخ میں یادگار کے طور پر باقی رہے۔ کے سل ایک نازک مزاج، حساس اور صاحب تخیل مصنف ہے اور یقین ہے کہ اس کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا —

تبصرے

ادب

تاریخ

متفرق

اردو کے جدید رسالے

——:o:——

ادب

قاموس المشاہیر

مرتبہ مولوی نظام الدین حسن صاحب نظامی بدایونی

مطبوعہ نظامی پریس بدایون سنہ ۱۹۲۴ ع

جلد اول۔ صفحات۔۴۔۳۲۴۔ قیمت چھہ روپیہ

قاموس المشاہیر مشرق کی بیاگریفیکل ڈکشنری ہے۔ اس میں ان مشاہیر علماء فضلاء شعراء اور ملوک امراء کے تذکرے درج ہیں جنھوں نے بلاد مشرق میں نمایاں شہرت حاصل کی ہے—

اس قسم کی دو تین کتابیں اگرچہ اس سے پہلے بھی اردو میں شایع ہو چکی ہیں۔ لیکن یہ کتاب اپنی ترتیب کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے اور اس کی تدوین ویسی ہی عمل میں آئی ہے جیسی کہ یورپ کی کتب اسکلادیر میں ہوا کرتی ہے اور مولانا نظامی نے اس کو ترتیب دے کر ادب اردو میں ایک مفید اور کار آمد اضافہ کیا ہے—

ہم نے قاموس المشاہیر کے جستہ جستہ مقامات دیکھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی تالیف میں پوری احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے اور اس وجہ سے اس میں بہت سی فروگزاشتیں ہوگئی ہیں۔ اکثر مشاہیر کے حالات نہایت تشنہ اور نامکمل ہیں اور ان میں اکثر ضروری اور اہم باتیں چھوٹ گئی ہیں— مثلاً

داغستانی مصنف ریاض الشعراء کا تذکرہ بہت ناقص لکھا ہے۔ یہاں تک کہ اس میں نام اور سنہ وفات بھی نہیں ہے—

تقی اوحدی کے احوال میں اس کے مشہور و معروف تذکرے عرفات العارفین وعرصات العاشقین کا ذکر نہیں ہے—

زلالی کے تذکرے میں اس کی مشہور مثنویات کا جو سبعہ سیارہ کہلاتی ہیں ذکر نہیں ہے—

کتاب میں ایسے بہت سے مقامات ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر تمام غلط ہیں اور اکثر مقامات پر واقعات بھی غلط لکھے ہیں۔ جو تذکرے انگریزی ماخذوں سے نقل لئے ہیں اور ان کے اسماء کو صحیح کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی ہے —

ذیل میں ہم بعض فروگذاشتوں کو نقل کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں اس قسم کے نقائص دور کردے جائیں گے —

———:O:———

صفحہ	کالم	سطر	
۲	۲	۲۶	آذری رازی-صحیح غضائری رازی ہے-(تذکرہ صوفی جلد جلد اول ص ۵۹) غضائری کے معنی ہیں کاشی ساز و کاسہ گر اور یہ منسوب ہے غضائر سے-غضائر جمع تھاسی ہے غضارہ کی-غضارہ کے معنی ہیں گل چسپیدہ-وہ ظروف سفالین جن پر کاشی اور چینی سے گل بوٹے بنائے جاتے ہیں غضار کہلاتے ہیں-بعض یوروپین مصنفین نے غلطی سے غضائری کا تلفظ عوض مہملہ کے ساتھ ادا کیا ہے-Uzdeeri Razi —
۱۷	۲	۲۵	ابوعسیبا موفق الدین ابوالعباس احمد (مصنف عیون الانبا فی طبقات الاطبا) صحیح ابن ابی اصیبعہ ہے (فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد خامس صفحہ ۹۲) —
۲۳	۲	۱۱	ابن رشید-ابوالولید محمد-صحیح ابن رشد ہے —
۲۷	۱	۲۱	ابن ہوکل (مشہور سیاح و جغرافیہ نویس) صحیح ابن حوقل ہے (فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد خامس صفحہ ۱۵۰)—
۳۲	۱	۱۰	ابوالفتح مصنف چار باغ اور ابوالفتح گیلانی کو علیحدہ
	۲	۱۲	علیحدہ لکھا ہے-لیکن حقیقت میں دو جدا جدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شخص ہے-چار باغ ابوالفتح گیلانی کے مجموعہ رقعات کا نام ہے دربار اکبری صفحہ ۶۵۹ و ۶۶۵)—
۳۳	۲	۲۷	ابوالفرج سنجری کو چنگیز خاں کا معاصر بتایا ہے-حالانکہ وہ عنصری کا اوستاد-آل سبکتگین کا معاصر اور امیر بوعلی سیمجور کا مداح ہے اور سنہ ۴۱۰ سے پہلے فوت ہوا ہے-مجمع الفصحا جلد اول صفحہ ۷۰) اور اس کی وفات کے

صفحہ کالم سطر

قریباً دو سو سال بعد ساتویں صدی کے شروع میں چنگیز خاں نے خروج کیا ہے۔ (ابوالفدا جلد سوم صفحہ ۲۲)—

۳۶ ۱ ۱۴ آثار باقیہ (حکیم ابو ریحان البیرونی کی ایک تصنیف کا نام) صحیح آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ ہے اور اسے پروفیسر سخاؤ نے سنہ ۱۸۷۸ ع میں چھپوایا ہے (فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد خامس صفحہ ۲)—

۶۳ ۲ ۱۰ احمد المکری (اندلس کا مورخ اور نفح الطیب کا مصنف) صحیح المقری ہے (فہرست کتب خانہ خدیویہ جلد ۵ صفحہ ۱۲۹)—

۷۶ ۲ ۹ ازرقی حکیم — ازرقی شاعر اور ازرقی مصنف اخبار مکہ ایک نہیں بلکہ دو علیحدہ علیحدہ شخص ہیں —

ازرقی شاعر فارس کا نہیں بلکہ ہرات کا باشندہ اور طغان شاہ بن موید والی نیشاپور کا مداح و معاصر ہے۔ (عوفی جلد دوم صفحہ ۸۲) طغان شاہ سنہ ۵۶۸ ہجری میں بر سر حکومت ہوا (ابوالفدا جلد سوم صفحہ ۵۳) اور سنہ ۵۸۱ ہجری میں فوت ہوا (روضۃ الصفا طبع ایران جلد چہارم صفحہ ۱۵۰)—

ازرقی مصنف اخبار مکہ کا نام ابوالولید محمد بن عبداللہ بن احمد الازرقی ہے اور اس نے ازرقی شاعر سے کم و بیش تین سو سال پہلے سنہ ۲۲۳ ہجری میں انتقال کیا ہے —

R. Dozyeat. Codicum Orientalium Bibliothecae Academiae Lugduno-Batavae Vol. II. pp.169.

۷۹ ۲ ۲۸ اسمعیل بن حسین جرجانی (طبیب مشہور) کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے فارسی میں طب کی دو کتابیں اغراض الطب اور خفی علائی لکھیں اور انہیں الپ ارسلان کے نام سے معنون کیا۔ اسمعیل کو الپ ارسلان (سنہ ۴۵۵ سنہ ۴۶۵) کا معاصر سمجھنا غلطی ہے۔ یہ سلطان علاء الدین تکش (سنہ ۵۶۸ سنہ ۵۹۶) کا معاصر ہے اور اسی کے نام سے اس نے کتابیں لکھی ہیں چنانچہ خوند میر کا بیان ہے کہ "سید اسمعیل بن حسین بن محمد الجرجانی زمان تکش خاں را بوجود خود مشرف داشت و

صفحه کالم سطر

بنام نامی آن بادشاه عالیشان فخیره خوارزم شاهی و کتاب اعراض الطبیه و خفی علائی را بر صحایف روزگار نگاشت (حبیب السیر جلد دوم جز چهارم صفحه ۱۷۹)—

۱۰۰ ۱ ۱۹ تاج الدین عبدالوهاب بن آسکی مصنف طبقات الشافعیادی. صحیح ابن السبکی اور کتاب کا نام طبقات الشافعیه ہے -

R. Dozy. Voll. 11 . pp. 302.

۱۱۳ ۱ ۱۰ انوری (مشہور شاعر) کا نام اشہدالدین لکھا ہے حالانکہ صحیح اوحدالدین ہے (عوفی جلد دوم صفحه ۱۱۷)

۱۲۳ ۲ ۵ بختری (عرب کا مشہور شاعر) صحیح بحتری ہے

R. Dozy. Vol. 11 pp. 5.

۱۳۴ ۲ ۹ بندرا بن داس-عالمگیر کے سنه ۳۰ جلوس میں اس نے خلاصة التواریخ لکھی ہے اس میں ہندوستان کی تاریخ آریاؤں کے زمانے سے عہد عالمگیر تک ترتیب دی ہے- خلاصة التواریخ بندرا بن کی تصنیف نہیں ہے بلکه ایسے سوجان رائے نے تصنیف کیا ہے-بندرابن نے جو تاریخ لکھی ہے اس کا نام لب التواریخ ہے-اور عالمگیر کے سنه ۳۳ سال جلوس میں تصنیف ہوئی ہے-اس میں دس ابواب ہیں-پہلے باب میں سلطان معزالدین محمد سام کے عہد سے سنه ۱۰۱۱ تک سلاطین دہلی کے حالات ہیں-بقیه نو ابواب میں سلاطین دہلی کے ان ہم عصر بادشاہوں کا تذکرہ ہے جو ۱-دکن ۲-گجرات ۳-مالوہ ۴-خاندیس ۵-بنگال ۶-جون پور ۷-سندہ ۸-ملتان ۹-کشمیر میں بر سر حکومت رہے ہیں—

(Wilson, Makenzie Collection-pp-. 375 Rieu, B.M. Cat. Persion. MSS. Vol. 1. pp 228)

۲۱۱ ۱ ۷ کتاب لطایف الطوایف کو ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف لکھا ہے حالانکه وہ ان کے فرزند ملا فخرالدین علی بن حسین کی تصنیف ہے (محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب صفحه ۶۹۳ —

۱۴ ۱ ۱۹ خاوند شاہ مصنف روضة الصفا کے حالات میں اوسکی

صفحه	کالم	سطر	
			دوسری تصلیفات کے حسب ذیل نام لکھے ھیں - ماثرالملوک اخبارالاخیار - دستورالوزرا - مکارم الاخلاق - ملتخب تاریخ وصاف - غرایب الاسرار - جواهرالاخبار - پھرانھیں کتابوں کو صفحه ۲۳۰ کالم ۲ میں خوند میر مصلف حبیب السیر کی تصلیفات بیان کیا ھے —
۲۲۷	۲	۸	خواجه محمد پارسا کے حالات میں اونکی تصلیف کا نام فصل الکتاب لکھا ھے - حالانکه صحیح نام فصل الخطاب لوصل الاحباب (محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب صفحه ۵۰۷)
۲۳۰	۲	۸	" خوند میر (مصلف حبیب السیر) امیرخاوند شاه مصلف روضة الصفا کا بیٹا اس کا پورا نام غیاث الدین محمد بن حمیدالدین خوند میر ھے " خوند میر خاوندشاه کا بیٹا نہیں بلکه نواسه ھے اور اس کے باپ کا صحیح نام همام الدین ھے — (Elliot . Vol . 1V . pp 142 .)
۲۴۳	۲	۷	دارا شکوه نے فارسی میں اپلکھت کا جوترجمه کیا تھا اس کا نام سرالاسرار لکھا ھے - حالانکه صحیح نام سراکبر ھے چنانچه بمقام بنارس ندوة العلما کا جو گیارواں اجلاس اپریل سنه ۱۹۰۶ عیسوی میں منعقد ہوا تھا - اوسمیں ایک علمی نمائش بھی قایم ہوئی تھی اور اس نمائش میں سراکبر کا ایک قلمی نسخه سنه ۱۰۶۷ کا لکھا ہوا پیش ہوا تھا - جس کے خاتمه پر کتاب کا نام اس طرح ثبت تھا " این ترجمه اپلکھا ے ھرچہار بید که موسوم به سراکبر ست وتمام نورالانوار محمد داراشکوه در مدت شش ماه آخر دوشنبه بیست وششم ماه رمضان سه یکہزار و شصت و ھفت ھجری در منزل نگمبود باتمام رسانید " — رساله الندوه جلد سوم نمبر دوم بابت اپریل ۱۹۰۶ صفحه ۱۵ —
۲۷۹	۲	۴	سامانی (مصلف کتاب الانساب) صحیح سمعانی ھے اور پورا نام یه ھے - ابوسعد عبدالکریم بن منصورالسمعانی

...

صفحه	کالم	سطر	
			السروزی - سمعانی ملسوب هے سمعان سے اور سمعان بطن قبیله تمیم کا (دول الاسلام امام ذهبی جلد دوم صفحه مفتاح السعادہ جلد اول صفحه ۲۱۱) —
۲۸۰	۲	۸	سبحانی (مشہور رباعی گو شاعر) صحیح سحابی هے نجف کا باشندہ نہیں بلکه استرآباد کا باشندہ هے - نجف اشرف میں اس کی سکونت تھی — Rieu . Vol . II . pp . 272 .
۲۸۶	۱	۲۵	سرخوش کے تذکرہ شعرا کا نام کلامته الشعراء لکھا هے حالانکه صحیح نام کلمات الشعراء هے Rieu. Vol . 1 . 369
۲۹۲	۲	۱۸	سعدی شیرازی کے حالات میں ان کی دیوان ثالث کا نام قوانین لکھا هے - حالانکه صحیح نام خواتیم هے (کلیات سعدی طبع بمبئی سنه ۱۳۰۹ صفحه ۳۷۳) —
۲۹۳	۱	۳	سکاکی کے حالات میں اس کی تصنیف کا نام مصباح العلوم لکھا هے حالانکه صحیح مفتاح العلوم هے (مفتاح السعادہ جلد اول صفحه ۱۸) —

خلفاے عباسیه اور بہت سے علماے عرب کو اُن کے ناموں پر الف لام زیادہ کر کے حرف الف میں لکھا گیا هے - جیسے المطلی - الراشد - الراضی - المامون - المتوکل - المستعصم - المقدسی - المنصور وغیرہ یه تریقه صحیح نہیں - کیونکه یه الف اصلی نہیں هے - ان تمام اسماء کو ان کے حروف اصلی میں لکھنا چاهئے - المطلی حرف بے میں الراضی کو حرف رے میں المامون و المنصور وغیرہ کو حرف میم میں علیٰ هذا القیاس —

لیکن باوجود اس کے هم قابل مولف کی محنت کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے - اُردو میں اس قسم کی کتابیں شاذ هیں جن سے طلبه کو اچھی علمی مطالعہ میں مدد مل سکے - مولانا نظامی نے اس کتاب کی تالیف سے بلا شبه اُردو زبان میں اضافه کیا هے - پہلی طبع میں اس نوع کی کتاب میں اس قسم کی فرو گذاشتوں کا هونا معمولی بات هے - اُمید هے که دوسری طبع میں پورے طور سے صحت کر دی جاے گی —

کتاب مولف یا انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد سے مل سکتی هے —

(ه - ق)

فہرست مخطوطات فارسی مخزونہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts in the Collection of the Asiatic Society of Bengal, by Wladimir Ivanow, late Assistant keeper of the Mohammadan Mss., Asiatic museum, Russian Academy of Sciences, Calcutta, 1924 pp. xxxvii. 934. Rs. 42 - 8.

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانہ میں فارسی زبان کی جس قدر قلمی کتابیں ہیں اُن کی یہ ضخیم فہرست ہے۔ اسے ایک روسی مستشرق ولد یمر ایوانو نے مرتب کیا ہے جو ایک عرصہ تک روس کی اکیڈیمی آف سائنس کے ایشیاٹک میوزیم میں اسلامی کتابوں کے مددگار محافظ رہ چکے ہیں اور ادبیات اسلامیہ کی نسبت وسیع واقفیت رکھتے ہیں —

یہ فہرست ایسی جامع اور مکمل نہیں ہے جیسی کہ ریو، ایتھے وغیرہ مستشرقین کی فہرستیں ہیں لیکن پھر بھی اس میں ایسی معلومات جمع ہیں کہ اُن کی وجہ سے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس کی اشاعت سے فارسی ببلیوگرافی میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے —

اس فہرست کی ترتیب و تدوین میں مولف نے بالکل ریو اور ایتھے کی فہرستوں کا اتباع کیا ہے اور ہر کتاب کے بیان میں بالالتزام امور ذیل کی پابندی کی ہے —

(۱) کتاب کا نام اور اُس کا عہد تصنیف
(۲) مصنف کا نام اور اُس کا سنہ وفات
(۳) اُس بادشاہ یا امیر کا نام جس کے نام پر یا عہد میں کتاب لکھی گئی ہے
(۴) کتاب کے ایڈیشن اور ترجموں کی کیفیت
(۵) مشرق و مغرب کی تاریخی کتابوں اور فہرستوں کے ریفرنس جن کی وجہ سے کتاب اور اُس کے مصنف کی نسبت مزید واقفیت حاصل کرنے میں رہنمائی ہوتی ہے اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب سوسائٹی کے علاوہ یورپ اور ہندوستان کے کون کون سے کتب خانوں میں موجود ہے —

اس کتاب کی ترتیب میں فاضل مولف نے کم و بیش چالیس کتابوں سے امداد

لی ہے اور جگہ جگہ ریو ایتھے فلوگل ' پرچ ' براون ' ڈورن ' پزی وغیرہ مستشرقین
کی ضخیم ضخیم تصنیفات کے حوالے دئے ہیں مثلاً

Rieu, Catalogue of the Persion Mss . In the Brilish Museum.,

Ethe, Catalogue of the Persion Mss . In the Library of the India office

Ethe, Neupersische Library,

Partsch, Die Hands chriften Verzeichnisse der Koniglichen Bibliothek Zu Berlin.

Dorn, Catalogue des Manuscrits et XylograPhe Orientanx de La Bibliothegue Imperiale Pnblique de ft . Petersbourg.

Brouin, Literary Histry of Pessia.

„ Catalogue of the Persion In the Library of the University of Cambridge

Pizzi, Storia deua Pocsia Persiuna,

Borthold, Turkestane, at the Mongol Jnvasion,

مطبوعات کی فہرست مسٹر ایڈورڈس Edwards کی کتاب Catalogue of the Persion Printed Books In the British Museum .
سے ماخوذ ہے - سلاطین کے سلسلہ حکومت اسٹینلی لین پول S . Lane, Pool
کی کتاب Muhammadan Dynasties سے نقل کئے ہیں —

اس فہرست میں (۱۷۸۱) کتابوں کا تذکرہ ہے - اور فنون کے اعتبار سے ان
کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے —

تاریخ ۲۱۱ (1 - 211)

---o---

اس ذخیرہ میں جو کتابیں خاص اہمیت رکھنے والی ہیں اون کی تفصیل ہے—

تاریخ

مجمل فصیحی (.D 278 9) اس کو فصیحی خوانی نے سنہ ۸۴۵ ہجری ں مرتب کیا ہے - اس میں سنین کے تحت میں تاریخی واقعات جمع ہیں- یت نایاب و کمیاب کتاب ہے - اس کا ایک نسخہ بانکی پور کی اورنٹیل لائبری ں بھی موجود ہے—

مجمل مفصل (D 275 , 43) سنہ ۱۰۶۵ ہجری کے قریب ہندوستان میں لیف ہوئی ہے-اس میں آغاز سال ہجری سے سنہ ۱۰۶۵ ہجری تک حالات ع ہیں—

حدیقۃالصفا (D 141 , 45) اس کو یوسف علی بن غلام علی نے سنہ ۱۱۷۴ ھ ں تصنیف کیا ہے-اس کے پہلے حصہ میں شاہان قدیم-خلفاے اسلام اور ان کے اصر سلاطین عالم کے حالات ہیں دوسرے حصہ میں ہندوستان کے شاہان تیموریہ ذکرہ ہے - تیسرے حصے میں ہندوستان کے ان فرمان روا خاندانوں کی ریخ تحریر ہے جو بنگالہ دکن گجرات سندھ مالوہ جون پور-کشمیر وغیرہ میں سر حکومت رہے ہیں-خاتمہ دو حصوں پر منقسم ہے-پہلے حصے میں حکماء کے الات ہیں دوسرے میں شعرا اور صوفیہ وغیرہ کا تذکرہ ہے—

خلاصۃالاخبار (D 154 , 106) اس کو مقصد اسلم نے لکھا ہے-اس میں

امیر دوست محمد خاں کے کارنامے سنہ ۱۲۵۳ ھجری تک مذکور ھیں—

تاج المآثر (110 , D 34) سلاطین ھندوستان کی قدیم تاریخوں میں نہایت نایاب کتاب ہے-اس میں سلطان شہاب الدین محمد بن سام اور اس کے جانشین قطب الدین ایبک اور شمس الدین ایلتمش کے حالات ھیں-

تاریخی مراسلات

انشاء قاسم طبسی (350 , F . 9) اس سے سلاطین دکن اور شاھان ایران کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے—

رقعات میر عبداللطیف (364 , F - 6) اس سے عہد جہانگیر اور شاہ جہاں کے سیاسی حالات معلوم ہوتے ھیں—

گلشن عجائب (392 , F - 10) اس میں مرزا فرخ سیر اور محمد شاہ کے مراسلات جمع ھیں—

تاریخی منظومات

تواریخ قطب شاہ (691 - D , 65) اس میں سلاطین قطب شاھیہ کے حالات ابتداء سے سنہ ۱۰۰۰ ھجری تک مذکور ھیں اور اسے میرا لعل خوش دل نے نظم کیا ہے—

انور نامہ (872 , N a , 7 -) سنہ ۱۱۷۳ ھجری میں تصنیف ہوا ہے-اس میں انور الدین خاں والی کرناٹک کے حالات ھیں-

نجیب نامہ (870 , N a, 86) اس کا دوسرا نام نامہ طرفہ ہے-سنہ ۱۱۸۵ ھ تصنیف ہوا ہے-اس میں نجیب الدولہ نواب نجیب خاں روھیلہ کے حالات میں مذکور ھیں—

ظفر نامہ (886 , N a , 87) اس میں عہد جنرل لیک (Lake) کے واقعات مذکور ھیں جو سنہ ۱۸۰۰ ع سے سنہ ۱۸۰۷ ع تک واقع ہوئے ھیں—

شعرا اور صوفیہ کے تذکرے

مذکرالاحباب (219 , D 98) اسے میر بہاء الدین حسن نقیب الاشراف بخارائی نے سنہ ۹۷۳ ع میں مرتب کیا ہے-نہایت نایاب اور قابل قدر تذکرہ ہے اس کی ۳۰۸ صفحات ھیں—

طبقات الصوفیہ (234 , D 232) یہ تذکرہ پیر ہرات شیخ الاسلام ابواسمعیل عبداللہ بن محمد الانصاری المتوفی سنہ ۴۸۱ ھجری کی تصنیفات سے ہے اور دنیا کی نایاب کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے —

ابوعبدالرحمن محمد بن حسین السلمی المتوفی سنہ ۴۱۲ ع سے عربی زبان

میں صوفیائے کرام کا ایک تذکرہ لکھا تھا (Brookel mann . Geschichte der Arabeischen litteraTur —
(VOl 1 . PP . 200)

خواجہ عبداللہ انصاری نے اپنی مجالس وعظ و تذکیر میں بزبان فارسی اس کا ترجمہ فرمایا۔یہ ترجمہ ہرات کی قدیم زبان میں تھا۔مولانا عبدالرحمن جامی نے اوسے مروجہ فارسی میں لکھا اور اس کا نام نفحات الانس من حضرات القدس رکھا—

گلزار ابرار (259 D. 262,) اسے محمد غوثی بن حسن بن موسی شطاری نے سنہ ۱۰۲۲ میں مرتب کیا ہے۔ہندوستان اور خاص کر گجرات کے اولیا اللہ کا ایک عظیم تذکرہ ہے —

شرائف عثمانی (277. D. 427.) مشاہیر بلگرام کا تذکرہ ہے۔اسے غلام حسن صدیقی فرشوری بلگرامی نے تصنیف کیا ہے اور اس کی تصنیف کی وجہ الفاظ ذیل میں بیان کی ہے—

> میر سید غلام علی متخلص بآزاد .. بسیعی نسب نامہ جمع فرمودند و بی اطلاع ما مردم اکثر اقوال سماعی و قیاسی کہ معتمد علیہ نبودند درج نمودند و بعد چندی یوم بزیارت حرمین شریفین از بلگرام براہ دکن سفر حجاز کردیدند ... الان بحسب آب خور در آن ملک (دکن) استقامت دارند و از انجا کتابی مسمی بماثرالکرام فی تاریخ بلگرام و نسخہ سرو آزاد نام تالیف فرمودہ بہ بلگرام فرستادند۔چوں بنظر جمعی از فضلا و بعضے از روسا ے بلگرام گذشت بسبب آنکہ اکثر اقوال خلاف واقع تاریخ و اسناد و وثایق فرامین بودند ہر یک بزرگان بملاحظہ آن بگرداب حیرت در افتادند کہ هر کارہ بنیان ایشاں سر تا سر خلاف واقع و مخالف اسناد و تواریخ سلف است بجز آنکہ ساقطہ از اعتبار است چہ تواں گفت قطع نظر بنائے کتاب محتوی بر صدق و صواب می باید تا جماعہ خلق را دلیل یقینی باشد و معتمد علیہ گردد— (الخ)

دواوین

شعرائے ذیل کے دواوین نہایت نایاب و کمیاب ہیں:—

دیوان قطرن بن منصور تبریزی المتوفی سنہ ۴۶۵ ہجری (408, Nb , 111)

دیوان سجتاری، سراج الدین عثمان بن محمدالغزنوی المتوفی قریب سنه ۵۴۴ھ ہجری (1753. M. 19)—

دیوان سوزنی، شمس الدین محمد بن علی السمرقندی المتوفی سنه ۵۶۹ ہجری (449. Nb. 71)—

دیوان شرف الدین شفروه محمدفضل الله الاصفہانی المتوفی ۶۰۰ ہجری 465. Nb. 13)

دیوان امامی-ابو عبدالله محمد بن عثمان الهروی المتوفی سنه ۶۶۷ ہجری (489. Nb. 15)—

کلیات عماد فقیه-خواجه عمادالدین کرمانی المتوفی سنه ۷۷۳ ہجری (583. Nd. 14.)—

دیوان آذری-شیخ جلال الدین حمزه بن علی البیہق المتوفی سنه ۸۶۶ ہجری (606. Nb. 1,)—

دیوان سہیلی-امیر نظام الدین احمد المتوفی سنه ۹۰۷ ہجری وزیر سلطان حسین مرزا (643. Nb. 72,)—

دیوان عبیدی-عبدالله خان بن محمود خان شیبانی والی ہرات (سنه ۹۴۰ تا ۹۴۶) (1759. Oa, 14)—

دیوانی تقی اوحدی-تقی الدین بلبانی (783. Nb. 29)—

صوفیانه نظمیں

مثنویات مولانا جمالی دهلوی (143 .75 · N 648) اس مجموعه میں ۲۷ مثنویاں ہیں منجمله اون کے بعض نام یه ہیں-مصباح الارواح-کنزالدقایق-تنبیه العارفین-روح القدس-مفتاح الفقر-فاتح الابواب وغیره—

کتب دینیه

امام ابوجعفر محمد بن جریرالطبری المتوفی سنه ۳۱۰ کی تفسیر کبیر کا فارسی ترجمه (955 Aa. 19) جس کو امیر منصور بن نوح سامانی (سنه ۳۵۰-سنه ۳۶۵) کے حکم سے علمائے بخارا و سمرقند و فرغانه نے مرتب کیا ہے-نہایت نایاب اور نادر الوجود کتاب ہے-سوسائٹی میں اس کا مکمل نسخه نہیں ہے-بلکه درمیانی جلد ہے جس کے ۸۰۰ صفحات ہیں-اور اس میں سورۂ آل عمران سے سورۂ کہف تک پندره سوروں کی تفسیر ہے—

فن حرب

سوسائٹی کی نایاب ترین کتابوں میں "آداب الحرب والشجاعه" (M. 160

1806 ./ ایک قابل ذکر کتاب ہے - یہ کتاب ۳۲۲ صفحات پر تمام ہوئی ہے - محمد بن منصور القریشی نے جو مبارک شاہ اور فخر مدبر کے لقب سے مشہور ہے اسے سلطان شمس الدین ایلتمش بادشاہ دہلی (سنہ ۶۰۷ ھجری سنہ ۶۳۳ ھجری) کے نام پر تصنیف کیا ہے - اس میں جنگ کے وہ آداب و قوانین مذکور ہیں جو ساتویں صدی کے مسلمانوں میں رائج تھے —

———:o:———

اس فہرست کی ترتیب و تدوین میں مولف سے متعدد مقامات پر غلطیاں ہو گئی ہیں مثلاً —

ترجمہ تاریخ طبری (No. 1)

اس کے متعلق لکھا ہے کہ ابو علی محمد بن محمد بلعمی نے منصور بن نوح سامانی کے حکم سے سنہ ۳۵۲ میں ترجمہ کیا اور محمد بن عبدالملک الہمدانی نے اس میں مستظہر باللہ عباسی کے عہد خلافت تک حالات اضافہ کئے —

یہ سمجھنا کہ محمد بن عبدالملک ہمدانی المتوفی سنہ ۵۲۱ نے فارسی ترجمہ پر حالات اضافہ کئے ایک صریح غلطی ہے - اس میں شک نہیں کہ محمد بن عبدالملک نے تاریخ طبری کا تکملہ لکھا ہے لیکن وہ فارسی ترجمہ کا نہیں ہے بلکہ اصل عربی کتاب کا ہے اور ذیل طبری کہلاتا ہے اور حاجی خلیفہ نے بھی اس کا ذکر کشف الظنون میں کیا ہے —

تاج المآثر (No. 155)

اس کے مصنف کا نام حسن (صدرالدین محمد بن حسن) نظامی لکھا ہے اور ایلیٹ کی تاریخ میں بھی یہی نام ہے (Elliot History of India. Vol. 11 pp. 204) —

اس کتاب کو صدر الدین محمد کی تصنیف قرار دینا ایک اہم تاریخی غلطی ہے - حقیقت یہ ہے صدرالدین محمد تاج المآثر کے مصنف کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے اصل نسخہ کے کاتب کا نام ہے اور اس نے کتاب پر ایک تقریظ لکھی ہے جو کتاب کے آخر میں بطور خاتمہ شامل ہے اور اس کا عنوان یہ ہے —

" ذکر فصلی کہ ملک الافاضل والعلماء مولانا صدر الملۃ والحق ملا محمد بن محمد المحوبکی رحمۃ اللہ کہ نسخۂ اصل ملتمس منہ بخط اوست در مدح این کتاب و مولفش در آخر نسخۂ اصل نوشتہ است " —

اس تقریظ میں مصنف کتاب کا نام " نظام الحق والملۃ و الدین الحسن

النظامی النیشاپوری" لکھا ہے-یہ حسن نظامی مشہور شاعر نظامی عروضی سمرقندی کا فرزند ہے جو ادب فارسی کی مشہور کتاب چہار مقالہ کا مصنف ہے (تاریخ گزیدہ-چھاپہ عکسی طبع لندن صفحہ ۸۲۶)—

جدول بادشاہان تیموری (No. 167.)

اس رسالہ کا صحیح نام "مجموعہ مرزا مہدی خاں صفوی" ہے-یہ نام تاریخی ہے اور اس سے سنہ ۱۱۳۲ سن تالیف بر آمد ہوتا ہے—

احقر خاندان مصطفوی و اقصر دودمان مرتضوی ابوالفاخر نظام الدین محمد ہادی الحسینی الصفوی الملقب بہ شاہ مرزا و المخاطب بہ مرزا مہدی خاں صفوی از کتب سیر و سوانح کہ بنظر رسیدہ بود بعد استخراج و استنباط بر نہج سطور ذیل ترسیم و ترقیم نمود و بالہام ملک مجید تاریخ اتمام این ارقام کہ رقم زدہ کلک تیرہ فام احقر انام است "مجموعہ مرزا مہدی خاں صفوی" موسوم گردید—

طلسمات خیال (No. 403.)

اس کے مصنف کا نام منشی نولکشور لکھا ہے-لیکن حقیقت میں یہ کتاب منشی کیول رام کی تصنیف ہے اور اس کے فرزند منشی نول کشور نے بعد اتمام اس پر خطبہ لکھا ہے اور اس خطبہ میں اس کی تاریخ تصنیف اس طرح بیان کی ہے—

بحمد اللہ کہ طبع قبلہ گاہی چہ نیکو پایۂ معنی بیفزود
پئے تاریخ سالش ہاتف غیب طلسمات خیال وے بفرمود

(محبوب الاحباب فی تعریف الکتب و الکتاب طبع حیدر آباد صفحہ ۳۶۳)

تذکرۃ الامرا جو امرائے دربار مغلیہ کا ایک ضخیم تذکرہ ہے-اسی منشی کیول رام کی تصنیفات سے ہے (Elliot. History of India, Vol. VIII, pp 192)

خمسہ نظامی (No. 466)

(۲) لیلی مجنون-اس کی نسبت لکھا ہے کہ یہ کتاب ابو المظفر شروان شاہ کے نام پر لکھی گئی ہے-لیکن یہ غلطی ہے-صحیح یہ ہے کہ مولانا نے اس کو اخستان شاہ کے نام پر لکھا ہے—

صاحب جہت جلال و تمکین یعنی کہ جلال دولت و دین
تاج ملکان ابو المظفر زیبندۂ ملک ہفت کشور
شاہ سخن اخستان کہ نامش مہر یست کہ مہر شد غلامش

اخستان ~~جی کا پورا~~ نام خاقان کبیر جلال الدین اخستان شاہ ہے
شاہ کا پورا

یہ فرزند اور جانشین ہے خاقان اعظم فخرالدین ملو چہر شروان شاہ کا خاقانی
وانی نے ان دونوں بادشاہوں کی مدح میں متعدد قصاید لکھے ہیں جو اس کے
وان میں موجود ہیں —

(۴) خسرو شرین - اس کتاب کا سن تصنیف سنـــہ ۵۷۶ لکھا ہے - اور اس
ریخ کے معین کرنے میں غالباً ایو کا اتباع کیا گیا ہے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس
ے میں ایو اور اس کے متبعین دونوں سے غلطی ہوگئی ہے - مولانا نظامی نے اس
ثنوی کو اتابک اعظم شمس الدین محمد جہاں پہلوان بن ایلدگز کے زمانہ میں
کھنا شروع کیا اور اس کی وفات کے بعد اس کے برادر اور جانشین مظفر الدین قزل
سلان کے عہد حکومت میں اختتام کو پہونچایا —

مولانا نظامی نے مثنوی کے اخیر حصہ میں اس کے اختتام محمد بن ایلدگز
ی وفات اور قزل ارسلان کی قدر دانی کے مفصل حالات لکھے ہیں - جن کا محاصل
ہ ہے کہ جب مثنوی تمام ہوئی تو قزل ارسلان نے مولانا کو دربار میں طلب کیا -
خسرو شرین کے اشعار سن کر تحسین و آفرین کی اور کہا کہ آپ نے میرا نام ہمیشہ کے
لے زندہ کر دیا ہے - اور اس کا صلہ دینا میرا فرض ہے - اس کے بعد دریافت کیا کہ
ھائی صاحب (محمد بن ایلدگز نے آپ کو دو گاؤں دینے کا ارادہ کیا تھا - وہ دیے
نہیں - مولانا نے جواب دیا کہ شاہ سعید نے بیشک ایسا ارادہ کیا تھا - لیکن اس کے
ورا ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا - اس پر قزل ارسلان نے مولانا کو دو گاؤں
طا کئے

بلے شاہ سعید از خاص خویشم — پذیرفت انچہ فرمودی زپیشم
چوں رخت عمرا و کشتی روان کرد — مرا نے' جملہ عالم رازیان کرد

جہاں پہلوان محمد بن ایلدگز کا سنہ ۵۸۱ ع میں انتقال ہوا ہے (دول الاسلام
ذہبی طبع حیدرآباد جلد ثانی صفحہ ۹۷ - حبیب السیر جلد دوم جز چہارم صفحہ ۱۲۶
اس اعتبار سے یہ مثنوی سنہ ۵۸۱ ع کے بعد تمام ہوئی ہے —

(۵) سکندر نامہ کی نسبت لکھا ہے کہ سنہ ۵۹۷ ھ کی تصنیف ہے اور اس کے
بعد بیان کیا ہے کہ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے —
پہلے حصے (سکندر نامہ بری یا شرف نامہ اسکندری) کی نسبت لکھا ہے کہ
اتابک نصرت الدین ابوبکر کے نام پر لکھا گیا ہے —
دوسرے حصے سکندر نامہ بحری یا خردنامہ اسکندری) کی نسبت لکھا ہے
کہ سلطان عزالدین مسعود بن نورالدین ارسلان کے نام پر معنون ہے —
اس کتاب کی نسبت مولف سے دو غلطیاں ہوئی ہیں - اول یہ کہ دونوں

حصوں کو ایک ہی سنہ میں تصنیف ہونا بیان کیا ہے ۔ حالانکہ دونوں حصے دو مختلف سنین میں تصنیف ہوئے ہیں۔ پہلا حصہ سنہ ۵۹۷ ھ میں اور دوسرا سنہ ۵۹۹ ھ میں تمام ہوا ہے۔ دوسرے حصے کی تاریخ تصنیف خاتمہ میں اس طرح مذکور ہے —

زهجرت چنان بردهم یاد گار نود نه گذشته زپا نصد شمار

دوم یہ کہ حصہ دوم کو عزالدین مسعود کے نام سے منسوب کیا ہے۔ حالانکہ یہ بادشاہ اس حصے کے تمام ہونے سے آٹھ سال بعد سنہ ۶۰۷ ھ میں برسر حکومت ہوا ہے۔(دول الاسلام ذہبی جلد ثانی صفحہ ۸۳ و صفحہ ۸۵ تاریخ ابوالفدا۔ طبع قسطنطنیہ جلد ثالث صفحہ ۱۱۳) —

دیوان واقف (No. 877)

واقف کا نام نورالدین وطن پٹیالہ (Patyala) اور سال وفات سنہ ۱۲۰۰ ء ۱۷۸۹ لکھا ہے جو غلط ہے —

واقف کا صحیح نام نورالعین وطن بٹالہ ہے اور سنہ ۱۱۹۵ ہجری میں ان کا انتقال ہوا ہے (خزانہ عامرہ طبع کانپور صفحہ ۴۵ نتائج الافکار طبع مدراس صفحہ ۴۵۴) —

عروس عرفان (No. 1283)

اس کے مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے " محمود بن باقر محمد بحشکی قادری " شیخ محمد باقر محمود بحری کے والد نہیں بلکہ مرشد ہیں۔ قاضی محمود بحری نے سنہ ۱۱۱۱ ہجری میں ایک مثنوی دکنی زبان میں " مسن لگن " کے نام سے لکھی ہے اور اس میں حمد و نعت کے بعد اپنے مرشد کے مناقب و مناقب بیان کئے ہیں اور اس کے ضمن میں ان کا نام محمد باقر لکھا ہے (من لگن طبع مدراس سنہ ۱۳۰۷ ہجری صفحہ ۷) —

قاضی محمود بحری کے والد کا صحیح نام بحرالدین اور لقب قاضی دریا ہے۔(تاریخ اردوے قدیم صفحہ ۸۶) —

—:o:—

اکثر مشاہیر کے سنین وفات چھوڑ دیے ہیں حالانکہ وہ تاریخ و تراجم کی کتابوں میں آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں اور چند سنین جو ہمیں یاد ہیں ذیل میں درج کرتے ہیں —

(6) حمداللہ مستوفی قزوینی سنہ ۷۶۶ ملتقام ناصری درلغت سنہ ۷۶۶ صاحب تاریخ گزیدہ

(511) شاہ ولی محمد اکبرآبادی سنہ ۱۰۵۷ مصنف الواصلین
مدارج مثنوی مولانا روم

(733) تقی الدین اوحدی بلیانی سنہ ۱۰۳۰ صبح گلشن طبع بھوپال صفحہ ۸۸
صاحب تذکرۃ الشعراء

(797) محمد سعید اشرف مازندرانی سنہ ۱۱۱۶ نتائج الافکار صفحہ ۳۷
استاد زیب النساء بیگم

(898) علاء الدین رصالی سنہ ۹۹۸ نتائج الافکار صفحہ ۲۸۹
صاحب ترجمہ بلد (ما مقیمان)

(1411) ابوالفر فراھی صاحب سنہ ۵۷۹ ملتقط ناصری در تحت سنہ ۵۷۹
صاب الصبیان

(1431) ملا عبدالرشید تتوی سنہ ۱۰۷۷ خزانہ عامرہ صفحہ ۴۲۴
صاحب منتخب اللغات و فرھنگ رشیدی

کتاب میں ان کے علاوہ اور بہت سی اغلاط و فروگزاشتیں موجود ہیں جن کی تصحیح اس مختصر سے مضمون میں غیر ممکن ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ارکان طبع ثانی میں ان کی اصلاح کر دیں گے—

(حکیم سید شمس اللہ قادری)

———:o:———

مقتل فریب مغربی معمل خانے

یہ ایک ۵۸ صفحہ کا چھوٹی تقطیع کا رسالہ ہے جس کے مصنف سید طالب علی صاحب طالب الہ آبادی ہیں، سائنس کی ترقی، نئے نئے آلات کی ایجاد اور زمانۂ جدید کے تجربے اور تحقیق کے ذوق نے اس میں شک نہیں کہ انسانی معلومات کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا ہے اور اس سے ہمیں بہت سے فائدے بھی پہونچ چکے ہیں، لیکن دوسری طرف اختیار و تجربے کے شوق کا ایک ادنیٰ نتیجہ یہ ہے کہ آدمی محض اپنے ذوق تحقیق کی خاطر بے زبان جاندار مخلوق پر طرح طرح کے ظلم کرتا ہے اور اپنا کے جواز کے لئے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ان باتوں سے اضافۂ علم مقصود ہے، یہ کتاب اسی "ظالمانہ شوق تشریح و تحقیق" کے خلاف ایک طرح کا احتجاج ہے، جناب مصنف نے علم تشریح الاعضا کو خاص طور پر ہدف ملامت بنایا ہے اور تجربے کے پردے میں بے زبان جانوروں پر جو مظالم ہوتے ہیں

انہیں اپنے مخصوص چبھتے ہوئے انداز میں ظاہر کیا ہے، کتاب میں دس بڑے بڑے عنوانات جیسے "قتل روح" "تجربات بے درد" "کلب مذبوح" "گربۂ مسکین" وغیرہ ہیں۔ ہر عنوان کے تحت جراحی عمل کی مختلف قسموں کا بیان اور تجربوں کا حال ہے، یہ تجربے اکثر ناکامیاب ہوتے ہیں—

ہم اس موقع پر یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتے کہ جناب مصنف کا نقطۂ خیال خالص علمی انسانی اور اخلاقی حیثیت سے صحیح ہے یا غلط، لیکن یہ ہم ضرور کہیں گے کہ اس کتاب میں صرف تصویر کے ایک رخ کو بہت بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ہے، بے زبان جانوروں کا عامل کے تیز آلات کے نیچے تڑپ تڑپ کر جان دینا و تـ ایک پر اثر نظارہ ہے، لیکن انسانوں کا ایسے امراض کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینا جن کی تحقیق کافی طور پر نہیں ہوئی ہے، اس سے بھی زیادہ جگر خراش منظر ہو سکتا ہے ہندوستان میں جس رد عمل کی ابتدا جناب مصنف کی اس کتاب سے ہوتی ہے وہ انگلستان میں بہت پہلے شروع ہو چکا ہے۔ ورڈس ورتھ کے الفاظ سنئے—

فطرت کی کہانی تو سریلی ہے لیکن ہمارا
ذہن دخل در معقولات کر کے اشیا کی
حسین صورتوں کو بگاڑ دیتا ہے تشریح
(چیر پھاڑ) کے شوق میں ہم قتل پر بھی
اتر آتے ہیں—

Sweet is the love which nature brings
Our meddling Intelleot
Mis shapes the beauteons forms of thing
We munder to lisseet

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال قابل غور ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جذبات کے علاوہ عقل کا بھی ہم پر آخر کچھ حق تو ضرور ہے، اسے بھی جانے دیجئے تو پوری انسانی نسل کیا اتنے ایثار اور مستحسن ظلم کی بھی مستحق نہیں!

کتاب کی عبارت شروع سے آخر تک طنزیہ ہے اور الجھی ہوئی ہے، عجیب و غریب ترکیبوں کا استعمال کیا گیا ہے "ہم ایک دن یقیناً حیات کی حدیث طبیعیہ والی تہ تک پہونچ کر رہیں گے" "ثمردار ترقی" "سایۂ باز انداختۂ آئینۂ جذبات" "خوش صوت جملے" وغیرہ کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا عجیب و غریب ترجمہ کیا گیا ہے Foxhound سگ روباہ شکار یا Labaratony کا معمل خانہ حالانکہ اس کے لئے صرف لفظ "معمل" کافی تھا کہ اس میں خود ظرفیت موجود ہے "دورۂ مغزیہ" "رگ قلبیہ" رگ حلقیہ تنفسیہ وغیرہ خدا معلوم کن اصطلاحات کے ترجمے ہیں، اصل الفاظ دئے جاتے تو مقابلہ ممکن تھا—

کتاب معمولی کاغذ پر چھپی ہے الناظر پریس لکھنؤ سے چار آنہ میں مل سکتی ہے —

(و)

گوتم بدھ

اس مضمون میں منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے نے ہندوستان کے سب سے بڑے اخلاقی رہنما کی مختصر سوانح عمری اور اسکی تعلیمات بیان کی ہیں - پہلے یہ الناظر لکھنؤ میں مسلسل شایع ہوتا رہا اور اب ایک دو جز کے رسالہ کی صورت میں علیحدہ طور پر الناظر پریس کی طرف سے شایع ہوا ہے ظاہر ہے کہ اس مختصر رسالے سے مہاتما بودھ کی سوانح نگاری کا فرض پوری طرح ادا نہیں ہوتا' اور نہ جناب مصنف نے اس کا دعوی کیا ہے' پھر بھی ان کی زندگی کے اہم واقعات سب کے سب اس میں آگئے ہیں' ولادت' ۲۹ سال کی عمر تک محل کی چار دیواری کے اندر رہنا' اتفاقاً آبادی کی طرف آن نکلنا اور انسانی مصائب کے نمونے دیکھنا' جوگ لینا' پھر سکون اور شانتی کی تلاش میں پھرنا' بودھی درخت کے نیچے عرفانی نور کا پرتو دیکھنا' ان سب چیزوں پر بحث کی گئی ہے' آخر میں اس کی تعلیمات کا نہایت مجمل بیان بھی ہے - کتاب کی عبارت بھی خاص طور پر دلچسپ ہے' اور چونکہ مضمون مختصر ہے اور نظر زیادہ گہری اور تاریخی نہیں ہے' اس لئے اس طرز کو شروع سے آخر تک خوب نباہا ہے' عام اردو داں حضرات اور مدارس کے طلبہ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا —

کاغذ معمولی اور لکھائی چھپائی غنیمت ہے الناظر پریس لکھنؤ سے ۴ آنہ میں مل سکتی ہے —

(و)

سرگزشت وزیرخاں لنکران

یہ ایک فارسی تمثیل ہے جس کے لکھنے والے مرزا جعفر قراچہ داغی ہیں - مرزائے موصوف شاہ کج کلاہ ایران فتح علی شاہ قاچار کے بیٹے شہزادہ جلال الدین

مرزا کی سرکار میں ملازم تھے' شہزادہ کے ایما سے انہوں نے کئی ترکی تسخیلات کو ایرانی لباس پہنایا - جامعہ لکھنئو کے پروفیسر محمد عبدالقوی صاحب فانی ایم-اے نے ان کے اس ڈرامے کو اپنے اردو ترجمے کے ساتھ چھپوایا ہے' اصل کے مقابل ترجمہ بھی دیا گیا ہے جو خاصہ سلیس اور عام فہم ہے' کتاب کے شروع میں ۳۲ صفحات کا ایک مقدمہ بھی ہے جو ڈرامے کی تاریخ سے متعلق ہے اس میں مختلف قوموں کے ڈراموں کا تھوڑا بہت حال بھی لکھدیا ہے' چونکہ اس حصے کی حیثیت محض تقریبی ہے اس لئے فاضل مترجم اس جامع نہ بنا سکے' بہرحال چونکہ اصل فارسی ڈرامہ جامعہ لکھنئو کے نصاب میں شریک ہے' اس لئے یہ مقدمہ ڈرامہ کی تقابل تاریخ کے لحاظ سے طلبا کے لئے ضرور مفید ہوگا—

اصل ڈرامہ کی زیادہ دلچسپ نہیں ہے' لیکن اس حیثیت سے کہ اس میں معاشرتی حالات سے بحث کی گئی ہے سبق آموز ضرور ہے' ویسے بھی فارسی ڈرامے باعتبار فن ابھی کچھ زیادہ ترقی نہیں کی ہے' مستثر وطہ کا زمانہ تو ادب عالیہ کی اس صنف کچھ ایک بھی ایسی مثال پیش نہیں کرسکتا جسے حقیقی معنوں میں ڈرامہ کہ سکیں کچھ ترجمے البتہ قابل قدر ہیں جیسے انگریزی کے ہنری دی فورتھ کا' یا فرانسیسی ڈرامہ نویس موتیر کے پہل LiemMalade Imaginnaire کا ترجمہ طبیب اخبار زیر تبصرہ ڈرامہ واقعہ نگاری کی حیثیت سے اچھا ہے' لیکن سیرت نگاری کے اعتبار سے کچھ نہیں' ترجمہ کے علاوہ کتاب کے آخر میں بھی مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ لگادی گئی ہے' جس سے یہ ڈراما طلبا کے لئے کافی طور پر آسان اور مفید ہوگیا ہے' اہل ذوق حضرات جنہیں فارسی ڈراموں کا رنگ دیکھنا ہو' اور طلبا جنہیں مصطلحات جدیدہ کے جاننے کی ضرورت ہو' اس کو ضرور مفید پائیں گے' کتاب ۵ جز کی ہے' لکھائی ہے' چھپائی' کاغذ سب کچھ اچھا ہے قیمت ایک روپیہ چارآنہ "آسی پریس - محمود نگر' لکھنئو" سے مل سکتی ہے—

(و)

———:O:———

شہاب کی سر گزشت

یہ افسانہ مولانا نیاز فتح پوری کی تازہ ترین تصنیف ہے' پہلے مسلسل ان کے رسالے نگار میں شایع ہوتا رہا' اور اب دفتر نگار کی طرف سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے —

افسوس ہے کہ اس افسانہ میں ہمیں پلاٹ کی کوئی ایسی خوبی نظر نہیں

آتی جس کی مولانا نیاز جیسے کہنہ مشق اہل قلم سے توقع ہو سکتی تھی - سوائے تقریروں یا خطوں کے اس کتاب میں کچھ نہیں ہے ' اور اگر ان حصوں کو حذف کردیا جائے جو برائے نام ربط قائم رکھنے کے لئے جابجا داخل کردیے گئے ہیں تو اس کو افسانہ کو شہاب کی سرگزشت کے بدلے " تین تعلیم یافتہ دوستوں کی مکالمت " کہا جاسکتا ہے —

اس افسانہ کے سرورق پر یہ لکھا ہوا دیکھکر کہ یہ اردو زبان کا پہلا افسانہ ہے جو تحلیل نفسی کے اصول پر لکھا گیا ہے " ہمارے شوق کی کوئی حد نہ رہی تھی ' اس لئے کہ ہندوستان تو ایک طرف خود انگلستان حتیٰ کہ جرمنی اور آسٹریا میں بھی جو تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کے موجد ہیں ' کسی نے اس اصول پر افسانہ نگاری کی ہمت نہیں کی ' لیکن تحلیل نفسی کے اصول تو درکنار ' ہمیں تو اس کتاب میں کوئی خاص بات ایسی بھی نظر نہیں آئی کہ جس کی بنا پر اسے نفسیاتی افسانہ (psychological novel) کہا جا سکے ' اس تعریفی جملہ کو استعمال نہ کیا جاتا تو اچھا تھا ' ہم نے پوری کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا لیکن ہمیں تو اس میں کہیں بھی اشارۃً یا کنایتاً کی " تحت - شعوری یا غیر شعوری " کا شائبہ نظر نہ آیا —

کتاب میں شہاب کی سیرت کو عجیب و غریب انداز سے پیش کیا گیا ہے - وہ ایک فلسفی ہے ' لیکن ایسا فلسفی کہ جس کی نظیر آج تک نہیں پیدا ہوئی اگر فلسفی کا تصور جناب مصنف کے ذہن میں یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو مروجہ اصولوں کے خلاف عمل کرے ' اور مروجہ خیالات کی مخالفت کرے ' فلسفی ہے تو ممکن ہے کہ شہاب بھی فلسفی ہو ' ورنہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس کی ہر گفتگو بتلاتی ہے کہ وہ اس نو جوان گریجویٹ طبقہ کا ایک ذہین فرد ہے جو فلسفہ کی دو چار درسی کتابیں پڑھکر ہر چیز کو فلسفیانہ طرز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اپنے مخاطبوں کے ہر قول کو اُلٹ دیتا ہے اور ہر رائج الوقت خیال یا رائے کی مخالفت کرتا ہے غرض سیرت نگاری میں مصنف کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے —

افسانے کی زبان کے متعلق تو کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں ہے ' صرف اتنا کہدینا کافی ہوگا کہ ہمارے ملک میں آئے دن جو گوہر فشانیاں ادب لطیف کے نام سے کی جاتی ہیں ' اس کا بہترین نمونہ ہے ' وہی الجھے ہوئے ' عربی آمیز ' انگریزی نما جملے ' وہی غیر مانوس ترکیبیں ' چند مثالیں ملاحظہ ہوں -

" میں اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے پوچھتا ہوں اب
یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں شادی سے انکار کروں " —

"یہ صبح و شام اپنے صحیح فرائض زندگی کو بھول کر گھنٹوں تک سنوارنے والیاں' یہ اپنے بے باک تبسموں' اپنی دلبر نگاہوں' اور اپنی چڑی و شوخ چتونوں سے دنیا کو مالوف کرلینے کی آرزو رکھتے ہوئے خود کسی سے محبت نہ کرسکنے والیاں"......

"تبسموں کی روشنی اور ہلکے ہلکے قہقہوں کی آواز سے مقاموں میں ایک موسیقی درخشاں دوڑ رہی تھی"

"میری فرصت تمہیں مخاطب کرنے کے لئے' یا تمہاری کسی تحریر کا جواب دینے کے لئے بہت تنگ نظر آتی ہے" -

---

اس وقت ہا اپنی سفید ساری میں خاص محویت کے عالم میں سمندر کے اندر ہلکے ہلکے ہچکولے لینے والے جہازوں کو دیکھ رہی تھی" ہم نے لفظوں پر خط کھینچ دیا ہے' انگریزی میں In her white sari کہہ سکتے ہیں لیکن اس جملہ میں لفظ "جلوس" کی سخت ضرورت ہے ورنہ سطر وف نہایت مضحکہ خیز ہو جاتا ہے' —
"جس وقت اس پر دوسرے دن کا آفتاب طلوع ہوا" یہ بھی انگریزی عبارت کی نقل ہے' اور کسم از کسم ہمیں خوش نہیں آتی- ایسی مثالیں بے شمار ہیں- چند ترکیبیں ملاحظہ ہوں—
لرزہ مسکرہم' ارتعاش ملتجی' سیلاب خندہ' تابناک اضطراب' —
"سینہ کی مثلث عریانی جو بلاؤز کی تراش کا نتیجہ ہے
"ملتہب تمنائیں" —

کاش فاضل مصنف اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ ٹیگور کے تصوفانہ گیتوں کے لئے جو زبان موزوں ہے وہ ہر جگہ بھلی نہیں ہوتی' اگر چندے یہی حالت رہی تو "ادب لطیف وہی" مسلخ شکل اختیار کرلے گا جو فرانس میں مذہب پارناسیت (Parnassianism) نے اختیار کی تھی' اور خدا معلوم اس سے اردو کو کیا صدمہ پونچے-

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
ستائیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

مولانا نیاز کی علمی قابلیت سے کسی کو انکار نہیں' کاش وہ اپنے صحیح راستوں

پر لے لائین۔ لڈی کے زور کی طرح قلم کا زور بھی صرف رخ کے پھیر سے مضر یا مفید ہو جاتا ہے'—

کتاب معمولی کاغذ پر چھپی ہے' دفتر نگار بھوپال سے ا روپیہ میں مل سکتی ہے — (و)

———:O:———

تاریخ

اسلامی خلافت کارنامہ حصہ اول

مرتبہ مولانا محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی

اردو زبان میں جتنی تاریخی کتابیں لکھی گئی ہیں یا لکھی جاری ہیں ان میں بہت زیادہ خامیاں نظر آتی ہیں تحقیق سے بہت کم کام لیا جاتا ہے لیکن چند کتابیں ایسی ہیں جو معیار پر پوری اترتی ہیں ان کتابوں میں سے یہ ایک کتاب ہے جس میں موجودہ یوروپی مورخین کا رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ مولف نے اپنی تالیف میں اسلام سے قبل دنیا کے مختلف مذاہب اوضاع و اخلاق پر مختصر بحث کی ہے اور ان کے مذہبی و اخلاقی عروج و زوال کو ظاہر کیا ہے کہیں کہیں نسل کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے اس بیان میں محنت و کاوش سے کام لیا گیا ہے مختلف انگریزی۔ عربی اور فارسی کتابوں کے حوالے دئے ہیں جہاں کہیں واقعات مشتبہ ہیں ان میں تصدیق بھی طلب کی گئی ہے۔ مولف نے مختلف اسناد دیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام سے پہلے تمام دنیا تاریکی و ظلمات سے گری ہوئی تھی۔ تہذیب بر اعظم قعرمذلت میں پڑے ہوے تھے اور راہ راست سے بھٹک چکے تھے اس لئے انسان کی اصلاح کے لئے ایک رہبر کی ضرورت تھی۔ کتاب پر ایک گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مولف نے منشائے نظر ضرورت بعثی قرار دیکر مختلف واقعات کو یکجا کیا ہے اور ان سب سے ایک ہی نتیجہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو واقعات ان کے مقصد کے موافق ہیں وہ لے لئے گئے ہیں اور جو مخالف ہیں ان کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے' اور واقعات کی ترتیب غیر فطری اور غیر ارتقائی ہوگئی ہے—

دوسری تاریخوں میں ہمیں ایک نقص بہت عیاں نظر آتا ہے یعنی

قدیم تواریخ کے حوالے غلط دے جاتے ہیں فاضل مولف نے اس کتاب میں قدیم تاریخوں میں سے اکثر حوالے دے ہیں اور ان میں بیشتر درست ہیں لیکن کئی جگہہ غلطیاں کی ہیں جن میں سے ہم صرف چند پیش کرتے ہیں— ملاحظہ ہو

صفحہ ۱۵ "عیسوی صدی سے تقریباً دو ہزار برس پہلے جب کہ تمام یورپ
کس میرسی کی حالت میں پڑا ہوا تھا اس زمانے میں اس بر اعظم میں
یونانی قوم کا ستارہ عروج پر تھا"—

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یونانی تہذیب کی ابتدا تو سنہ ۷۵۳ ق م کے بعد ہوئی ہے جب انہوں نے (Theseus تھیس کی سرکردگی میں قریطش کی سیادت کا جوا اتار پھینکا تھا—

صفحہ ۳۵ "اندلس میں پہلے آئی بیری اور لگوائی اور اس کے بعد یہاں فینیقی آے اور
پھر یونانی اور پھر قرطاجنی' یونانیوں نے ہسپانیہ پر کب قبضہ کیا تاریخ
تو اس قبضہ کے متعلق بالکل خاموش ہے۔یونان کا صرف ایک جرنیل
اسکندر تھا (اسکندر اعظم کے عزیزوں میں سے تھا) جس نے جزیرہ صقلیہ کا
رخ کیا تھا۔وہ ہسپانیہ تک نہیں پہنچا"—

صفحہ ۸۷ "کارتھیجیا یا قرطاجنہ کی قدیم سلطنت جو افریقہ میں تھی اس کے رہنے
والے لوگ بھی حسام ہی کی نسل میں ہوں گے جو اس افریقہ کی پرانی
عظیم الشان سلطنت کے بانی تھے—"

قرطاجنہ کی تاریخ تو بالکل صاف ہے اس سلطنت کی بنیاد اس فینیقی امیر جماعت نے ڈالی تھی جو صور [Tyre] کی عوامی تحریک سے بھاگ کر افریقہ کو چلی آئی تھی اس لئے قرطاجنی سامی نسل میں سے ہیں کیونکہ فینیقی بھی بابل کے قریبی علاقوں میں سے آئے تھے—

فاضل مولف نے ایران کے افسانوں کو بالکل تاریخ کی حیثیت دی ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ تاریخی واقعات کی بیخ و بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا ہے—

صفحہ ۱۲۴ ساکیامنی کی پیدائش کی تاریخ سنہ ۶۸۸ ق م مقرر کی گئی ہے اور
تاریخ وفات سنہ ۵۵۰ ق م مقرر کی ہے حالانکہ جدید تاریخی تحقیق سے
یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ بدھ کی تاریخ پیدائش سنہ ۵۶۸ ق م
ہے اور تاریخ وفات ۴۸۸ ق م ہے۔یہ تاریخیں غالباً مہاویر کے متعلق
ہوں لیکن تاریخ پیدائش پھر بھی غلط ہوگی—

صفحہ ۱۵۰ "پانچویں صدی قبل مسیح میں اس ظالم جابر اور مشرک سلطنت
(بابل تہذیب ثانی) کا ایرانیوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ

ہو گیا"—

بابل کا شہر سنہ ۵۳۸ ق م میں ایشسرو کے ہاتھوں فتح ہوا نہ کہ پانچویں صدی میں—

صفحہ ۱۵۴ "یمن کے بادشاہ ابرھہ الاشرم نے ہاتھیوں کی فوج لے کر مکہ مکرمہ پر خانۂ کعبہ کو ڈھا دینے کی غرض سے چڑھائی کی تھی"—

ابرھہ یمن کا بادشاہ نہ تھا بلکہ نجاشی کی طرف سے حاکم یمن تھا جس نے پہلے حاکم اریاط کو قتل کرکے نجاشی سے وہاں کی حکومت کا پروانہ حاصل کیا تھا—

صفحہ ۱۹۵ "سنہ ۷۰ ق م میں یونانیوں نے حملہ کرکے اس جدید یہودی سلطنت کو نیست و نابود کر دیا"—

اس وقت یونانیوں میں کونسی قوت موجود تھی جو وہ بیت المقدس پر حملہ کرتے۔ سنہ اور اس کے بعد پامپی نے سنہ ۷۸ ق م سے پہلے ہی ان کی سلطنت کا قریب قریب خاتمہ کر دیا تھا۔ متھری ڈیٹس [Mithridates] باقی رہ گیا تھا اس کا بھی چند ہی سالوں میں خاتمہ ہوگیا—

کہیں کہیں مولف نے جغرافئی غلطیاں کی ہیں۔ ملاحظہ ہو

صفحہ ۱۳۸ "عرب کے شمال میں ایلائے سویز۔ جنوب میں دریائے فرات"—

اگر یہ ہے تو کیا شداد کے زمانے میں صبا اور عدن اسی دریا پر آباد کئے گئے تھے؟—

ایک جگہ انوکھا نظریہ قایم کیا ہے اور اس میں کوئی دلیل یا سند پیش نہیں کی—

صفحہ ۱۰ "لا مذھب أصول کے لوگ اخلاقی یا کسی انتظامی قانون کی پابندی کے واسطے اپنے کو مجبور خیال نہیں کرتے تھے"—

اس سے غالباً مولف کے نشانہ ملامت ایپی کیورین ہیں یہ لوگ فی الحقیقت ایسے نہیں تھے جیسا کہ ان کو بیان کیا گیا ہے۔ ایپی کیورس کا فلسفہ یقیناً دہریت کی تعلیم دیتا تھا لیکن اخلاق کے متعلق اس نے نہایت سخت فلسفہ قائم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی سب کوششوں کا مطمح نظر راحت ہے اور اسی مطلب کے لئے تمام نیکی عمل میں آتی ہے۔ نیز اس کا قول ہے کہ ہمیں شہوانی لذتوں سے بچ کر حقیقی مسرت کے لئے کوشش کرنی چاہئے—

کتاب میں نقائص ضرور ہیں لیکن پھر بھی موجودہ اسلامی تاریخوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور اس میں ہمیں مستند تاریخ کا

رنگ نظر آتا ہے۔ مولف اس ترتیب کے لئے مستحق مبارک باد ہیں۔

چھپائی عمدہ ہے کاغذ اچھا ہے۔ کتاب مذکور محمدی پریس علی گڑھ سے ایک روپیہ آٹھ آنہ میں مل سکتی ہے —

(ا)

———:o:———

ثانی اثنین، ذوالنورین، ابوالحسنین

یہ مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر کے تین لکچر ہیں جو انہوں نے لکھنو میں ایک منتخب مجمع کے سامنے پڑھے تھے۔ پہلے لکچر میں حضرت ابوبکر صدیق دوسرے میں حضرت عثمان غنی اور تیسرے میں حضرت علی کے حالات ہیں تاریخی حیثیت سے یہ لکچر خاص وقعت رکھتے ہیں۔ اُس زمانے کے حالات اور واقعات بہت وضاحت، صفائی اور تاریخی تنقید کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جس تاریخ کا لگاؤ مذہب سے آ پڑتا ہے وہاں مورخ کو بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ذاتی خیالات یا عام تعصبات کی وجہ سے حالات و واقعات کو یا تو اصلی حالت میں بے لاگ طریقہ سے نہیں دکھایا جاتا یا ان کی توجیہ یا تاویل کرنی پڑتی ہے۔ مولانا شرر کے یہ لکچر اس سے بالکل پاک ہیں۔ صحابۂ رسول اللہ اور خصوصاً خلفائے راشدہ اُن نفوس میں سے ہیں جن کے کارنامے دنیا میں ہمیشہ عزت و احترام سے دیکھے جائیں گے۔ لیکن آخر وہ انسان تھے اور اس لئے مورخ کو ان کے حالات اسی نظر سے دیکھنے چاہئیں۔ مولانا شرر نے نہایت صفائی اور آزادی سے واقعات کی تنقید کی ہے اور اپنی رائے کے اظہار میں کہیں تامل نہیں کیا ہے۔ اگرچہ یہ رسالے حجم میں کچھ زیادہ نہیں لیکن اُن کے پڑھنے سے ایسی بصیرت ہوتی ہے جو بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہوتی۔ اس قسم کی تحریریں ملک کے لئے نہایت مفید ہیں۔ ان سے لوگ بہت سے حالات و واقعات پر آسانی سے عبور کرسکتے ہیں اور بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جاتی ہیں۔ جو صاحب آنحضرت (صلعم) کے بعد کے حالات پڑھنا چاہتے ہیں اور خلفائے راشدہ کی سیرت اور اُن کے واقعات سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں یہ لکچر ضرور مطالعہ کرنے چاہئیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان سے اُنہیں ضرور فائدہ ہو گا—

———:o:———

سیر الصحابہ

مسلمانوں کے لئے یہ کچھ کم موجب فخر نہیں ہے کہ انہوں نے تاریخ نویسی میں وہ ملکہ حاصل کیا جو اس سے پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھا۔ انہوں نے تاریخ کو فسانے کے دائرہ سے نکال کر فن کی حیثیت تک پہنچا دیا۔ اسلام کے پہلے ہی دور میں مذہبی تحفظ کے خیال سے روایات کی تحقیق، راویوں کی تنقید تنقید کے اصول مرتب ہوئے، رجال حدیث کے حالات قلم بند کئے گئے۔ تصنیفات و تالیفات کے دور اور طبقے قائم ہوئے۔ غرض اس طرح فن رجال و اسانید کے دفتر تیار ہو گئے جس کی روشنی میں ہر مورخ تاریخ نگاری کا صحیح راستہ تلاش کر سکتا ہے اور اسلامی سیرۃ نگار جو ائمہ خلفاء یا مشاہیر اسلام کی سیرت لکھنی چاہتا ہو اس کے لئے تو یہ سڑک بالکل خس و خاشاک سے پاک ہے —

مولانا سعید انصاری نے جو اس کتاب کے مصنف ہیں اردو میں تمام صحابہ کی سیرت اور اُن کے حالات لکھنے کا بیڑہ اٹھایا ہے جو حقیقت میں بڑا کام ہے یہ کتاب اس کی پہلی قسط ہے۔ اس میں پہلے ایک مقدمہ ہے۔ مقدمہ میں اُن جلیل القدر فقہائے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا ذکر ہے جن کے ذریعہ سے علوم نبوی کی نشر و اشاعت ہوئی اور جو روایات اسلامی کی مستحکم عمارت کے لئے بمنزلہ سنگ بنیاد اور فن رجال و اسانید کے لئے ایک سر چشمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر مصنفین سیر و تاریخ متعدد ہیں اور ان کی تصنیفوں پر کچھ تنقید کی ہے اسی سلسلہ میں ایک عنوان "کتب رجال کے نقائص" کا قایم کر کے لکھا ہے کہ "اسلام کا اصل الاصول قرآن مجید، عمل متواتر، احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ ہے لیکن رجال کی کتابوں میں متعدد روایتیں اُن کے خلاف ملتی ہیں" "اور اکثر مصنفین نے تو جرح و نقد کی زحمت بھی گوارا نہیں کی" ہم کو حیرت ہے کہ کتب رجال جن کی غایت محض جرح و تعدیل ہے ان میں اس قسم کی روایتوں کا کیونکر دخل ہو سکتا ہے۔ اچھی بری روایتوں کا میدان تو حدیث کی کتابیں ہیں۔ تعجب ہے کہ کتب رجال اور کتب حدیث کا فرق و امتیاز پیش نظر نہ رکھا گیا۔ بہر حال لایق مصنف نے پہلا نقص نص قرآنی کی مخالفت کا بیان کیا ہے جس سے اصولاً کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن اس کے نظائر میں جو سماع موتی، آنحضرت کی امیت، نکاح، متعہ وغیرہ کی روایتوں کو پیش کیا ہے اس میں بہت کچھ کلام کی گنجایش ہے اس لئے کہ اُن میں باہمی توفیق و تطبیق بآسانی ممکن ہے۔ اسی تصادم کے سلسلہ میں مصنف نے قرأت، خلف الامام اور

رفع یدین کی حدیثوں پر لمبی چوڑی بحث کر کے صحیح بخاری اور صحاح کے راویوں پر لے دے کرنے میں پوری طاقت صرف کر دی ہے۔ ہماری رائے میں ایک سیرۃ کی کتاب ایسے اخلافی مسائل اور اجتہاد کی بحثوں سے بالکل علیحدہ رہنی چاہئے۔ روایت اور درایت کی بحث میں مصنف نے محدثین کے بیان کئے ہوئے اصول بتا کر لکھا ہے کہ "محدثین نے بے شبہ ان اصول سے احادیث کے نقد میں کام لیا ہے لیکن ان ہی لوگوں نے اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اس کا یہ اثر ہوا کہ آج کتب رجال میں جو بے سر و پا باتیں ملتی ہیں وہ اسی غلطی کا نتیجہ ہیں"—

اگر یہ صحیح ہے تو بظاہر ان جملوں کا مفہوم اور کیا ہوسکتا ہے کہ رجال کی کتابیں جو روایات کے پرکھنے کا واحد ذریعہ ہیں' بے اعتباری کی آگ میں جھونک دی جائیں—

اسی ضمن میں مصنف نے روایتوں پر حکومت کے اثرات' کا سلسلہ چھیڑ دیا ہے اور نظیر میں واقعہ حرہ کی روایت کو پیش کرکے مجاہد پر جو دور اول کے مشہور مفسر ہیں معترض اس لئے کہ اُن کے قلم سے اہل مدینہ کے متعلق لمداہنتہم کا لفظ نکل گیا ہے' یہ طعن کیا ہے کہ " یزید کی سیہ کاریوں کی داد دینے کا طریقہ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ تمام صحابہ' تابعین اور تبع تابعین کو مداہن کہا جائے "—

مجاہد کے اصل الفاظ یہ ہیں وبعث یزید الی اہل المدینۃ عشرین الفا فاباحوا المدینۃ ثلاثا یصنعون ماشاء والمداہنتہم—

ہماری رائے میں تو مجاہد نے کوئی بیجا بات نہیں کہی۔اگر سیاسی امور میں مدینہ والے مداہنت اختیار نہ کرتے اور ابتداہی سے جس چیز کے وہ دل سے مخالف تھے اس کے لئے کچھ بھی ہاتھ پاؤں ہلاتے تو کیا عجب تھا کہ سیاست کی بساط پر کوئی ایسی چال پیدا ہوجاتی کہ یوں بنی ہاشم کو شہ مات نہ ہوتی اور اسلام کے اتنے مہرے جلد اور آسانی سے نہ پٹتے اور اشراف مدینہ پر یہ مصیبت نہ آتی۔علاوہ اس کے مجاہد کے لفظ " لمداہنتہم " کا دامن اس قدر دراز کیوں ہوگیا جس کے لپیٹ میں تمام صحابہ' تابعین اور تبع تابعین آگئے—

اس کے بعد اسی تیر کا نشانہ حسن بصری رحمۃاللہ علیہ کو بنایا ہے۔لکھتے ہیں کہ " حسن بصری ربیع بن زیاد والئی خراسان کے دفتر میں کام کرچکے تھے جو امیر معویہ کا نائب تھا اس لئے اس نمک خواری کا اثر دیکھو کہ وہ محمد بن ابی بکر کو فاسق بن ابی بکر کے نام سے یاد کیا کرتے تھے " پھر لکھتے ہیں کہ " جانتے ہو؟ یہ

فاسق کیوں تھا؟ محمد بن ابو بکر جو رسول اللہ کے صحابی ' حضرت ابوبکر کے فرزند اور حضرت علی کے آغوش پروردہ تھے - حضرت علی ان کی مدح کرتے اور فضیلت دیتے تھے" —

یہ شبہ وہ ابوبکر کے بیٹے ' اور شاید وہ مولانا کی تحقیق جدید کی رو سے صحابی بھی ہوں مگر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ حسن بصری رح کے خیال میں وہ اپنے مشہور عمل غیر صالح اور نالائق کرتوتوں کی وجہ سے اہل ابی بکر نہیں بلکہ اہل فسق میں شمار ہونے کے مستحق ہوں - ہمارے خیال میں تو اگر سرے ہی سے اس روایت ہی کو یہ اصل ٹھہرا دیا جائے تو بہت اچھا ہو کیوں کہ صوفیانہ درایت کے لحاظ سے ہم کیوں کر معدوم سمجھیں کہ حضرت حسن بصری نے اپنے پیر و مرشد خاتم الولایت مولانا علی علیہ السلام کے ممدوح اور آغوش پروردہ کی نسبت ایسا لفظ زبان سے نکالا ہوگا - حقیقت یہ ہے کہ مشاجرات صحابہ اور تابعین میں اس قسم کے ظن و تخمین سے کام لے کر جادۂ اعتدال پر قائم رہنا بہت کٹھن اور دشوار ہے —

روایت بالمعنی کی بحث میں آپ لکھتے ہیں کہ " حضرت عایشہ ' ابوہریرہ ' عبداللہ بن عباس ' ابوسعید خذری ' جابر ' عبداللہ بن عمر ' عمرو بن العاص روایت باللفظ نہ کرتے تھے بلکہ صرف مطالب ادا کیا کرتے تھے " - اس التزام کے ثبوت میں اِن حضرات کے اقرار و قبال کا حوالہ پیش کرنا ضروری تھا —

مقدمہ کے بعد مصنف نے مہاجرین اولین کے کچھ مناقب ' قرآن و حدیث سے بیان کرکے شخصوں کی سیرت لکھنی شروع کر دی ہے اور چونکہ مصنف کا خیال ہے کہ تاریخ کی کتابیں ماخذ کے لحاظ سے زیادہ بلند رتبہ نہیں ہوتیں اور صحابہ کے حالات تاریخ سے زیادہ احادیث میں موجود ہیں اور صحت کے اعتبار سے پایہ بھی احادیث کا تاریخ سے بڑھا ہوا ہے اس لئے مصنف نے احادیث صحیحہ کو پیش نظر رکھا ہے اور سب سے زیادہ مستند کتاب ' صحیح بخاری سے واقعات زیادہ تر انتخاب کئے ہیں اور اصل موضوع کے لحاظ سے یہی ایک خصوصیت ' اس کتاب کے صحت و اعتبار کے لئے کافی ضمانت ہے —

(منظور)

——:o:——

تاریخ القران

اس کتاب کے مصنف مولوی مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی نے بڑی جانکاہی اور مصلحت شائد اٹھاکر ان شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے جو بعض

رطب ویابس احادیث اور آثار کی بنا پر قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے متعلق پیدا ہوسکتے ہیں، مثلاً اس قسم کی روائتیں کہ "قرآن آنحضرت صلعم کی زندگی میں کتابی طریقہ پر ایک جا جمع نہیں ہوا تھا، خلیفہ اول نے جمع کرایا۔ یا یہ کہ "قرآن کی بعض سورتیں بہت بڑی تھیں وہ مختصر کرادی گئیں یا یہ کہ خلیفہ اول کے عہد میں بعض آیتیں لکھنے سے رہ گئیں تھیں خلیفہ سوم کے وقت میں لکھی گئیں" یا یہ کہ "قرآن کی آخری دو سورتیں یعنی معوذتین عبداللہ بن مسعود کے نزدیک قرآن میں داخل نہیں یا یہ کہ قرآن کی موجودہ ترتیب ابی ابن کعب اور حضرت علی کے قرآن کی ترتیب کے خلاف ہے"۔

لائق مصنف نے ان تمام احادیث و آثار پر بحیثیت روایت و درایت بحث و تنقید کر کے انکو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے اور اُن کے مقابلے میں وہ صحیح روایتیں اور محققانہ اقوال پیش کئے ہیں اور اُن تمام گرد و پیش کے حالات کو پیش نظر رکھکر یہ ثابت کردیا ہے کہ عہد نبوی ہی میں قرآن نے بحیثیت کلام الہی اور دستورالعمل اسلام ہونے کے ہر مسلمان کے قلب و دماغ میں جگہ کرلی تھی، ہر زبان پر اُس کا ذکر تھا۔ نمازوں میں اس کی قرآت اور اوراد میں اس کی تلاوت تھی، نماز کی امامت میں اس کی شرط تھی۔ فوجی عہدوں کے تقرر میں خاص طور پر اس کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ عہد نبوت میں نہ صرف قرآن کے حافظ ہی بہت سے تھے بلکہ ایسے صحابہ بھی موجود تھے جنھوں نے پورے قرآن کو ایک جا لکھا اور جمع کیا جیسے ابوالدرداء، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، عبادہ بن صامت وغیرہ۔

مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس زمانہ میں سامان کتابت وغیرہ بھی موجود تھا، اُس وقت بجائے موجودہ کاغذ کے حریر اور باریک جھلی پر کتابت ہوتی تھی۔ لکھنے والوں کی بھی اسوقت میں کمی نہ تھی چنانچہ صرف قریش میں (۱۷) کاتب تھے اور آنحضرت صلعم نے مدینہ میں چونکہ باضابطہ کتابت کی تعلیم کا انتظام فرمایا تھا بہت سے لوگ لکھنا سیکھ گئے تھے۔ ان لوگوں میں جن سے پیغمبر صاحب وحی وغیرہ کے لکھنے پڑھنے کا کام لیتے تھے ان کی تعداد (۴۲) تھی۔ بہر حال مصنف نے اس بات کو بخوبی ثابت کر دیا کہ قرآن مجید قرن اول میں اوراق و صحایف پر تمام و کمال لکھا اور جمع کیا گیا اور اس کے نشر و اشاعت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ عہد عمری میں ہزارہا نسخے قرآن مجید کے لوگوں کے پاس موجود تھے۔

پس قرآن کے اس تواتر اور توارث عملی کے مقابلہ میں کوئی خبر واحد خواہ وہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو کسی طرح قابل لحاظ اور لائق اعتبار

نہیں ہوسکتی"—

اس رسالہ میں کلمات کی بعض غلطیاں ایسی رہگئی ہیں جن سے کہیں کہیں مطلب خبط ہوجاتا ہے—

(منظور)

متفرق

مینا بازار

یہ مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر کا نیا تاریخی ناول ہے۔ مولانا کے اکثر ناول تاریخی ہیں اور ان سے اردو داں طبقے میں تاریخ کا عجیب شوق پیدا ہوگیا ہے۔ اگرچہ اس ناول سے مولانا شرر کے کمال کا اندازہ نہیں ہوسکتا لیکن مینا بازار کا جو نقشہ انہوں نے کھینچا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے—

دلگداز پریس لکھنؤ سے ایک روپیہ میں مل سکتا ہے۔

تفریح دل

حاجی خطیب قادر بادشاہ صاحب المتخلص بہ بادشاہ مرحوم رئیس وانمباڑی (علاقہ مدراس) نے اپنی فرصت کے وقت میں کچھ لطائف مختلف قسم کے جمع کئے تھے وہ اب ان کے فرزند خطیب محمد عبدالرشید صاحب نے ایک رسالے کی صورت میں طبع کرکے شائع کرادئے ہیں۔ دل بہلانے کی اچھی چیز ہے۔ مگر کوئی خاص بات نہیں۔ قیمت ۲ آنہ خطیب محمد عبدالرشید نمبر۷۸ گوڈون اسٹریٹ مدراس سے مل سکتی ہے—

سراج المنیر (حصۂ چہارم)

یہ حافظ ظہیرالدین احمد صدیقی سندیلوی منیر' بیرسٹر ایٹ لا کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں نعتیہ' صوفیانہ اور عاشقانہ سب قسم کی نظمیں

ہیں- کلام صاف ستھرا ہے اور حضرت ساہر کی طبیعت میں لگاؤ اور سوز ہے- معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ان کے کلام کے تین حصے شایع ہوچکے ہیں' یہ چوتھا حصہ ہے سید محمد عبدالوحید رضوی ملصرم ریاست سروہی (راجپوتانہ) سے آٹھ آنے میں مل سکتا ہے—

———:o:———

بہارستان

سدرشن صاحب کے قصے اور ناول اس سے پہلے ملک میں شایع اور مقبول ہوچکے ہیں-اور ان میں سے بعض پر اس رسالے میں تبصرہ بھی ہو چکا ہے-یہ ان کی کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے- جس میں پندرہ چھوٹے چھوٹے قصے اور ایک مختصر ڈراما ہے سدرشن صاحب کو مختصر قصے لکھنے کا بہت ہی اچھا سلیقہ ہے- اس مجموعے میں بعض قصے بہت پر درد اور دلچسپ ہیں-اور ان میں قابل مولف نے انسانی فطرت کے بعض راز اس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ پڑھ کر جی خوش ہوتا ہے-انہوں نے صرف دلچسپی اور تفریح ہی کا سامان جمع نہیں کیا بلکہ ان کے مطالعے سے اخلاقی سبق بھی حاصل ہوتے ہیں-ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ سدرشن صاحب اپنے فن میں ترقی کر رہے ہیں اور اپنے قلم سے ملک کو فائدہ پہنچا رہے ہیں- اس فن میں انہوں نے ملک کے نامور قصہ نویس منشی پریم چند کی تقلید کی ہے جنہوں نے بہارستان پر ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے—

کتاب مجلد چھوٹی تقطیع پر ۳۲۷ صفحے کی ہے- قیمت ایک روپیہ چودہ آنے ہے رام کتھا بک ڈپو' لاہور سے مل سکتی ہے—

———:o:———

سفر نامۂ مظہری

یہ حاجی مظہرعلوم انصاری مرحوم کا سفرنامہ ہے جو اُن کے بڑے بھائی مولوی محمد حلیم صاحب انصاری نے اپنے عزیز بھائی کی وفات کے بعد اُن کے روز نامچوں وغیرہ سے مرتب کرکے شایع کیا ہے—

مرحوم کی زندگی عجیب و غریب تھی- ہمیشہ چلتے پھرتے اور کام کرتے گزری- دل میں سیاحت اور آزادی کی امنگ تھی، ایک جگہ بیٹھ کر پابندی کے ساتھ کام کرنے سے طبیعت اکتاتی تھی- اس لئے چند روز ملازمت کرکے اسے ترک کردیا تجارت کی طرف توجہ کی- ایسی تجارت نہیں کہ جسمیں دکان جماکر بیٹھنا

پڑے بلکہ مال لیکر شہر شہر پھرتے اور نہادانہ نہایانی کھاتے پیتے اور کاروبار کرتے چلے جاتے تھے۔ لیکن ایک مدت بعد یہ مشغلہ بھی چھوٹ گیا، اور رسالہ مخزن میں ملازمت کی۔ یہاں بھی اُن سے زیادہ تر چلتے پھرنے ہی کا کام متعلق تھا۔ مخزن کو ان کی وجہ سے بڑی رونق ہوئی اور اس رسالہ کی مقبولیت اور عروج میں مرحوم کا بھی حصہ ہے۔ اس کے بعد مرحوم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ملبر ہوگئے اور کچھ عرصہ کے بعد انجمن ترقی اردو کے سفارت اختیار کی یہ میدان اُن کے لئے بہت وسیع تھا۔ خوب کام کیا۔ ہرملش اور ہر قماش کے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہرملت اور ہرقوم کے لوگوں سے صحبت رہی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مردم شناس بھی تھے اور زمانہ شناس بھی۔ بعض ایسے ایسے لوگوں سے انہوں نے قومی کاموں کے لئے چندے وصول کئے جو آن کو جان پر اور جان کو مال پر قربان کردیتے ہیں۔ وہ بہت بے تکلف زندہ دل اور بے لاگ آدمی تھے۔ جہاں جاتے لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیتے اور اس لئے ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس سفرنامے میں جہاں جہاں وہ پہنچے ہیں اور جس جس سے ملے ہیں سب کا حال بے کم و کاست بیان کردیا ہے۔ ہرمقام کے آثار قدیمہ، تاریخی حالات معاشرت، جن جن سے ملاقات ہوئی ہے اُن کی سیرت، مختصر مگر بہت سلیقے سے بیان کی ہے۔ جولوگ قومی کام کرنا چاہتے ہیں، یا جو ہندوستان کی سیاحت اس غرض سے کرنا چاہتے ہوں کہ وہ اپنے ملک کو صحیح طور سے سمجھیں، یا جو چاہتے ہوں کہ ایک سرگرم قومی سفیر کا کارنامہ پڑھیں تو انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔۔

(کتاب مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ناظم دینیات مسلم ہوسٹل یونیورسٹی الہ آباد سے دو روپیہ آٹھ آنے میں ملسکتی ہے۔ صفحات ۷۳۱ مجلد۔)

—:o:—

اردو کے جدید رسالے

—:o:—

نورس

جس طرح غلے اور میوے کی فصل ہوتی ہے یا شادیوں کا خاص موسم ہوتا ہے اسی طرح کتابوں کی بکری اور رسالوں کی اشاعت بھی فصلی ہونے لگی ہے۔

گزشتہ دو سال سے اردو زبان میں رسالوں کی ایسی بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی ہے
کہ ہر مہینے کوئی نہ کوئی نیا رسالہ نکل آتا ہے۔ اگرچہ بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر
ہی خوش ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اُن کی ناپائیداری سے دل کڑھتا بھی ہے۔ اب حال یہ
ہے کہ جہاں کسی کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہوا تو سب سے پہلے رسالہ نکالنے کا خیال
آتا ہے۔ پڑھنے والے کم اور اخبار اور رسالہ روز افزوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم
زمانے کے ہاتھوں پلنے پاتے ہیں اور سارا روپیہ، محنت اور جد و جہد رائگاں
جاتی ہے اور اس کا اثر اُن رسالوں پر بھی پڑتا ہے جن کی بقا ملک کے لئے ضروری ہے
لیکن ایڈیٹری کی ہوس مجبور کردیتی ہے اور ابتدا میں اس جوش کا روکنا ایسا
ہی مشکل ہے جیسے چڑھتے ہوئے دریا کا۔ اس کا نشہ دولت اور حکومت کے نشے سے
بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ جسے اس کا چسکا پڑ جاتا ہے پھر وہ کسی طرح چھڑائے نہیں
چھوٹتا۔ بعض اڈیٹر (جن میں سے بعض سے ہم ذاتی طور پر واقف ہیں) ایسے ہیں
کہ وہ دنیا کی ہر شے ترک کرنے پر آمادہ ہیں، مگر نہیں ترک کر سکتے تو رسالہ۔
البتہ ایسے رسالے جو کسی خاص مقصد سے نکلتے ہیں اور ملک یا کسی جماعت یا
خاص حصہ ملک کی حقیقی خدمت انجام دے رہے ہیں اُن کا جاری رکھنا
لازم ہے —

رسالہ نورس جو حال ہی میں اورنگ آباد کالج سے شایع ہوا ہے ایک خاص
مقصد مد نظر رکھتا ہے۔ اس کی غایت کالج کے طلبہ میں انشا پردازی اور ادب
کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ اس پہلے نمبر میں زیادہ تر مضامین طلبہ ہی کے
لکھے ہوئے ہیں۔ کالج کی عمر ابھی دو سال کی ہے اور اس لئے یہ نام بہت موزوں
ہے اور اس کا مقصد قابل تحسین ہے۔ کالج میں پڑھ کر ہر شخص عالم و فاضل نہیں
ہوسکتا، لیکن ایک تعلیم یافتہ شخص کے لئے یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو
شایستہ طریقے سے ادا کرسکے۔ اگر اس رسالے سے یہ مقصد حاصل ہوگیا تو سمجھنا چاہئے
کہ اس نے اپنا فرض ادا کردیا۔ شروع میں علمی خبریں ہیں جن کا جاننا طالب
علموں کے لئے بہت ضروری ہے۔ مضامین بھی دلچسپ اور مفید ہیں۔ آخر میں کالج
کا ذکر ہے اور اس کے مختلف شعبوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی تفصیل درج ہے
طلبہ کے لئے یہ بہت اچھی چیز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ کالج کے پروفیسر اور طلبہ اس کی
ترقی میں کوشش کریں گے اور اس کا ہر نمبر پہلے سے اچھا ہوگا —

انجمن ترقی اردو کے مطبع میں ٹائپ میں بہت صاف ستھرا چھپا ہے رسالہ
دو ماہی ہے اور سالانہ قیمت تین روپیہ —

———:o:———

قوس قزح

یہ بھی ایک نیا ماہواری رسالہ ہے جو محمد وحید گیلانی صاحب کی ادارت میں لاہور سے شایع ہوا ہے۔ اردو میں نئے نئے رسالے اس کثرت سے نکل رہے ہیں کہ ایڈیٹر کو اپنے رسالے کی تمہید یا مقصد بیان کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی اپنے قصور کی معذرت کرتا ہے یا خجالت رفع کرنے کے لئے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر ہمیں ایڈیٹر صاحب قوس قزح کا یہ ابتدائی جملہ بہت پسند آیا "جس حالت میں ملک میں ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہوار رسالے اس کثرت سے نکل رہے ہیں مجھ سے گمنام شخص کا ایک اور رسالہ جاری کر دینا بالکل بے حقیقت معلوم ہوتا ہے اور سوائے اس کے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ مجھے کوئی مفاد مد نظر ہو اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ یونہی سہی "مرگ انبوہ جشنے دارد" آپ بھی سمجھ لیں کہ جو مطمح نظر دوسرے رسائل کا ہوتا ہے وہی قوس قزح کا ہے"—

لیکن یہ جملہ عام بد گمانی کی وجہ سے قلم سے نکل گیا ہے ورنہ اُن کا ارادہ بہت بلند ہے "میرا عزم بالجزم ہے کہ قوس قزح میں ایسے نرالے، حیرت انگیز اور دلچسپ مضامین درج ہوا کریں گے جو کم سے کم پنجاب کے اور کسی اردو رسالے میں شایع نہیں ہوتے" یہ محض دعویٰ ہی نہیں بلکہ اس مقصد کے پورا کرنے میں انہوں نے ایک حد تک کوشش بھی کی ہے۔ شروع میں دنیا کے عجائبات اور دلچسپ معلومات کے تحت میں بہت سی کام کی اور دلچسپ باتیں جمع کر دی ہیں۔ افسانے بھی درج کئے گئے ہیں۔ ظرافت کی چاشنی بھی دی گئی ہے لیتھو کی چند تصویریں بھی ہیں۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے اور تا امکان رسالے کو دلکش بنانے میں اہتمام کیا گیا ہے۔ تاہم اس کے بعد بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کیا اس کے لئے درحقیقت کسی نئے رسالے کے جاری کرنے کی ضرورت تھی؟—

سب سے نئی اور انوکھی بات یہ ہے کہ "قوس قزح بفضلہ تعالیٰ مضامین کے بارہ میں اردو رسائل یا اجرتی مضامین کا محتاج نہیں، اس کے پاس اپنا ذخیرہ مضامین کا اس قدر ہے کہ انشاءاللہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آئیگا"۔ یہ بے نیازی اور ہمت ہر طرح قابل تعریف ہے۔ سالانہ چندہ کی مقدار رسالے میں کہیں نظر نہیں پڑی—

———:o:———

حسن خیال

مشاعرہ ایک بہت دلچسپ صحبت ہوتی ہے۔ شاید اس کا وجود ہندوستان کے سوا کسی ملک میں نہیں۔ ان صحبتوں کی وجہ سے اردو شعر و سخن کو بہت فروغ ہوا۔ لوگوں کو زبان کی طرف توجہ ہوئی اور تقلید کلام میں طرح طرح کی موشگافیاں کی گئیں۔ لیکن یہ ذوق لفظی تقلید سے آگے نہ بڑھا۔ مشاعرہ کا میدان ہمیشہ غزل تک محدود رہا اور اس تقلید میں کبھی اسے وسعت دینے کا خیال نہ ہوا البتہ ایک زمانے میں کرنل ہالرائڈ کے زیر ہدایت لاہور میں ایک مشاعرہ قائم ہوا تھا جس میں بجائے مصرعۂ طرح کے نظم کے لئے کوئی مضمون تجویز کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی کی بعض بے مثل نظمیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔ بہر حال یہ صحبتیں اوستادوں کے زور سخن اور مبتدیوں کی مشق کے لئے خوب ہیں اور ہمارے زندہ دل شعرا کی بدولت اب تک قائم ہیں۔ کچھ عرصے سے ایک ایسا ہی مشاعرہ اورنگ آباد میں بھی قائم ہوا ہے اور اسی کی ایک صحبت میں جو کلام پڑھا گیا تھا اس کا انتخاب "حسن خیال" کے نام سے شایع کیا گیا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس دور افتادہ اور اُجڑے شہر میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کا کلام پڑھنے کے قابل ہے۔ سکرٹری صاحب نے توقع دلائی ہے کہ اگر یہ مشاعرہ مستقل طور سے قائم ہو گیا تو یہ رسالہ ماہانہ کر دیا جائیگا۔ ہمیں امید ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب محوی جنہوں نے یہ شوق پیدا کیا ہے اور دوسرے احباب مثلاً حضرات اثر و انیس وشمیم وغیرہ اسے کامیاب بنانے میں ضرور کوشش کریں گے —

———:o:———

الناظر کا انعامی مضمون

اڈیٹر صاحب الناظر نے ہمیں اپنے پرچے کے انعامی مضمون پر ریویو کرنے پر توجہ دلائی تھی، لیکن ہم نے تبصرہ سے عمداً احتراز کیا کیوں کہ یہ بحث ایسی نہیں جو چند سطروں میں طے ہو جائے۔ مگر اڈیٹر صاحب نے اس کے بعد خط کے ذریعہ سے تبصرہ کی فرمائش کی۔ لہذا تعمیل ارشاد میں ہم ایک سرسری نظر اس مضمون پر ڈالتے ہیں —

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ (آزاد کی اُردو شاعرانہ، نذیر احمد کی عامیانہ اور سوقیانہ اور حالی کی روکھی پھیکی ہے۔ اُردو میں اگر کوئی اعلیٰ ادیب اور انشا پرداز ہوا ہے تو وہ شبلی ہے) ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ بالغ نظر ادیبوں

نظم میں کیا وقعت رکھ سکتا ہے —

علاوہ ادبی تنقید کے مضمون نگار نے مولانا نذیر احمد مرحوم کے حق میں
اصد ناانصافی کی ہے - وہ شبلی کو علامہ، حالی کو مولانا، محمد حسین آزاد
پروفیسر (یہ بھی غنیمت) لکھتے ہیں - لیکن نذیر احمد کو ہر موقع پر ڈپٹی
نذیر احمد لکھتے ہیں - جو شخص عربی کا اتنا بڑا جید عالم ہو، جس نے قرآن کا
مثل ترجمہ کیا ہو اور اصول و اخلاق اسلام پر اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی ہوں
اتنا بھی حق نہیں رکھتا کہ اس کے نام کے ساتھ مولوی یا مولانا کا لفظ لکھا
ے - حالانکہ فرنگی محل، ندوہ اور جامعہ ملیہ کے معمولی طالب علموں کے
موں کے ساتھ بھی مولوی اور مولانا کے لفظ لکھے جاتے ہیں - ہم خوب جانتے ہیں
یہ لفظ عمداً لکھا گیا ہے اور اس سے لکھنے والے کی نفس کی کیفیت اور اس کی
ت کا پتہ چلتا ہے - ایسے شخص سے کسی صحیح تنقید کی توقع رکھنا عبث ہے -
لانا شبلی زندہ ہوتے تو ان سے بڑھ کر کوئی اس پر تعریض نہ کرتا —

آج کل یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ لوگ فصاحت و بلاغت، معنی و بیان،
لا و محاورہ، ادب و انشا کے متعلق ادھر ادھر سے چن کر اچھی خاصی باتیں
یہ جاتے ہیں لیکن موقع و محل کو نہیں دیکھتے - وہ سمجھتے ہیں کہ ان اصول
بیان کر کے ان کے تحت میں جو لکھ دیا وہ جائز ہے - اگر صحیح ذوق نہیں ہے
اصول کچھ کام نہیں آتے - یہ حقیقت ہمیں اس مضمون میں جگہ جگہ نظر آئی —

مولانا آزاد کی نثر کے نمونے دربار اکبری سے نقل کر کے لکھے گئے ہیں - حالانکہ
لوم ہے کہ اس میں بہت کچھ تصرف کیا گیا ہے اور مولانا حالی کی تصانیف
ں تو بقول مضمون نگار "بلند اور پر زور عبارت ملنی مشکل ہے" - جب آدمی
بات کہنے کا سلیقہ نہیں ہوتا تو وہ چیخ پکار اور شور غل سے کام لیتا ہے - یہی
س انشاپرداز کرتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بہت بلند اور پر زور عبارت
لکھتے ہیں - مولانا حالی جس طرح الفاظ کا صحیح اور برجا استعمال کرتے ہیں اور
بعات اور کیفیات بیان کرنے میں جیسا انہیں ڈھب آتا ہے اور جس طرح انہوں
بعض تھیٹ اردو کے لفظوں کو رواج دیا ہے اور ہر موقع استعمال کیا ہے اس
نظیر ہماری انشا پردازی میں نہیں ملتی - ہمارے ایک فاضل بزرگ جو
بی فارسی اردو انگریزی اور فرنچ میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں اور ان کا ادبی
ق مسلم ہے، وہ فرماتے تھے کہ ہماری زبانوں میں نثر تھی ہی نہیں مولانا حالی
لے شخص ہیں جنہوں نے معنی اور پاکیزہ نثر لکھی - مگر الناظر کے مضمون نگار
نظروں میں ان کی نثر "بلا کی پھیکی اور بے مزہ" ہے —

قابل مضمون نگار نے جو بعض نمونے مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف سے انتخاب کر کے لکھے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن میں "بلند اور پر زور" عبارت کا کیا مفہوم ہے۔

"ایک طرف خود سالہ پیر ضعیف ہے جس کو دعا ہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہے"—

اس عبارت کو پڑھ کر اُردو کے ادنیٰ ناٹک نظر کے سامنے پھر جاتے ہیں—

"اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنۃ ہوتے" دارالسلطنۃ کا لفظ یہاں کس قدر موزوں ہے!—

شاید یہی چیزیں قابل مضمون نگار کی زبان میں "اختراعات فائقہ ہیں— ?

مضمون نگار صاحب ملا ہوا، تواڑے، پٹخ پٹخ کر، کو متروک سمجھتے ہیں اور کھنڈنا، جھپٹنا، بکٹٹ، ٹھٹور، کو پڑھنے اور سننے والوں کے لئے گراں اور نا گواری کا سبب خیال فرماتے ہیں۔ اُن کے خیال میں چھو خانی، پھٹکنا، لتاڑ، چھدا رکھنا، نکو تھیو، للھمق، اولو، پٹکھا پن اور اسی قسم کے دوسرے لفظ عامیانہ اور سوقیانہ اور ادبی مذاق کے لئے سخت نا گوار ہیں۔ انہیں یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ ہر لفظ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے اور اس کی خوبی اور برائی کا انحصار استعمال کرنے والے کے ذوق پر ہے۔ لفظ بذاتہ نہ بھلا ہے نہ برا۔ ایک اچھے سے اچھے لفظ کا بے موقع استعمال اسے نا گوار اور برا بنا دیتا ہے اور ایک معمولی اور عامیانہ لفظ کا صحیح اور بر محل استعمال عبارت میں خاص شان پیدا کر دیتا ہے۔ متروکات کے متعلق مناسب ہوگا کہ وہ جناب پاتوت برجموهن دتا تریہ صاحب کیفی کا مضمون مطالعہ فرمائیں جو اسی رسالہ میں درج ہے—

قابل مضمون نگار نے بار بار اپنے مضمون میں "عام بول چال" عامیانہ اور سوقیانہ کا لفظ استعمال کیا ہے اور عام لوگوں کی بول چال کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زبان کتابوں سے سیکھی ہے۔ جو لوگ کتابوں سے زبان سیکھتے ہیں وہ زندہ زبان کی حقیقت سے نا واقف ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اصل زبان یہی ہے اور یہی رہے گی۔ مولانا شبلی مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔* وہ دوسروں کے مقلد ہیں اور سب سے بڑے مقلد مولانا حالی کے۔ خاص کر سوانح

x [illegible] کیونکہ جناب کیفی [illegible] کے مشہور خاندان "الفاء" (کوشین) [illegible] ہیں۔ [illegible]

* [illegible] "کیمیائے سعادت" [illegible]

نویسی اور تنقید بھی تنقید انہوں نے حالی ہی سے سیکھی ہے اور زبان میں آزاد، حالی اور نذیر احمد سے خوشہ چینی کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نثر میں کوئی خصوصیت پیدا نہ کر سکے —

یہاں اس کے متعلق بحث کی زیادہ گنجائش نہیں، لیکن مختصر طور پر اس قدر عرض کرنا پڑتا ہے کہ عام یا عامیانہ بول چال کو حقارت سے دیکھنا ایک عالمانہ خود پسندی اور تنگ نظری کی علامت ہے۔یہی عام بول چال زبان کا سرچشمہ قوت ہے جس سے وہ ہر وقت غذا اور تقویت حاصل کرتی رہتی ہے۔زبان کو عام انسانی معاشرت اور حالات سے دوش بدوش رہنا ضرور ہے۔ایسی صورت میں لازم ہے کہ وہ عوام کی بول چال سے فیض حاصل کرتی رہے، ورنہ وہ مردہ ہوجائے گی۔ ہندوستان کی آریائی زبانوں کا یہی حشر ہوا۔جب نحویوں نے اپنے قواعد و ضوابط کے جکڑ بند سے انہیں مقید کرنا شروع کیا اور وہ کتابوں میں محدود ہوگئیں تو اسی وقت سے ان میں انحطاط پیدا ہونے لگا اور کچھ دنوں میں مردہ ہوکے رہ گئیں۔عام بول چال زندہ زبان کے لئے بمنزلہ دل کے ہے جس سے ہر وقت اُسے خون پہنچتا رہتا ہے اور جس وقت یہ رسد بند ہوجاتی ہے تو زبان مرجھنی شروع ہوجاتی ہے اور کتابوں کے اوراق میں بند ہوکے رہ جاتی ہے۔تمام دنیا کی زبانیں جو مردہ کہلاتی ہیں اسی طرح مردہ ہوئیں۔کیا ہم اُردو کو ابھی سے محدود، مفلوج اور مردہ کرنا چاہتے ہیں؟

میں آخر میں مولانا نذیر احمد کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں جو مضمون نگار صاحب نے اپنے مضمون میں لکھی ہے۔اُس کے آخر میں اُن کی رائے لکھوں گا۔اس سے اُن کی ادبی ذوق اور تنقید کی حقیقت معلوم ہوجائے گی —

"ادھر تو نصوح اور سلیم دونو باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔اُدھر اتنی ہی دیر میں فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھڑپ ہوگئی۔نعیمہ اس وقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔پانچ مہینے کا پہلونٹی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت میں پلی، نانی کی چہیتی، ما کی لاڈو، مزاج کچھ تو قدرتی تیز، باپ کے لاڈ پیار سے رہی کہاوت ہے، کریلا اور نیم چڑھا اور بھی چڑچڑا ہوگیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا۔گھونگھٹ کے ساتھ ملہ کھلا اور ملہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہوگیا۔اب چھ چھ مہینے سے ما کے گھر بیٹھی ہوئی تھی مگر رسی جلی پر بل نہ گیا۔باوجودیکہ اُجڑی ہوئی میکے پڑی تھی، مزاج میں وہی طنطنہ تھا، کوار پنے ہی میں سوا گز کی زبان تھی۔کچھ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا، سو بیاہے سے ان کو بھی

مختار بتائی -بولتا چلے پہنچے تو اور بھی کھل کھیلی ' موچھوں کا لحاظ اٹھا دیا. فہمیدہ نے میاں کے روبرو بیٹھوں کا بھرا اٹھاتے تو اٹھا لہالکی لہسہ کے تصور سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور جی ہی جی میں کہتی تھی کہ ذرا بھی اس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑوں گی تو میرا سر مونڈ کر بھی بس نہ کریں گی "۔

اس پاک صاف ستھری عبارت کے متعلق مضمون نگار صاحب کی یہ رائے ہے کہ " اس زبان کے بولنے سمجھنے کا پورا پورا لطف تو گزشتہ صدی میں دلی کے بعض محلے اور کوچے ہی کے لوگ اٹھا سکتے ہیں " اس سے بڑہ کر نا انصافی اور بد مذاقی ہو نہیں سکتی-ہم نے یہ عبارت کئی بار پڑھی مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ ملا جو اس وقت نہ بولا جاتا ہو یا ٹکسال باہر ہو-اس سے بہتر زبان اس موقع کے لئے ہو نہیں ہو سکتی-ہر جملہ موتیوں کی لڑی معلوم ہوتا ہے-اگر لائق مضمون نگار اُن الفاظ اور جملوں کی جگہہ جنہیں وہ قابل اعتراض سمجھتے ہیں دوسرے الفاظ اور جملے رکھہ کر دیکھتے تو انہیں اپنی تنقید کی ساری حقیقت معلوم ہوجاتی (مولانا نذیر احمد اور (مولانا حالی کا بڑا احسان اردو زبان پر یہ ہے کہ انہوں نے بہت اردو کے ایسے الفاظ اور محاورات جو صرف بول چال میں زبانوں پر تھے' ادبی زبان میں داخل کردئے-ان سے زبان کی رونق دو بالا ہوگئی اور مطالب کے ادا کرنے میں خاص لطف پیدا ہوگیا-یہ بڑی جرأت کا کام تھا اور اُن کی یہ جرأت' بہت ہی قابل تحسین ہے' ورنہ خود پسند اور بے لہ انشا پردازوں کے ڈر سے جو بد قسمتی سے اپنے آپ کو ادیب بھی سمجھتے ہیں ہر شخص یہ جرأت نہیں کرسکتا-آج ان دونوں بزرگوں کی بدولت سیکڑوں نئے پر معنی اور پر مغز لفظ اور محاورے ہمارے ادب میں آگئے ہیں جو اب ہر انشا پرداز استعمال کرتا ہے اور تو اور مولانا شبلی کی تصانیف ان الفاظ اور محاوروں سے بھری پڑی ہے جو اُنہیں ان دو حضرات کی بدولت حاصل ہوئے ہیں—

بہر حال یہ مضمون ایک طالب علمانہ مشق کی حیثیت سے بہت اچھا ہے اور اڈیٹر صاحب الناظر کا جو اصل مقصد تھا' یعنی رسالہ کا اشتہار' وہ بھی اس سے حاصل ہوگیا ہے —

(خوب سچ اور بے لاگ تنقید ہے جی)

رسالہ تاج (حیدرآباد دکن) میں اسی پر ایک مضمون مولوی سید جلال صاحب نے تحریر فرمایا ہے' اگرچہ اس کی اُٹھان اچھی ہے لیکن مضمون

نکلتا ہے - افسوس اڈیٹر صاحب تاج نے بوجہ عدم گنجائش زیادہ لکھنے کی اجازت نہیں دی - رسالۂ تاج ترقی کر رہا ہے - گزشتہ سے پیوستہ رسالہ میں ایک بہت بڑا مضمون قدیم اُردو پر چھپا ہے - اس کے مولف ہمارے دوست حکیم شمس اللہ صاحب قادری ہیں - انہوں نے اس کی تالیف میں بڑی تحقیق اور محنت سے کام کیا ہے اور یہ بہت قابل قدر مضمون ہے - اب کتاب کی صورت میں علیحدہ بھی چھپ گیا ہے - انجمن ترقی اُردو سے مل سکتا ہے —

- - - :0: - - -

تصحیح

جولائی کے رسالۂ اُردو میں اختر شیرانی صاحب کی ایک نظم " نوائے گل " کے عنوان سے چھپی تھی اس کے اس مصرعے میں " بہار ہے "اگر" خدائے گل تو بوئے گل کو جانئے دعائے گل " - یہ "اگر" مصرعے میں داخل نہ سمجھا جائے —

اس رسالہ کی طباعت میں حسب ذیل غلطیاں رہ گئی ہیں براہ کرم
درست کر لی جائیں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
٥٣٦	١	عہد	عہدہ
٥٣٩	٩	مقربہیں	مقرہیں
٥٥٩	٢٠	اُس خوب	اُس کو خوب
٥٩٣	١	وزے	کوزے
٥٩٣	٢٢	گوی	گویا
٥٩٢	٢٢	و اور ہم	وہ اور ہم
٦٠٢	١١	پہلوتی	پہلو تہی
٦٠٣	١٢	رکھا	رکھتا
٦٠٣	٧	آفرین	آفرینی
٦٠٥	٢٢	حمادو	جادو
٦٠٦	١١	کو سمر	کو ثمر
٦٠٦	٢١	سارہ	ساز رہ
٦٠٧	٢	ارادم	آرام
٦٠٨	٥	کے فلسفیانہ	کے انہوں فلسفیانہ
٦١٥	١٣	جمیعت	جمعیت
٦١٦	١٢	گر نی	گرنی
٦١٧	٨	چھالے	چھپالے
٦١٨	٣	نما	نمائے
٦١٩	٧	کرتے	کرتے کرتے
٦٢٣	٣	مزاجی	مجازی
٦٢٣	٢٠	کہ لو گو	کہ گو
٦٢٥	١٦	و لاردری	ولاادری
٦٢٨	٣	پائدار	نا پائدار
٦٢٨	١٠	جہالت	جہاد
٦٢٩	١٢	مغنی الفر	مستغنی الفقر
٦٣٦	١٢	باودرچھوں	باورچھوں
٦٣٧	٣	مردہ رہ ا	مردہ وا رہ
٦٤٢	٢٠	اُن پر	اُن پہ
٦٥٣	٣	متروکی	متروکات کی
٦٥٨	٢	کو کبھی	کے کبھی
٦٦٠	٢٢	اتاع	اتباع
٦٦٢	٢	واجو	واجد
٦٦٣	٢	خوشی کی کسی	خوشی کسی
٦٦٤	١	گریباں	غریباں
٦٦٥	٢٣	ان کو چوتھی	ان کے چوتھے
٦٧٣	٥	لئے	لے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۷۹	۱۶	فهم نے	فهم	۷۲۷	۱۹	سرد	سرو
۶۸۶	۱۹	عاج	عاجز	۷۲۷	۲۸	دوادیں	دواویں
۷۰۱	۲۵	روش	روشنی	۷۲۷	۲۹	دوادیں	هواویں
۷۰۲	۱۰	کهلا	کهلا	۷۲۸	۱۷	دیوانی	دیوان
۷۰۷	۱۳	شق	شوق	۷۲۹	۸	طربی	طبری
۷۰۸	۱۴	بهی تهین	بهی هیں	۷۲۹	۱۳	سے تاریخ طربی	نے تاریخ طبری
۷۰۸	۱۸	هیں نا یه	هیں یه	۷۳۰	۳۰	حا کا پوراه	شاه کا پورا
۷۰۸	۲۱	معمور	مصور	۷۳۱	۱۶	اراه	اراده
۷۱۲	۳	تح	بح	۷۳۲	۵	لوز	نود
۷۱۲	۱۱	جتلے	جهٹے	۷۳۲	۲۰	سجائد	مصامد
۷۲۰	۱۵	ایسے	اسے	۷۳۸	۶	مضامین	فضا میں
۷۲۲	۱۹	تریقه	طریقه	۷۳۸	۲۲	مسلم	مسخ
۷۲۳	۱۲	مکشرقین	مستشرقین	۷۳۸	۲۵	سمائیں	که ایں
۷۲۶	۲۰	میں مذکور	مذکور	۷۳۹	۱۶	دیدیه	دے کر یه

فہرست مضامین رسالۂ اُردو جلد پنجم بابتہ سنہ ۱۹۲۵ء

رسالہ اردو کے خریداروں کے ساتھ خاص رعایت

رسالہ اردو کے خریداروں کو انجمن ترقی اردو کی شایع کی ہوئی کتابیں فی روپیہ چار آنہ کمی قیمت کے ساتھ دی جائیں گی۔ امید ہے کہ خریدار اس رعایت سے فائدہ اٹھائیں گے

دیگر مقامات کی کتابیں جو بطور ایجنسی انجمن میں فروخت ہوتی ہیں ان کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی جا سکتی —

آنریری سکرٹری
انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

اطلاع

رسالہ اردو نمبر ۲ سے نمبر ۱۵ تک اور نمبر ۱۷ سے نمبر ۲۰ تک موجود ہیں اور بہ حساب فی رسالہ دو روپیہ سکۂ انگریزی علاوہ محصول ڈاک مل سکتے ہیں —

المشتہر
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

نیرنگ ارضی ۱ روپیہ ۴ آنہ
سیر المصنفین ۲ روپیہ
Hindustani Simplified (اردو آموز)
دنیش چندر دت صاحب ایم اے ۳ روپیہ
شرح Hindustani Simplified ۱ روپیہ
رسالہ نماز Prayer Book ۱ روپیہ
معراج العاشقین ۲ آنہ
ابتدائی تعلیم کی رام کہانی ۱ روپیہ ۴ آنہ
ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی
جغرافیائی کیفیت ۲ آنہ
وہ جاندار جو نظر نہیں آتے ۴ آنہ
جہاں آرا بیگم ۸ آنہ
(تصانیف نور الہی و محمد عمر صاحبان)
موجودہ لندن کے اسرار ۱ روپیہ
ناٹک ساگر یعنی دنیائے ڈراما کی تاریخ
مجلد ۳ روپیہ
تین توپیاں ۸ آنہ
ظفر کی موت ۴ آنہ
قزاق ۸ آنہ
بگڑے دل ۸ آنہ
(دارالاشاعت پنجاب لاہور کی کتابیں)
صبح زندگی ۱ روپیہ ۸ آنہ
شام زندگی ۱ روپیہ ۴ آنہ
شب زندگی ہر دو حصہ ۲ روپیہ ۴ آنہ
منازل السائرہ ۱ روپیہ
سلجوک ۱۰ آنہ
جوہر ندامت ۱ روپیہ ۸ آنہ
تحفۂ سائنس ۲ روپیہ ۸ آنہ

مشاہیر ہند ۲ روپیہ ۸ آنہ
نیلی چھتری ۱ روپیہ ۴ آنہ
بہرام کی گرفتاری ۱ روپیہ
اختر النسا بیگم ۱ روپیہ ۸ آنہ
دکھ بھری کہانی ۲ آنہ ۲ پائی
روشنک بیگم ۲ روپیہ
رانی کرونارت ۱ آنہ
رسوم دہلی ۳ آنہ ۲ پائی
ان پورنا دیوی کا مندر ۱ روپیہ ۸ آنہ
ایام غدر ۱ روپیہ ۴ آنہ
نقش فرنگ ۱ روپیہ ۴ آنہ
پریم پچیسی مکمل ۳ روپیہ
پریم بتیسی حصۂ اول ۱ روپیہ ۸ آنہ
بانگ درا مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ
بانگ درا غیر مجلد ۴ روپیہ
نعمت خانہ ۱ روپیہ ۴ آنہ
خواب راحت ۴ آنہ
چلدن ہار ۲ آنہ
انمول موتی ۱ آنہ ۲ پائی
سوکن کا جلاپا ۲ آنہ
گوہر مقصود ۲ آنہ
لیلی ۲ روپیہ
سواد السبیل ۱ روپیہ
سخندان پارس ۱۰ آنہ
قوانین دولت ۴ آنہ
مینا ۱۲ آنہ
چکرا ۱۲ آنہ

———•———

مطبوعات انجمن

جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق

سرکار نظام نے نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کو جاپان کے تعلیمی نظام کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاصکر تعلیمی نظم و نسق کو نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا۔ کتاب کے ابتدائی حصہ میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے۔ جو ہمارے اہل وطن کے لئے بہت سبق آموز ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے۔ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھے جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات ہے۔ خاصکر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں (حجم ۳۸۲ صفحہ)

قیمت فی جلد مجلد تین روپیہ کلدار

سرگزشت حیات یا آپ بیتی

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نشو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔ حیات کی ابتدائی حالت سے لے کر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقہ سے بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا ہوا آدمی بھی سمجھ سکے اور اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہے مگر بیان کی سلاست میں فرق نہیں آیا۔ یہ کتاب جدید معلومات سے لبریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۲۰۰ صفحہ)

قیمت غیر مجلد مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار۔

تذکرۂ شعرائے اردو

مولنہ میر حسن دہلوی۔ میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ ان کی مثنوی بدر منیر کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر طبع کی گئی ہے۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت ہے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے۔ قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنہ کلدار۔ غیر مجلد ایک روپیہ ۹ آنہ کلدار۔

تاریخ تمدن

سرتامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا

ترجمہ ہے۔ الف سے ی تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ حصۂ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ مجلد دو روپیہ کلدار حصۂ دوم مجلد ۲ روپیہ کلدار ـــ

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس دان حکیم ہکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔ اس میں مظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار۔ مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار ـــ

الفوز الاصغر

امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف فوز الاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب فلسفۂ الہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو منطبق کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار مجلد ایک روپیہ کلدار ـــ

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے قیمت غیر مجلد ۱۲ آنہ کلدار۔ مجلد ۱ روپیہ کلدار ـــ

قاعدہ و کلید قاعدہ

یہ قاعدہ مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہئے ان کی تشریح کے لئے ایک کلید بھی تیار کی گئی ہے۔ قاعدہ غیر مجلد ۲ آنہ کلدار۔ کلید قاعدہ غیر مجلد ۴ آنہ کلدار ـــ

فلسفۂ تعلیم

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلۂ تعلیم کی آخری کتاب ہے غور و فکر کا بہترین کارنامہ۔ والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے۔ تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔ قیمت مجلد ۳ روپیہ کلدار۔ غیر مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار ـــ

دریائے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاءاللہ خاں کی تصنیف ہے۔ اردو صرف و نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنہ کلدار مجلد ۲ روپیہ کلدار ـــ

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل

ترجمہ کئے ہیں۔کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مترادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔قیمت غیر مجلد ۲روپیہ کلدار مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

مشاهیر یونان و روما

ترجمہ ہے۔سیرت نگاری اور تاریخ نگاری میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادیبان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے۔وطن پرستی اور بے نفسی عزم وجواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے۔قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپیہ کلدار۔مجلد ۴ روپیہ کلدار جلد دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

اسباق النحو

ملک کے ادیب کامل مولانا حمیدالدین صاحب بی اے کی تالیف ہے اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔قیمت حصہ اول غیر مجلد ۶ آنہ کلدار حصہ دوم غیر مجلد ۴ آنہ کلدار —

علم المعیشت

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم اے نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب

ہیں۔اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔ حجم ۸۸۵ صفحے قیمت مجلد ۵ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر۔تحقیق و صداقت کا مرادف ہے۔ یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن۔ معاشرت – اصول – اخلاق – مذاہب و خیالات کا مرقع ہے۔حصہ اول مجلد ۳روپیہ کلدار حصہ دوم مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ۔اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے۔ایف اے کلاس کے طلبا جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار —

انتخاب کلام میر

میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے کلام کا انتخاب ہے۔مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اورشروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۰ صفحہ کا ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔قیمت مجلد ۲ روپیہ کلدار —

رسالۂ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے-علمی اصطلاحات سے معرا-طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں نہ سمجھہ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ کلدار—

دیہاتی صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت پر (مثلاً ہوا-پانی-غذا-لباس-مکان وغیرہ) مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے-زبان عام فہم اور پیرایہ موثر و دلپذیر ہے ملک کی بہترین تصنیف ہے-اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا-حجم ایک ہزار صفحے-قیمت مجلد چار روپیہ کلدار—

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے-بسط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے قیمت غیر مجلد دو روپیہ کلدار—

نکات الشعراء

یہ اردو کا تذکرہ استاد الشعرا میر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے-اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں-نیز میر صاحب کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل ہیں-مولانا مصنف حبیب الرحمن خان صاحب شروانی صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک عالمانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے-قیمت مجلد دو روپیہ ۴ آنہ کلدار—

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے-جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لطافت اور زبان آوری کے ساتھہ بحث کی گئی ہے-متعلمان نفسیات اسے مفید پائیں گے قیمت مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ کلدار—

وضع اصطلاحات

یہ کتاب ملک کے نامور انشاپرداز اور عالم مولوی وحیدالدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے بقول فاضل مولف "یہ بالکل نیا موضوع ہے-میرے علم میں شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں"-اس میں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھہ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں-مخالف و موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے-سابقوں اور لاحقوں-اردو مصادر اور ان کے

لغات - غرض مضمون دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آگئی ہیں۔ اردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان میں ان کی نظیر نہیں۔لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کردی ہیں اور ہمارے حوصلے بلند کردئے ہیں۔اس سے پہلے ہم اردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعوی کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے۔تعداد صفحات ۳۰۵ قیمت مجلد تین روپیہ ۱۲ آنہ کلدار —

نفح الطیب

یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے۔خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے۔علامۂ مقری کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۶۰۴ قیمت مجلد چھہ روپیہ ۸ آنہ کلدار —

محاسن کلام غالب

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا معرکۃالآرا مضمون ہے۔اردو زبان میں یہ پہلی تصویر ہے جو اس جہان کی لکھی گئی ہے۔یہ مضمون اردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا۔صاحب نظر قدر دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۸ آنہ کلدار —

ملل قدیمہ

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں بعض قدیم اقوام۔سلطنت کالدانی۔آشوری۔بابل۔بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت۔عقائد۔صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دئے ہیں۔اردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہوسکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ہیں۔صفحہ ۲۷۳۔قیمت مجلد دو روپیہ ۹ آنہ کلدار —

بجلی کے کرشمے

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے۔ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے۔کہاں سے آتی ہے۔کیا کام آسکتی ہے۔یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے۔لڑکے لڑکیوں کے لئے بھی مفید ہے۔ قیمت دو روپیہ ۳ آنہ کلدار —

—:o:—

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں
(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

(دار المصنفین اعظم گڈھ)

۱- سیرۃ النبی حصۂ اول ۴ روپیہ
۲- سیرۃ النبی حصۂ دوم ۳ روپیہ ۸ آنہ
۳- سیرۃ النبی حصۂ سوم ٦ روپیہ
۴- شعر العجم مکمل ۵ حصے ۱۲ روپیہ
۵- سفرنامہ مولانا شبلی ۲ روپیہ
٦- علم الکلام ۲ روپیہ
۷- الکلام ۲ روپیہ
۸- کلیات شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۹- اسوۂ صحابہ مکمل دو حصے ۸ روپیہ
۱۰- انقلاب الامم ۲ روپیہ
۱- برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱- مکالمات برکلے ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱- مثنوی بحر المحبت ۱۲ آنہ
۱- تفسیر ابومسلم اصفہانی (عربی) ۲ روپیہ
۱- سیر الصحابیات ۲ روپیہ ۴ آنہ
۱- روح الاجتماع ۲ روپیہ
۱- ابن رشد ۴ روپیہ
۱- گل رعنا ۵ روپیہ
۱- سیر الانصار ۳ روپیہ ۸ آنہ

(مطبع کاویانی - برلن)

- موش و گربہ (فارسی) ۵ آنہ ٦ پائی
- زاد المسافرین (فارسی) ۸ روپیہ
- گلستان (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۴- تیاتر (فارسی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
۵- تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) ۲ روپیہ ۸ آنہ
٦- نصاب الصبیان (فارسی) ۱ روپیہ
۷- رہنمائے پسران (فارسی) ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- تلغراف بی سیم (فارسی) ۱ روپیہ
۹- ہزار و یک سخن (فارسی) ۱۱ آنہ

(جامعہ ملیہ - علی گڈھ)

۱- الخلافت الکبریٰ ۵ روپیہ
۲- الصراط المستقیم ۳ روپیہ
۳- بصائر ٦ آنہ
۴- سیرۃ الرسول ۱ روپیہ ۸ آنہ
۵- خلافت راشدہ ۲ روپیہ
٦- خلافت بنی امیہ ۱ روپیہ ۸ آنہ
۷- خلافت عباسیہ ۲ روپیہ
۸- خلافت عباسیہ بغداد ۲ روپیہ
۹- مبادی معاشیات ۱ روپیہ
۱۰- انتخاب میر (از نور الرحمن صاحب) ۱ روپیہ
۱۱- قواعد عربی ۲ روپیہ
۱۲- عرض جوہر ۸ آنہ
۱۳- مجموعہ کلام جوہر ٦ آنہ
۱۴- اسلامی تہذیب و قومی تعلیم ۳ آنہ
۱۵- ازہار العرب ۸ آنہ

ا- انتخاب مضامین جوہر ۱ روپیہ
ا- ترکوں کی کہانیاں ۳ آنہ
ا- خطبہ شیخ الہند ۲ آنہ
ا- خطبہ حکیم اجمل خاں صاحب
۲ آنہ
۱- ہمارے نبی ۸ آنہ
ا- تاریخ ہند قدیم ۱ روپیہ
ا- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر
۱۲ آنہ

(نظامی پریس- بدایوں)

- قاموس المشاہیر جلد اول ۲ روپیہ
- نکات غالب مجلد ۱ روپیہ
- دیوان غالب مشرح مجلد دو روپیہ
۸ آنہ
- دیوان جان صاحب مجلد ۱ روپیہ
۸ آنہ
- دیوان درد ۱ روپیہ ۴ آنہ
- دیوان غالب (لائبریری ایڈیشن)
۱ روپیہ ۸ نہ
- خطوط سرسید قسم اول ۳ روپیہ
- خطوط سرسید قسم دوم ۲ روپیہ
ا- لیتھوگرافی مجلد ۲ روپیہ ۸ آنہ
ا- انتخاب زرین مجلد ۲ روپیہ
ا- مراثی انیس جلد اول مجلد
۱۰ روپیہ
ا- مراثی انیس جلد دوم قسم اول
۸ روپیہ قسم دوم ۴ روپیہ
ا- تذکرۃ الصلحا ۸ آنہ
ا- کنزالتاریخ ۱ روپیہ ۸ آنہ

(دائرۂ ادبیہ۔ لکھنؤ)

۱- یادگار غالب ۳ روپیہ
۲- مکاتیب امیر مینائی ۲ روپیہ ۸ آنہ
۳- مکاتیب اکبر روپیہ
۴- میلاے سخن ۱ روپیہ
۵- حزن اختر ۸ آنہ
۶- درس عمل ۴ آنہ
۷- خواتین انگورہ ۱ روپیہ
۸- بیگمات بنگال ۶ آنہ
۹- اسلام کا اثر یورپ پر ۳ آنہ
۱۰- مشرقی ترکستان ۶ آنہ
۱۱- سیاحت زمین ۱ روپیہ
۱۲- سیاحت ہوا ۱ روپیہ

الناظر پریس- لکھنؤ

۱- تاریخ عرب ۷ روپیہ ۸ آنہ
۲- موازنہ انیس و دبیر ۳ روپیہ
۳- مقدمہ شعر و شاعری ۱ روپیہ ۴ آنہ
۴- اصول النسخ ۲ آنہ
۵- مسلمانان اندلس ۱ روپیہ ۸ آنہ
۶- اسرار رنگون ۱ روپیہ
۷- ہوم رول ۵ آنہ
۸- خوان دعوت ۱ روپیہ
۹- مصنوعی شوہر ۲ آنہ
۱۰- وکرم اروسی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۱- مسلمانوں کی تہذیب ۲ آنہ
۱۲- الاحسان ۸ آنہ
۱۳- ارض نہرین ۴ آنہ
۱۴- تذکرۂ حزیں ۴ آنہ
۱۵- حیات نظامی ۴ آنہ
۱۶- خطاب ۴ آنہ

۱۷- سعادت نبوی ۳ آنہ
۱۸- تصویر درد ۳ آنہ
۱۹- شمع و شاعر ۲ آنہ
۲۰- فریاد امت ۳ آنہ

(دوسری قابل قدر کتابیں)

۱- رسائل شبلی ۱ روپیہ ۸ آنہ
۲- کتب خانہ اسکندریہ ۵ آنہ
۳- مسدس حالی ۱۲ آنہ
۴- جنگل کی پہلی کہانی ۵ آنہ
۵- بادل کے بچے ۱ روپیہ
۶- بانگ درا ۳ روپیہ
۷- یادگار غالب ۱ روپیہ ۸ آنہ
۸- مجموعہ نظم حالی ۸ آنہ
۹- اکبری اقبال ۳ آنہ
۱۰- الفاروق ۳ روپیہ
۱۱- اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ۸ آنہ
۱۲- نظم شبلی ۳ آنہ
۱۳- نفس اللغۃ ۱ روپیہ
۱۴- ترانۂ شوق ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۵- خوبی سخن ۸ آنہ
۱۶- دیگر ممالک میں قطع تعلق ۱۰ آنہ
۱۷- آزادی اسلام ۳ آنہ
۱۸- مصطفیٰ کمال پاشا ۱ روپیہ ۸ آنہ
۱۹- گوکھلے کی تقریریں ۱۲ آنہ
۲۰- سلف گورنمنٹ ۶ آنہ
۲۱- عالم خیال ۸ آنہ
۲۲- حیات خسرو ۸ آنہ
۲۳- نظام حیات انسانی ۸ آنہ
۲۴- فرہنگ فارسی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ
۲۵- فرہنگ عربی جدید ۱ روپیہ ۸ آنہ
۲۶- اسلامی حکومت ۲ آنہ

———:o:———

دیوان غالب جدید و قدیم

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا- اس میں مرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے- میر صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے- مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم مجلد ۵ روپیہ کلدار- غیر مجلد ۴ روپیہ کلدار (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپیہ ۸ آنہ کلدار غیر مجلد دو روپیہ ۸ آنہ کلدار)—

مکاتیب

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحومین کے غیر مطبوعہ خطوط کا قابل قدر- دلچسپ- پر از معلومات اور بہترین مجموعہ- مرتبہ مولوی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ ریاست بھوپال ۱ روپیہ—

المشتہر

انجمن ترقی اردو- اورنگ آباد (دکن)